text dark and light

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222108

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. [illegible] Accession No

Author

Title

This book should be returned on or before the date last stamped below.

# چوگانِ ہستی

ایک ناول

(دوسرا حصہ)

منشی پریم چند

پہلی بار ——— ۵۰۰ پانچسو

5/8/-

قیمت ساڑھے پانچ روپیہ

پبلشرز۔ ادبی مرکز دھلی

سول ایجنٹ۔ مکتبہ دبنگین ۹۰۔ گنجمیر خان
عقب نئی لائٹ دھلی
(گروپ نگر بریلی)

# چوگانِ ہستی

(دوسرا حصہ)

ایک ناول

پریم چند

ادبی مرکز دہلی

# منشی صاحب کی تمام بہترین کتابیں ہم سے منگوائیں

| | |
|---|---|
| نرملا | ۴/۸/- |
| خاک پروانہ | ۲/۱۲ |
| حب وطن | ۲/- |
| بازار حسن | ۴/۸/- |
| واردات | ۳/- |
| زادِ راہ | ۲/۸/- |
| غبن | ۵/- |
| میدان عمل | ۶/- |
| پردہ مجاز | ۵/۸/- |
| بیوہ | ۲/۸/- |
| رنگھی رانی | ۲/- |
| خواب وخیال | ۲/- |
| گوشۂ عافیت | ۱۲/- |
| دیہات کے افسانے | ۳/- |

بہترین مصنفوں کی بہترین کتابیں چاہے کہیں چھپی ہوں۔ ہم سے طلب کریں

مکتبہ رنگین ۱۰۹۷ گنج میر خاں عقب ڈیلائٹ دہلی ۷

## (۲۶)

ارآدلی کی سرسبز جھومتی ہوئی پہاڑیوں کے دامن میں جسد نت نگر اس طرح منہ چھپائے ہوئے ہے جیسے بچہ ماں کی گود میں۔ ماں کی چھاتی سے دودھ کی دھاریں جوش محبت سے ہزار ہا البتی میٹھے سُروں میں گاتی نکلتی ہیں اور بچہ کے ننھے سے منہ میں نہ سما کر نیچے بہہ جاتی ہیں۔ صبح کی سنہری شعاعوں میں نہا کر یہاں کا چہرہ نکھر گیا ہے۔ اور بچہ بھی آنچل سے منہ نکال کر یہاں کے امنڈتے بھرے چہرہ کی طرف دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے۔ مگر ماں بار بار اُسے آنچل سے ڈھک لیتی ہے کہ کہیں اُسے نظر نہ لگ جائے۔

دفعتاً توپ کے دغنے کی کرخت آواز سنائی دی۔ ماں کا دل دہل گیا۔ بچہ گود سے چمٹ گیا۔ پھر وہی مہیب آواز۔ ماں کانپ اُٹھی۔ بچہ سمٹ گیا۔

پھر تو لگاتار توپیں چھوٹنے لگیں۔ ماں کے چہرہ پر خوف کے بادل چھا

گئے۔ آج ریاست کے نئے پولیٹیکل ایجنٹ یہاں آ رہے ہیں۔ انہیں کے خیر مقدم میں سلامیاں اُتاری جا رہی ہیں۔

مسٹر کلارک اور صوفیا کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا۔ جاگیرداروں کی ملاقاتوں دعوتوں نذرانوں سے اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ آپس میں کچھ بات چیت ہو۔ صوفیا بار بار مونے سنگھ کا تذکرہ کرنا چاہتی، مگر نہ تو اسے موقعہ ہی ملتا اور نہ یہی سوجھتا کہ کس طرح تذکرہ کروں۔ آخر جب پورا مہینہ ختم ہو گیا تو ایک روز اس نے کلارک سے کہا۔ "ان خاطر داریوں کا سلسلہ تو جاری ہی رہے گا۔ اور یہ سال گذری جا رہی ہے۔ اب یہاں جی نہیں لگتا۔ اب پہاڑی علاقوں کی سیر کرنی چاہئے۔ پہاڑیوں میں خوب بہار ہوگی"۔ مسٹر کلارک بھی راضی ہو گئے۔ ایک ہفتہ سے دونوں ریاست کی سیر کر رہے ہیں۔ ریاست کے دیوان سردار سنگھ راؤ بھی ہمراہ ہیں۔ جہاں یہ لوگ پہنچتے ہیں۔ بڑی دھوم دھام سے ان کا خیر مقدم ہوتا ہے۔ سلامیاں دی جاتی ہیں۔ ایڈریس ملتے ہیں۔ خاص خاص مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے۔ مدرسوں، شفاخانوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ صوفیہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ وہ قیدیوں کو اُن کے کھانے کے مقامات، کوٹھڑی، قید خانہ کے قواعد کو نہایت توجہ سے دیکھتی ہے۔ اور قید خانوں کی حالت میں اصلاح کرنے پر ملازموں سے خاص زور دیتی ہے۔ آج تک بدنصیب قیدیوں کی طرف کسی ایجنٹ نے بھی کبھی توجہ نہ کی تھی۔ اُن کی حالت قابلِ افسوس تھی۔ انسانوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا تھا کہ اُس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر صوفیا کی متواتر مساعی سے ان کی حالت سُدھرنے لگی ہے۔ آج جسونت نگر کو مہمانوں کی خاطر تواضع کرنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ اور سارا شہر ان کی خاطر داریوں میں مصروف ہے۔ ریاست کے ملازمین پگڑیاں باندھے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ کسی کے ہوش و حواس بجا نہیں

ہیں۔ جیسے خواب میں کسی نے بھیڑیا دیکھا ہو۔ عمال نے بازاروں کو آراستہ کرایا ہے۔ جیل کے قیدیوں اور شہر کے چوکیداروں نے قلیوں اور مزدوروں کا کام کیا ہے۔ وہاں کا کوئی بھی آدمی بلا اجازت سڑکوں پر نہیں جانے پاتا۔ شہر کا کوئی شخص اس خیر مقدم میں شریک نہیں ہوا۔ اور ریاست نے عوام کی اس بے اعتنائی کا اسی صورت میں جواب دیا ہے۔ سڑکوں کے دونوں طرف مسلح سپاہیوں کی قطاریں استادہ ہیں۔ کہ رعایا کی دلی بے چینی کا کوئی نشان نظر نہ آئے۔ عام جلسوں کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ جلوس نکلا۔ پیدل اور سوار آگے آگے تھے۔ فوجی باجے بج رہے تھے۔ سڑکوں پر روشنی ہو رہی تھی۔ مگر مکانوں میں چھتوں پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔ مگر چھتوں سے نہیں بلکہ سپاہیوں کے ہاتھوں سے۔ صوفیا سب کچھ سمجھتی تھی مگر کلارک کی آنکھوں پر پردہ سا پڑا ہوا تھا۔ اقتدار کی ہیجان انگیزی نے ان کی عقل خبط کر دی ہے۔ سرکاری عمال سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن عقیدت عامہ پر ان کا قابو نہیں ہوتا۔ شہر میں کہیں جوش مسرت کا پتہ نہیں ہے۔ مردنی سی چھائی ہوئی ہے۔ نہ ہر قدم پر بچے کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ نہ کوئی دیوی آرتی اتارنے کو آتی ہے اور نہ کہیں گانا بجانا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے سوگ میں ہتلاں کے سامنے جشن منایا جا رہا ہے۔

شہر کا گشت کر کے صوفیا، مسٹر کلارک، سردار نیلکنٹھ اور دو ایک اعلیٰ ملازمین سرکاری تو شاہی محل میں آکر رونق افروز ہوئے۔ بقیہ لوگ رخصت ہو گئے۔ میز پر چاء لائی گئی۔ مسٹر کلارک نے بوتل سے پیالہ میں شراب ڈالی تو سردار صاحب جنہیں شراب کی بو سے نفرت تھی۔ کھسک کر صوفیا کے پاس جا بیٹھے اور بولے جسونت نگر آپ کو کیسا پسند آیا؟

صوفیا۔ نہایت پرفضا مقام ہے۔ پہاڑیوں کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ شاید کشمیر کے سوا ایسا قدرتی نظارہ اور کہیں نہ ہوگا۔ شہر کی صفائی

سے جی خوش ہو گیا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں یہیں رہوں

نیلکنٹھ ڈر گئے۔ ایک دو روز تک تو پولیس اور فوج کی طاقت سے شہر کو پُر امن رکھا جا سکتا ہے۔ مگر مہینے دو مہینے تک کسی طرح بھی نہیں۔ بالکل ناممکن ہے۔ کہیں یہ لوگ یہاں ٹھہر گئے تو شہر کی واقعی حالت ضرور ہی روشن ہو جائے گی۔ نہ جانے اُس کا کیا انجام ہو۔ بولے۔ "یہاں کی ظاہری دلفریبی کے دھوکے میں نہ آئیے۔ آب و ہوا بہت خراب ہے۔ آگے جا کر آپ کو اس سے زیادہ بہتر مقامات دیکھنے کو ملیں گے۔"

صوفیا۔ کچھ ہی ہو۔ میں یہاں دو ہفتے ضرور ہی رہوں گی۔ کیوں ولیم۔ تمہیں یہاں سے جانے کی جلدی تو نہیں ہے؟

کلارک۔ تم یہاں رہو تو میں دفنا ہو جانے کو تیار ہوں۔

صوفیا۔ لیجئے سردار صاحب۔ ولیم کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔

صوفیا کو سردار صاحب کے دق کرنے میں مزہ آ رہا تھا۔

نیلکنٹھ۔ پھر بھی میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جمعیت نگر بہت اچھی جگہ نہیں ہے۔ آب و ہوا کی خرابی کے علاوہ یہاں کی رعایا میں بدامنی کی علامات پیدا ہو گئی ہیں۔

صوفیا۔ جب تو ہمارا یہاں ٹھہرنا اور بھی ضروری ہے۔ میں نے کسی ریاست میں یہ شکایت نہیں سُنی۔ گورنمنٹ نے ریاستوں کو اندرونی انتظامات میں خود مختار بنا رکھا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ ریاستوں میں بغاوت کے جراثیم کو نشو و نما پانے کا موقع دیا جاوے۔ اس کی ذمہ داری ریاست کے حکام پر ہے۔ اور گورنمنٹ کو اختیار ہے کہ وہ اس غفلت کے لئے اُن سے اطمینان بخش جواب طلب کرے۔

سردار صاحب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ صوفیا سے انہوں نے یہ بات بیخوف ہو کر کہہ دی تھی۔ اس کی مکسر المزاجی سے انہوں نے سمجھ لیا تھا۔

کہ میری نند و نیاز نے اپنا کام کر دکھایا۔ وہ کچھ بے تکلف سے ہو گئے تھے۔ یہ ڈانٹ پڑی تو آنکھیں چندھیا گئیں۔ التجا کے لہجہ میں بولے :۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر چہ ریاست پر موجودہ حالات کی ذمہ داری ہے تاہم ہم لوگوں نے جتنے الامکان حالات کو درست رکھنے کی کوشش کی اور اب بھی کر رہے ہیں۔ یہ بدامنی کا بیج اس مقام سے آیا جہاں سے اس کے آنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ یا یوں کہئے کہ زہر کے قطرے نہری برتنوں میں لائے گئے۔ بنارس کے رئیس کنور بھرت سنگھ کے وائسٹیروں نے کچھ ایسی ہوشیاری سے کام کیا کہ ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ڈاکوؤں سے دولت کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔ مگر سادہ لوحوں سے نہیں۔ رضاکاروں نے خدمت کی آڑ میں یہاں کی بیوقوف رعایا پر ایسا منتر پھونکا کہ اس کے اثار فرو ہیں ریاست کو بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خصوصاً کنور صاحب کا لڑکا تو نہایت شریر طبیعت کا آدمی ہے۔ اس نے اس علاقہ میں اپنے باغیانہ خیالات کی یہاں تک اشاعت کی کہ اُسے باغیوں کا اکھاڑا بنا دیا۔ اس کی باتوں میں کچھ ایسا جادو ہوتا تھا۔ کہ رعایا پتنگوں کی طرح اس کی طرف دوڑتی تھی۔ اس کا فقیرانہ بھیس، اس کی سادہ اور بے لوث زندگی، اس کی سچی ہمدردی و غمگساری اور سب سے زیادہ اس کے حسن مردانہ کی کشش نے سب چھوٹے بڑوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ ریاست کو بڑی فکر ہوئی۔ ہم لوگوں کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر لحہ بغاوت کی آگ بھڑک اٹھنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں تک کہ ہمیں صدر سے فوجی کمک روانہ کرنی پڑی۔ دنے سنگھ تو کسی طرح گرفتار ہو گیا مگر اس کے دیگر رفقاء ابھی تک علاقہ میں چھپے ہوئے رعایا کو اکسا رہے ہیں۔ کئی بار یہاں سرکاری خزانہ لٹ چکا ہے۔ کئی بار دنے کو جیل سے نکال لے جانے کی ناکام کوشش کی جا چکی ہے۔ اور ملازمین کو ہمیشہ اپنے جانوں کا خوف بنا رہتا ہے۔ مجھے مجبور ہو کر آپ سے یہ حال بیان کرنا پڑا۔ میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی صلاح ہرگز

نہ دوں گا۔ اب آپ خود سمجھ سکتی ہیں کہ ہم لوگوں نے جو کچھ کیا۔ اس کے سوا اور کیا کر سکتے تھے۔"

صوفیا نے بہت زیادہ متفکرانہ انداز سے کہا۔ واقعی حالت اُس سے زیادہ تشویشناک ہے جتنا میں سمجھتی تھی۔ ایسی حالت میں وہیم کا یہاں سے چلا جانا فرض کے خلاف ہوگا۔ وہ یہاں گورنمنٹ کے فائق مقام ہو کر آئے ہیں۔ صرف سیر و تفریح کے لئے نہیں۔ کیوں وہیم! تمہیں یہاں رہنے میں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ یہاں کے حالات کی رپورٹ بھی تو بھیجنی پڑے گی۔

مسٹر کلارک نے شراب کا ایک گھونٹ پیتے ہوئے جواب دیا: "تمہاری مرضی ہو تو جہنم میں بھی بہشت کی خوشی حاصل کر سکتا ہوں۔ رہا رپورٹ کا لکھنا۔ وہ تمہارا کام ہے۔"

نیلکنڈ۔ میری آپ سے مؤدبانہ عرض ہے کہ ریاست کو سنبھلنے کے لئے کچھ اور وقت دیجئے۔ آپ کا رپورٹ بھیجنا ہمارے لئے مُضر ہوگا۔

اِدھر تو یہ تماشہ ہو رہا تھا۔ صوفیا اقتدار کے تخت پر جلوہ افروز تھی۔ ثروت مور چھل ہلاتی تھی۔ رعب اردلی میں کھڑا تھا۔ اُدھر دو سنگھ اپنی اندھیری کال کوٹھری میں غم و غصہ میں بھرا بیٹھا ہوا عورت کی بیدردی اور بیوفائی پر رو رہا تھا۔ اور قیدی اپنے اپنے کمرے صاف کر رہے تھے۔ انہیں کل نئے کمبل اور نئے کرتے دیئے گئے تھے جو ریاست کی تاریخ میں ایک نیا واقعہ تھا۔ جیل کے ملازمین قیدیوں کو پڑھا رہے تھے: "میم صاحب پوچھیں۔ تمہیں کیا شکایت ہے تو سب لوگ یکزبان ہو کر کہنا۔ حضور کے اقبال سے ہم سب لوگ بہت آرام سے ہیں۔ اور حضور کے جان و مال کی خیر مناتے ہیں۔ پوچھیں۔ کیا چاہتے ہو تو کہنا حضور کی روز بروز ترقی ہو۔ اس کے سوا ہم اور کچھ نہیں چاہتے۔ خبردار جو کسی نے سر اوپر اٹھایا یا کوئی اور بات زبان سے نکالی۔ کھال اُدھیڑ دی جائے گی۔" قیدی جامہ میں پھولے نہ

سمانے تھے۔ آج میم صاحبہ کی آمد کی خوشی میں مٹھائیاں ملیں گی۔ ایک دن کی چھٹی ہوگی۔ بھگوان انہیں سدا سکھی رکھیں کہ ہم ابھاگوں پر اتنی دیا کرتی ہیں۔

مگر دالے کے کمرہ میں ابھی تک صفائی نہیں ہوئی۔ نیا کمبل پڑا ہوا ہے چھوا تک نہیں گیا۔ نیا کرتہ جوں کا توں تہ کیا ہوا رکھا ہے۔ وہ اپنا پرانا کرتہ ہی پہنے ہوئے ہے۔ اس کے جسم کے ایک ایک جزو سے۔ دماغ کے ایک ایک ذرہ سے۔ دل کی ایک ایک حرکت سے یہی آواز آرہی ہے۔ "صوفیا! اس کے سامنے کیونکر جاؤں گا؟" اس نے سوچنا شروع کیا۔ "صوفیا یہاں کیوں آرہی ہے؟ کیا میری تحقیر کرنا چاہتی ہے۔ صوفیا! جو رحم و محبت کی مجسم دیوی تھی؟ کیا وہ مجھے کلارک کے سامنے بلا کر اپنے پیروں تلے کچلنا چاہتی ہے؟ اتنی بیدردی اور مجھ سے بدنصیب پر جو آپ ہی اپنے دلوں کی گردش کو رو رہا ہے۔ نہیں۔ وہ اتنی سنگدل نہیں ہے۔ واقعی اس کا نازک دل اتنا سخت نہیں ہو سکتا۔ یہ سب مسٹر کلارک کی شرارت ہے۔ وہ مجھے صوفیا کے سامنے ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں انہیں یہ موقعہ نہیں دوں گا۔ میں ان کے سامنے ہی نہ جاؤں گا۔ مجھے جبراً لے جائے جس کا جی چاہے۔ کیوں بہانہ کروں کہ میں بیمار ہوں؟ صاف کہہ دوں گا۔ میں وہاں نہیں جاتا۔ اگر جیل کا یہ قانون ہو تو ہوا کرے۔ مجھے ایسے قانون کی پرواہ نہیں۔ جو بالکل بے معنی ہو سنتا ہوں۔ دونوں یہاں ایک ہفتہ تک ٹھہرنا چاہتے ہیں۔ کیا رعایا کو پیس ہی ڈالیں گے۔ اب بھی تو مشکل سے نصف آدمی بچ رہے ہوں گے۔ سینکڑوں نکال دئے گئے۔ سینکڑوں جیل میں ٹھونس دئے گئے۔ کیا اس شہر کو بالکل تباہ کر دینا چاہتے ہیں؟

دفعتاً جیل کا داروغہ آکر تند لہجہ میں بولا "تم نے کمرہ کی صفائی نہیں کی؟ ارے تم نے تو ابھی تک کرتہ بھی نہیں بدلا۔ کمبل تک نہیں بچھایا! تمہیں حکم

ملا یا نہیں؟"

ونے۔ حکم تو ملا مگر میں نے اُس کی تعمیل کرنا ضروری نہیں خیال کیا۔

داروغہ نے اور گرم ہو کر کہا" اس کا یہی نتیجہ ہوگا۔ کہ تمہارے ساتھ بھی اور قیدیوں کا سا سلوک کیا جائیگا۔ ہم تمہارے ساتھ اب تک شرافت کا برتاؤ کرتے آئے ہیں۔ اس لئے کہ تم ایک معزز رئیس کے لڑکے ہو اور یہاں غیر جگہ آ پڑے ہو۔ مگر میں شرارت نہیں برداشت کر سکتا"۔

ونے۔ یہ بتلائیے کہ مجھے پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے تو نہ جانا پڑیگا؟

داروغہ۔ اور یہ کمبل اور کرتہ کس لئے دیا گیا ہے؟ کبھی اور بھی کسی نے یہاں نیا کمبل پایا ہے؟ تم لوگوں کے تو نصیب جاگ اُٹھے۔

ونے۔ اگر آپ میرے ساتھ اتنی رعایت کریں کہ مجھے صاحب کے سامنے جانے پر مجبور نہ کریں۔ تو میں آپ کا حکم ماننے کو تیار ہوں۔

داروغہ۔ کیسی بے سر پیر کی باتیں کرتے ہو جی؟ میرا کوئی اختیار ہے؟ تمہیں جانا پڑے گا۔

ونے نے منت آمیز لہجے میں کہا" میں آپ کا یہ احسان نہ بھولونگا۔ کسی دوسرے موقع پر داروغہ جی شاید جامہ سے باہر ہو جاتے۔ مگر آج قیدیوں کو خوش رکھنا ضروری تھا۔ بولے ــــ" مگر بھائی۔ یہ رعایت کرنی میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھ پہ نہ جانے کیا آفت آ جائے ــ سردار صاحب مجھے کچا ہی کھا جائیں گے۔ میم صاحبہ کو جیل خانوں کے دیکھنے کا خبط ہے۔ بڑے صاحب تو اہلکاروں کے دشمن ہیں۔ مگر میم صاحبہ اُن سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ سچ پوچھو۔ تو جو کچھ ہیں وہ میم صاحبہ ہی ہیں۔ صاحب تو ان کے اشاروں کے غلام ہیں۔ کہیں وہ ناراض ہو گئیں تو تمہاری میعاد تو دونی ہو ہی جائے گی۔ پر ساتھ ہی ہم بھی کہیں کے نہ رہیں گے"۔

ونے ۔ معلوم ہوتا ہے میم صاحب اُن پر بہت حاوی ہیں؟

داروغہ ۔ حاوی! اجی یہ کہو کہ میم صاحبہ ہی پولٹیکل ایجنٹ ہیں۔ صاحب تو صرف دستخط کرنے کو ہیں۔ نذر نیاز سب میم صاحب ہی کے ہاتھوں میں جاتی ہے۔

ونے ۔ آپ میرے ساتھ صرف اتنی رعایت کیجئے کہ مجھے ان کے سامنے جانے کے لئے مجبور نہ کیجئے۔ اتنے قیدیوں میں ایک قیدی کی کمی معلوم ہی نہ ہوگی ۔ ہاں وہ اگر مجھے نام لے کر بلائیں گی تو میں حاضر ہو جاؤں گا۔

داروغہ ۔ سردار صاحب مجھے زندہ ہی نگل جائیں گے۔

ونے ۔ مگر کرنا آپ کو یہی پڑے گا ۔ میں اپنی خوشی سے ہرگز نہ جاؤنگا۔

داروغہ ۔ میں بڑا آدمی ہوں ۔ مجھے دق مت کرو ۔ میں نے اسی جیل میں بڑے بڑے سرکش قیدیوں کی گردنیں ڈھیلی کر دی ہیں۔

ونے ۔ اپنے کو کوسنے کا آپ کو اختیار ہے ۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ میں جبر کے سامنے سر جھکانے والا آدمی نہیں ہوں۔

داروغہ ۔ بھئی تم عجیب آدمی ہو۔ اس کے حکم سے سارا شہر خالی کرایا جا رہا ہے۔ اور تم پھر بھی اپنی ضد کئے جاتے ہو۔ لیکن تمہیں اپنی جان بھاری ہو ۔ مجھے تو اپنی جان بھاری نہیں ہے۔

ونے ۔ کیا شہر خالی کرایا جا رہا ہے؟ یہ کیوں؟

داروغہ ۔ میم صاحب کا حکم ہے اور کیا؟ جسونت نگر پر اُن کا قہر ہے ۔ جب سے انہوں نے یہاں کی واردا تیں سُنی ہیں ۔ مزاج بگڑ گیا ہے۔ ان کا بس چلے تو سارا شہر کھدوا کر پھینک دیں۔ حکم ہوا ہے ۔ کہ ایک ہفتہ تک کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے ۔ اندیشہ ہے کہ کہیں شورش برپا نہ ہو جائے ۔ صدر سے فوجی امداد طلب کی گئی ہے۔

داروغہ نے حالات کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ اس سے ان کا مقصد

ونے سنگھ پر اثر ڈالنا تھا۔ اور ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ ونے سنگھ کو فکر ہوئی۔ کہ کہیں حکم عدولی سے ناراض ہو کر حکام نے مجھ پر زیادہ سختی کرنی شروع کی۔ اور عوام کو یہ خبر ملی۔ تو وہ یقیناً فساد برپا کر دیں گے۔ اور اس حالت میں ان کی خونریزیوں کے گناہ کا عذاب میری گردن پر ہو گا۔ کون جانے۔ میرے بعد میرے ساتھیوں نے عوام کو اور بھی ابھار رکھا ہو۔ کیونکہ ان میں شریر المزاج نوجوانوں کی کمی نہیں ہے۔ نہیں۔ حالت نازک ہے۔ مجھے اس وقت صبر و تحمل سے کام لینا چاہئے۔ داروغہ سے پوچھا "میم صاحب یہاں کس وقت آئیں گی؟"

داروغہ۔ ان کے آنے کا کوئی وقت تھوڑا ہی مقرر ہے۔ دھوکا دے کر کسی ایسے وقت آ پہنچیں گی۔ جب ہم لوگ غافل پڑے ہوں گے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں کہ کمرہ کی صفائی کر ڈالو۔ کپڑے بدل لو۔ کون جانے۔ آج ہی آ جائیں۔

ونے۔ اچھی بات ہے۔ آپ جو کچھ کہتے ہیں۔ سب کر لوں گا۔ آپ بےفکر ہو جائیں۔

داروغہ۔ سلامی کے وقت آنے سے انکار تو نہ کرو گے؟

ونے۔ جی نہیں۔ آپ مجھے سب سے پہلے صحن میں موجود پائیں گے۔

داروغہ۔ میری شکایت تو نہ کرو گے؟

ونے۔ شکایت کرنا میری عادت نہیں۔ اسے آپ خوب جانتے ہیں۔

داروغہ چلا گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ونے نے اپنے کمرہ میں جھاڑو لگائی۔ کپڑے بدلے۔ کمبل بچھا دیا۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے کسی کی توجہ ان کی جانب مائل ہو۔ وہ اپنی بے عذری

سے حکام کے شکوک کو رفع کر دینا چاہتے تھے۔ کھانے کا وقت آ گیا۔ مگر مسٹر کلارک نہ آئے۔ بالآخر داروغہ نے نا امید ہو کر قید خانہ کے دروازے بند کرا دئے اور قیدیوں کو سونے کا حکم دے دیا۔ وہ لیٹے تو سوچنے لگے:۔ صوفیا میں یہ تبدیلی کیوں کر ہو گئی؟ وہی شرم و حیا کی دیوی۔ وہی خدمت و ایثار کی پتلی۔ آج اپنی مطلق العنانی کے سبب ڈائن سی بنی ہوئی ہے۔ اس کا دل کتنا نرم تھا اور رحم سے کتنا معمور۔ اس کے جذبات کتنے بلند اور خیالات کتنے پاکیزہ تھے۔ اس کے مزاج میں کتنی سادگی تھی۔ اس کی ایک نگاہ دل پر کیا اس کی ایک ایک تبسم کا سا اثر پیدا کرتی تھی۔ اس کے منہ سے جو لفظ نکلتا تھا وہ شمع کے نور کی طرح دل کو منور کر دیتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف پھولوں کی خوشبو سے اس کی سرشت ہوئی ہے۔ کتنا سادہ۔ کتنا متین۔ کتنا دل کش حسن تھا! وہی صوفیا اب کتنی بیدرد ہو گئی ہے!

چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا گویا کوئی طوفان آ رہا ہے۔ آج جیل خانہ کے صحن میں داروغہ کے مویشی نہ بندھتے تھے نہ برآمدوں میں گھاس کے ڈھیر تھے۔ آج کسی قیدی کو اہلکاران جیل کے جوٹھے برتن نہیں صاف کرنے پڑے۔ کسی کو سپاہی کی چپی نہیں کرنی پڑی۔ جیل کے ڈاکٹر کی بڑھیا بہری آج قیدیوں کو گالیاں نہیں دے رہی تھی۔ اور دفتر میں قیدیوں سے ملاقات کرنے والے رشتہ داروں سے وصول کئے گئے نذرانہ کی تقسیم نہ ہوتی تھی۔ کمروں میں چراغ تھے۔ دروازے بھی کھلے رکھے گئے تھے۔ وہ کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ کیوں نہ بھاگ چلوں۔ ممکن ہے کہ میرے سمجھانے بجھانے سے عوام کو تسکین ہو۔ صدر سے فوج آ رہی ہے۔ ذرا سی بات میں غدر ہو سکتا ہے۔ اگر میں امن قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو وہ میرے اس گناہ کا کفارہ ہو گا۔ انہوں نے دبی ہوئی نگاہوں سے جیل کی اونچی

دیواروں کو دیکھا۔ کمرہ سے باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے دیکھ لیا تو؟ لوگ یہی سمجھیں گے کہ میں عوام کو بھڑکانے کے ارادہ سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسی حیض بیض میں رات گذر گئی۔ ابھی اہلکاروں کی نیند بھی نہ کھلی تھی۔ کہ موٹر کی آواز نے آنے والوں کو خبر کر دی۔ داروغہ۔ ڈاکٹر۔ وارڈر۔ چوکیدار سب گھبرا کر جھٹ پٹ نکل پڑے۔ گھنٹی بجی۔ قیدی میدان میں نکل آئے۔ انہیں قطاروں میں کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ اور اسی وقت صوفیا، مسٹر کلارک اور سردار نیلکنٹھ جیل میں داخل ہوئے۔

صوفیا نے آتے ہی قیدیوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں انتظار نہ تھا۔ اشتیاق نہ تھا۔ خوف تھا۔ اضطراب تھا۔ بیچینی تھی۔ جس آرزو نے اُسے برسوں رلایا تھا۔ جو اُسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔ جس کے لئے اُس نے اپنے پسندیدہ اصولوں کو قربان کر دیا تھا۔ اس کو سامنے دیکھ کر وہ اس وقت مضمحل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی پردیسی بہت دنوں کے بعد اپنے گاؤں میں آکر اندر قدم رکھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کہ کہیں کسی کی صدائے ماتم کانوں میں نہ آپڑے۔ دفعتاً اُس نے ونے کو سر جھکائے ہوئے کھڑے دیکھا۔ دل میں محبت کا ایک ہیجان پیدا ہوا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ گھر وہی تھا مگر ویران جس وخاشاک سے دھکا ہوا پہچاننا مشکل تھا۔ وہ شگفتہ چہرہ کہاں تھا جس پر شعر کی نزاکت نثار ہوتی تھی۔ وہ دستِ کرم کا سا فراخ سینہ کہاں تھا؟ صوفیا نے بے اختیار چاہا۔ کہ ونے کے پیروں پر گر پڑوں۔ اُسے آنسوؤں سے دھوؤں۔ اُسے گلے سے لگاؤں۔ دفعتاً ونے سنگھ غش کھا کر گر پڑے۔ ایک درد بھری آواز تھی جو ایک لمحہ تک گونج کر فرطِ غم سے دب گئی۔ صوفیا فوراً ونے کے پاس جا پہنچی۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔ جیل کا ڈاکٹر دوڑا۔ داروغہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ اب

نوکروں کی خیریت نہیں میم صاحب پوچھیں گی۔ اس کی حالت اتنی نازک تھی تو ہسپتال میں کیوں نہیں رکھا؟ بڑی مصیبت میں پھنسا۔ اس بھلے آدمی کو بھی اسی وقت بیہوش ہونا تھا۔ کچھ نہیں۔ یہ سب اس کی شرارت ہے۔ اس نے دم روک رکھا ہے۔ بنا ہوا ہے۔ مجھے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ بچہ جانے دو میم صاحب کو تو دیکھنا تمہاری کیسی خبر لیتا ہوں۔ کہ ساری بیہوشی غائب ہو جائے۔ اور پھر کبھی بیہوش ہونے کا نام نہ لو۔ یہ آخر اسے ہو کیا گیا؟ کسی فیاری کو آج تک یوں بیہوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں فصتوں میں لوگوں کا بات بات میں بے ہوش ہو جانا پڑھا ہے۔ صرع کی بیماری ہوگی اور کیا؟"

داروغہ تو اپنی جان کی خیر منا رہا تھا اور اُدھر سردار صاحب مسٹر کلارک سے کہہ رہے تھے کہ یہ وہی نوجوان ہے جس نے ریاست میں شورش برپا کر رکھی ہے۔ صوفیا نے ڈاکٹر کو جھڑک کر ہٹ جانے کو کہا اور ونے کو اٹھوا کر دفتر میں لے گئی۔ آج وہاں قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ نفرئی کرسیاں تھیں۔ میز پر ناشتہ کی چیزیں چنی ہوئی تھیں۔ تجویز تھی کہ معائنہ کے بعد صاحب یہاں ناشتہ کریں گے۔ صوفیا نے ونے کو قالین کے فرش پر لٹا دیا اور سب لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ ہمدردی اور رحم کے لئے مشہور تھی کسی کو کچھ تعجب نہ ہوا۔ جب کمرہ میں کوئی نہ رہا تو صوفیا نے دریچوں پر پردے ڈال دئے۔ ونے کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اپنا رومال اس پر جھلنے لگی۔

آنسوؤں کے گرم گرم قطرے اس کی آنکھوں سے نکل کر ونے کے چہرہ پر گرنے لگے۔ ان میں کس قدر جان فزائی تھی۔ ان میں اس کی ساری قلبی اور روحانی طاقت بھری ہوئی تھی۔ ایک ایک قطرہ اس کی زندگی کے چشمہ کا ایک ایک قطرہ تھا۔ ونے سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں

بہشت کا ایک پھول لازوال لاانتہا خوشبو میں نہایا ہُوا اور ہوا کے ہلکے جھونکوں سے ملتا ہُوا سامنے موجود تھا۔ حُسن کی سب سے زیادہ دلکش اور سہاونی نمود وہ ہے جب وہ رشک آلود غم میں مُبتلا نظر آتا ہے۔ وہی اُس کی روحانی نمود ہوتی ہے۔ وہ چونک کر اٹھ نہیں بیٹھے۔ یہی تو ان کا بہشت ہے۔ یہی تو ان کی سنہری سلطنت ہے۔ یہی تو ان کی آرزوؤں کی انتہا ہے۔ اس روحانی لذت سے میری کہاں؟ اس کے دل میں ایک درد بھری حسرت پیدا ہوئی:۔ کاش اسی طرح محبت کی سیج پر لیٹے ہوئے یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتیں۔ ساری آرزوؤں کا خاتمہ بالخیر ہو جاتا۔ مرنے کے لئے اس سے بہتر اور کون سا موقع ہو سکتا ہے؟

دفعتاً اُسے یاد آگیا۔ کہ صوفیا کو چھونا بھی اس کے لئے ممنوع ہے۔ اس نے فوراً اپنا سر اس کے زانو پر سے ہٹا لیا۔ اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مسز کلارک۔ آپ نے مجھ پر بڑی مہربانی کی۔ اس کے لئے میں آپ کا احسان مند ہوں"۔

صوفیا نے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "احسان گالی کی شکل میں تو نہیں ظاہر کیا جاتا۔

ولے نے متحیر ہو کر کہا۔ "ایسا بڑا قصور مجھ سے کبھی نہیں ہُوا۔

صوفیا۔ خواہ مخواہ کسی شخص کے ساتھ بیرا رشتہ قائم کر دینا گالی نہیں تو اور کیا ہے؟

ولے۔ مسز کلارک؟

صوفیا۔ کلارک کو میں تمہارے جُوتے کا تسمہ کھولنے کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔

ولے۔ لیکن اماں جی نے . . . . .

صوفیا۔ تمہاری اماں جی نے جھوٹ لکھا اور تم نے اس پر یقین

کر کے مجھ پر واقعی بڑا ظلم کیا۔ کوئل آم نہ پا کر بھی ٹکوڑیوں پر نہیں گرتی۔

اتنے میں مسٹر کلارک نے آکر پوچھا۔ "اس قیدی کی کیا حالت ہے؟ ڈاکٹر آرہا ہے۔ وہ اس کی دوا کرے گا۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔"

صوفیا نے سرد مہری سے جواب دیا۔ "تم جاؤ۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔"

کلارک۔ کتنی دیر تک تمہاری راہ دیکھوں؟

صوفیا۔ یہ تو میں نہیں بتلا سکتی۔ میرے خیال میں ایک انسان کی خدمت کرنا سیر کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔

کلارک۔ خیر میں تھوڑی دیر اور ٹھہروں گا۔

یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔ اس وقت صوفیا نے ونے کے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ "ونے! میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے بچالو۔ میں نے اپنی صاحبہ کے شکوک سے بچنے کے لئے یہ سوانگ رچا تھا۔"

ونے نے متشکوک انداز سے پوچھا۔ "تم یہاں مسٹر کلارک کے ساتھ کیوں آئیں۔ اور ان کے ساتھ کیسے رہتی ہو؟"

صوفیا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "ونے! ونے پوچھو۔ تم میں ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا تمہارے لئے کیا اور میں اس قید سے نکلنے کے لئے مجھے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ میں نے کلارک کو مغالطہ میں ڈال رکھا ہے۔ تمہارے ہی لئے میں نے یہ جھوٹا بھیس لے رکھا ہے۔ اگر تم اس وقت کہو کہ صوفیا تو میرے ساتھ جیل میں رہ۔ تو میں یہاں آکر تمہارے ساتھ رہوں گی۔ اگر تم میرا ہاتھ پکڑ کر کہو کہ صوفیا تو میرے ساتھ چل۔ تو آج ہی تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی۔ میں نے تمہارا دامن پکڑ لیا ہے۔ اور اب اُسے کسی طرح بھی نہیں چھوڑ سکتی۔ خواہ تم مجھے ٹھکرا ہی کیوں نہ دو۔ میں نے اپنی خودداری تک کو تمہارے لئے وقف کر دیا

ونے یہ ایشور کی مرضی ہے۔ یہ اسی کی تحریک ہے۔ ورنہ اس قدر ذلت و خواری برداشت کرتے ہوئے تم مجھے زندہ نہ پاتے۔

ونے نے صوفیا کے دل کی تھاہ لینے کے لئے کہا۔ اگر ایشور کی مرضی ہے۔ تو اس نے میرے اور تمہارے درمیان میں یہ دیوار کیوں کھڑی کر دی ہے؟

صوفیا۔ یہ دیوار ایشور نے نہیں کھڑی کی بلکہ آدمیوں نے کھڑی کی ہے۔

ونے۔ کتنی مضبوط ہے۔

صوفیا۔ مگر ناقابل شکست نہیں۔

ونے۔ تم اسے توڑ سکو گی؟

صوفیا۔ اسی لمحہ تمہاری آنکھوں کے ایک اشارہ پر۔ ایک وقت تھا۔ جب میں اس دیوار کو ایشور کی بنائی ہوئی خیال کرتی تھی۔ اور اس کا احترام کرتی تھی۔ مگر اب اس کی اصلیت سے واقف ہو گئی ہوں۔ پریم (محبت) ان رکاوٹوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ جسمانی رشتہ نہیں۔ روحانی رشتہ ہے۔

ونے نے صوفیا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ اور اس کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ تو آج سے تم میری ہو اور میں تمہارا ہوں۔

صوفیا کا سر ونے سنگھ کے سینہ پر جھک گیا اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ جس طرح سیاہ بادل زمین پر جھک کر ایک لمحہ میں اسے سیراب کر دیتے ہیں۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ خاموش رہ گئی۔ غم کی انتہا خموشی ہے مگر خشک اور جلانے والی خوشی کی انتہا بھی خموشی ہے۔ مگر نم اور طراوت بخش۔ صوفیا کو اب اپنے ایک ایک عضو میں نبض کی ایک ایک حرکت میں باطنی قوت کا احساس ہو رہا تھا۔ کشتی نے ناخدا کا سہارا پا لیا تھا۔ اب اس کے لئے منزلِ مقصود ایک یقینی شے تھی۔ وہ اب ہوا کے جھونکوں یا لہروں کے تھپیڑوں کے ساتھ ڈانواں ڈول نہ ہوگی۔ بلکہ ٹھیک طور سے اپنے راستہ پر چلے گی۔

ونے بھی دونوں پر کھولے ہوئے خوشی کے آسمان میں اڑ رہا تھا۔ وہاں

کی ہوا میں خوشبو تھی۔ روشنی میں جان تھی۔ کسی ایسی شے کا وجود نہ تھا جو دیکھنے میں کریہہ۔ سُننے میں کرخت چھونے میں سخت اور ذائقہ میں تلخ ہو۔ وہاں کے پھولوں میں کانٹے نہ تھے۔ آفتاب میں اتنی تمازت نہ تھی۔ زمین پر آندھیاں نہ تھیں۔ پیری نہ تھی۔ مفلسی نہ تھی۔ فکر نہ تھی۔ لڑائی نہ تھی۔ ایک سلطنت تھی۔ امن و آشتی سے معمور۔ صوفیا سلطنت کی ملکہ تھی۔ اور وہ خود اس کی آغوشِ محبت میں لیٹا ہوا تھا۔ اس خوابِ مسرت کے مقابلہ میں وہ ایثار و ریاضت کی زندگی کتنی بے مزہ کتنی مایوس بخش تھی۔ وہ حجرۂ تاریک کس قدر خوفناک!

دفعتاً مسٹر کلارک نے پھر آکر کہا۔ ڈارلنگ (پیاری) اب دیر نہ کرو۔ دیر تو بہت ہو رہی ہے۔ سردار صاحب منتظر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اس مریض کی تیمارداری کرے گا۔

صوفیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دنے کی طرف سے منہ پھیر کر درد سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ گھبرانا نہیں۔ میں کل پھر آؤں گی۔

وِنے کو ایسا معلوم ہوا گویا رگوں میں خون منجمد اور خشک ہوتا جا رہا ہے۔ وہ سُن کر پڑا رہ گیا۔ صوفیا دروازہ تک گئی۔ پھر رومال لینے کے بہانہ سے واپس آکر وِنے کے کان میں کہنے لگی۔ میں کل پھر آؤں گی۔ اور جبھی ہم دونوں یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں تمہاری جانب سے سردار نیلکنٹھ سے کہہ دوں گی کہ وہ معافی چاہتے ہیں۔

صوفیا کے چلے جانے کے بعد بھی یہ جملے میں کہے گئے مگر اُمید سے بھرے اور محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ کسی نغمۂ شیریں کی آخری گونج کی طرح وِنے کے کانوں میں گونجتے رہے۔ مگر وہ جلد ہی محسوس دُنیا میں آنے کے لئے مجبور ہوا۔ جیل کے ڈاکٹر نے آکر اس کو دفتر ہی میں ایک پلنگ پر لٹا دیا اور مقوی دوائیں دیں۔ پلنگ پر نرم بستر تھا۔ ٹیکے لگے تھے۔ پنکھا جھلا جا رہا تھا۔ داروغہ ایک منٹ بعد مریض کی مزاج پُرسی کے لئے آتا تھا۔ اور ڈاکٹر تو وہاں

سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ یہاں تک کہ وِنے نے ان تیمارداریوں سے تنگ آکر ڈاکٹر سے کہا، میں بالکل اچھا ہوں۔ اب آپ جائیں۔ شام کو آ جائیے گا۔

ڈاکٹر صاحب ڈرتے ڈرتے بولے۔ آپ کو ذرا نیند آ جائے۔ تو میں چلا جاؤں۔

وِنے نے انہیں یقین دلایا کہ آپ کے رخصت ہوتے ہی مجھے نیند آ جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب اپنی مفروضہ خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے چلے گئے۔ اسی حیلہ سے وِنے نے داروغہ کو بھی ہٹایا جو آج اخلاق مجسم کے پتلے بنے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے سمجھا تھا کہ مہیم صاحب کے چلے جانے پر اس کی خوب خبر لوں گا، مگر وہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ سردار صاحب نے جاتے وقت تاکید کر دی تھی کہ ان کی تیمارداری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا ورنہ مہیم صاحب جہنم رسید کریں گی۔

کسی بات کو اطمینان سے سوچنے کے لئے تنہائی کا ہونا اُسی قدر ضروری ہے۔ جتنا کہ مراقبہ کے لئے۔ ہوائی جنبش ترازو کے پلڑوں کو برابر نہیں ہونے دیتی۔ وِنے کو اب خیال آیا:۔ اماں کو یہ حال معلوم ہوا تو وہ اپنے دل میں کیا کہیں گی۔ میرے ساتھ ان کی کتنی دلی تمنائیں وابستہ ہیں۔ صوفیا کے دامِ محبت سے بچانے کے لئے انہوں نے مجھے جلاوطن کیا۔ اور اس لئے انہوں نے صوفیا کو بدنام کیا۔ اُن کا دل ٹوٹ جائے گا۔ رنج تو پتاجی کو بھی ہوگا۔ مگر وہ مجھے معاف کر دیں گے۔ اس لئے کہ انہیں انسانی کمزوریوں سے ہمدردی ہے۔ اماں جی میں دماغ ہی دماغ ہے۔ پتاجی میں دل اور دماغ دونوں ہیں۔ لیکن میں اسے کمزوری کیوں کہوں؟ میں کوئی ایسا کام نہیں کر رہا ہوں جسے دنیا میں کسی نے کیا نہ ہو۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جنہوں نے اپنے کو قوم پر قربان کر دیا ہے؟ ذاتی خیال کے ساتھ ہی قوم کا خیال رکھنے والے آدمیوں نے اب تک جو کچھ کیا

ہے وہ کیا ہے۔ غلامی القوم ہو جانے والے لوگوں کا شمار تو انگلیوں پر کیا جا سکتا ہے۔ پھر جس قوم کے حکام میں عقل و انصاف نہیں۔ رعایا میں احساس و جوش نہیں۔ اس کے لئے قربان ہو جانا فضول ہے۔ اندھوں کے آگے رو کر اپنے دیدے کھونے کے سوا اور کیا ہاتھ آتا ہے؟

رفتہ رفتہ تخیلات نے زندگی کی آسائش کے سامان جمع کرنا شروع کئے:۔ دیہات میں رہوں گا۔ وہیں ایک چھوٹا سا مکان بنواؤں گا۔ صاف کشادہ اور ہوادار۔ زیادہ تکلف یا تصنع کی ضرورت نہیں۔ وہیں ہم دونوں سب سے الگ رہ کر بغانیت زندگی بسر کریں گے۔ بیجا نمود سے کیا فائدہ؟ میں باغیچہ میں کام کروں گا۔ کیاریاں بناؤں گا۔ قلمیں لگاؤں گا اور صوفیا کو اپنی کارگذاری سے حیرت میں ڈالوں گا۔ گلدستے بنا کر اس کے سامنے پیش کروں گا اور دست بستہ کہوں گا کہ سرکار۔ کچھ انعام ملے۔ پھلوں کی ڈالیاں لگاؤں گا اور کہوں گا کہ رانی جی کچھ نگاہ ہو جائے۔ کبھی کبھی صوفیا بھی پودوں کو سینچے گی۔ میں تالاب سے پانی بھر بھر دوں گا۔ وہ لاکر کیاریوں میں ڈالے گی۔ اس کا نازک جسم پسینہ سے اور خوشنما لباس پانی سے تر ہو جائے گا۔ اس وقت کسی پیڑ کے نیچے اسے بٹھلا کر میں پنکھا جھلوں گا۔ کبھی کبھی کشتی میں سیر کریں گے۔ دیہاتی کشتی ہوگی۔ ڈانڈ سے چلنے والی۔ موٹر بوٹ میں وہ لطف کہاں۔ وہ سکون کہاں؟ اس کی تیزی سے سر چکرا جاتا ہے۔ اس کے شور سے کانوں کے پردے پھٹ جاتے ہیں۔ میں کشتی میں بیٹھ کر ڈانڈ چلاؤں گا۔ صوفیا کنول کے پھول توڑے گی۔ ہم ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہ ہوں گے۔ کبھی کبھی پربھو سیوک بھی آئیں گے۔ آہ کتنی خوش کن زندگی ہوگی۔ کل ہم دونوں عازم وطن ہوں گے جہاں خوشیاں آغوش کھولے ہمارا انتظار کر رہی ہیں۔

صوفیا اور کلارک کی آج شام کو ایک جاگیردار کے یہاں دعوت تھی۔ جب میز پر آراستہ ہو گئیں اور ایک حیدرآبادی مداری نے اپنے

کرتب دکھانے شروع کئے تو صوفیا نے موقعہ پاکر سردار نیلکنٹھ سے کہا۔
"اس قیدی کی حالت مجھے خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کے دل کی حرکت بہت سُست پڑگئی ہے۔ کیوں ولیم۔ تم نے دیکھا اس کا چہرہ کتنا زرد پڑگیا تھا؟"

کلارک نے آج پہلی مرتبہ خلاف اُمید جواب دیا۔" غشی کی حالت میں اکثر چہرہ زرد پڑجاتا ہے"۔

صوفیا۔ وہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔ کہ اس کی حالت اچھی نہیں۔ ورنہ غشی کیوں ہوتی۔ بہتر ہو کہ آپ اسے کسی ہوشیار معالج کے سپرد کردیں۔ میری رائے میں اب وہ اپنے قصور کی کافی سزا پاچکا ہے۔ اُسے رہا کردینا ہی مناسب ہوگا۔

نیلکنٹھ۔ میم صاحب۔ اس کی صورت پر نہ جائیے۔ آپ کو معلوم نہیں ہے۔ یہاں عوام پر اس کا کتنا اثر ہے۔ وہ ریاست میں اتنی زبردست بدامنی پیدا کردے گا۔ کہ اس کا دبانا مشکل ہوجائے گا۔ وہ بلا کا ضدی ہے۔ ریاست سے باہر جانے پر راضی نہیں ہوتا۔

کلارک۔ اس سرکش کو قید رکھنا ہی اچھا ہے۔

صوفیا نے بگڑ کر کہا۔" میں اسے سراسر ناانصافی سمجھتی ہوں اور مجھے آج پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ تم اتنے بیدرد ہو"۔

کلارک۔ مجھے تمہارے جیسا دردمند دل رکھنے کا دعوےٰ نہیں ہے۔

صوفیا نے کلارک کے چہرہ کی طرف غور سے دیکھا۔ یہ خودسری۔ یہ تمکنت کہاں سے آئی؟ حقارت سے بولی۔ ایک انسان کی زندگی اتنی حقیر شے نہیں ہے۔

کلارک۔ سلطنت کے تحفظ کے مقابلہ میں ایک انسان کی زندگی

کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ جس رحم سے جس ہمدردی سے کسی غریب کا پیٹ بھرتا ہو۔ اُس کی جسمانی تکالیف کا دفعیہ ہوتا ہو۔ کسی مغموم کی تشفی ہوتی ہو۔ اُس کا میں قایل ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں ان صفات سے بے بہرہ نہیں ہوں۔ لیکن جو ہمدردی سلطنت کی جڑ کھوکھلی کردے۔ سرکشوں کو سر اٹھانے کا موقعہ دے۔ رعایا میں بغاوت پھیلائے۔ اُسے میں نا عاقبت اندیشی ہی نہیں بلکہ حماقت سمجھتا ہوں۔

صوفیا کے چہرہ پر ایک غیر انسانی نمود کی جھلک دکھائی پڑی مگر اُس نے ضبط کیا۔ شاید اتنے تحمل سے اس نے کبھی کام نہیں لیا تھا۔ مذہب داری کو تحمل سے عناد ہے۔ مگر اس وقت اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک غیر محتاط کلمہ بھی اس کی ساری زندگی کو تباہ کر سکتا تھا۔ نرم ہو کر بولی۔ "ہاں اس نقطۂ خیال سے بے شک شخصی زندگی کی کوئی قیمت نہیں باقی رہتی۔ میں نے اس پہلو سے خیال نہ کیا تھا مگر پھر بھی اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اگر وہ چھوڑ دیا جائے تو اس ریاست میں قدم نہ رکھے گا۔ اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ وہ اپنے وعدہ کا پکا ہے۔

نیلکنٹھ۔ کیا آپ سے اس نے وعدہ کیا ہے؟

صوفیا۔ ہاں وعدہ ہی سمجھئے۔ میں اس کی ضمانت کر سکتی ہوں۔

نیلکنٹھ۔ اتنا تو میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ وہ اپنے قول سے پھر نہیں سکتا۔

کلارک۔ جب تک اس کی تحریری درخواست میرے سامنے نہ آئے۔ میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔

نیلکنٹھ۔ ہاں۔ یہ تو نہایت ہی ضروری ہے۔

صوفیا۔ درخواست کا مضمون کیا ہوگا؟

کلارک۔ سب سے پہلے وہ اپنا قصور تسلیم کرے اور اپنی وفاداری

کا یقین دلانے کے بعد حلفی معاہدہ کرے کہ اس ریاست میں پھر قدم نہ رکھوں گا۔ اُس کے ساتھ ضمانت بھی ہونی چاہئے۔ یا تو نقد روپے ہوں یا معزز آدمیوں کی ضمانت ہو۔ تمہاری ضمانت کی میری نظر میں کتنی ہی وقعت ہو۔ ضابطہ کی نظر میں اس کی ذرا بھی وقعت نہیں ہے۔

دعوت کے بعد صوفیا شاہی محل میں آئی تو سوچنے لگی۔ یہ عقدہ کیونکر حل ہو؟ یوں تو میں وِنے کی منت سماجت کروں تو وہ ریاست سے چلے جانے پر راضی ہو جائیں گے۔ لیکن غالباً وہ تحریری معاہدہ نہ کریں گے۔ اگر کسی طرح میں نے رو دھو کر انہیں اس پر بھی راضی کر لیا تو یہاں کون معزز شخص ان کی ضمانت کرے گا؟ ہاں ان کے گھر سے نقد روپے آسکتے ہیں۔ مگر رانی جی کبھی اسے منظور نہ کریں گی۔ وِنے کو کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے پر ان کو رحم نہ آئے گا۔ لُطف تو جب ہے کہ تحریری معاہدہ اور ضمانت کا کوئی ذکر ہی نہ رہے۔ وہ بلا کسی شرط کے آزاد کر دیئے جائیں۔ اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

محل برقی روشنی سے منور ہو رہا تھا۔ محل کے باہر چاروں طرف ساون کی کالی گھٹا تھی اور اتھاہ تاریکی۔ اس محیط تاریکی میں چمکدار محل ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نیلے آسمان پر چاند نکلا ہو۔ صوفیا اپنے آراستہ کمرہ میں آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی ان قوتوں کو بیدار کر رہی ہے جن کا اثر لامحدود ہے۔ آج اُس نے مدت کے بعد اپنے بالوں میں پھول گوندھے ہیں۔ فیروزی ریشمی ساڑھی پہنی ہے اور کلائیوں میں کنگن باندھے ہیں۔ آج پہلی مرتبہ اُس نے ان حُسن افزا ترکیبوں سے کام لیا ہے۔ جن سے عورتیں واقف ہوتی ہیں۔ یہ منتر انہیں کو آتا ہے۔ کہ کیونکر زلفوں کا ایک خم آنچل کی ایک لہر دل کو مضطرب کر دیتی ہے۔ آج اس نے مسٹر کلارک کے سلطنت پسندی والے اصول پر فتح یاب ہونے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج وہ اپنے حُسن کی طاقت کو آزمائے گی۔

رِم جھم بوندیں گر رہی تھیں گویا موسمی کے پھول جھڑ رہے ہوں۔

بوندوں میں ایک دلکش نغمہ تھا۔ شاہی محل اور سرکوہ پر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دیوتاؤں نے محفلِ جشن و طرب آراستہ کی ہے۔ صوفیا پیانو پر بیٹھ گئی اور دل کو بے چین کر دینے والا راگ گانے لگی۔ جس طرح صبح صادق کا سنہرا جلوہ ظہور پذیر ہوتے ہی قدرت کے ہر ہر جزو کو بیدار کر دیتا ہے۔ اُسی طرح صوفیا کی پہلی تان نے دل میں ایک چٹکی سی لی۔ مسٹر کلارک آ کر ایک کوچ پر بیٹھ گئے اور محو ہو کر سننے لگے۔ گویا کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ گئے ہوں۔ انہیں کبھی کوئی کشتی اُمڈے ہوئے سمندر میں جھکولے کھاتی نظر آتی جس پر چھوٹی چھوٹی خوبصورت چڑیاں منڈلاتی تھیں اور کبھی کسی صحرائے ناپیدا کنار میں ایک فقیر جھولی کندھے پر رکھے لاٹھی ٹیکتا ہوا نظر آتا۔ نغمہ سے تخیل باتصویر بن جاتا ہے۔

جب تک صوفیا گاتی رہی مسٹر کلارک بیٹھے سر دُھنتے رہے۔ جب وہ خاموش ہو گئی تو اس کے پاس گئے اور اس کی کرسی کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اس کے منہ کے پاس منہ لے جا کر بولے۔ ان انگلیوں کو دل میں رکھ لوں گا۔

صوفیا۔ دل کہاں ہے؟

کلارک نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہاں تڑپ رہا ہے۔

صوفیا۔ شاید ہو۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ میرا تو خیال ہے کہ خدا نے تم کو دل دیا ہی نہیں۔

کلارک۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر خدا نے جو کسر رکھی تھی۔ اُسے تمہاری نغمہ سرائیوں نے پورا کر دیا۔ شاید اُن میں خلق کرنے کی صفت ہے۔

صوفیا۔ اگر مجھ میں یہ اعجاز ہوتا تو آج مجھے ایک غیر شخص کے سامنے نادم نہ ہونا پڑتا۔

کلارک نے بے صبری سے کہا۔ کیا میں نے تمہیں نادم کیا؟ میں نے!

صوفیا۔ جی ہاں۔ آپ نے! مجھے آج تمہاری بے اعتنائی سے جتنا رنج ہوا اتنا شاید اور کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے بچپن سے یہی سبق دیا گیا ہے۔ کہ ہر جان دار پر رحم کرنا چاہئے۔ مجھے بتلایا گیا ہے۔ کہ یہی انسان کا سب سے بڑا فرض ہے۔ مذہبی کتب میں بھی رحم اور ہمدردی ہی انسان کی خاص صفات بتلائی گئی ہیں۔ مگر آج معلوم ہوا ہے کہ بے رحمی کی اہمیت رحم سے کہیں زیادہ ہے۔ سب سے بڑا رنج مجھے اس بات کا ہے کہ اجنبی آدمی کے سامنے میری ہتک ہوئی۔

کلارک۔ خدا جانتا ہے۔ صوفیا میں تمہاری کتنی عزت کرتا ہوں۔ اس کا افسوس مجھے ضرور ہے کہ میں تمہاری مرضی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور ہوا۔ اس کا سبب تمہیں معلوم ہی ہے۔ ہماری سلطنت اسی وقت تک ناقابلِ فتح رہ سکتی ہے۔ جب تک رعایا کے دلوں پر ہمارا رعب قائم ہے۔ جب تک وہ ہم کو اپنا بھی خواہ اپنا محافظ اپنا سہارا سمجھتی رہے۔ جب تک ہمارے انصاف پر اس کا خاص اعتقاد ہو۔ جس روز رعایا کے دل سے ہمارا اعتبار اٹھ جائے گا اسی روز ہماری سلطنت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر سلطنت کو قائم رکھنا ہماری زندگی کا مقصد ہے تو شخصی خیالات و جذبات کے لیے اس میں ذرا بھی گنجائش نہیں۔ سلطنت کے تحفظ کے لئے ہم بڑے سے بڑا نقصان برداشت کر سکتے ہیں۔ بڑی سے بڑی سختیاں جھیل سکتے ہیں۔ ہمیں اپنی سلطنت جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ اور جس شخص سے ہمیں نقصان کا ذرا بھی اندیشہ ہو اُسے ہم کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اُسے بالکل فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی طرح کی رعایت۔ ہمدردی یہاں تک کہ منصفانہ سلوک بھی نہیں کر سکتے۔

صوفیا۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ مجھے سلطنت سے اتنی محبت نہیں

جتنی تمہیں ہے اور میں اس کے لئے اتنی قربانیاں نہیں کر سکتی جتنی تم کر سکتے ہو۔ تو تم نے مجھے بالکل نہیں سمجھا۔ مجھے دعوے ہے کہ اس معاملہ میں میں کسی سے جو کبھی بھی پیچھے نہیں ہوں۔ لیکن یہ بات میرے قیاس میں بھی نہیں آئی کہ کہ دو دوستوں میں کبھی اتنا اختلاف ہو سکتا ہے کہ ہمدردی اور برداشت کے لئے کوئی گنجائش نہ رہے اور خصوصاً اسی حالت میں جب کہ گوش دیوار کے لئے کوئی دوسرا کان بھی سننے کے لئے موجود ہو۔ دیوان کا دل حُبّ الوطنی کے جذبات سے ایک دم خالی ہے۔ وہ اس کی عمق و وسعت سے ذرا بھی واقف نہیں۔ اس نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ جب ان دونوں میں میرے روبرو اس قدر بدمزگی ہو سکتی ہے تو تخلیہ میں نہ جانے کیا ہوتا ہوگا۔ شاید آج سے اُس کے دل میں میری عزت اٹھ گئی۔ اس نے اور لوگوں سے بھی یہ ماجرا بیان کیا ہوگا۔ میری ناک سی کٹ گئی۔ تم سمجھتے ہو کہ میں گا رہی ہوں۔ یہ گانا نہیں رونا ہے۔ جب عقد والے مکان کے دروازہ ہی پر یہ حالت ہو رہی ہے جہاں پھولوں سے خوشی کے نعروں سے پر جوش مصافحوں سے ہنستی ہوئی آنکھوں سے میرا خیر مقدم ہونا چاہئے تھا۔ تو میں اس مکان کے اندر قدم رکھنے کی جرأت کیونکر کر سکتی ہوں؟ تم نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ شاید تم مجھے بہت زیادہ ذکی الحس خیال کرتے ہو گے مگر اپنی فطرت کو بنا کر دینا میرے امکان کے باہر ہے۔ میں اپنے کو مبارکباد دیتی ہوں کہ میں نے اپنے عقد کے معاملہ میں اتنی دور اندیشی اور تامل سے کام لیا۔

یہ کہتے کہتے صوفیا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں گرنے لگیں۔ مصنوعی غم کے اظہار میں بھی اکثر واقعی غم کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مسٹر کلارک افسوس و معذرت کا راگ الاپنے لگے۔ مگر نہ مناسب الفاظ ہی ملتے تھے نہ ویسے خیالات۔ آنسوؤں کا سیلاب ذلیل اور توجیہ

کے لئے کوئی راہ فرار نہیں چھوڑتا۔ انہوں نے بڑی مشکل سے کہا۔ صوفیا مجھے معاف کرو۔ واقعی میں نہ سمجھتا تھا کہ اس ذرا سی بات سے تمہیں اتنا ملال ہوگا۔

صوفیا۔ اس کی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ تم میرے غلام نہیں ہو۔ کہ میرے جا و بیجا احکامات کی تعمیل کرو۔ مجھ میں وہ اوصاف ہی نہیں ہیں جو مردوں کا دل کھینچ لیتے ہیں۔ نہ وہ حسن ہے۔ نہ وہ نمود ہے۔ نہ وہ اندازِ دلکشی ہیں ناز و نخرہ کرنا نہیں جانتی۔ روٹھ کر بیٹھ جانا نہیں جانتی۔ مجھے رنج صرف اس بات کا ہے کہ اس آدمی نے تو میرے ایک اشارہ پر میری بات مان لی اور تم اتنی محنت کرنے پر بھی انکار ہی کرتے جاتے ہو۔ وہ بھی اپنے اصولوں کا مضبوط آدمی ہے۔ حکام کی سختیاں برداشت کیں۔ ذلتیں اٹھائیں۔ جیل کے تاریک حجرہ میں قید ہونا پسند کیا۔ لیکن اپنی بات پر قائم رہا۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس کی ضد جائز تھی یا بیجا۔ ہاں وہ اُسے جائز سمجھتا تھا۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا تھا اس سے خوف یا لالچ یا سزا کا خیال اسے منحرف نہیں کر سکا۔ لیکن جب میں نے نرمی سے اُسے سمجھایا کہ تمہاری حالت خطرناک ہے۔ تو اس کی زبان سے چیستناک الفاظ نکلے۔ "میم صاحب۔ جان کی تو پرواہ نہیں۔ اپنے احباب و رفقاء کی نظروں سے گر کر زندہ رہنا قابلِ تعریف نہیں۔ پھر بھی میں آپ کی بات نہیں ٹالنا چاہتا۔ آپ کے الفاظ میں ثقالت نہیں۔ ہمدردی ہے اور میں ابھی تک بالکل بے حس نہیں ہوا ہوں۔" مگر تمہارے اوپر میرا کوئی جادو نہ چلا۔ شاید تم اس سے بھی زیادہ اپنے اصولوں کے پکے ہو۔ حالانکہ ابھی اس کی آزمائش نہیں ہوئی۔ خیر میں تمہارے اصولوں سے سوتیلا سلوک نہیں کرنا چاہتی۔ سواری کا انتظام کر دو۔ میں کل ہی چلی جاؤں گی۔ اور پھر اپنی نادانیوں سے تمہارے اصولوں کی راہ کا کانٹا بننے کے لئے نہ آؤں گی۔

مسٹر کلارک نے روحانی کرب کے ساتھ کہا۔ ڈارلنگ تم نہیں جانتیں کہ یہ کتنا خطرناک شخص ہے۔ ہم بغاوت سے سازشوں سے جنگ، جدل سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا اس قسم کے استقلال سے۔ ڈھن سے میں بھی انسان ہوں۔ صوفیا۔ اگرچہ اس وقت میری زبان سے ایسا دعوے بہت دیدہ نُف نہیں معلوم ہوتا۔ مگر کم از کم اس مقدم ہستی کے نام پر جس کا میں ایک ادنیٰ عقیدت مند ہوں۔ مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس نوجوان کا دل سے احترام کرتا ہوں۔ اس کے آہنی ارادہ کا اس کی ہمت کا اُس کی سچائی کا دل سے معترف ہوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ وہ ایک باثروت باپ کا بیٹا ہے اور شاہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں مصروف رہ سکتا ہے۔ مگر اُس کے یہی پاکیزہ اوصاف ہیں۔ جنہوں نے اس کو ناقابل فتح بنا رکھا ہے۔ ایک فوج کا مقابلہ کرنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا ایسے محض چند آدمیوں کا جنہیں دُنیا میں کسی کا خوف نہیں ہے۔ میرا قومی فرض میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہے۔

صوفیا کو یہ معلوم ہوگیا۔ کہ میری دھمکی بالکل بے اثر نہیں ہوئی۔ مجبوری کا کلمہ زبان پر افسوس کا خیال دل میں آیا اور رضامندی کی پہلی منزل پوری ہوئی۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس وقت نازو انداز کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا پُرزور اصرار کا۔ اصول کا پابند انسان نازو انداز کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا دل مضبوط کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ضمیر کے سامنے اپنی کمزوری کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ لیکن بیجا مگر پُرزور اصرار کے مقابلہ میں وہ نکما ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کی ایک نہیں چلتی —

صوفیا نے طنز سے کہا۔ اگر تمہارا قومی فرض تمہیں عزیز ہے تو مجھے بھی اپنی خودداری عزیز ہے۔ وطن کی ابھی تک کسی نے تعریف یا توضیح نہیں کی۔ مگر عورت کا حفظِ مراتب اُس کا ایک نہایت ضروری جزو

ہے اور ہونا چاہئے۔ اس سے تم انکار نہیں کر سکتے۔

یہ کہہ کر وہ مالکہ کی طرح میز کے پاس گئی اور ایک ڈاکٹ فارم نکالا۔ جس پر ایجنٹ اپنے احکام لکھا کرتا تھا۔

**کلارک** ۔ کیا کرتی ہو صوفیا؟ خدا کے لئے ضد نہ کرو۔

**صوفیا**۔ "جیل کے داروغہ کے نام حکم لکھوں گی" کہتے ہوئے وہ ٹائپ رائٹر کے پاس بیٹھ گئی۔

**کلارک** ۔ یہ اندھیر نہ کرو صوفیا۔ غضب ہو جائے گا۔

**صوفیا** ۔ میں غضب سے کیا۔ قیامت سے بھی نہیں ڈرتی۔

صوفیا نے ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرتے ہوئے حکم نامہ کو ٹائپ کیا۔ اس نے عمداً ایک لفظ بے موقع ٹائپ کر دیا جیسے ایک باضابطہ حکم نامہ میں نہ ہونا چاہئے تھا۔ اس پر کلارک نے کہا۔ یہ لفظ نہ رکھو۔

**صوفیا**۔ کیوں شکریہ ادا نہ کروں؟

**کلارک** ۔ حکم نامہ میں شکریہ کا کیا ذکر؟ کوئی پرائیویٹ خط تھوڑا ہی ہے۔

**صوفیا**۔ ہاں درست ہے۔ یہ لفظ خارج کئے دیتی ہوں۔ نیچے کیا لکھوں؟

**کلارک** ۔ نیچے کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف میرے دستخط ہوں گے۔

صوفیا نے پورا حکم نامہ پڑھ کر سنا دیا۔

**کلارک** ۔ ڈارلنگ۔ یہ تم بُرا کر رہی ہو۔

**صوفیا**۔ کچھ پرواہ نہیں۔ میں بُرا ہی کرنا چاہتی ہوں۔ دستخط بھی ٹائپ کر دوں؟ نہیں (مُہر نکال کر) یہ مہر کئے دیتی ہوں۔

**کلارک** ۔ جو چاہو کرو۔ جب تمہیں اپنی ضد کے آگے کچھ بھلا بُرا

نہیں سوجھتا تو میں کیا کہوں۔

صوفیا۔ کہیں، اور تو اس کی نقل نہ ہوگی؟

کلارک۔ میں کچھ نہیں جانتا۔

یہ کہہ کر مسٹر کلارک اپنی خوابگاہ کی طرف جانے لگے۔ صوفیا نے کہا۔ آج اتنی جلدی نیند آگئی؟

کلارک۔ ہاں تھک گیا ہوں۔ اب سوؤں گا۔ تمہارے اس خط سے ریاست میں تہلکہ مچ جائے گا۔

صوفیا۔ ہاں اگر تمہیں اتنا خوف ہے تو میں ابھی چاک کئے ڈالتی ہوں۔ اتنا نہیں گدگدانا چاہتی کہ ہنسی کے بدلے رونا آجائے۔ بیٹھے ہو تو دیکھو یہ لفافہ پھاڑتی ہوں۔

کلارک۔ کرسی پر بے پروائی کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے۔ "لو بیٹھ گیا۔ کیا کہتی ہو؟"

صوفیا۔ کہتی کچھ نہیں۔ شکریہ کا گیت سنتے جاؤ۔

کلارک۔ شکریہ کی ضرورت نہیں۔

صوفیا نے پھر گانا شروع کیا اور کلارک خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ ان کے چہرہ پر پُر درد اشتیاق کا رنگ نمودار تھا جو زبان حال سے کہہ رہا تھا۔ یہ امتحان و آزمائش کب تک؟ اس کھیل کی کوئی حد بھی ہے؟ اس اشتیاق نے انہیں سلطنت کی فکر سے آزاد کر دیا۔ "آہ کاش اب بھی معلوم ہو جاتا کہ تو اتنی بڑی بھینٹ پاکر خوش ہوگئی!" صوفیا نے ان کی آتش شوق کو خوب مشتعل کر دیا۔ اور اس وقت یک دم پیانو بند کر دیا۔ پھر بلا کچھ کہے ہوئے اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی۔ کلارک وہیں بیٹھے ہے۔ جیسے کوئی تھکا ہوا مسافر تنہا کسی درخت کے نیچے بیٹھا ہو۔

صوفیا نے ساری رات اپنی آئندہ زندگی کی تصویر کھینچنے میں بسر

کی مگر خاطر خواہ رنگ نہ دے سکی۔ پہلے رنگ بھر کر اُسے ذرا دور سے دیکھتی تو معلوم ہوتا کہ دھوپ کی جگہ چھاؤں ہے۔ چھاؤں کی جگہ دھوپ ہے۔ سُرخ رنگ زیادہ ہو گیا ہے۔ باغ میں فروتی و لکشتی ہے۔ پہاڑوں پر ضرورت سے زیادہ ہریالی ہے۔ اور دریاؤں میں غیر مادی سکون ہے پھر برش لے کر ان خرابیوں کو درست کرنے لگتی تو سارا منظر ضرورت سے زیادہ بے لطف۔ اُداس اور میلا ہو جاتا۔ اس کی مذہبیت اب اپنی زندگی میں خدا کا ہاتھ دیکھتی تھی۔ اب خدا ہی اس کا محرک تھا۔ وہ اپنے نیک و بد اعمال کے نیکی بدی سے مبرا تھی۔

علی الصباح وہ بستر سے اٹھی تو مسٹر کلارک سو رہے تھے۔ موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس نے شوفر کو بُلا کر موٹر کی تیاری کا حکم دیا۔ اور ایک محمد میں جیل کی طرف روانہ ہوئی۔ جیسے کوئی لڑکا اسکول سے گھر کی طرف دوڑے۔

اس کے جیل پہنچتے ہی جیل میں سنسنی مچ گئی۔ چوکیدار آنکھیں ملتے ہوئے دوڑ دوڑ کر دروازے پیٹنے لگے۔ داروغہ جی نے جلدی میں اُلٹی چپکین پہنی اور بے تحاشا دوڑے۔ ڈاکٹر صاحب بھی ننگے پاؤں بھاگے۔ یاد نہ آیا کہ رات کو جوتے کہاں رکھے تھے اور اس وقت تلاش کرنے کی فرصت نہ تھی۔ وارڈر سنگھ زیادہ رات گئے سوئے تھے اور ابھی تک خواب شیریں کے مزے لے رہے تھے۔ کمرہ میں مینہ کی شمولیت سے تر و تازہ ہوا آ رہی تھی۔ نرم قالین بچھا ہوا تھا۔ ابھی تک رات کا دیپ بھی نہ بجھا تھا۔ گویا دینے کی بیقراری کی شہادت دے رہا تھا۔ صوفیا کا رومال ابھی تک وہ کے سرہانے پڑا ہوا تھا۔ اور اس میں سے بڑھیا خوشبو نکل رہی تھی۔ داروغہ نے حاضر ہو کر صوفیا کو سلام کیا۔ اور وہ ان کو لے دینے کے کمرہ میں گئی۔ دیکھا تو نیند

میں ہیں۔ رات کی میٹھی نیند سے چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہے۔ لبوں پر ہلکی مسکراہٹ ہے۔ گویا پھول پر شعاعیں چمک رہی ہوں۔ صوفیا کو ورنے آج تک کبھی اتنے خوبصورت نہ معلوم ہوئے تھے۔

صوفیا نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ رات کو اس کی کیسی حالت تھی؟

ڈاکٹر۔ حضور کئی بار غش آئے مگر میں ایک لمحہ کے لیئے بھی یہاں سے نہیں ہٹا۔ جب یہ سو گئے تو میں کھانے کے لیئے چلا گیا۔ اب تو ان کی حالت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔

صوفیا۔ ہاں مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ آج کمزوری نہیں ہے میں اب سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اسے کسی دوسری جگہ میں کیوں نہ بھیجوا دوں۔ یہاں کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں ہے۔ مگر آپ لوگوں کے سامنے وہ اپنے دل کی باتیں نہ کہے گا۔ آپ لوگ ذرا باہر چلے جائیں تو میں اسے جگا کر دریافت کروں اور اس کی خواہش کی بھی جانچ کر لوں۔ (مسکرا کر) ڈاکٹر صاحب میں بھی اس علم سے واقف ہوں۔ نیم حکیم ہوں لیکن خطرہ جان نہیں۔

جب کمرہ میں تخلیہ ہو گیا تو صوفیا نے ورنے کا سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ اس کی پیشانی کو سہلانے لگی۔ ورنے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اس طرح جھپٹ کر اٹھا جیسے نیند میں کسی دریا میں جھپٹ پڑا ہو۔ خواب کا نشہ شاید ہی کسی کو اس قدر جلد ملا ہو۔

صوفیا نے مسکرا کر کہا "تم ابھی تک سو رہے ہو۔ میری آنکھوں کی طرف دیکھو جو رات بھر نہیں جھپکیں۔

ورنے۔ "دنیا کا سب سے قیمتی جواہر پا کر بھی میٹھی نیند نہ سوؤں۔ مجھ سا بدنصیب اور کون ہوگا؟"

صوفیا۔ میں تو اس سے بھی زیادہ بیش قیمت جواہر پا کر اور بھی تفکرات

میں مبتلا ہوگئی۔ اب یہ خوف ہے۔ کہ کہیں وہ ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ نیند کا لطف ناداری میں ہے جب کوئی فکر نہیں ہوتی۔ اچھا اب تیار ہو جاؤ۔

ونے۔ کس بات کے لیئے؟

صوفیا۔ بھول گئے؟ اس تاریکی سے روشنی میں جانے کے لیئے۔ اس کال کوٹھڑی سے جُدا ہونے کے لیئے۔ میں موٹر لائی ہوں۔ تمہاری رہائی کا حکم نامہ میری جیب میں ہے۔ کوئی ذلت آمیز شرط نہیں ہے۔ صرف اودے پور کی ریاست میں بلا اجازت نہ داخل ہونے کا وعدہ لیا گیا ہے۔ آؤ چلیں۔ میں تمہیں ریلوے اسٹیشن تک پہنچا کر لوٹ آؤں گی۔ تم دہلی پہنچ کر میرا انتظار کرنا۔ ایک ہفتہ کے اندر ہی میں تم سے وہیں آملوں گی۔ اور پھر ہم ایک دوسرے سے جُدا نہ ہوں گے۔

ونے سنگھ کی حالت اُس بچے کی سی تھی جو مٹھائیوں کے خوانچہ کو دیکھتا ہے مگر اس خوف سے کہ ماں مارے گی منہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مٹھائیوں کا ذائقہ یاد کر کے اُس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ رس گُلے کتنے رسیلے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دانت کسی مٹھاس کے کُنڈ میں پھسل پڑے۔ امرتیاں کتنی کُرکُری ہیں۔ ان میں رس بھرا ہی ہوگا۔ گلاب جامن کتنی سوندھی ہوتی ہے کہ کھاتا ہی چلا جائے۔ مٹھائیوں سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ماں پیسے نہ دے گی۔ پیسے ہی نہ ہوں گے۔ وہ کس سے مانگے گی۔ زیادہ ضد کروں گا۔ تو رونے لگے گی۔ خیر دنے سنگھ آبدیدہ ہو کر بولے۔ "صوفیا میں بدنصیب شخص ہوں۔ مجھے اسی حالت میں رہنے دو۔ میرے ساتھ اپنی زندگی برباد نہ کرو۔ مجھے قسمت نے رنج اٹھانے ہی کے لئے بنایا ہے۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم . . . . .

صوفیا نے قطع کلام کر کے کہا "ونے میں مُصیبت ہی کی بھوکی ہوں۔ اگر تم عیش پسند ہوتے۔ اگر تمہاری زندگی عیش و عشرت کی زندگی ہوتی۔

اگر تم نفس کے غلام ہوتے تو شاید میں تمہاری طرف سے منہ پھیر لیتی۔ تمہارے حوصلہ و ایثار ہی نے مجھے تمہاری طرف کھینچا ہے۔"

وِنے ۔ اماں جی کو تم جانتی ہو۔ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔

صوفیا۔ تمہاری محبت کا سہارا پاکر میں ان کے غصہ کو برداشت کر لوں گی۔ جب وہ دیکھیں گی کہ میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بلکہ تمہارے پیچھے اڑنے والی گرد ہوں تو ان کا دل پگھل جائے گا۔

وِنے نے صوفیا کو محبت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ تم ان کے مزاج سے واقف نہیں ہو۔ وہ ہندو دھرم پر جان دیتی ہیں۔"

صوفیا۔ میں بھی ہندو دھرم پر جان دیتی ہوں۔ جو روحانی سکون مجھے اور کہیں نہ ملا وہ گوپیوں کی داستان الفت میں مل گیا۔ وہ پریم کا اوتار جس نے گوپیوں کو پریم کا رس چکھایا۔ جس نے کنجا کی ناؤ پار لگائی۔ جس نے پریم کا کھیل دکھانے کے لئے ہی سنسار کو اپنے قدموں سے پاک بنایا اُسی کی داسی بن کر جاؤں گی تو وہ کون سچا ہندو ہے جو مجھ سے بیر رکھے گا۔

وِنے نے مسکرا کر کہا۔" اس چھلیا نے تم پر جادو ڈال دیا؟ میرے خیال میں تو کرشن کی داستان محبت صرف ان کے بھگتوں کی خیالی ایجاد ہے۔"

صوفیا۔ ہو سکتی ہے۔ یسوع کا وجود بھی تو خیالی کہا جاتا ہے۔ شیکسپیئر کا وجود بھی تو خیالی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالیداس کی سرشت آب و گل سے ہوئی تھی؟ لیکن ان ہستیوں کے خیالات پر بھی ہم ان کی پاک شہرت کے معتقد ہیں اور واقعی ہستیوں کی شہرت سے نسبت زیادہ تر۔ شاید اسی لئے کہ اوّل الذکر کا وجود غلیظ عناصر سے نہیں بلکہ لطیف تخیل سے ہوا ہے۔ آدمیوں کے نام نہوں یا نہ ہوں مگر ان کی معیاروں کے نام ضرور ہیں۔ اُن میں سے ہر شخص انسانی زندگی کا ایک ایک معیار ہے۔

وِنے ۔ صوفیا میں تم سے دلائل میں پیش نہ پا سکوں گا۔ مگر میرا دل

کہتا ہے کہ میں تمہارے حسنِ ظن سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ تم میری اصلی صورت نہیں دیکھ رہی ہو۔ کہیں اس پر نگاہ پڑ جائے تو تم میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرو گی۔ تم میرے پیروں کی زنجیر چاہے نہ بن سکو مگر میری دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے والی ہوا ضرور بن جاؤ گی۔ ماں نے بہت سوچ بچار کر مجھے یہ پوزیشن دیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ایک مرتبہ میں اس پابندی سے آزاد ہوا تو نفس مجھے اس قدر تیزی سے بہالے جائے گا کہ پھر شاید میرے وجود کا پتہ ہی نہ لگے۔ صوفیا مجھے اس سخت ترین آزمائش میں نہ ڈالو۔ میں دراصل بہت کمزور اور نفس پرور شخص ہوں۔ تمہاری اضافی بلندی مجھے خائف کر رہی ہے۔ ہاں مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کرو کہ آج ہی یہاں سے کسی دوسرے مقام کو روانہ ہو جاؤں۔

صوفیا۔ کیا تم مجھ سے اتنی دور بھاگنا چاہتے ہو؟

ونے۔ نہیں نہیں۔ اس کا اور ہی سبب ہے۔ نہ جانے کیونکر یہ حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ کہ جسونت نگر ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا جائے۔ کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار صاحب نے تمہاری حفاظت کے لئے یہ بندوبست کیا ہے۔ مگر لوگ تم کو بدنام کر رہے ہیں۔

صوفیا اور کلارک کی باہمی بحث سُن کر سردار نیلکنٹھ نے فوراً یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ مہم صاحب کے سامنے صاحب کی ایک نہ چلے گی اور دنے کو رہا کر دینا پڑے گا۔ اس لئے پہلے ہی سے حفظ امن کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ صوفیا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ کیا ایسا حکم دیا گیا ہے؟

ونے۔ ہاں مجھے خبر ملی ہے۔ کوئی چپڑاسی کہتا تھا۔

صوفیا۔ مجھے مطلقاً خیر نہیں ہے۔ میں ابھی جاکر پتہ لگاتی ہوں اور اس حکم کو منسوخ کرکے دیتی ہوں ایسی زیادتی ریاستوں کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ یہ سب تو ہو جائے گا۔ مگر تم کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

ولے۔ نہیں صوفیا۔ مجھے معاف کرو۔ دُور کا سنہرا منظر قریب آکر ریگ کا میدان بن جاتا ہے۔ تم میرے لئے ایک زندہ معجزہ ہو۔ تمہاری محبت کا مزہ میں تخیل ہی کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں تمہاری نظروں سے نہ گر جاؤں۔ اپنے کو کہاں تک پوشیدہ رکھوں گا جو تمہیں پاکر پھر میری زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ پرستش اور حصول کے لئے پھر میرے پاس کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ صوفیا۔ میری زبان سے نہ جانے کیا کیا فضول باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے خود شک ہو رہا ہے کہ میں اپنے ہوش میں ہوں یا نہیں۔ فقیر تخت شاہی پر بیٹھ کر اگر پریشان خاطر ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ مجھے کہنے پڑا رہنے دو۔ میری تم سے یہی آخری التجا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔

صوفیا۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔

ولے۔ کم از کم مجھے یہاں سے جانے کے لئے مجبور نہ کرو۔ کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔ شہر کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں ہے کہ میں عوام کو قابو میں رکھ سکوں گا۔

صوفیا نے متانت سے کہا جیسی تمہاری مرضی۔ میں جتنا تمہیں وہ مزاج سمجھتی تھی۔ تم اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں اور اسی لئے کہتی ہوں کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ نوجوان عورت کا دل بچوں کی طرح ہوتا ہے، اسے جس چیز کے لئے منع کرو اُسی کی طرف دوڑے گا۔ اگر تم اپنی تعریف کرتے اپنے کاموں کی سراہنا کرتے تو شاید میں تمہاری جانب سے بدشوق ہو جاتی۔ اپنے

کہتا ہے کہ میں تمہارے حسنِ ظن سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں۔ تم میری اصلی صورت نہیں دیکھ رہی ہو۔ کہیں اس پر نگاہ پڑ جائے تو تم میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرو گی۔ تم میرے پیروں کی زنجیر چاہے نہ بن سکو مگر میری دبی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے والی ہوا ضرور بن جاؤ گی۔ ماں نے بہت سوچ بچار کر مجھے یہ رعایت دیا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ ایک مرتبہ میں اس پابندی سے آزاد ہوا تو نفس مجھے اس قدر تیزی سے بہائے جائے گا کہ پھر شاید میرے وجود کا پتہ ہی نہ لگے۔ صوفیا مجھے اس سخت ترین آزمائش میں نہ ڈالو۔ میں در اصل بہت کمزور اور نفس پرور شخص ہوں۔ تمہاری اخلاقی بلندی مجھے خائف کر رہی ہے۔ ہاں مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کرو کہ آج ہی یہاں سے کسی دوسرے مقام کو روانہ ہو جاؤں۔

صوفیا۔ کیا تم مجھ سے اتنی دور بھاگنا چاہتے ہو؟

وے۔ نہیں نہیں۔ اس کا اور ہی سبب ہے۔ نہ جانے کیونکر یہ حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ کہ جسونت نگر ایک ہفتہ کے لئے خالی کر دیا جائے۔ کوئی جوان آدمی شہر میں نہ رہنے پائے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار صاحب نے تمہاری حفاظت کے لئے یہ بندوبست کیا ہے۔ مگر لوگ تم کو بدنام کر رہے ہیں۔

صوفیا اور کلارک کی باہمی بحث سُن کر سردار نیلکنٹھ نے فوراً یہ حکم جاری کر دیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ میم صاحب کے سامنے صاحب کی ایک نہ چلے گی اور دے کو رہا کر دینا پڑے گا۔ اس لئے پہلے ہی سے حفظِ ماتقدم کا انتظام کرنا ضروری تھا۔ صوفیا نے متحیر ہو کر پوچھا۔ کیا ایسا حکم دیا گیا ہے؟

وے۔ ہاں مجھے خبر ملی ہے۔ کوئی چپڑاسی کہتا تھا۔

صوفیا۔ مجھے مطلقاً خبر نہیں ہے۔ میں ابھی جاکر پتہ لگاتی ہوں اور اس حکم کو منسوخ کرنے دیتی ہوں دوسری زیادتی ریاستوں کے سوا اور کہیں نہیں ہو سکتی۔ یہ سب تو ہو جائے گا۔ مگر تم کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

ولنے۔ نہیں صوفیا۔ مجھے معاف کرو۔ دُور کا سنہرا منظر قریب آکر ریگ کا میدان بن جاتا ہے۔ تم میرے لئے ایک زندہ خیال ہو۔ تمہاری صحبت کا مزہ میں تخیل ہی کے ذریعہ حاصل کر سکتا ہوں۔ مجھے خوف ہے کہ میں تمہاری نظروں سے نہ گر جاؤں۔ اپنے کو کہاں تک پوشیدہ رکھوں گا جب تمہیں پاکر پھر میری زندگی بے لطف ہو جائے گی۔ پرستش اور حصول کے لئے پھر میرے پاس کوئی شے باقی نہ رہے گی۔ صوفیا۔ میری زبان سے نہ جانے کیا کیا فضول باتیں نکل رہی ہیں۔ مجھے خود شک ہو رہا ہے کہ میں اپنے ہوش میں ہوں یا نہیں۔ فقیر تخت شاہی پر بیٹھ کر اگر پریشان خاطر ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ میری تم سے یہی آخری التجا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔

صوفیا۔ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔

ولنے۔ کم از کم مجھے یہاں سے جانے کے لئے مجبور نہ کرو۔ کیونکہ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ میں یہاں سے نہ جاؤں گا۔ شہر کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں ہے کہ میں عوام کو قابو میں رکھ سکوں گا۔

صوفیا نے متانت سے کہا جیسی تمہاری مرضی۔ میں سمجھتی تھی وہ مزاج سمجھتی تھی۔ تم اس سے کہیں زیادہ ہوشیار ہو۔ میں تمہارا مطلب سمجھتی ہوں اور اسی لئے کہتی ہوں کہ جیسی تمہاری مرضی۔ مگر شاید تمہیں معلوم نہیں ہے کہ نوجوان عورت کا دل بچوں کی طرح ہوتا ہے۔ وہ جس چیز کے لئے منع کر دو اسی کی طرف دوڑے گا۔ اگر تم اپنی تعریف کرتے اپنے کارناموں کی سراہنا کرتے تو شاید میں تمہاری جانب سے بدشوق ہو جاتی۔ اپنے

عیوب و نقائص کو ظاہر کر کے تم نے مجھے اور بھی فریفتہ کر لیا ہے۔ تم مجھ سے روٹھتے ہو۔ اس لئے میں تمہارے سامنے نہ آؤں گی پر رہوں گی تمہارے ہی ساتھ۔ جہاں جہاں تم جاؤ گے میں سایہ کی طرح تمہارے ساتھ رہوں گی۔ محبت ایک خیالی وجود ہے۔ خیال ہی سے اس کی پرورش ہوتی ہے۔ خیال ہی سے وہ زندہ رہتا ہے اور خیال ہی سے وہ فنا بھی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی مادی وجود نہیں ہے۔ تم میرے ہو۔ یہ یقین میری محبت کو زندہ اور آرزومند رکھنے کے لئے کافی ہے۔ جس دن اس یقین کی جڑ ہل جائے گی اسی دن اس زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اگر تم نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ اس قید خانہ میں رہ کر تم اپنی زندگی کے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ پورا کر سکتے ہو تو میں اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ اس بے نفسی نے میرے دل میں تمہاری عزت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔ کل شام کو پھر آؤں گی۔ میں نے اس مہم کے لئے جتنا "تریا چرتر" لیا ہے۔ وہ تم سے بتلا دوں۔ تو تم تعجب کرو گے۔ تمہاری ایک نہیں نے میری ساری کوشش پر پانی پھیر دیا۔ کلارک کہے گا میں کہتا تھا کہ وہ راضی نہ ہوگا۔ شاید طعنے دے۔ مگر کچھ مضائقہ نہیں کوئی بہانہ کر دوں گی۔

یہ کہتے کہتے صوفیا کے پُر اشتیاق لب ونے سنگھ کی طرف جھکے۔ مگر وہ کانی پر پھسلنے والے آدمی کی طرح گرتے گرتے سنبھل گئی۔ اس نے آہستہ سے ونے سنگھ کا ہاتھ دبایا اور دروازہ کی طرف چلی۔ مگر باہر جا کر پھر واپس آئی اور نہایت لجاجت سے بولی "ونے تم سے ایک بات پوچھتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم صاف صاف بتلا دو گے۔ میں کلارک کے ساتھ یہاں آئی۔ اس سے چالاکی برتی۔ اسے جھوٹی امیدیں دلائیں اور اب بھی اسے مغالطہ میں ڈالے ہوئے ہوں۔ تم اسے بیجا تو نہیں خیال کرتے؟ تمہاری نگاہ میں میں قابل ملامت تو نہیں

ہوں؟"

دینے کے پاس اس کا ایک ہی ممکن جواب تھا صوفیا کا رویہ اس کو قابل اعتراض معلوم ہوتا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی اُس نے اس بات کو تعجب کے لہجہ میں ظاہر کر دیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اس خیال کو ظاہر نہ کر سکا۔ یہ کتنی سخت ناانصافی ہوتی۔ کتنی بڑی بے رحمی۔ وہ جانتا تھا کہ صوفیا نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ ایک مذہبی خیال کے تابع ہو کر۔ وہ اُسے خدائی تحریک سمجھ رہی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید اب تک وہ نا اُمید ہو گئی ہوتی۔ ایسی حالت میں کھڑی اور کھوس سچائی سے اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔ عقیدت مندانہ سرگرمی سے بولے۔ "صوفیا تم یہ سوال کر کے اپنے اوپر اور اس سے زیادہ میرے اوپر ظلم کر رہی ہو۔ میرے لئے تم نے اب تک تیاگ (ترک) ہی تیاگ کئے ہیں۔ تم نے عزت۔ ثروت۔ اصول کسی ایک کی بھی پرواہ نہیں کی۔ دنیا میں مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کوئی نہ ہوگا۔ اگر میں تمہارے اس پریم کی بے وقعتی کروں۔"

یہ کہتے کہتے وہ رُک گئے۔ صوفیا بولی۔ "کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟ رُک کیوں گئے؟ یہی نہ کہ تمہیں میرا کلارک کے ساتھ رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ جس دن مجھے نا اُمیدی ہو جائے گی کہ میں اپنی مغالطہ آمیز روش سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اسی دن میں کلارک کو پیروں سے اس طرح ٹھکرا دوں گی۔ اس کے بعد تم مجھے پریم کی جوگن کے بھیس میں دیکھو گے۔ جس کی زندگی کا واحد مقصد ہوگا۔ تمہارے اوپر نثار ہو جانا۔"

## (۲۷)

نائیک رام محلہ والوں سے رخصت ہو کر اودے پور روانہ ہوئے۔

ریل کے مسافروں کو ان کی بہت جلد عقیدت ہو گئی کسی کو تمباکو مل کر کھلاتے۔ کسی کے بچہ کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ جس مسافر کو دیکھتے کہ جگہ نہیں مل رہی۔ ادھر اُدھر بھٹک رہا ہے۔ جس کمرہ میں جاتا ہے۔ وہی دھکے کھاتا ہے۔ اس کو بلا کر اپنی بغل میں بٹھا لیتے۔ پھر ذرا دیر میں اس سے سوالوں کا تانتا باندھ دیتے:۔ کہاں مکان ہے؟ کہاں جاتے ہو؟ کتنے لڑکے ہیں؟ کیا کاروبار ہوتا ہے؟ ان سوالات کا سلسلہ اس انجام پر ختم ہوتا:۔ میرا نام نایک رام پنڈا ہے۔ جب کبھی کاشی آؤ۔ میرا نام پوچھ لو۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ دو دن چار دن۔ مہینے دو مہینے جب تک جی چاہے آرام سے وہیں ٹھہرو۔ گھر دوار۔ لوگ چاکر۔ سب حاضر ہیں۔ گھر کا سا آرام پاؤ گے۔ وہاں سے چلتے وقت جو چاہے دے دو۔ نہ ہو نہ دو۔ گھر آکر بھیج دو۔ اس کی کوئی پروا نہیں۔ یہ کبھی مت سوچو۔ بھی روپے نہیں ہیں۔ پھر چلیں گے۔ شبھ کاج کے لئے مہورت نہیں دیکھی جاتی۔ ریل کا کرایہ لے کر چل کھڑے ہو۔ کاشی میں تو ہیں موجود ہی ہیں۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ کام پڑ جائے تو جان لڑا دیں۔ تیرتھ جاترا کے لئے مال منول مت کرو۔ کوئی نہیں جانتا کب بڑی جاترا کرنی پڑ جائے۔ دُنیا کے جھگڑے تو لگے ہی رہیں گے۔

دلی پہنچے تو کئی نئے مسافر گاڑی میں آئے۔ آریہ سماج کے کسی جلسہ میں جا رہے تھے۔ نایک رام نے اُن سے بھی وہی جرح شروع کی یہاں تک کہ ایک بہاشے گرم ہو کر بولے:۔ تم ہمارے باپ دادا کا نام پوچھ کر کیا کرو گے؟ ہم تمہارے پھندے میں پھنسنے والے نہیں۔ یہاں گنگا بھی کے قائل نہیں اور نہ کاشی ہی کو بیکنٹھ سمجھتے ہیں۔

نایک رام ذرا بھی خفیف نہیں ہوئے۔ مسکرا کر بولے:۔ بابو جی آپ آریہ ہو کر ایسا کہتے ہیں۔ آریہ لوگوں نے ہی تو ہندو دھرم کی لاج رکھی۔ نہیں تو اب تک سارا دیس مسلمان کرستان ہو گیا ہوتا۔ ہندو دھرم

کے اودھارک ہوکر آپ کاشی کو بھلا کیسے نہ مانیں گے؟ اسی نگری میں راجہ ہریشچندر کی پرچھا (آزمائش) ہوئی تھی۔ وہیں بدھ بھگوان نے اپنا دھرم چکر چلایا تھا۔ وہیں سُنکر بھگوان نے منڈن مسر سے ساستر ارتھ کیا تھا۔ وہاں جینی آتے ہیں۔ بدھ آتے ہیں۔ وشنو آتے ہیں۔ وہ ہندوؤں کی نگری نہیں ہے۔ سارے سنسار کی نگری ہے۔ دُور دُور کے لوگ بھی جب تک کاشی جی کے درشن نہ کرلیں۔ ان کی جاترا سپھل نہیں ہوتی۔ گنگا جی مکتی دیتی ہیں۔ پاپ کاٹتی ہیں۔ یہ سب تو گنوارو کو بہلانے کی باتیں ہیں۔ اُن سے کہو کہ جی کرانس یونیورسٹی کو دیکھ آؤ۔ جہاں پگ پگ پر آریہ جاتی کے نشان ملتے ہیں جس کا نام لیتے ہی بھکتوں مہاتماؤں۔ رشیوں منیوں کی یاد آجاتی ہے۔ تو اُن کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے گی۔ پر اصلی میں بات یہی ہے۔ کاشی کا مہاتم اس لئے ہے کہ وہ آریہ جاتی کا جیتا جاگتا پُران ہے۔

اُن اصحاب کو پھر کاشی کی مذمت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ دل میں شرمندہ ہوئے اور نائیک رام کی ذہنی راقفیت کے قائل ہوگئے۔ حالانکہ نائیک رام نے یہ چند فقرے ایسے موقعوں کے لئے کسی مقرر کی تقریر سے چُن کر رٹ لئے تھے۔

ریل کے اسٹیشنوں پر وہ ضرور اُترتے اور ریل کے ملازموں سے تعارف پیدا کرتے۔ کوئی انہیں پان کھلا دیتا۔ کوئی کچھ ناشتہ کرا دیتا۔ سارا سفر ختم ہوگیا۔ مگر وہ لیٹے تک نہیں۔ ذرا بھی آنکھ نہ جھپکی۔ جہاں دو مسافروں کو لڑتے جھگڑتے دیکھتے۔ آپ فوراً ثالث بن جاتے اور ان میں میل کرا دیتے۔ تیسرے روز وہ اودے پور پہنچ گئے اور وہاں کے حاکموں اور اہلکاروں سے ملتے جُلتے گھومتے پھرتے جیوتشی کے ہاں داخل ہوئے۔ دیکھا کہ مسٹر کلارک کا ڈیرا پڑا ہوا ہے۔ باہر سے آنے جانے والوں کی بڑی جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ شہر کا پھاٹک بند سا ہے۔ لیکن

پنڈے کو کون روکتا؟ شہر میں پہنچ کر سوچنے لگے۔ دنے سنگھ سے کیونکر ملاقات ہو؟ رات کو تو ایک دھرم شالہ میں ٹھیرے۔ سویرا ہوتے ہی جیل کے داروغہ کے مکان میں جا پہنچے۔ داروغہ جی صوفیا کو بھیج کر آئے تھے۔ اور نوکر پر بگڑ رہے تھے۔ کہ تو نے حقہ کیوں نہیں بھرا۔ اتنے میں برآمدہ میں پنڈا جی کی آہٹ پاکر باہر نکل آئے۔ انہیں دیکھتے ہی نایک رام نے گنگا جل کی شیشی نکالی اور ان کے سر پر جل چھڑک دیا۔

داروغہ جی نے ذرا رکھائی سے کہا۔ "کہاں سے آتے ہو؟"

نایک رام۔ مہاراج استھان تو پراگ راج ہے پر آرہا ہوں بڑی دور سے۔ جی میں آیا ادھر بھی ججمانوں کو آسیرواد دیتا چلوں۔

داروغہ جی کا لڑکا جس کی عمر ابھی ۱۴-۱۵ سال کی تھی نکل آیا۔ نایک رام نے اُسے سر سے پیر تک بغور دیکھا۔ گویا اس کے دیدار سے دلی مسرت حاصل ہو رہی ہے اور پھر داروغہ جی سے بولے۔ "یہ آپ کے چرنجیو پتر ہیں نا؟ پتا پتر کی صورت کیسی ملتی ہے کہ دور ہی سے پہچان لے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب کیا پڑھتے ہو؟"

لڑکے نے کہا۔ "انگریزی پڑھتا ہوں۔"

نایک رام۔ یہ تو میں ہی سمجھ گیا تھا۔ آج کل تو اسی ودیا کا دور دورہ ہے۔ راج ودیا ٹھہری جو۔ کس دیکھا (دفعہ) میں پڑھتے ہو بھیا؟

داروغہ۔ ابھی تو حال ہی میں انگریزی شروع کی ہے۔ اس پر بھی پڑھنے میں جی نہیں لگاتے۔ ابھی تھوڑی ہی پڑھی ہے۔

لڑکے نے سمجھا میری تحقیر ہو رہی ہے۔ بولا۔ "تم سے تو زیادہ ہی پڑھا ہوں۔"

نایک رام۔ اس کی کوئی چنتا نہیں سب آجائے گا۔ ابھی ان کی اوستھا (عمر) ہی کیا ہے۔ بھگوان کی اچھا (مرضی) ہوگی تو کل (خاندان)

کا نام روشن کردیں گے۔ آپ کے گھر پر کچھ جگہ جمین بھی ہے؟

داروغہ جی نے اب سمجھا۔ زود فہمی سے نابلد تھے۔ اکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئے اور بولے ـــــ ہاں چتوڑ کے علاقہ میں کئی گاؤں ہیں۔ پرانی جاگیر ہے۔ میرے پتا جی مہارانا کے درباری تھے۔ ہلدی گھاٹ کی لڑائی میں مہارانا پرتاپ نے میرے بزرگوں کو یہ جاگیر بخشی تھی۔ اب بھی مجھے دربار میں کرسی ملتی ہے اور پان الائچی سے خاطر کی جاتی ہے۔ ضرورت ہوتی ہے۔ تو مہارانا کے یہاں سے آدمی آتا ہے۔ بڑا لڑکا مرا تھا۔ تو مہارانا نے ہمدردی کا خط بھیجا تھا۔

نایک رام۔ جاگیرداری کا کیا کہنا۔ جو جاگیردار وہی راجہ۔ نام کا فرق ہے۔ اصلی راجہ تو جاگیردار ہی ہوتے ہیں۔ رانا تو نام کے ہیں۔

داروغہ۔ راج گھرانے سے برابر آمدورفت قائم ہے

نایک رام۔ ابھی ان کی کہیں بات چیت تو نہیں ہو رہی ہے؟

داروغہ۔ اجی لوگ جان تو کھا رہے ہیں۔ روز ایک نہ ایک جگہ سے پیغام آتا رہتا ہے۔ مگر میں تو سب کو ٹکا سا جواب دے دیتا ہوں۔ جب تک پڑھ لکھ نہ لے۔ اس وقت تک اس کی شادی کر دینا حماقت ہے۔

نایک رام۔ یہ آپ نے پکی بات کہی۔ جنھارتھ (اصل) میں ایسا ہی ہونا چاہئے۔ بڑے آدمیوں کی بدھی (عقل) بھی بڑی ہی ہوتی ہے۔ پر لوک ریت (دنیاوی رواج) پر چلنا ہی پڑتا ہے۔ اچھا اب آگیا (اجازت) دیجئے۔ کئی جگہ جانا ہے۔ جب تک میں لوٹ کر نہ آؤں۔ کسی کو جواب نہ دیجئے گا۔ ایسی کنیا آپ کو نہ ملے گی۔ اور نہ ایسا دھر گل ہی پائے گا۔

داروغہ۔ واہ واہ۔ اتنی جلد چلے جائیے گا۔ کم سے کم بھوجن تو کر لیجئے۔ کچھ ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ آپ کس کا سندیسہ (پیغام) لائے ہیں

وہ کون ہیں۔ کہاں رہتے ہیں؟

نائیک رام۔ سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ پر ابھی بتانے کا حکم نہیں ہے۔

داروغہ نے لڑکے سے کہا "تلک! اندر جاؤ۔ پنڈت جی کے لئے پان بنوا لاؤ۔ کچھ ناشتہ بھی لیتے آنا۔"

یہ کہہ کر تلک کے پیچھے پیچھے خود اندر گئے اور بیوی سے بولے "لو کہیں سے تلک کے بیاہ کا سندیسہ آیا ہے۔ پان طشتری میں بھیجنا۔ ناشتہ کے لئے کچھ نہیں ہے؟ وہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ گھر میں کتنی ہی چیز آئے۔ دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملتی۔ نہ جانے کہاں کے مربھو کے جمع ہو گئے ہیں۔ ابھی کل ہی ایک قیدی کے گھر سے مٹھائیوں کا ایک پورا تھال آیا تھا۔ کیا ہو گیا؟"

بیوی۔ انہیں لڑکوں سے پوچھو کیا ہو گیا۔ میں تو ہاتھ سے چھونے کی بھی قسم کھاتی ہوں۔ یہ کوئی صندوق میں بند رکھنے کی چیز تو ہے نہیں۔ جس کا جب جی چاہے نکال کر کھاتا ہے۔ کل سے کسی نے روٹیوں کی طرف نہیں دیکھا۔

داروغہ۔ تو آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟ تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا کہ جو چیز گھر میں آئے اُسے احتیاط سے رکھو۔ احتیاط سے خرچ کرو۔ وہ لونڈا کہاں گیا؟

بیوی۔ تمہیں نے تو ابھی اُسے ڈانٹا تھا۔ بس چلا گیا۔ کہہ گیا ہے کہ گھڑی گھڑی کی ڈانٹ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔

داروغہ۔ یہ اور مصیبت ہوئی۔ یہ چھوٹے آدمی روز بروز چڑھتے جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک ان کی خوشامد کرے۔ اب کون بازار سے مٹھائیاں لائے؟ آج تو کسی سپاہی کو بھی نہیں بھیج سکتا۔ نہ جانے

سر سے کب یہ بلا ٹلے ، تم چلے جاؤ ۔ تلک!
تلک ۔ شربت کیوں نہیں پلا دیتے ؟
بیوی ۔ شکر بھی تو نہیں ہے ۔ چلے کیوں نہیں جاتے ؟
تلک ۔ ہاں چلے کیوں نہیں جاتے ! لوگ دیکھیں گے تو کہیں گے کہ حضرت مٹھائیاں لئے جاتے ہیں ۔
داروغہ ۔ تو اس میں کیا گالی ہے ؟ کسی کے گھر چوری تو نہیں کر رہے ہو ۔ بُرے کام سے لجانا چاہئے ۔ اپنا کام کرنے میں کیا لاج ؟
تلک یوں تو لاکھ سر پٹکنے پر بھی باز نہ آتے ۔ مگر اس وقت انہیں اپنی شادی کی خوشی کھنچ لے گئی ۔ داروغہ جی نے طشتری میں پان رکھے اور نایک رام کے پاس لائے ۔
نایک رام ۔ سرکار آپ کے گھر پان نہیں کھاؤں گا ۔
داروغہ ۔ اجی ۔ ابھی کیا ہرج ہے ؟ ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی ۔
نایک رام ۔ میرا من بیٹھ گیا تو سب ٹھیک سمجھئے ۔
داروغہ ۔ یہ تو آپ نے بُری بیخ لگائی ۔ یہ بات نہیں ہو سکتی ۔ کہ آپ ہمارے دروازہ پر آئیں اور ہم بغیر کافی خاطر و مدارت کئے آپ کو چلے جانے دیں ۔ میں تو مان بھی جاؤں گا پر تلک کی ماں کسی طرح نہ مانیں گی ۔
نایک رام ۔ اسی سے تو میں یہ سندیسہ لے کر آنے سے انکار کر رہا تھا ۔ جس بھلے مانس کے دروازے پر جائے وہ بنا بھوجن اور وچھنا کے گلا نہیں چھوڑتا ۔ اسی سے تو آج کل کچھ لبا ڑیوں نے بر کھوجنے کو ایک دھندا بنا لیا ہے ۔ اس سے یہ کام کرتے اور بھی سکوچ (تامل) ہوتا ہے ۔
داروغہ ۔ ایسے دغا باز یہاں روز ہی آیا کرتے ہیں ۔ مگر میں تو پانی کو بھی نہیں پوچھتا ۔ جیسا منہ ہوتا ہے ویسا بیڑا ملتا ہے ۔ یہاں

تو آدمی کو ایک نظر دیکھا اور اس کے رگ و ریشے سے واقف ہو گیا۔ آپ یوں نہ جانے پائیں گے۔

نائیک رام۔ میں جانتا کہ آپ اس طرح پیچھے پڑ جائیں گے تو لبا تریوں ہی کی سی بات چیت کرتا۔ کلا تو چھوٹ جاتا

داروغہ۔ یہاں ایسا نادان نہیں ہوں۔ اُڑتی چڑیا پہچانتا ہوں۔

نائیک رام ڈٹ گئے۔ دوپہر ہوتے ہوتے بچے بچے سے ان کی دوستی ہو گئی۔ داروغائن نے بھی پالاگن کہلا بھیجا۔ ادھر سے بھی آشیرواد دیا گیا۔ داروغہ تو دس بجے دفتر چلے گئے۔ نائیک رام کے لئے گھر میں پوڑیاں۔ کچوریاں۔ رائیتہ۔ دہی۔ چٹنی۔ حلوہ۔ یہ سب چیزیں بڑی ترکیب سے تیار کی گئیں۔ پنڈت جی نے اندر جا کر بھوجن کیا۔ داروغائن نے خود پنکھا جھلا۔ پھر تو انہوں نے اور بھی رنگ جمایا۔ لڑکے لڑکیوں کے ہاتھ دیکھے۔ داروغائن نے بھی لجاتے ہوئے ہاتھ دکھایا۔ پنڈت جی نے رکیھاؤں (خط) کی پرکھ کے علم میں اچھی واقفیت دکھلائی۔ اور بھی دھاک جم گئی۔ شام کو داروغہ جی دفتر سے لوٹے تو پنڈت جی شان سے مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ اور پڑوس کے کئی آدمی انہیں گھیرے کھڑے تھے۔ داروغہ نے کرسی پر لیٹ کر کہا۔ یہ عہدہ تو اتنا اونچا نہیں اور نہ مشاہرہ ہی کچھ ایسا زیادہ ملتا ہے۔ مگر کام اتنی ذمہ داری کا ہے کہ معتبر اشخاص کو ہی دیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے آدمی کسی نہ کسی جرم کے لئے سزا پا کر آتے ہیں۔ اگر چاہوں تو ان کے گھر والوں سے ایک ایک ملاقات کے لئے ہزاروں روپے وصول کر لوں۔ لیکن اپنا یہ وتیرہ نہیں ہے۔ جو سرکار سے ملتا ہے اسی کو بہت سمجھتا ہوں کسی بزدل شخص کا تو یہاں گھڑی بھر بھی نباہ نہ ہو۔ ایک سے ایک خونی ڈکیت بدمعاش آتے رہتے ہیں۔ جن کے

ہزاروں مددگار ہوتے ہیں۔ چاہیں تو دن دہاڑے جیل کو لڑوا دیں مگر میں ایسے ڈھنگ سے ان پر رعب جماتا ہوں کہ بدنامی بھی نہ ہو اور نقصان بھی نہ اٹھانا پڑے۔ اب آج ہی کل دیکھئے۔ کاشی کے کروڑپتی راجہ ہیں مہاراجہ بھرت سنگھ۔ اُن کا لڑکا بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے۔ حکام تک اس کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بڑے صاحب کی میم صاحبہ دن میں دو دو بار اس کی مزاج پرسی کے لئے تشریف لاتی ہیں اور سردار نیلکنٹھ راؤ بھی برابر خطوط کے ذریعہ اس کے حالات خیر و عافیت دریافت کرتے رہتے ہیں۔ چاہوں تو مہاراجہ بھرت سنگھ سے ایک ملاقات کے لئے لاکھوں روپے اینٹھ لوں۔ مگر یہ اپنا شعار نہیں۔

نائیک رام۔ اچھا کیا راجہ بھرت سنگھ کا لڑکا یہیں قید ہے؟

داروغہ۔ اور یہاں سرکار کو کس پر اتنا اعتبار ہے؟

نائیک رام۔ آپ جیسے مہاتماؤں کے درشن دُرلبھ ہیں۔ مگر بُرا نہ مانئے تو کہوں۔ بال بچوں کا بھی دھیان رکھنا چاہئے۔ آدمی گھر سے چار پیسے کمانے ہی کے لئے نکلتا ہے۔

داروغہ۔ ارے تو کیا کوئی قسم کھائی ہے پر کسی کا گلا نہیں دباتا۔ چلئے آپ کو جیل خانہ کی سیر کرا دوں۔ بڑی صاف ستھری جگہ ہے میرے یہاں تو جو کوئی مہمان آتا ہے اس کو وہیں ٹھہرا دیتا ہوں۔ جیل کے داروغہ کی دوستی سے جیل کی ہوا کھانے کے سوا اور کیا ملے گا؟

یہ کہہ کر داروغہ جی مسکرائے۔ وہ نائیک رام کو کسی حیلہ سے ٹالنا چاہتے تھے۔ لوکر بھاگ گیا تھا۔ قیدیوں اور چپڑاسیوں سے کام لینے کا موقعہ نہیں تھا۔ انہوں نے سوچا۔ اپنے ہاتھ چلم بھرنی پڑے گی۔ بستر بچھانا پڑے گا۔ پانی لانا پڑے گا۔ عزت میں بٹہ لگے گا۔ گھر کا پردہ فاش ہو جائے گا۔ انہیں وہاں ٹھہرا دوں گا۔ کھانا بھجوا دوں گا۔ بہروپ ڈھکا

وہ جائے گا۔

نائیک رام۔ کون جانے کبھی آپ کی سیوا (خدمت) میں آنا ہی پڑے۔ پہلے سے ٹھوکر کھانا دیکھ لوں۔ مہاراجہ صاحب کے لڑکے نے کون سا قصور کیا تھا؟

داروغہ۔ قصور کچھ نہیں تھا۔ بس حاکموں کی ضد ہے۔ یہاں دیہاتوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کو سمجھاتا پھرتا تھا۔ بعض حاکموں کو اس پر شبہ ہو گیا کہ یہ بغاوت پھیلا رہا ہے۔ یہاں لا کر قید کر دیا۔ مگر آپ تو ابھی اُسے دیکھئے ہی گا۔ ایسا صبر و شاکر اور خلیق شخص آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ ہاں وہ کسی سے دبتا نہیں۔ خوشامد کرکے چاہے کوئی پانی بھرا لے مگر چاہو کہ رعب سے اُس کو دبا لیں۔ تو پھر جو بھر بھی نہ دبے گا۔

نائیک رام دل میں خوش تھے کہ بڑی اچھی ساعت گھر سے چلا تھا کہ بھگوان آپ ہی سب دروازے کھولے دیتے ہیں۔ دیکھوں اب دنے سنگھ سے کیا بات ہوتی ہے۔ یوں تو وہ نہ جائیں گے۔ پھر رانی جی کی بیماری کا بہانہ کرنا پڑے گا۔ وہ راضی ہو جائے۔ پھر تو یہاں سے نکال لے جانا میرا کام ہے۔ بھگوان کی دیا ہو جاتی تو میری مراد پوری ہو جاتی۔ گھر بس جاتا۔ زندگی سپھل ہو جاتی۔

## (۲۸)

صوفیا کے چلے جانے پر دنے کے دل میں طرح طرح کے اندیشے پیدا ہونے لگے۔ نفس ایک بزدل دشمن ہے جو ہمیشہ پس پشت وار کرتا ہے۔ جب تک صوفیا سامنے بیٹھی تھی۔ اُسے سامنے آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صوفیا کے پیٹھ پھیرتے ہی اُس نے خم ٹھوکنا شروع کر دیا۔ "نہ جانے میری باتوں کا صوفیا پر کیا اثر ہوا۔ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھ گئی

کہ میں نے زندگی بھر کے لئے قومی خدمت کا عہد کر لیا ہے۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ اُسے ماتا جی کی ناراضگی کا خوف دلانے لگا۔ جیسے بھولے بھالے بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر بات پر ماں سے کہہ دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ جب وہ میرے لئے اتنی قربانیاں کر رہی ہے۔ یہاں تک کہ مذہب جیسی پاک شے کو ترک کر دینے سے بھی اُس کو عار نہیں۔ تو اس کے سامنے قومی خدمت اور فرض ادائی کا ڈھونگ رچنا بالکل خلاف قاعدہ ہے۔ مجھے وہ اپنے دل میں کتنا بیدرد۔ کتنا کم ہمت۔ کتنا بے انس سمجھ رہی ہوگی۔ مانا کہ دوسروں کے مفاد کی کوشش کرنا معیارِ زندگی ہے۔ لیکن ذاتی مفاد کا خیال بھی تو یک دم قابلِ ترک نہیں۔ بڑے سے بڑا قومی خادم بھی ذاتی مفاد کی طرف جھکتا ہے۔ اس مفاد کا صرف ایک جزو ترک کر دینا قوم پرستی کے لئے کافی ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے۔ آہ میں نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری۔ وہ کتنی مغرور ہے۔ پھر بھی اُس نے میرے لئے کیا کیا ذلتیں برداشت نہیں کیں۔ میری ماں نے اسے جتنا ذلیل کیا اتنا شدید اس کی ماں نے کیا ہوتا تو وہ اس کا مُنہ نہ دیکھتی مجھے آخر سوجھی کیا بے شک میں اس کے قابل نہیں ہوں۔ اس کی جذباتی رفعت مجھے خائف کرتی ہے۔ مگر میری عقیدت میری کمزوریوں کی تلافی نہیں کر سکتی؟ جہانگیر ہمدیا نفس پرست اور کم فہم شخص اگر نورجہاں کو خوش رکھ سکتا ہے تو میں اپنی بے نفسی اپنی محبت سے اُسے آسودہ نہیں کر سکتا؟ کہیں وہ میری اُداسی سے ناخوش ہو کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے مُنہ نہ پھیر لے۔ اگر میری قوم پرستی اور ماں کی فرمانبرداری اور پس و پیش کا یہ انجام ہوا تو یہ زندگی ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔

آہ کتنا بے نظیر حُسن ہے! اعلیٰ تعلیم و تخیل سے چہرہ پر کیسی متانت آگئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی دیوی جنت سے اُتر آئی ہے۔

گویا ظاہری دنیا سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ بلکہ وہ صرف باطنی دُنیا میں چلتی پھرتی ہے۔ پاکیزہ خیالی قدرتی حسن کو کتنا دلفریب بنا دیتی ہے۔ وہی حسن کا اصلی سنگار ہے۔ پوشاکوں اور زیوروں سے تو اس کی قدرتی رونق ہی زائل ہو جاتی ہے۔ وہ مصنوعی اور خواہش انگیز ہو جاتی ہے۔

(بے ڈھنگی) کا لفظ ہی اس مفہوم کو خوب ادا کرتا ہے۔ قہقہہ اور تبسم میں جو فرق ہے۔ دھوپ اور چاندنی میں جو فرق ہے۔ موسیقی اور نثر میں جو فرق ہے۔ وہی فرق مرصع اور مہذب حسن میں ہے۔ اس کا تبسم کتنا دلآویز ہے۔ جیسے بسنت کی ٹھنڈی ہوا یا کسی شاعر کا اچھوتا خیال۔ یہاں کسی حسینہ سے باتیں کرنے لگو تو طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ یا تو شین قاف درست نہیں یا تذکیر و تانیث کا خیال نہیں۔ صرف یہ کہ عہد قاعدہ یا اصول سے انحراف کرنا قابل عفو ہی نہیں بلکہ زینت بخش بھی ہے۔ یہ میرے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اس کے بغیر میری زندگی ایک سوکھے پیڑ کی طرح ہوگی جس کو لگاتار بارش بھی سرسبز نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کا مقصد اور مفہوم ہی باقی نہ رہے گا۔ زندگی رہے گی مگر محبت اور خوشی اور مقصد سے خالی!

وہ اسی قسم کے خیالات میں غرق تھا کہ داروغہ جی آکر بیٹھ گئے اور بولے "معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ بلا سر سے جلد ہی ٹلے گی۔ ایجنٹ صاحب یہاں سے کوچ کرنے والے ہیں۔ سردار صاحب نے شہر میں منادی کروادی ہے کہ اب کسی کو بستی چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے معلوم ہوتا ہے۔ میم صاحب نے یہ حکم دیا ہے۔"

دنے۔ میم صاحب بہت دُور اندیش ہیں۔

داروغہ۔ یہ نہایت اچھا ہوا۔ ورنہ فساد ضرور ہو جاتا اور سینکڑوں جانیں تلف ہوتیں۔ جیسا تم نے کہا۔ میم صاحب نہایت دور اندیش ہیں۔

الانکہ عمر ابھی کچھ نہیں ہے۔

وِلنے۔ آپ کو خوب معلوم ہے کہ وہ کل یہاں سے چلی جائیں گی۔

داروغہ۔ ہاں اور کیا۔ سُنی بات کہتا ہوں۔ حکام کی باتوں کی گھنٹہ گھنٹہ بھر میں خبر ملتی رہتی ہے۔ رسد اور بیگار جو ایک ہفتہ کے لئے جانے والا تھی بند کر دی گئی ہے۔

وِلنے۔ یہاں پھر آئیں گی؟

داروغہ۔ تم تو اتنے بیقرار ہو گیا اُن پر عاشق ہو۔

وِلنے نے شرمندہ ہو کر کہا "مجھ سے انہوں نے کہا تھا کہ میں تمہیں دیکھنے آؤں گی۔"

داروغہ۔ کیا ہوگا۔ پر اب تو ان کی تیاری ہے۔ یہاں تو خوش ہیں۔ کہ بے داغ بچ گئے ورنہ اور سب جگہ حلیلیوں پر جُرمانے ہوئے ہیں۔

داروغہ تو چلے گئے تو وِلنے سوچنے لگے:۔ "صوفیا نے کل آنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیا اپنا وعدہ بھول گئی؟ اب نہ آئے گی؟ اگر ایک بار آ جاتی تو میں اس کے قدموں پر گر کر کہتا۔ صوفیا۔ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں۔ دیوی اپنی پرستش کرنے والے سے اس لئے تو ناراض نہیں ہوتی کہ وہ اس کے چرنوں کو چھوتے ہوئے کبھی جھجکتا ہے؟ یہ تو پوجنے والے کی ناعقیدت مندی کا نہیں بلکہ عین عقیدت مندی کا ثبوت ہے۔"

جوں جوں دن گزرتا تھا وِلنے کی بیتابی بڑھتی جاتی تھی مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے؟ اس نے سوچا۔ رات کو یہاں سے کسی طرح بھاگ کر صوفیا کے پاس جا پہنچوں۔ وائے قسمت کہ وہ میری رہائی کا حکم نامہ تک لے کر آئی تھی۔ اس وقت میرے سر پر نہ جانے کون سا شیطان سوار ہوا تھا۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے دفتر کے سامنے ٹہل رہا تھا۔ دفعتاً اسے خیال آیا۔ کیوں نہ پھر بیہوشی کا بہانہ کر کے گر پڑوں؟ یہاں سب لوگ پریشان ہو جائیں گے اور صوفیا کو میری خبر ضرور مل جائے گی۔ اگر اس کی موٹر تیار ہوگی۔ تو بھی وہ ایک بار مجھے دیکھنے ضرور آجائے گی۔ مگر مجھے تو سوانگ بھرنا بھی نہیں آتا۔ اپنے اوپر خود ہی ہنسی آجائے گی۔ کہیں ہنسی رُک نہ سکی تو خفت اٹھانی پڑے گی۔ لوگ سمجھ جائیں گے بناوٹ ہے۔ کاش اس قدر موسلا دھار بارش ہونے لگتی کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکتی۔ مگر شاید بارش کے دیوتا اندر کو بھی مجھ سے دشمنی ہے۔ آسمان پر بادل کا کہیں نام و نشان نہیں۔ گویا کسی قاتل کا بے رحم دل ہو۔ کلارک ہی کو کچھ ہو جاتا تو آج اس کا جانا رُک جاتا۔

جب اندھیرا ہو گیا تو اسے صوفیا پر غصہ آنے لگا۔ جب آج ہی اس کو یہاں سے چلا جانا تھا۔ تو اس نے مجھ سے کل آنے کا وعدہ ہی کیوں کیا؟ مجھ سے دیدہ دانستہ جھوٹ کیوں کہا؟ کیا اب کبھی ملاقات ہی نہ ہوگی۔ جبھی پوچھوں گا۔ اسے خود ہی سمجھ جانا چاہئے تھا کہ یہ اس وقت پریشان ہے۔ اس سے میرے دل کی حالت مخفی نہیں ہے۔ وہ اس کشمکش سے بخوبی واقف ہے جس میں مبتلا ہوں۔ ایک طرف محبت و عقیدت ہے تو دوسری طرف اپنا عہدہ اور ناخوشی کا خوف اور بدنامی کا خیال۔ اس قدر مختلف جذبات کے یکجا ہونے پر اگر کوئی بے معنی گفتگو کرنے لگے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے۔ اس کو اس حالت میں مجھ سے ناخوش ہونا چاہئے تھا۔ بلکہ اپنی محبت آمیز ہمدردی سے میرے دل کی آگ کو فرو کرنا چاہئے تھا۔ اگر اس کی یہی مرضی ہے کہ میں اسی حالت میں گھل گھل کر مر جاؤں۔ تو یہی سہی۔ یہ دل کی جلن

زندگی کے ساتھ ہی مٹ جائے گی۔ آہ۔ یہ دو دن کتنے خوشی کے دن تھے! رات ہو رہی ہے۔ پھر اسی تاریک اور گندی کوٹھڑی میں بند کیا جاؤں گا۔ کون پوچھے گا کہ مرتے ہو یا جیتے۔ اس تاریکی میں چراغ کی روشنی نظر بھی آئی تو جب تک میں وہاں پہنچوں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

اتنے میں داروغہ پھر آئے۔ مگر اب کے وہ تنہا نہ تھے۔ ان کے ساتھ ایک پنڈت جی بھی تھے۔ ونے سنگھ کو خیال آیا کہ میں نے ان پنڈت جی کو کہیں دیکھا ہے مگر یاد نہ آتا تھا کہ کہاں۔ داروغہ جی دیر تک کھڑے پنڈت جی سے باتیں کرتے رہے۔ ونے سے کوئی نہ بولا۔ پس اس نے سمجھا کہ مجھے دھوکا ہوا ہے۔ کوئی اور آدمی ہوگا۔

رات کو سب قیدی کھا پی کر لیٹے۔ چاروں طرف کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ونے کانپ رہا تھا کہ مجھے بھی اپنی کوٹھڑی میں جانا پڑے گا۔ مگر نہ جانے کیوں اس کو وہیں پڑا رہنے دیا گیا۔"

روشنی گل کر دی گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ ونے اسی حالت اضطراب میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ کیسے یہاں سے نکلوں۔ جانتا تھا کہ چاروں طرف کے دروازے بند ہیں۔ نہ رسی ہے نہ کوئی اوزار۔ نہ کوئی رفیق نہ مددگار۔ تاہم وہ منتظر سا دروازہ پر کھڑا تھا کہ شاید کوئی تدبیر سوجھ جائے۔ مایوسی میں انتظار اندھے کی لاٹھی کا کام دیتا ہے۔

دفعتاً سامنے سے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ ونے نے سمجھا۔ کوئی چوکی دار ہوگا۔ وہ ڈر گیا کہ مجھے یہاں کھڑا دیکھ کر کہیں اس کے دل میں کوئی شبہ نہ پیدا ہو جائے۔ آہستہ کمرہ کی طرف چلا۔ اتنا بزدل وہ کبھی نہ ہوا تھا۔ توپ کے سامنے کھڑا ہوا سپاہی بھی بچھو کو دیکھ کر خائف ہو جاتا ہے۔

16833

وہ کمرہ میں داخل ہوا ہی تھا کہ پیچھے سے وہ آدمی بھی اندر آپہنچا۔ رونے نے چونک کر پوچھا۔ "تم کون؟"

نائیک رام بولے:۔ آپ کا غلام ہوں نائیک رام پنڈا۔

رونے۔ تم یہاں کہاں؟ اب یاد آیا۔ آج تمہیں تو داروغہ کے ساتھ پگڑی باندھے کھڑے تھے۔ ایسی صورت بنالی تھی کہ پہچانے ہی نہ جاتے تھے۔ تم یہاں کیسے آگئے؟

نائیک رام۔ آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔

رونے۔ جھوٹے ہو۔ یہاں کوئی مجھانی ہے کیا؟

نائیک رام۔ مجھان کیسے۔ یہاں تو مالک ہی ہیں۔

رونے۔ کب آئے کب؟ وہاں تو سب خیریت ہے؟

نائیک رام۔ ہاں سب خیریت ہی ہے۔ کنور صاحب نے جب سے آپ کا حال سنا ہے۔ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ رانی جی بھی بیمار ہیں۔

رونے۔ اماں جی کب سے بیمار ہیں؟

نائیک رام۔ کوئی ایک مہینہ ہونے آتا ہے۔ بس گھلی جاتی ہیں۔ نہ کچھ کھاتی ہیں نہ پیتی ہیں۔ نہ کسی سے کچھ بولتی ہیں۔ نہ جانے کون روگ ہے۔ کہ کسی بید حکیم ڈاکٹر کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ دور دور سے ڈاکٹر بلائے گئے ہیں پر روگ کی تھاہ نہیں ملتی۔ کوئی کچھ بتاتا ہے۔ کوئی کچھ۔ کلکتہ سے کوئی کبیراج آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ بچ نہیں سکتیں۔ ایسی گھل گئی ہیں کہ دیکھتے ہی ڈر لگتا ہے مجھے دیکھا تو دھیرے سے بولیں۔ "پنڈا جی اب ڈیرا کوچ ہے۔" میں کھڑا کھڑا روتا رہا۔

رونے نے سسکتے ہوئے کہا۔ "ہائے ایشور۔ مجھے ماں کے چرنوں

کے درشن بھی نہ ہوں گے کیا؟"

نائک رام۔ میں نے جب بہت پوچھا۔ سرکار کسی کو دیکھنا چاہتی ہو تو آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ "ایک بار رونے کو دیکھنا چاہتی ہوں پر بھاگ میں دیکھنا بدا نہیں ہے۔ نہ جانے اُس کا کیا حال ہوگا؟"

دنے اتنا روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ جب ذرا آواز قابو میں ہوئی تو بولے۔ "اماں جی کو کبھی کسی نے روتے نہیں دیکھا تھا۔ اب پریشان ہوں۔ کیسے ان کے درشن ہوں گے؟ بھگوان نہ جانے کن پاپوں کی یہ سزا مجھے دے رہے ہیں۔"

نائک رام۔ میں نے پوچھا کہ حکم ہو تو جاکر انہیں لاؤں۔ اتنا سُننا تھا کہ وہ جلدی سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ "تم اسے لوا لاؤ گے؟ نہیں وہ نہ آئے گا۔ وہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے۔ کبھی نہ آئے گا۔ اُسے ساتھ لاؤ تو تمہارا بڑا احسان ہوگا۔" اتنا سنتے ہی میں وہاں سے چل کھڑا ہوا۔ اب دیر نہ کیجئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماتا کی خواہش دل کی دل ہی میں رہ جائے اور آپ کو جنم بھر پچھتانا پڑے۔

دنے۔ کیسے چلوں گا؟

نائک رام۔ اس کی چنتا مت کیجئے۔ لے تو میں چلوں گا۔ جب یہاں تک آگیا تو یہاں سے نکلنا کیا مشکل ہے۔

دنے۔ کچھ سوچ کر بولے۔ پنڈا جی میں تو چلنے کے لئے تیار ہوں پر اندیشہ یہی ہے کہ کہیں اماں جی ناراض نہ ہو جائیں۔ تم تو اُن کے سوبھاؤ کو نہیں جانتے۔"

نائک رام۔ بھیا۔ اس کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ انہوں نے تو کہا ہے کہ جیسے بنے ویسے لاؤ۔ انہوں نے تو کہا کہ ناتھی (معافی) بھی

مانگنی پڑے تو اس وقت مانگ لینی چاہیئے۔

ونے۔ تو چلو کیسے چلتے ہو؟

نایک رام۔ دیوال پھاند کر نکل جائیں گے۔ یہ کون مشکل ہے۔

ونے سنگھ کو خیال ہوا کہ کہیں کسی کی نگاہ پڑ جائے تو صوفیا اس بات کو سن کر کہے گی۔ سارے حکام مجھ پر تالیاں پیٹیں گے۔ صوفیا سوچے گی کہ بڑے سچے بنتے تھے۔ اب وہ سچائی کہاں گئی؟ کسی طرح صوفیا کو یہ خبر دی جا سکتی تو وہ ضرور حکم نامہ بھیج دیتی۔ پر یہ بات نایک رام سے کیسے کہوں؟ بولے۔ پکڑے گئے تو؟"

نایک رام۔ پکڑے گئے تو۔ پکڑے گا کون؟ کہیں کچی گولی نہیں کھیلے ہیں۔ سب آدمیوں کو پہلے ہی سے گانٹھ رکھا ہے۔

ونے۔ خوب سوچ لو۔ پکڑے گئے تو پھر کسی طرح چھٹکارا نہ ہوگا۔

نایک رام۔ پکڑے جانے کا تو نام ہی نہ لو۔ یہ دیکھو۔ سامنے کئی اینٹیں دیوال سے ملا کر رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے پہلے ہی سے وہ انتظام کر لیا ہے۔ میں اینٹوں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ آپ میرے کندھے پر چڑھ کر اس رسّی کو لئے ہوئے دیوال پر چڑھ جائے گا۔ رسّی اُس طرف پھینک دیجئے گا۔ میں اِسے اِدھر مضبوط پکڑے رہوں گا۔ آپ اُدھر دھیرے سے اتر جائیے گا۔ پھر وہاں آپ رسّی کو مضبوط پکڑے رہیئے گا۔ میں بھی ادھر سے چلا آؤں گا۔ رسّی بڑی مضبوط ہے۔ ٹوٹ نہیں سکتی۔ مگر ہاں چھوڑ نہ دیجئے گا۔ نہیں تو میری ہڈی پسلی ٹوٹ جائے گی۔

یہ کہہ کر نایک رام رسّی کا بلندہ لئے ہوئے اینٹوں کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ ونے بھی آہستہ آہستہ چلے۔ دفعتاً کسی چیز

کھٹکنے کی آواز آئی۔ ونے نے چونک کر کہا۔ بھائی میں نہ جاؤں گا۔ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ ماتا جی کے درشن کرنا مجھے بدا نہیں ہے۔

نایک رام۔ تو اسی جیوٹ پر چلے تھے سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنے۔ خطرہ کے وقت حفظ ماتقدم کا خیال جاتا رہتا ہے۔

ونے۔ تم مجھے ضرور پھنساؤ گے۔

نایک رام۔ مرد ہو کر پھنسنے سے اتنا ڈرتے ہو؟ پھنس ہی گئے تو کون چوڑیاں میلی ہو جائیں گی۔ دشمن کی قید سے بھاگنے میں لاج نہیں جاتی۔ یہ کہہ کر وہ اینٹوں پر کھڑا ہو گیا اور ونے سے بولا۔ میرے کندھے پر آ جاؤ۔

ونے۔ کہیں تم گر پڑے تو؟

نایک رام۔ تمہارے جیسے پانچ سوار ہو جائیں تو لے کر دوڑوں۔ دھرم کی کمائی میں بل ہوتا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے ونے کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے کندھے پر ایسی آسانی سے اٹھا لیا گویا کوئی بچہ ہے۔

ونے۔ کوئی آ رہا ہے۔

نایک رام۔ آنے دو۔ یہ رسی کمر میں باندھ لو اور دیوار پکڑ کر چڑھ جاؤ۔

اب ونے نے ہمت مضبوط کی یہی فیصلہ کن موقع تھا۔ صرف ایک جست کی ضرورت تھی۔ اوپر پہنچ گئے۔ تو بیڑا پار ہے۔ نہ پہنچ سکے۔ تو ذلت۔ بدنامی۔ سزا سب کچھ ہے۔ اوپر بہشت ہے۔ نیچے دوزخ۔ اوپر نجات ہے۔ نیچے قید۔ دیوار پر چڑھنے میں ہاتھوں کے سوا اور کسی چیز سے مدد نہ مل سکتی تھی۔ کمزور ہونے پر بھی فطرتاً مضبوط آدمی تھے۔ چھلانگ ماری اور بیڑا پار ہو گیا۔ دیوار پر جا پہنچے اور

رسی پکڑ کر نیچے اُتر پڑے۔ بدقسمتی سے پیچھے ہی دیوار سے ملی ہوئی گہری خندق تھی۔ جس میں برساتی پانی بھرا ہوا تھا۔ ونے نے جیوں ہی رسی چھوڑ دی۔ گردن تک پانی میں ڈوب گئے اور پھر بڑی مشکل سے باہر نکلے۔ پھر رسی پکڑ کر نایک رام کو اشارہ کیا۔ وہ مشتاق کھلاڑی تھا۔ دم زدن میں نیچے آ پہنچا۔ ایسا معلوم ہُوا۔ کہ وہ دیوار ہی پر بیٹھا تھا اور صرف اُترنے کی دیر تھی۔

ونے۔ دیکھنا کھائی ہے۔

نایک رام۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ تم سے بتانے کی یاد ہی نہ رہی۔

ونے۔ تم اس کام میں ہوشیار ہو۔ میں کبھی نہ نکل سکتا۔ اب کدھر چلو گے؟

نایک رام۔ سب سے پہلے تو دیبی کے مندر میں چلوں گا اور وہاں سے پھر موٹر میں بیٹھ کر اسٹیشن کو۔ ایشور نے چاہا تو آج کے تیسرے دن گھر پہنچ جائیں گے۔ دیبی کی مدد نہ ہوتی تو اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے یہ کام نہ ہوتا۔ انہیں نے یہ سنکٹ ہرا ہے۔ ان پر اپنا خون چڑھاؤں گا۔

اب دونوں آزاد تھے۔ ونے کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ میرے پیر خود بخود اُٹھے جاتے ہیں۔ وہ اتنے ہلکے ہو گئے تھے۔ ذرا دیر میں دونوں سڑک پر آ گئے۔

ونے۔ صبح ہوتے ہی دوڑ دھوپ شروع ہو جائے گی۔

نایک رام۔ تب تک ہم لوگ یہاں سے سو کوس پر ہوں گے۔

ونے۔ گھر سے بھی تو وارنٹ کے ذریعہ پکڑ منگا سکتے ہیں۔

نایک رام۔ وہاں کی چنتا مت کرو۔ وہ اپنا راج ہے۔

آج سڑک پر بڑی ہل چل تھی۔ سینکڑوں آدمی لالٹینیں لئے بستی سے چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔ ایک غول ادھر سے آتا تھا۔ دوسرا اُدھر سے۔ عموماً لوگوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ ونے سنگھ کو حیرت ہوئی کہ آج یہ بھیڑ کیسی۔ عوام پر وہ سکون نما پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ جو کسی خوف ناک جوش کا پتہ دیتی ہے۔ لیکن وہ کسی سے کچھ پوچھ نہ سکتے تھے کہ پہچان نہ لئے جائیں۔

نائیک رام۔ دیبی کے مندر تک تو پیدل ہی چلنا پڑے گا۔

ونے۔ پہلے ان آدمیوں سے تو پوچھو۔ کہاں دوڑے جا رہے ہیں؟ مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہو۔

نائیک رام۔ ہو گی ہمیں ان باتوں سے کیا مطلب۔ چلو اپنی راہ چلیں۔

ونے۔ نہیں نہیں۔ ذرا پوچھو تو کیا بات ہے۔

نائیک رام نے ایک آدمی سے پوچھا۔ معلوم ہوا کہ نو بجے کے وقت ایجنٹ صاحب اپنی میم کے ساتھ موٹر پر بیٹھے ہوئے بازار کی طرف سے نکلے۔ موٹر بڑی تیزی سے جا رہا تھا۔ چوراہے پر پہنچا تو ایک آدمی جو بائیں طرف سے آتا تھا موٹر کے نیچے آگیا۔ صاحب نے آدمی کو دبتے ہوئے دیکھا مگر موٹر کو نہ روکا۔ یہاں تک کہ کئی آدمی موٹر کے پیچھے دوڑے۔ بازار کے اس سرے تک آتے آتے موٹر کو بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا۔ صاحب نے آدمیوں کو ڈانٹا کہ ابھی ہٹ جاؤ۔ جب لوگ نہ ہٹے تو انہوں نے پستول داغ دی۔ ایک آدمی فوراً گر پڑا۔ اب لوگ غصہ سے پاگل ہو کر صاحب کے بنگلہ کی طرف جا رہے تھے۔

ونے نے پوچھا۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟

ایک آدمی۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ہو جائے گا۔ یہی ہو گا نہ۔ مارے جائیں گے۔ مارے تو یونہی جا رہے ہیں۔ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ دس پانچ آدمی مر گئے تو کون سنسار سُونا ہو جائے گا۔

ونے کے ہوش اڑ گئے۔ یقین ہو گیا۔ کہ آج کوئی فساد ضرور برپا ہو گا۔ بگڑی ہوئی رعایا وہ پانی کا سیلاب ہے۔ جو کسی کے رُکے نہیں رُک سکتا۔ یہ لوگ جھلائے ہوئے ہیں۔ اس حالت میں ان سے صبر و عفو کی باتیں کرنا فضول ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ بنگلہ کو گھیر لیں۔ صوفیا بھی وہیں ہے کہیں اس پر حملہ نہ کر بیٹھیں۔ غصہ میں شرافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ نایک رام سے بولے۔ پنڈا جی۔ ذرا بنگلہ تک ہوتے چلیں۔

نایک رام۔ کس کے بنگلے تک؟

ونے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کے۔

نایک رام۔ اُن کے بنگلہ پر جا کر کیا کیجئے گا؟ کیا ابھی تک پرالپکار سے جی نہیں بھرا۔ یہ جانیں وہ جانیں۔ ہم سے آپ سے مطلب؟

ونے۔ نہیں موقع نازک ہے۔ وہاں جانا ضروری ہے۔

نایک رام۔ نایک اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو۔ وہاں کچھ دنگا ہو جائے تو؟ آخر مرد ہیں۔ چپ چاپ کھڑے منہ تو دیکھتے نہ رہیں گے۔ دو چار ہاتھ اِدھر یا اُدھر چلا ہی دیں گے۔ بس دھر پکڑ ہو جائے گی۔ اس سے کیا فائدہ؟

ونے۔ کچھ ہی ہو۔ میں یہاں یہ ہنگامہ ہوتے دیکھ کر اسٹیشن نہیں جا سکتا۔

نایک رام۔ رانی جی پل پل بھر میں پوچھتی ہوں گی۔

ونے۔ تو یہاں ہمیں کون دو چار دن لگ جاتے ہیں۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔

نایک رام۔ جب تمہیں کوئی ڈر نہیں ہے۔ تو یہاں کون رونے والا بیٹھا ہُوا ہے؟ میں آگے آگے چلتا ہوں۔ دیکھنا میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔ یہ تم لے لو۔ جوکھم کا معاملہ ہے۔ میرے لئے یہ لکڑی کافی ہے۔

یہ کہہ کر نایک رام نے ایک دونلی پستول کمر سے نکال کر دونے کے ہاتھ میں رکھ دی۔ دونے پستول لئے ہوئے آگے بڑھے۔ جب شاہی محل کے نزدیک پہنچے تو اتنی بھیڑ دیکھی کہ ایک ایک قدم چلنا مشکل ہو گیا اور محل سے ایک گولی کے فاصلہ پر تو انہیں مجبور ہو کر رُک جانا پڑا۔ سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ محل کے سامنے ایک برقی لالٹین جل رہی تھی۔ اور اس کی صاف روشنی میں ہلنا چلنا۔ رُکنا ٹھٹھکنا ہُوا لوگوں کا ہجوم اس طرح محل کی طرف جا رہا تھا گویا اُسے نگل جائے گا۔ محل کے سامنے اس ہجوم کو روکنے کے لئے وردی پوش سپاہیوں کی ایک قطار سنگین چڑھائے ہوئے خاموش کھڑی تھی اور اونچے چبوترہ پر کھڑی ہوئی صوفیا کچھ کہہ رہی تھی مگر اس شور و غل میں اُس کی آواز کچھ سُنائی نہ دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دیوی کی مورت ہے۔ جو صرف اشاروں سے کچھ کہہ رہی ہے۔

دفعتاً صوفیا نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ صوفیا نے اونچی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں آخری مرتبہ تم لوگوں کو جتائے دیتی ہوں کہ یہاں سے چپ چاپ چلے جاؤ۔ ورنہ سپاہیوں کو مجبور ہو کر گولیاں چلانی پڑیں گی۔ ایک لمحہ میں یہ میدان صاف ہونا چاہئے۔"

**بیر پال سنگھ** نے آگے کہا۔ "رعایا اس قسم کی بدعتیں اب نہیں برداشت کر سکتی۔"

**صوفیا**۔ اگر لوگ دیکھ بھال کر راستہ میں چلیں۔ تو ایسے واقع

کیوں ہوں؟

**بیر پال سنگھ۔** موٹر والوں کے لئے بھی کوئی قانون ہے یا نہیں؟

**صوفیا۔** ان کے لئے قانون بنانا تمہارے اختیار میں نہیں ہے۔

**بیر پال سنگھ۔** ہم قانون بنا نہیں سکتے مگر اپنی جانوں کی حفاظت تو کر سکتے ہیں۔

**صوفیا۔** تم بغاوت پر آمادہ ہو اور تم خود اس کے بُرے نتائج کے ذمہ دار ہو گے۔

**بیر پال سنگھ۔** ہم باغی نہیں ہیں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا ایک بھائی کسی موٹر کے نیچے دب جائے چاہے وہ موٹر مہاراناہی کا کیوں نہ ہو اور ہم منہ نہ کھولیں۔

**صوفیا۔** وہ محض اتفاق تھا۔

**بیر پال سنگھ۔** احتیاط اُس اتفاقی حادثہ کو ٹال سکتی تھی۔ اب ہم اُس وقت تک یہاں سے نہ جائیں گے۔ جب تک ہم سے وعدہ نہ کیا جائے گا کہ آئندہ ایسے ناگوار واقعات کے لئے مجرم کو مناسب سزا دی جائے گی چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

**صوفیا۔** اتفاقیہ باتوں کے لئے کوئی وعدہ نہیں کیا جا سکتا لیکن...

صوفیا کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ کسی نے ایک پتھر اس کی طرف پھینکا جو اُس کے سر میں اتنے زور سے لگا کہ وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اگر وہ فوراً کسی بلند مقام پر کھڑے ہو کر عوام کو سمجھاتے تو شاید فساد نہ ہوتا اور لوگ چپ چاپ اپنے اپنے گھر چلے جاتے۔ صوفیا کا زخمی ہو جانا عوام کا غصہ فرو کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر جو پتھر صوفیا کے سر میں لگا۔ وہی کئی گنا زور کے ساتھ وہ کے سینہ

پر دل پر لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جامہ سے باہر ہو گیا۔ مجمع کو زبردستی ہٹاتا آدمیوں کو دھکے دیتا کچلتا ہوا صوفیا کی بغل میں جا پہنچا۔ پستول کمر سے نکالا اور بیر پال سنگھ پر گولی چلا دی۔ پھر کیا تھا۔ سپاہیوں کو گویا حکم مل گیا۔ انہوں نے بندوقیں سر کرنی شروع کر دیں۔ کہرام مچ گیا۔ لیکن پھر بھی لوگ کئی منٹ تک وہیں کھڑے گولیوں کا جواب اینٹ پتھر سے دیتے رہے۔ دو چار بندوقیں ادھر سے بھی چلیں۔ بیر پال سنگھ بال بال بچ گیا اور رونے کے نزدیک ہونے کے سبب انہیں پہچان کر بولا ۔ آپ بھی انہیں میں ہیں!

رونے۔ قاتل!

بیر پال سنگھ۔ یہ ماتا ہم سے روٹھ گیا ہے۔

رونے۔ تمہیں ایک عورت پہ ہاتھ اٹھاتے شرم نہیں آتی؟

چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں ۔ رونے سنگھ ہیں۔ یہ کہاں سے آ گئے؟ یہ بھی اُدھر مل گئے۔ انہیں نے تو پستول چھوڑی ہے۔

"بنا ہوا تھا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈاہ"۔

"شاید شرط پر چھوڑے گئے ہیں"۔

"دولت کی ہوس سر پر سوار ہے"۔

"مار دو ایک ہتھڑ۔ سر پھٹ جائے۔ یہ بھی ہمارا دشمن ہے"۔

"دغاباز ہے"۔

"اتنا بڑا آدمی اور تھوڑے سے روپوں کے لئے ایمان بیچ بیٹھا"۔

بندوقوں کی باڑھ کے سامنے بھلا لوگ کب تک ٹھہرتے۔ جب اپنی طرف کئی آدمی لگاتار گرے تو بھگدڑ پڑ گئی۔ کوئی اِدھر بھاگا۔ کوئی اُدھر۔ مگر بیر پال سنگھ اور اس کے ساتھی پانچوں سوار جن کے پاس

بندوقیں تھیں۔ محل کے پیچھے کی طرف سے ونے سنگھ کے سر پر جا پہنچے۔ تاریکی میں کسی کی نگاہ ان پر نہ پڑی۔ ونے نے اپنے پیچھے گھوڑوں کی ٹاپ سنی تو چونکے۔ پستول چلائی مگر وہ خالی تھی۔

بیر پال سنگھ نے طنز سے کہا۔ آپ تو رعایا کے دوست بنتے تھے۔

ونے۔ تم جیسے قاتلوں کی مدد کرنا میرا قاعدہ نہیں۔

**بیر پال**۔ مگر ہم اُس سے اچھے ہیں جو حکام سے مل کر رعایا کی گردن پر چھری چلائے۔

ونے سنگھ غضبناک ہو کر باز کی طرح جھپٹے کہ اُس کے ہاتھ سے بندوق چھین لیں۔ مگر بیر پال کے ایک ساتھی نے جھپٹ کر ونے سنگھ کو نیچے گرا دیا اور دوسرا ساتھی تلوار لے کر ان کی طرف لپکا ہی تھا کہ صوفیا جو اب تک بیہوش سی زمین پر پڑی ہوئی تھی، چیخ مار کر اُٹھی اور ونے سنگھ سے لپٹ گئی۔ تلوار اپنے نشانہ پر نہ پہنچ کر صوفیا کے ماتھے پر پڑی۔ اتنے میں نایک رام لاٹھی لئے ہوئے آ پہنچا اور لاٹھی چلانے لگا۔ دو باغی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑے۔ بیر پال سنگھ اب تک ششدر اور ساکت کھڑا تھا۔ نہ اُسے معلوم تھا کہ صوفیا کو بیچ میں کس نے مارا۔ نہ اس نے اپنے ساتھیوں ہی کو ونے پر حملہ کرنے کے لئے کہا تھا۔ یہ سب کچھ اُس کی آنکھوں کے سامنے مگر اُس کی مرضی کے خلاف ہی ہو رہا تھا مگر اب اپنے ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر وہ بے لاگ نہ رہ سکا۔ اس نے بندوق کا کندا تان کر اتنی زور سے نایک رام کے سر پر مارا کہ اُس کا سر پھٹ گیا اور ایک لمحہ میں اُس کے تینوں ساتھی اپنے زخمی ساتھیوں کو لے کر بھاگ نکلے۔ ونے سنگھ سنبھل کر اُٹھے تو دیکھا کہ قبل میں نایک رام خون سے شرابور بیہوش پڑا ہے اور صوفیا کا کہیں پتہ نہیں۔ اسے کون لے گیا۔ کیوں لے گیا۔ کیسے لے گیا۔ ان باتوں کی انہیں مطلق خبر

نہ تھی۔ میدان میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ دو چار لاشیں البتہ ادھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں۔

مسٹر کلارک کہاں تھے؟ طوفان اُٹھا اور گیا۔ آگ لگی اور بجھی۔ مگر ان کا کہیں پتہ تک نہیں۔ وہ شراب کے نشہ میں مخمور۔ دین دُنیا سے بے خبر۔ اپنی خواب گاہ میں پڑے ہوئے تھے۔ باغیوں کا شور سُن کر صوفیا محل سے نکل آئی تھی۔ مسٹر کلارک کو اس لئے جگانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے آنے سے عوام کے قتل کئے جانے کا اندیشہ تھا۔ اُس نے پُرامن ذرائع سے امن قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اسی کا یہ انجام تھا۔ وہ پہلے ہی سے ہوشیار ہو جاتی تو شائد حالت اتنی نازک نہ ہونے پاتی۔

وہ نے ایک رام کو دیکھا۔ نبض کا پتہ نہ تھا۔ آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ فکر، رنج اور پشیمانی سے دل اتنا بیقرار ہوا کہ وہ رو پڑے۔ فکر تھی ماں کی کہ اُن کے درشن بھی نہ کرنے پایا۔ غم تھا صوفیا کا کہ نہ جانے اُسے کون لے گیا۔ پشیمانی تھی اپنے غصہ پر کہ میں ہی اس بغاوت اور قتل کا سبب ہوں۔

آسمان پر کالی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ مگر وہ کے قلبی آسمان پر چھائی ہوئی غم کی گھٹا اس سے کہیں زیادہ کالی اور گھنگھور تھی۔

## (۲۹)

مسٹر ولیم کلارک اپنے دیگر ہموطنوں کی طرح شراب کے شائق ضرور تھے۔ مگر اُس کے عادی نہ تھے۔ وہ ہندوستانیوں کی طرح پی کر مست ہونا نہ چاہتے تھے۔ گھوڑے پر سوار ہونا جانتے تھے۔ مگر اُس کو قابو سے باہر نہ ہونے دیتے تھے۔ لیکن آج صوفیا نے دیدہ دانستہ ان کو معمول سے زیادہ پلا دی تھی۔ جو صلہ دلاتی جاتی تھی "واہ اتنی ہی۔ ایک گلاس اور تو لو۔ اچھا یہ میری خاطر سے۔

واہ ابھی تم نے میرا جام صحت تو پیا ہی نہیں۔" صوفیا نے ونے سے کل ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر اُن کی باتیں اسے ایک لمحہ کے لئے بھی چین نہ لینے دیتی تھیں۔ وہ سوچتی تھی:۔ ونے نے آج یہ نئے بہانے کیوں ڈھونڈ نکالے؟ میں نے ان کے لئے مذہب کی بھی پرواہ نہیں کی۔ پھر بھی وہ مجھ سے بھاگنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب میرے پاس اور کون سی تدبیر ہے؟ کیا محبت کا دینا اتنا سنگدل ہے۔ کیا وہ بڑی سے بڑی بھینٹ پاکر بھی راضی نہیں ہوتا؟ ماں کی ناراضگی کا اتنا خوف انہیں کبھی نہ تھا۔ کچھ نہیں۔ اب اُن کی محبت گھٹ گئی ہے۔ مردوں کا دل ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اس کا ایک اور ثبوت مل گیا۔ اپنی ناقابلیت کا تذکرہ اُن کے مُنہ سے کتنا غیر فطری معلوم ہوتا تھا۔ وہ جو اتنے پراو لکاری، اتنے نیاگی، اتنے سچے، اتنے فرض شناس ہیں۔ وہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں تمہارے قابل نہیں ہوں۔ ہائے وہ کیا جانتے ہیں کہ میں ان سے کتنی گہری عقیدت رکھتی ہوں۔ میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کے قدم چھو سکوں۔ کتنا پاک دل ہے۔ کتنا اُونچا خیال۔ کتنا روحانی ایثار! انہیں۔ وہ مجھ سے دُور رہنے ہی کے لئے یہ حیلہ کر رہے ہیں۔ انہیں خوف ہے کہ میں اُن کے پیروں کی زنجیر بن جاؤں گی۔ انہیں فرض کے راستہ سے ہٹا دوں گی۔ اُن کو معیار سے الگ کر دوں گی۔ میں ان کے اس خوف کو کیسے رفع کر دوں؟

دن بھر انہیں خیالات میں غرق رہنے کے بعد شام کو وہ اتنی مضطرب ہوئی کہ اُس نے رات ہی کو ونے سے پھر ملنے کا قصد کیا۔ اس نے کلارک کو شراب پلا کر اسی لئے بیہوش کر دیا تھا کہ اس کو کسی طرح کا شُبہ نہ ہو۔ جیل کے حکام سے اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ اس وقفہ کو ونے سے منت و سماجت کرنے میں ان کی سوئی ہوئی محبت کو جگانے میں ان کے شکوک کو رفع کرنے میں گزارنا چاہتی تھی۔ مگر اُس کی کوشش اُسی کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ مسٹر کلارک موقع پر پہنچ سکتے تو شاید معاملہ اتنا سنگین نہ ہونے پاتا۔ کم از کم صوفیا کو یہ روز بد نہ دیکھنا پڑتا۔

کلارک صاحب اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر بھی اُس کی حفاظت کرتے۔ صوفیا نے اُس سے دغا کر کے اپنا ہی ستیاناس مار لیا۔ اب وہ نہ جانے کہاں اور کس حالت میں تھی۔ عموماً لوگوں کا خیال تھا کہ باغیوں نے اُسے قتل کر دیا اور اُس کی لاش کو زیورات کے طمع سے اپنے ساتھ لے گئے۔ صرف دو نے سنگھ اس بات سے متفق نہ تھے۔ انہیں یقین تھا کہ صوفیا ابھی زندہ ہے۔ باغیوں نے ضمانت کے طور پر اُس کو اپنے یہاں قید کر رکھا ہے کہ انہیں صلح کی شرائط طے کرنے میں آسانی ہو۔ صوفیا ریاست کو دبا دینے کے لئے ان کے ہاتھوں میں ایک آلہ کی طرح تھی۔

اس سانحہ سے ریاست میں تہلکہ مچ گیا۔ حکام آپ سے ڈرتے تھے اور رعایا اپنے لئے۔ اگر ریاست کے ملازموں ہی تک معاملہ رہتا تو زیادہ تشویش کی بات نہ تھی۔ ریاست تون کابدلخون سے کر مطمئن ہو جاتی۔ زیادہ سے زیادہ ایک کی جگہ چار کو قتل کر ڈالتی۔ مگر صوفیا کے درمیان میں پڑ جانے سے معاملہ زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ وہ اب ریاست کے دائرہ اختیار سے باہر تھا۔ لوگوں کو اندیشہ تھا کہ خود ریاست پر کوئی زوال نہ آجائے۔ اس لئے ملزموں کی گرفتاری میں غیر معمولی مستعدی اور سرگرمی سے کام لیا جا رہا تھا۔ ذرا سا شبہ ہونے پر بھی لوگوں کو ماخوذ کر لیا جاتا تھا اور انہیں سخت سے سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ گواہ اور ثبوت کی کوئی پوچھ نہ تھی۔ ان ملزموں کا مواخذہ کرنے کے لئے ایک علیحدہ عدالت قائم کر دی گئی تھی۔ وہاں انصاف کرنے کے لئے (؟) رعایا کے چُنے چُنے دشمنوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ یہ عدالت کسی کو چھوڑنا نہ جانتی تھی۔ کسی ملزم کو سزائے موت دینے کے لئے ایک سپاہی کی شہادت کافی تھی۔ سردار نیلکنٹھ بلا کھائے پیئے صبح سے شام تک ملزموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ہز ہائی نس مہاراجہ صاحب خود ہی شملہ، دہلی اور آگرہ وغیرہ پر ایک کئے ہوئے تھے۔ پولیس کے اہلکاروں کے نام روزانہ ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں اور اُدھر شملہ سے بھی تاکیدوں کا تانتا بندھا ہوا تھا

تاکیدوں کے بعد دھمکیاں آنے لگیں۔ اُسی مناسبت سے یہاں رعایا کے ساتھ بھی حکّام کی سختیاں بڑھتی جاتی تھیں۔ مسٹر کلارک کو یقین تھا کہ اس معاملہ میں ریاست کا ہاتھ بھی ضرور تھا۔ اگر ریاست نے پیشتر ہی سے باغیوں کا رہنا ناممکن کر دیا ہوتا تو وہ ہرگز اس طرح سر نہ اٹھا سکتے تھے۔ ریاست کے بڑے بڑے حکّام بھی اُن کے سامنے جاتے ہوئے کانپتے تھے۔ وہ دورہ پر نکلتے تو ایک اور انگریزی رسالہ ساتھ لے لیتے۔ علاقے کے علاقے اُجڑوا دیتے۔ گاؤں کے گاؤں تباہ کرا دیتے یہاں تک کہ عورتوں پر بھی زیادتیاں ہوتی تھیں۔ اور سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ ریاست اور کلارک ان تمام بداعمالیوں میں دلی و جان سے شرکت کرتے تھے۔ سچ پوچھئے تو اُن پر دیوانگی سی طاری تھی۔ خدمت و ایثار کے خیالات ان کے دل سے یک قلم محو ہو گئے تھے۔ صوفیا اور اُس کے دشمنوں کا سُراغ لگانے کی کوشش بس یہی ایک کام اُن کے لئے رہ گیا تھا۔ مجھے دنیا کیا کہتی ہے۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ ماتا جی کا کیا حال ہُوا۔ ان باتوں کی طرف اب اُن کا دھیان ہی نہ جاتا تھا۔ اب تو وہ ریاست کے دست راست بنے ہوئے تھے۔ حکّام انہیں وقتاً فوقتاً اور بھی اشتعال دیتے رہتے تھے۔ باغیوں کے دبانے میں کوئی پولیس کا اہلکار یا ریاست کا نوکر اتنا بے اُنس بے انصاف اور بے پرواہ نہ بن سکتا تھا۔ اُن کی وفاداری کی کوئی حد نہ تھی یا یوں کہئے کہ اس وقت وُہ ریاست کے ایک خاص رُکن بنے ہوئے تھے یہاں تک کہ سردار نہلکینھ بھی اُن سے دبتے تھے۔ مہاراناصاحب کو ان پر اتنا اعتبار تھا کہ ان کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کرتے تھے۔ اُن کے لئے آنے جانے میں کوئی روک نہ تھی اور مسٹر کلارک سے تو اُن کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں ایک ہی بنگلہ میں رہتے تھے اور درپردہ سردار صاحب کی جگہ پر دینے کی تقریری کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔

تقریباً ایک سال تک تمام ریاست میں یہی حال رہا جب دفعتہً شگر

باغیوں سے پاک وصاف ہوگیا یعنی وہاں کوئی جوان شخص باقی نہ رہ گیا تو ونے خود ہی صوفیا کے پتہ لگانے پر آمادہ ہوا۔ ان کی مدد کے لئے خفیہ پولیس کے کئی تجربہ کار اہلکار تعینات کئے گئے۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نایک رام ابھی تک کمزور تھے۔ اُن کے بچنے کی تو کوئی اُمید ہی باقی نہ رہی تھی۔ مگر زندگی باقی تھی بچ گئے۔ انہوں نے ونے کو جانے پر آمادہ دیکھا تو ہمراہ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جاکر بولے "بھیّا۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔ میں یہاں اکیلا نہ رہوں گا۔"

**ونے**۔ میں کہیں پردیس تھوڑا جاتا ہوں۔ سات دن میں روز یہاں آیا کروں گا۔ تم سے ملاقات ہو جائے گی۔

**سردار نیلکنٹھ** وہاں بیٹھے ہوئے تھے بولے۔ ابھی تم جانے کے قابل نہیں ہو۔

**نایک رام**۔ سردار صاحب۔ آپ بھی انہیں کی سی کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ تو رانی جی کو کون سانتونہ دکھاؤں گا۔

**ونے**۔ تم یہاں زیادہ آرام سے رہ سکو گے۔ تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں۔

**نایک رام**۔ سردار صاحب اب آپ ہی بھیّا کو سمجھائیے۔ آدمی ایک گھڑی کی نہیں چلاتا۔ ایک ہفتہ تو بہت ہوتا ہے۔ پھر مورچہ لینا ہے بیر پال سنگھ سے جس کا لوہا میں بھی مانتا ہوں۔ میری کئی لاٹھیاں اُس نے ایسی روک لیں کہ ایک بھی پڑ جاتی تو کام تمام ہو جاتا۔ لیکن پھینکیت ہے۔ کیا میری جان تمہاری جان سے زیادہ پیاری ہے۔

**نیلکنٹھ**۔ ہاں بیر پال ہے تو ایک ہی شیطان۔ نہ جانے کب کدھر سے کتنے آدمیوں کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ اُس کے گرویدے ساری ریاست میں پھیلے ہوئے ہیں۔

**نایک رام**۔ تو ایسے جوکھم میں کیسے ان کا ساتھ چھوڑ دوں؟

مالک کی چاکری میں جان بھی نکل جائے تو کیا غم ہے۔ اور یہ زندگی ہے کس لئے؟

**دنے۔** بھئی بات یہ ہے کہ میں اپنے لئے کسی غیر کی جان جوکھم میں نہیں ڈالنا چاہتا۔

**نائیک رام۔** ہاں جب آپ مجھے غیر سمجھتے ہیں تو دوسری بات ہے۔ ہاں غیر تو ہوں ہی۔ غیر نہ ہوتا تو رانی جی کے اشارہ پر یہاں کیسے دوڑا آتا۔ جیل میں جا کر کیسے باہر نکال لاتا اور سال بھر تک کھاٹ کیوں سیتا۔ سردار صاحب۔ مجبور ہی اب نباہئے کیجئے۔ میں غیر ہوں؟ جس کے لئے جان ہتھیلی پر لئے پھرتا ہوں وہی غیر سمجھتا ہے۔

**نیلکنٹھ۔** دنے سنگھ یہ آپ کا اپنائے ہے۔ آپ انہیں غیر کیوں کہتے ہیں؟ اپنے خیر خواہوں کو غیر کہنے سے انہیں رنج پہنچتا ہے۔

**نائیک رام۔** بس سردار صاحب۔ مجبور نے لاکھ روپے کی بات کہہ دی پولیس کے آدمی غیر نہیں اور میں غیر ہوں۔

**دنے۔** اگر غیر کہنے سے تمہیں رنج ہوتا ہے تو میں یہ لفظ واپس لیتا ہوں۔ میں نے غیر صرف اس خیال سے کہا تھا کہ تمہاری نسبت مجھے گھر والوں کو جواب دینا پڑے گا۔ پولیس والوں کے لئے تو کوئی مجھ سے جواب نہ طلب کرے گا۔

**نائیک رام۔** سردار صاحب اب آپ ہی اس کا جواب دیجئے۔ یہ میں کیسے کہوں کہ مجھے کچھ ہو گیا۔ تو کنور صاحب کچھ پوچھ تاچھ نہ کریں گے۔ اُن کا بھیجا ہوا آیا ہی ہوں۔ بھیّا کو جواب دہی تو ضرور کرنی پڑے گی۔

**نیلکنٹھ۔** یہ مانا کہ تم ان کے بھیجے ہوئے آئے ہو مگر تم اتنے نادان نہیں ہو کہ تمہارے نفع نقصان کی ذمہ داری دنے سنگھ کے سر ہو۔ تم اپنا بھلا بُرا آپ سمجھ سکتے ہو۔ کیا کنور صاحب اتنا بھی نہ سمجھیں گے؟

**نائیک رام۔** اب کہئے دھرما اوتار۔ اب تو مجھے لے چلنا پڑے گا۔

سردار صاحب نے میری ڈگری کر دی۔ میں کوئی نابالک (نابالغ) نہیں ہوں کہ سرکار کے سامنے آپ کو جواب دینا پڑے۔

بالآخر ونے سنگھ نے نایک رام کو ساتھ لے جانا منظور کر لیا۔ اور دو تین دن کے بعد دس آدمیوں کی ایک جماعت بھیس بدل کر سب طرح تیار ہو کر سراغرساں کتوں کو ساتھ لئے آمدورفت کے ناقابل پہاڑی راستوں میں داخل ہوئی۔ پہاڑوں سے آگ نکل رہی تھی۔ اکثر کوسوں تک پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ملتا۔ راستے پتھریلے۔ درختوں کا پتہ نہیں۔ دوپہر کو لوگ غاروں میں آرام کرتے تھے۔ رات کو بستی سے الگ کسی چوپال یا مندر میں سو رہتے۔ دو دو آدمی ایک ساتھ رہتے تھے۔ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار سب آدمیوں کو ایک ہی جگہ پہ جمع ہونا پڑتا تھا۔ دوسرے روز کا دستورالعمل طے کر کے لوگ پھر الگ الگ ہو جاتے تھے۔

نایک رام اور ونے سنگھ کی ایک جوڑی تھی۔ نایک رام ابھی تک چلنے پھرنے میں کمزور تھا۔ پہاڑوں کی چڑھائی میں تھک کر بیٹھ جاتا۔ خوراک کی مقدار بہت کم ہو گئی تھی۔ کمزور اتنا ہو گیا تھا کہ پہچاننا مشکل تھا۔ لیکن ونے سنگھ پہ جان قربان کرنے کو تیار رہتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ دیہاتیوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ مختلف مزاج اور رتبہ کے لوگوں سے واقف تھا۔ جس گاؤں میں پہنچتا دھوم مچ جاتی کہ کاشی سے پنڈاجی آئے ہیں۔ عقیدت مندوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ نائی۔ کہار آ پہنچتے۔ دودھ گھی پھل پھول۔ سبزی ترکاری وغیرہ کی افراط ہو جاتی۔ بچے۔ بوڑھے۔ مرد عورت بیدھڑک پنڈاجی کے پاس آتے۔ اور انہیں حسب مقدور دکشنا دیتے۔ پنڈاجی باتوں باتوں میں ان سے گاؤں کا سارا حال دریافت کر لیتے۔ ونے سنگھ کو اب معلوم ہوا کہ نایک رام ساتھ نہ ہوتے تو مجھے کتنی دقتیں پیش آتیں۔ وہ خود کم سن۔ متین اور مشربیلے آدمی تھے۔ ان میں وہ حکمانہ انداز نہ تھا جو عوام پر اپنا رعب جما لیتا ہے۔ نہ ان میں وہ شیریں کلامی تھی جو دلوں کو کھینچ لیتی ہے۔ ایسی حالت میں نایک رام کا ساتھ ہونا ان

کے لئے خدائی مدد سے کم نہ تھا۔

راستہ میں کبھی کبھی تو خونخوار درندوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر نایک رام سینہ سپر ہو جاتا تھا۔ ایک روز چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ دُور تک آبادی کا کوئی نشان نہ تھا۔ دھوپ کی شدت سے ایک ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ کوئی کنواں یا تالاب بھی نظر نہ آتا تھا۔ دفعتاً ایک اُونچا ٹیکرا دکھائی دیا۔ نایک رام اس پر چڑھ گیا کہ شاید اوپر سے کوئی گاؤں یا کنواں نظر آئے۔ اس نے چوٹی پر پہنچ کر اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو دُور پر ایک آدمی جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی اور پیٹھ پر ایک تھیلی تھی۔ کوئی بغیر وردی کا سپاہی معلوم ہوتا تھا۔ نایک رام نے اس کو کئی بار زور زور سے پکارا تو اس نے گردن پھیر کر دیکھا۔ نایک رام اُسے پہچان گئے۔ یہ ونے سنگھ کے ساتھ کا ایک رضاکار تھا۔ اسے اشارہ سے بُلایا اور ٹیلے سے اُتر کر اُس کے پاس گئے۔ اس قومی رضاکار کا نام اندر دت تھا۔

**اندر دت** نے پوچھا۔ تم یہاں کیسے آ پھنسے جی؟ تمہارے کنور کہاں ہیں؟

**نایک رام**۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یہاں کوئی گاؤں بھی ہے۔ کہیں دانہ پانی مِل سکتا ہے؟

**اندر دت**۔ جس کے رام دھنی اُسے کون کمی۔ کیا راج دربار نے بھوجن کی رسد نہیں لگائی۔ تیلی سے بیاہ کر کے تیل کا رونا۔

**نایک رام**۔ کیا کروں بھائی۔ بُرا پھنس گیا ہوں۔ نہ رہتے بنتا ہے نہ جاتے۔

**اندر دت**۔ اُن کے ساتھ تم بھی اتنی مٹی خراب کر رہے ہو۔ کہاں ہیں آج کل؟

**نایک رام**۔ کیا کروگے؟

**اندردت** ۔ کچھ نہیں ۔ ذرا ملنا چاہتا تھا ۔

**نایک رام** ۔ ہیں تو وہ بھی ۔ یہیں بھینٹ ہو جائے گی ۔ تھیلی میں کچھ ہے ؟

اس طرح باتیں کرتے ہوئے دونوں ونے سنگھ کے پاس پہنچے ۔ ونے نے اندردت کو دیکھا تو غصہ سے بولا " اندردت تم کہاں ؟ گھر کیوں نہیں گئے ؟ "

**اندردت** ۔ آپ سے ملنے کی بڑی خواہش تھی ۔ آپ سے کتنی ہی باتیں کرنی ہیں ۔ پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے یہ چولا کیوں بدلا ؟

**نایک رام** ۔ پہلے تم اپنی تھیلی میں سے کچھ نکالو ۔ پھر باتیں ہوں گی ۔

ونے سنگھ اپنی کایا پلٹ کے جواز کو ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے ۔ بولے :" اس لئے کہ مجھے اپنی بھول معلوم ہو گئی ۔ میں پہلے سمجھتا تھا کہ رعایا ٹیڑی منحل اور امن پسند ہے ۔ اب معلوم ہوا کہ وہ کمینہ اور باجی ہے ۔ اس کو جوں ہی اپنی طاقت کا کچھ احساس ہو جاتا ہے وہ اُسے بُرے طریقہ پر استعمال کرنے لگتی ہے ۔ جو آدمی طاقت کے پیدا ہوتے ہی پاگل ہو جائے اُس کا کمزور اور پامال رہنا ہی اچھا ہے ۔ گذشتہ بغاوت کا ہونا اس امر کا ایک بین ثبوت ہے ۔ ایسی حالت میں مَیں نے جو کچھ کیا اور کر رہا ہوں وہ بالکل قرینِ انصاف اور قرینِ مصلحت ہے ۔

**اندردت** ۔ کیا آپ کی رائے میں رعایا کو چاہئے کہ خواہ اُس پر کتنے ہی مظالم کئے جائیں پر وہ زبان نہ ہلائے ؟

**ونے** ۔ ہاں موجودہ حالت میں اس کا یہی فرض ہے ۔

**اندردت** ۔ اُس کے رہنماؤں کو بھی یہی معیار اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہئے ؟

**ونے** ۔ بے شک ۔

**اندردت** ۔ تو جب آپ نے رعایا کو بغاوت پر آمادہ دیکھا تو اُس کے سامنے کھڑے ہو کر تحمل اور امن کا وعظ کیوں نہیں دیا ؟

**وِنے** ۔ بالکل فضول تھا۔ اُس وقت کوئی میری نہ سُنتا۔

**اندرودت** ۔ اگر نہ سُنتا تو کیا آپ کا یہ فرض نہیں تھا کہ دونوں صفوں کے درمیان میں کھڑے ہو کر پہلے آپ خود ہی گولی کا نشانہ بن جاتے ؟

**وِنے** ۔ میں اپنی زندگی کو اتنی ہیچ نہیں سمجھتا۔

**اندرودت** ۔ جو زندگی قومی خدمت کے لئے وقف ہو چکی اُس کے لئے اس سے بہتر اور کون موت ہو سکتی تھی ؟

**وِنے** ۔ آگ میں کود نے کا نام خدمت نہیں ہے ۔ اس پر قابو کرنا ہی اس کی خدمت کرنا ہے ۔

**اندرودت** ۔ اگر یہ خدمت نہیں ہے تو غریب رعایا کو اپنے نفس پر قربان کر دینا بھی خدمت نہیں ہے ۔ بہت ممکن تھا کہ صوفیا نے اپنے دلائل سے ہر پال سنگھ کو لاجواب کر دیا ہوتا۔ مگر آپ نے مغلوب النفس ہو کر پستول کا پہلا وار کیا اور اس لئے اس کشت و خون کا سارا الزام آپ ہی کی گردن پر ہے اور جلد یا دیر میں آپ کو اس کا کفارہ کرنا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں ۔ رعایا کو آپ کے نام سے کتنی نفرت ہے ؟ اگر کوئی شخص آپ کو یہاں دیکھ کر پہچان جائے تو اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ آپ کے اوپر تیر چلائے ۔ آپ نے یہاں کی رعایا کے ساتھ اپنے رفیقوں کے ساتھ۔ اپنی قوم کے ساتھ اور سب سے زیادہ اپنی قابل تعظیم ماں کے ساتھ جو دغا کی ہے اُس کا الزام کبھی آپ کے سر سے دُور نہ ہوگا۔ شاید رانی جی آپ کو دیکھیں تو اپنے ہاتھوں سے آپ کی گردن پر تلوار پھیر دیں ۔ آپ کی زندگی سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہُوا کہ انسان کا کتنا اخلاقی زوال ہو سکتا ہے ۔

**وِنے** نے کسی قدر نرم لہجہ میں کہا۔" اندرودت ۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے خود غرضی سے حکام کی مدد کی تو تم میرے ساتھ سخت ناانصافی کر رہے ہو۔ رعایا کا ساتھ دینے میں جتنی آسانی سے نیک نامی مِل سکتی ہے اس سے کہیں زیادہ آسانی سے حکام کا ساتھ دینے میں بدنام ہو جانا یقینی ہے ۔ یہ

میں جانتا تھا لیکن خادم کا فرض نیکنامی اور بدنامی کا لحاظ کرنا نہیں ہے۔ اُس کا فرض سچائی کے راستہ پر چلنا ہے۔ میں نے قومی خدمت کا عہد کیا ہے اور الیشور نہ کرے کہ میں وہ دن دیکھنے کے لئے زندہ رہوں۔ جب میرے خدمتی جذبہ میں خود غرضی کا شائبہ ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں رعایا کی نامناسب روش دیکھ کر بھی اس کی حمایت کروں۔ میرا عہد میری عقل کا خون نہیں کر سکتا۔

**اندرودت** ۔ کم از کم اتنا تو آپ مانتے ہی ہیں کہ اپنے فائدہ کے لئے عوام کو نقصان نہ پہنچانا چاہیئے۔

**ونے** ۔ تم مجھ پر جھوٹا الزام لگاتے ہو۔ میں عوام کے لئے سچائی سے دست بردار نہیں ہو سکتا۔ سچائی مجھ کو ملک و قوم دونوں سے زیادہ عزیز ہے۔ جب تک میں سمجھتا تھا کہ رعایا حق بجانب ہے میں اس کی حفاظت کرتا تھا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے حق سے انحراف کیا ہے تو میں نے بھی اُس سے اپنا منہ موڑ لیا۔ مجھے ریاست کے حکام سے کوئی ذاتی عناد نہیں ہے۔ میں وہ شخص نہیں ہوں کہ حکام کو راہِ حق پر دیکھ کر بھی خواہ مخواہ ان سے دشمنی کروں اور نہ مجھ سے یہی ہو سکتا ہے کہ رعایا کو بغاوت اور سرکشی پر آمادہ دیکھ کر بھی اس کی مدد کروں۔ اگر کوئی شخص مس صوفیا کے موٹر کے نیچے دب گیا۔ تو یہ ایک اتفاقی بات تھی۔ صوفیا نے جان بوجھ کر تو اس پر سے اپنا موٹر چلا نہیں دیا۔ ایسی حالت میں رعایا کا یوں برانگیختہ ہو جانا اس امر کا بین ثبوت تھا۔ کہ وہ حکام کو بزور اپنے قابو میں رکھنا چاہتی ہے۔ آپ صوفیا کے تعلق سے میرے اطوار پر حملہ کر کے صرف میرے ساتھ بے انصافی نہیں کر رہے ہیں بلکہ خود اپنے کو بھی ذلیل کر رہے ہیں۔

**اندرودت** ۔ یہ ہزاروں آدمی بلا کسی قصور کے کیوں قتل ہوئے؟ کیا یہ بھی رعایا کا ہی قصور تھا؟

**ونے** ۔ اگر آپ حکام کی مشکلات سے ذرا بھی واقف ہوتے تو

ہرگز یہ سوال نہ کرتے۔ میں اس کے لئے آپ کو معاف کرتا ہوں۔ ایک سال قبل جب حکام سے میرا کوئی تعلق نہ تھا۔ شاید میں بھی ایسا ہی خیال کرتا۔ لیکن اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ انہیں ایسے مواقع پر انصاف سے کام لینے میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں۔ میں یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ذی اختیار ہوتے ہی انسان کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ انسان فطرتاً انصاف پسند ہوتا ہے۔ اُسے کسی کو خواہ مخواہ ایذا پہنچانے سے خوشی نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ اُتنا ہی رنج ہوتا ہے جتنا کسی خادم قوم کو۔ فرق صرف اتنا ہی ہے۔ کہ خادمِ قوم کسی غیر کو موردِ الزام قرار دے کر اپنے کو خوش کر لیتا ہے۔ یہیں اُس کا فرض تمام ہو جاتا ہے۔ حکام کو یہ موقع نہیں ملتا۔ وہ خود اپنے رویہ کی صفائی پیش نہیں کر سکتے۔ آپ کو خبر نہیں کہ حکام نے ملزموں کو ڈھونڈ نکالنے میں کتنی دقتیں اُٹھائیں۔ رعایا ملزموں کو چھپا لیتی تھی اور کسی سیاسی اصول کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اس لئے ملزموں کے ساتھ بیگناہوں کا ماخوذ ہو جانا ممکن ہی تھا۔ پھر آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس بغاوت نے ریاست کو کتنی بڑی مصیبت میں ڈال دیا ہے۔ انگریزی سرکار کو شک ہے کہ دربار ہی کی وجہ سے یہ ساری سازش ہوئی۔ اب دربار کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اس الزام سے بری کرے۔ اور جب تک مسِ صوفیا کا سُراغ نہیں مل جاتا۔ ریاست کی حالت نہایت نازک اور تشویشناک ہے۔ ہندوستانی ہونے کے سبب میرا فرض ہے کہ ریاست کے چہرہ سے اس داغ کو مٹا دوں۔ خواہ اس کے لئے مجھے کتنی ہی ذلت کتنی ہی بدنامی کتنی ہی سخت کلامی کیوں نہ برداشت کرنی پڑے۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ خادمِ قوم کی حالت کوئی مستقل صورت نہیں رکھتی۔ گرد و پیش کے حالات کے مطابق اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کل میں ریاست کا جانی دشمن تھا۔ آج اُس کا جاں نثار خادم ہوں اور اس کے لئے مجھے ذرا بھی ندامت نہیں ہے۔

اندرودت۔ ایشور نے آپ کو بحث کے لئے عقل دی ہے اور اُس

سے آپ دن کو رات ثابت کر سکتے ہیں۔ مگر آپ کی کوئی تاویل رعایا کے دل سے یہ خیال دُور نہیں کر سکتی کہ آپ نے اُس کے ساتھ دغا کی اور اس دغا کی جو سزا آپ کو صوفیا کے ہاتھوں ملے گی اُس سے آپ کی آنکھیں کھُل جائیں گی۔

ونے نے اس طرح جھپٹ کر اندردت کا ہاتھ پکڑ لیا گویا وہ کہیں بھاگا جا رہا ہو اور بولے تمہیں صوفیا کا پتہ معلوم ہے؟

**اندردت۔** نہیں۔

**ونے۔** جھوٹ بولتے ہو۔

**اندردت۔** ہو سکتا ہے۔

**ونے۔** تمہیں بتانا پڑے گا۔

**اندردت۔** آپ کو اب مجھ سے یہ پوچھنے کا حق نہیں رہا۔ آپ کا یا ورہار کا مقصد پورا کرنے کے لئے میں دوسروں کی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ آپ نے ایک مرتبہ دغا کی ہے اور پھر کر سکتے ہیں۔

**نایک رام۔** بتا دیں گے۔ آپ کیوں اتنے گھبرائے جاتے ہیں۔ اتنا تو بتا ہی دو بھیا اندردت۔ کہ میم صاحب کُشل (خیریت) سے ہیں نا؟

**اندردت۔** ہاں اچھی طرح ہیں اور خوش ہیں۔ کم سے کم وہ اس لئے کبھی بیچین نہیں ہوتیں۔ سچ پوچھو تو انہیں اب ان کے نا گئی ہے۔

**ونے۔** اندردت ہم اور تم بچپن کے دوست ہیں؟ ہو تو میں اپنی جان تک دے دوں مگر تم اتنی ذراسی بات بتلا رہے ہو۔ یہی دوستی ہے؟

**اندردت۔** دوستی کے پیچھے دوسروں کی جان کیوں عذاب میں ر

**ونے۔** میں ماتا کے چرنوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اسے مخفی رکھوں گا۔ میں صرف ایک مرتبہ صوفیا سے ملنا چاہتا ہوں۔

اندر دت ۔ کاٹھ کی ہانڈی بار بار نہیں چڑھتی۔
ولے ۔ اندر میں تمام عمر تمہارا احسان مانوں گا۔
اندر دت ۔ جی نہیں بلی بخشتے مُرغا بانڑا ہی اچھا۔
ولے ۔ مجھ سے جو قسم چاہے لے لو۔
اندر دت ۔ جس بات کے بتلانے کا مجھے اختیار نہیں ہے اُسے بتلانے کے لئے آپ مجھ سے ناحق اصرار کر رہے ہیں۔
ولے ۔ تم سنگدل ہو۔
اندر دت ۔ میں اس سے بھی زیادہ سخت ہوں۔ مجھے جتنا چاہے کوس لیجئے۔ پر صوفیا کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔
نایک رام ۔ ہاں بھیّا۔ بس یہی ٹیک چلی جائے۔ مردوں کا یہی کام ہے۔ دو ٹوک کہہ دیا کہ جانتے ہیں پر بتلائیں گے نہیں۔ چاہے کسی کو بھلا لگے چاہے بُرا۔
اندر دت ۔ اب تو قلعی کھل گئی نا؟ کیوں کنور صاحب مہاراج اب تو بڑھ کر باتیں نہ کرو گے؟
اندر دت ۔ جلے پر نمک نہ چھڑکو۔ جو بات پوچھنا ہوں بتلا دو۔ ورنہ ڈرے گا۔ تمہاری جتنی خوشامد کر رہا ہوں اُتنی آج تک کسی کی ہمارے اوپر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔
ایک بار کہہ چکا کہ مجھے جس بات کے بتلانے کا اختیار نہیں بتلاؤں گا۔ بس اس بارہ میں تمہارا اصرار بے فائدہ ہے۔ جانا ہوں۔ تمہیں جہاں جانا ہو جاؤ۔
نایک رام ۔ سیٹھ جی بھاگو مت۔ مِس صاحبہ کا پتہ بتائے بنا نہ جانے پاؤ گے۔
اندر دت ۔ کیا زبردستی پوچھو گے؟
نایک رام ۔ ہاں زبردستی پوچھوں گا۔ براہمن ہو کر تم سے بھیک مانگ

رہا ہوں اور تم انکار کرتے ہو۔ اسی پر دھرنا تا اور میوک بنتے ہو۔ یہ سمجھ لو برہمن بھیک لئے بنا دروازے سے نہیں جاتا۔ نہیں پاتا تو دھرنا دے کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر لے کر ہی اٹھتا ہے۔

اندردت۔ مجھ سے یہ ہٹ دھرمی چالیں نہ چلو۔ سمجھے۔ ایسے بھیک دینے والے کوئی اور ہوں گے۔

نایک رام۔ کیوں باپ دادوں کا نام ڈبوتے ہو بھیا؟ کہتا ہوں یہ بھیک دئے بنا اب تمہارا گلا نہیں چھوٹ سکتا۔

یہ کہتے ہوئے نایک رام فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اندردت کے دونوں پیر پکڑ لئے۔ ان پر اپنا سر رکھ دیا اور بولے ــ "اب تمہارا بوجھ ہو وہ کرو۔ میں تو رکھ ہوں گنوار ہوں پر برہمن ہوں۔ تم سارتھی آدمی ہو جیسا مناسب سمجھو کرو۔"

اندردت اب بھی نہ پسیجے۔ انہوں نے اپنے پیروں کو چھڑا کر چلے جانے کی کوشش کی۔ مگر ان کے چہرہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بڑے پس و پیش میں پڑے ہوئے ہیں اور اس عاجزانہ التماس کا لحاظ نہ کرنے پر نہایت شرمندہ ہیں۔ وہ طاقتور شخص تھے۔ رضاکاروں میں کوئی ان کا ساڈیل ڈول والا نوجوان نہ تھا۔ نایک رام ابھی کمزور تھے۔ قریب تھا کہ اندردت اپنے پیروں کو چھڑا کر نکل جائیں کہ نایک رام نے دبے سے کہا "بھیا کھڑے کیا دیکھتے ہو۔ پکڑ لو ان کے پاؤں۔ پھر دیکھوں یہ کیسے نہیں بتلاتے۔"

ونے سنگھ کسی ذاتی غرض کے لئے بھی کسی کی خوشامد کرنا برا سمجھتے تھے پھر پاؤں پر گرنے کی تو بات ہی کیا۔ کسی سادھو مہاتما کے سامنے عاجزی کرنے سے انہیں عار نہ تھا۔ بشرطیکہ اس سے دلی عقیدت ہو۔ صرف اپنا کام نکالنے کے لئے انہوں نے سر جھکانا سیکھا ہی نہ تھا۔ مگر جب انہوں نے نایک رام کو اندردت کے پیروں پر گرتے دیکھا تو خود داری کا کوئی موقعہ باقی نہ رہا۔ سوچا کہ جب میری خاطر نایک رام برہمن ہو کر یہ ذلت برداشت کر رہا ہے تو میرا دور ہی کھڑے

ہوئے شان دکھلانا مناسب نہیں۔ اگرچہ ابھی ذرا پہلے اندردت سے انہوں نے سخت کلامی سے گفتگو کی تھی اور ان کی خوشامد کرتے ہوئے شرم آتی تھی۔ مگر صوفیا کا حال بھی اس کے سوا اور کسی تدبیر سے معلوم ہونا غیر ممکن تھا۔ انہوں نے اپنی خودداری کو بھی صوفیا پر قربان کر دیا۔ "میرے پاس یہی ایک چیز تھی جسے میں نے ابھی تک تیرے ہاتھ سے نہ دیا تھا۔ آج اُسے بھی تیرے حوالہ کرتا ہوں۔ آقا اب بھی سر نہ جھکانا چاہتی تھی پر کمر جھک گئی" اور ایک لمحہ میں اُن کے ہاتھ اندردت کے پیروں پر جا پہنچے۔ اندردت نے فوراً پیر کھینچ لئے اور دونے کو اٹھاتے ہوئے بولے۔ "دونے یہ کیا غضب کر رہے ہو؟"

دونے کی حالت اس نوکر کی سی تھی جسے اس کے مالک نے تھوک کر چاٹنے کا حکم دیا ہو۔ انہیں اپنی اس ذلت پر رونا آگیا۔

نائک رام نے اندردت سے کہا۔ "بھیا مجھے بھکاری سمجھ کر دھتکار سکتے تھے۔ مگر اب بتاؤ"

اندردت نے مخمصہ میں پڑ کر کہا۔ "دونے کیوں مجھے اتنا نادم کر رہے ہو میں زبان دے چکا ہوں۔ کہ میں کسی سے یہ بھید نہ بتاؤں گا۔"

نائک رام "تم سے کوئی زبردستی تو نہیں کر رہا ہے۔ جو اپنا دھرم سمجھو وہ کرو۔ تم آپ تو صاحبان (عقل مند) ہو۔

اندردت نے جھنجھلا کر کہا۔ "زبردستی نہیں تو اور کیا ہے؟ غرض بادل آتی ہے پر آج معلوم ہوگا کہ دولت بھی بری ہوتی ہے۔ دونے تم مفت میں اپنی آتما پر ظلم کر رہے ہو۔ بھلے آدمی کیا خودداری کو بھی کھول کر پی گئے؟ تمہارا فرض تھا کہ جان دے کر بھی آتما کی حفاظت کرتے۔ اب تمہیں معلوم ہوا ہوگا کہ خود غرضی انسان کو کتنا ذلیل کر دیتی ہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ایک سال قبل ساری دنیا مل کر بھی تمہارا سر نہ جھکا سکتی تھی۔ آج تمہارا یہ اخلاقی تنزل ہو رہا ہے! اب اٹھو مجھے گنہگار نہ کرو۔

دنے کو اتنا غصہ آیا کہ اس کے پیروں کو کھینچ لوں اور سینہ پر چڑھ بیٹھوں۔ ظالم اس حالت میں بھی نیش زنی سے باز نہیں آتا۔ مگر یہ خیال کر کے کہ اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔ مغموم ہو کر بولے ہے "اندردت تم مجھے جتنا ذلیل سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں۔ مگر صوفیا کے لیئے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ میری خودداری۔ میری دانائی۔ میری زندگی۔ میرا فرض سب کچھ محبت کی آگ میں بھسم ہو چکا۔ اگر تمہیں اب بھی مجھ پر ترس نہ آئے تو میری طرف پستول نکال کر میرا کام تمام کر دو"۔

یہ کہتے ہوئے دنے سرگوں آب دیدہ ہو گئے۔ اندردت نے انہیں اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ مزاحیہ انداز سے بولے "دنے معاف کرو۔ اگر چہ تم نے قوم کی بدخواہی کی ہے پر میں جانتا ہوں کہ تم نے وہی کیا جو شاید تمہاری جگہ میں ایسی حالت میں ہوتا اور کوئی شخص بھی کرتا۔ مجھے تمہاری تحقیر کرنے کا حق نہیں ہے۔ تم نے اگر محبت کے لیئے خودداری کو فنا کر دیا تو میں بھی دوستی اور شرافت کے لیئے اپنے وعدہ سے مکر جاؤں گا۔ جو تم چاہتے ہو وہ میں بتلا دوں گا۔ مگر اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہو گا کیونکہ مس صوفیا کی نگاہوں سے تم گر گئے ہو۔ اے اب تمہارے نام سے نفرت ہے۔ اس سے مل کر تمہیں رنج ہو گا"۔

نائیک رام۔ بھیا تم اپنی ہی کرو۔ مس صاحب کو منانا تو ان کا کام ہے۔ عاشق اور معشوق پہلے پہلے پر نزے ہوتے ہیں چھیڑے ہوئے سہرے دیکھتے ہی کر سیدھے ہوتے ہیں۔ معشوق (معشوق) کو چٹکی بجاتے اپنا کر لیتے ہیں۔ جبرا نگھوں نے پانی بھر کر دیکھا اور وہ پانی ہوا۔

اندردت۔ مس صوفیا مجھے کبھی معاف نہ کریں گی۔ لیکن وہ ان کا سامان کہاں سے لاؤں؟ ہاں ایک بات بتلا دو۔ یہ جانے بغیر میں کچھ بھی نہ بتلا سکوں گا۔

دنے۔ پوچھو۔

**اندر دت** ۔ تمہیں وہاں اکیلے جانا پڑے گا۔ وعدہ کرو کہ خفیہ پلیس کا کوئی آدمی تمہارے ساتھ نہ ہوگا۔

**ونے** ۔ اس سے تم بے فکر رہو۔

**اندر دت** ۔ اگر پولیس کے ساتھ گئے تو صوفیا کی لاش کے سوا اور کچھ نہ پاؤ گے۔

**ونے** ۔ میں ایسی حماقت ہی کیوں کروں گا۔

**اندر دت** ۔ یہ سمجھ لو کہ میں صوفیا کا پتہ بتلا کر ان لوگوں کی جانیں تمہارے ہاتھ میں رکھے دیتا ہوں جن کی کھوج میں تم نے کھانا پینا حرام کر رکھا ہے۔

**نائیک رام** ۔ بھیا چاہے اپنی جان نکل جائے اُن پر کوئی آنچ نہ آنے پائے گی۔ لیکن یہ بھی بتا دو کہ وہاں ہم لوگوں کی جان کا جوکھم تو نہیں ہے؟

**اندر دت** (ونے سے) ۔ اگر وہ لوگ تم سے دشمنی برتنا چاہتے۔ تو اب تک تم لوگ زندہ نہ ہوتے۔ ریاست کی ساری سکت بھی تمہیں بچا نہ سکتی انہیں تمہاری ایک ایک بات کی خبر ملتی رہتی ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ تمہاری جان ان کی مٹھی میں ہے۔ رعایا کے ساتھ اتنی بُرائی کرنے پر اگر تم ابھی زندہ ہو تو صرف مس صوفیا کی بدولت۔ اگر مس صوفیا تم سے ملاقات کرنا چاہتیں تو اس سے زیادہ آسان کوئی بات نہ تھی۔ لیکن وہ تو اب تمہارے نام سے چڑتی ہیں۔ اگر اب بھی تمہیں اُن سے ملنے کی خواہش ہو تو میرے ساتھ آؤ۔

ونے سنگھ کو اپنی قلبی تالیف کر دینے والی قوت پر کامل اعتماد تھا۔ اُس کی انہیں ذرا بھی فکر نہ تھی کہ صوفیا مجھ سے بات چیت نہ کرے گی۔ ہاں فکر اس بات کی تھی کہ میں نے صوفیا ہی کے لئے حکام کی جو مدد کی اُس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کاش مجھے پہلے ہی معلوم ہو جاتا کہ صوفیا کو یہ طرزِ عمل پسند نہیں ہے۔ وہ دوستوں کے درمیان میں ہے اور خوش ہے تو میں یہ طریقہ اختیار ہی کیوں کرتا؟ مجھے رعا سے کوئی عداوت تو تھی نہیں۔ صوفیا پر بھی تو اس کی کچھ نہ کچھ ذمہ واری

ہے۔ وہ میرے مزاج سے واقف ہے تو کیا ایک خط بھیج کر مجھے اپنے حالات سے آگاہ نہ کر سکتی تھی؟ جب اُس نے ایسا نہیں کیا تو اُسے اب مجھ سے برہم ہونے کا کیا حق ہے؟

یہ سوچتے ہوئے وہ اندردت کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ بھوک پیاس سب جاتی رہی۔

## (۳۰)

چلتے چلتے شام ہو گئی۔ کوہستان کی شام میدان کی راتوں سے کہیں زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ ہر سو اشخاص چلے جا رہے تھے لیکن ابھی منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔ پہاڑیوں کے سائے لمبے ہو گئے۔ سورج ڈوبنے کے پہلے ہی دن ختم ہو گیا۔ راستہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ دونوں آدمی بار بار اندردت سے پوچھتے۔ اب کتنی دور ہے مگر ہر بار یہی جواب ملتا کہ چلے آؤ۔ اب پہنچے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنے نے ایک بار جھنجھلا کر کہا۔ اندردت! اگر تم ہمارے خون کے پیاسے ہو تو صاف صاف کیوں نہیں کہتے؟ اس طرح کڑھا کڑھا کر کیوں مارتے ہو؟ اندردت نے اس بار بھی یہی جواب دیا کہ چلے آؤ۔ اب دُور نہیں ہے۔ ہاں ذرا ہوشیار رہنا۔ راستہ خطرناک ہے۔

دنے کو اب بار بار پچھتاوا ہو رہا تھا کہ وہ اندردت کے ساتھ کیوں آیا؟ کیوں نہ پہلے اس کے ہاتھوں صوفیا کو ایک خط بھیج دیا؟ جواب ملنے پر جب صوفیا کی تحریر پہچان لیتا تو بے خوف ہو کر اس طرف آتا۔ صوفیا اتنی سنگدل تو ہے نہیں کہ خط کا جواب ہی نہ دیتی۔ یہ عجلت کرنے میں مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اندردت کی نیت درست نہیں معلوم ہوتی۔ ان تفکرات کی وجہ سے اُس کا راستہ اور بھی مشکل ہو رہا تھا۔ یہ لوگ جیوں جیوں آگے بڑھتے تھے۔ راستہ بیہڑ اور ناہموار ہوتا جاتا تھا کبھی ٹیلوں پر چڑھنا پڑتا۔ کبھی اتنا نیچے اُترنا پڑتا کہ معلوم ہوتا کہ تحت الثرے

کو جا رہے ہیں۔ کبھی دائیں، بائیں گہرے غاروں کے درمیان میں ایک تنگ سی پگ ڈنڈی مل جاتی۔ آنکھیں بالکل کام نہ دیتی تھیں۔ صرف انگلی کا سہارا تھا جو واحد چشم بینا تھی۔ وہ نے پستول چڑھائے ہوئے تھے۔ دل میں عہد کر لیا تھا کہ ذرا بھی شک ہوا تو اندر دت پر پہلا وار کروں گا۔

دفعتاً اندر دت رک گئے اور بولے "لیجیے آ گئے۔ بس آپ لوگ یہیں ٹھہریئے میں جا کر ان لوگوں کو اطلاع دے دوں۔"

وہ نے متحیر ہو کر کہا "یہاں گھر تو کوئی نظر نہیں آتا۔ بس سامنے ایک درخت ہے۔"

اندر دت۔ باغیوں کے لئے ایسے ہی پوشیدہ مقامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں ملک المموت کے فرشتے بھی نہ پہنچ سکیں۔

وہ نے۔ بھئی یوں اکیلے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ کیوں نہیں سے آواز دو۔ یا چلو میں بھی چلتا ہوں۔

اندر دت۔ یہاں سے تو شاید سنکھ کی آواز بھی نہ پہنچے اور دوسروں کو لے چلنے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ گھر میرا نہیں ہے اور دوسروں کے گھر میں میں آپ کو کیونکر لے جا سکتا ہوں؟ ان غریبوں کے پاس یہاں کوئی فوج یا قلعہ نہیں ہے۔ صرف راستہ کی پہچان ہے کی ان کی حفاظت کرنی ہے۔ مجھے دیر نہ لگے گی۔

یہ کہہ کر وہ تیزی سے چلا اور کئی قدم چل کر اسی درخت کے نیچے غائب ہو گیا وہ نے سنگھ کچھ دیر تک تو اندیشہ میں پڑے ہوئے اس کی راہ دیکھتے رہے پھر ایک دم سے بولے "اس ظالم نے تو بڑا چکمہ دیا۔ یہاں اس سنسان مقام پر لا کر کھڑا کر دیا کہ بے موت ہی مر جائیں۔ ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا۔"

نائک رام۔ تمہیں اندیشہ کس بات کا ہے؟ عاشق لوگ تو جان ہتھیلی پر لئے ہی رہتے ہیں۔ مرے تو ہم کہ سوکھے ہی پر رہے۔

وہ نے۔ میں اس کی نیت کو تاڑ گیا تھا۔

نائیک رام۔ تو پھر کیوں بنا کان پونچھ ہلائے چلے آئے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی ڈبویا۔ یا عشق (عشق) میں بُدھی گھن چکر ہو جاتی ہے؟

ونے۔ آدھ گھنٹہ ہو گیا۔ ابھی تک کسی کا پتہ نہیں ہے۔ یہاں سے بھاگنا بھی چاہیں تو کہاں جائیں؟ اس نے ضرور دغا کی۔ زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا۔

نائیک رام۔ عاشق ہو کر مرنے سے ڈرتے ہو؟ مرنا تو ایک دن ہے ہی۔ آج ہی سہی۔ ڈر کیا؟ جب اکھل میں سمر دیا تو موسلوں کا کیا غم؟ مارے اس کا جدّا جی چاہے۔

ونے۔ کہیں سچ مچ صوفیا آ جائے۔

نائیک رام۔ پھر کیا کہنے؟ لپک کر ٹانگ لینا۔ مزہ تو جب آئے کہ تم ہائے ہائے کر کے روئے لگو اور وہ آنکھوں سے تمہارے آنسو پونچھے۔

ونے۔ بھئی دیکھنا۔ میں اُسے دیکھ کر روپڑوں تو ہنسنا مت۔ اُسے دیکھتے ہی دوڑوں گا اور اتنی زور سے پکڑوں گا کہ چھڑا نہ سکے۔

نائیک رام۔ یہ میرا انگوچھا لے لو۔ جھٹ پٹ اُس کے پاؤں باندھ دینا۔

ونے۔ تم ہنسی اڑا رہے ہو اور میرا دل دھڑک رہا ہے کہ نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔ آہا میں سمجھ گیا۔ میں اِدھر سے ایک بار گیا ہوں۔ ہم جمنوتی نگر کے آس پاس ہی کہیں ہیں۔ اندر دت ہم کو دھوکے میں ڈالنے کے لئے اتنا چکر دے کر لایا ہے۔

نائیک رام۔ جمنوتی نگر یہیں ہے تو ہمیں کیا؟ ہم یہاں چلائیں۔ تو کون سُنے گا؟

ونے۔ کیا سچ مچ اس نے دھوکا دیا۔ کیا؟ میرا تو جی چاہتا ہے کہ یہاں سے کسی طرف کو چل دوں۔ اگر صوفیا نے سخت باتیں کہنا شروع کیں تو میرا دل پھٹ جائے گا۔ جس کے لئے اتنے اودھم اور پاپ کئے اُس کی ہمدردی کیسے سہی جائے گی؟ ایسی ہی باتوں سے دُنیا سے جی کھٹا ہو جاتا ہے جس کے لئے چور بنے وہی پکارے چور۔

نائیک رام۔ عورتوں کا یہی حال ہے۔

ورنے۔ جو سُنا کرتا تھا وہ آنکھوں کے آگے آیا۔

نائیک رام۔ میں یہ انگوچھا بچھائے دیتا ہوں۔ پتھر ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ آرام سے لیٹو۔ مس صاحبہ آئیں۔ تو ہرا اچھا۔ نہیں تو تڑکے یہاں سے چل دیں گے۔ کہیں نہ کہیں دال ہی جائے گی۔ میں یہ پستول لیے بیٹھا ہوں۔ کوئی کھٹکا ہوا تو دیکھا جائے گا۔ میرا تو اب یہاں سے جی بھر گیا۔ نہ جانے وہ کون دن ہوگا کہ پھر گھر کے درسن ہوں گے۔

ورنے۔ میرا تو گھر بسنے کا ناتا ہی ٹوٹ گیا۔ صوفیا کے ساتھ جاؤں گا تو گھسنے ہی نہ پاؤں گا۔ صوفیا نہ ملی تو جاؤں گا ہی نہیں۔ یہیں دھونی رماؤں گا۔

نائیک رام۔ بھیا تمہارے سامنے بولنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے پر ساتھ رہتے رہتے ڈھیٹھ ہو گیا ہوں۔ مجھے تو مس صاحب ایسی کوئی بڑی اسپرا نہیں معلوم ہوتیں۔ یہاں تو بھگوان کی دیا سے روز ہی ایسی ایسی صورتیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ مس صاحب اُن کے آگے پانی بھریں۔ دیکھو تو جیسے میرا دیکھ رہا ہو۔ اور ان کے لئے تم راج پاٹ چھوڑنے پر تیار ہو۔ سچ کہتا ہوں۔ رانی جی کو بڑا دکھ ہوگا۔ ماں کا دل دکھانا اچھا پاپ ہے۔ کچھ حال بھی تو نہیں ملا۔ نہ جانے چل سیں کہ ہیں۔

ورنے۔ پنڈا جی۔ میں صوفیا کے روپ کا پاسک (پرستار) نہیں ہوں۔ میں خود نہیں جانتا کہ اُس میں وہ کون سی بات ہے جو مجھے اندر کھینچ رہی ہے۔ میں اُس کے لئے راج پاٹ تو کیا اپنا دھرم تک چھوڑ سکتا ہوں۔ اگر میں تمام دُنیا کا مالک ہوتا تو اُسے بھی صوفیا کی بھینٹ دیتا۔ اگر آج مجھے معلوم ہو جائے کہ صوفیا اس دنیا میں نہیں ہے تو تم مجھے جیتا نہ پاؤ گے۔ اُس سے ملنے کی اُمید ہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اُس کے چرنوں پر جان نچھاور کر دینا ہی میری زندگی کی پہلی اور آخری خواہش ہے۔

درخت کی طرف لالٹین کی روشنی نظر آئی۔ دو شخص آ رہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں جام۔ ورنے نے دونوں کو پہچان لیا۔ ایک تو بیر پال سنگھ تھا اور دوسرا اس کا ساتھی۔ بیر پال نے سامنے آ کر

لالٹین رکھ دی اور ونے کو پرنام کر کے دونوں چپ چاپ جاجم بچھانے لگے۔ جاجم بچھا کر بیر پال بولا "آئیے۔ بیٹھ جائیے۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ مس صاحب ابھی آ رہی ہیں"۔

امید اور نا امیدی کے مخالف حالات میں پڑ کر ونے کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ انہیں شرم آ رہی تھی۔ کہ جن آدمیوں کو میں نے حکام کی مدد سے تباہ کر دینے کی کوشش کی بالآخر انہیں کے دروازہ کا مجھے گدا ہونا پڑا۔ مزہ تو جب آتا کہ یہ سب ہتھکڑیاں پہنے ہوئے میرے سامنے آتے اور میں ان کو معاف کر دیتا۔ واقعی فتح کا سہرا تو انہیں کے سر رہا۔ آہ جنہیں میں بد معاش اور قاتل سمجھتا تھا وہی آج میری قسمت کا فیصلہ کرنے والے بنے ہوئے ہیں۔

جب وہ جاجم پر جا بیٹھے اور تاریک رام ہوشیار ہو کر ٹہلنے لگے تو بیر پال نے کہا "کنور صاحب میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ آج آپ کو اپنے سامنے عدالت کی کرسی پر بیٹھے نہ دیکھ کر اپنے دروازہ پر بیٹھا دیکھ رہا ہوں ورنہ ان بدنصیبوں کے ساتھ میری گردن پر بھی چھری چل جاتی جنہوں نے مار کھا کر رونے کے سوا اور کوئی قصور نہیں کیا تھا"۔

ونے۔ بیر پال سنگھ اُن باتوں کی چرچا کر کے مجھے نادم نہ کرو۔ اگر اُن کا کچھ کفارہ ہو سکتا ہے تو میں کرنے کو تیار ہوں۔

بیر پال۔ سچے دل سے؟

ونے۔ ہاں اگر مس صوفیا کی تم نے حفاظت کی ہے۔

بیر پال۔ انہیں تو آپ ابھی خود دیکھیں گے۔

ونے۔ تو میں بھی تمہیں معاف کرا دینے کی حتے الامکان کوشش کروں گا۔

بیر پال۔ آپ جانتے ہیں۔ میں مس صاحب کو کیوں لایا؟ اسی لئے کہ ہم انہیں کی خدمت اور سفارش سے اپنے بچاؤ کی اُمید رکھتے تھے جنہیں

اُمید تھی کہ ہم مس صاحب کے ذریعہ اپنی جانوں کی امان پانے میں کامیاب ہونگے۔ مگر بدقسمتی سے انہیں ہمارے قیاس کی بہ نسبت کہیں زیادہ گہرا زخم لگا تھا جس کے بھرنے میں پورے نو مہینے لگ گئے۔ اپنے منہ سے کیا کہیں، پر جتنی دل لگن کے ساتھ ہم نے ان کی تیمارداری کی وہ ہمیں جانتے ہیں۔ یہی سمجھ لیجئے کہ مجھے چھ مہینے تک گھر سے نکلنے کا موقعہ نہ ملا۔ اتنے دنوں تک جسوت نگر میں رعایا اور انصاف دونوں کا خون ہوتا رہا۔ روز روز کی خبریں سُنتا تھا اور اپنا ماتھا ٹھونک کر رہ جاتا تھا۔ مس صاحب کو اپنی حفاظت کے لئے لایا تھا۔ اُن کے پیچھے سارا علاقہ تباہ ہوگیا۔ خیر جو کچھ ایشور کو منظور تھا ہوا۔ اب میری آپ سے یہی التجا ہے کہ میرے اوپر رحم کی نگاہ ہونی چاہئے۔ آپ کو پرماتما نے اس قابل بنایا ہے۔ آپ کے ایک اشارہ سے ہم لوگوں کی جان بچ جائے گی۔

راجہ نے کھلے دل سے کہا کہ مجھے تو پورا یقین ہے کہ دربار تمہارا قصور معاف کر دے گا۔ ہاں تم کو بھی یہ عہد کرنا پڑے گا کہ اب سے ریاست کے ساتھ تم کسی قسم کی عداوت نہ رکھو گے۔

بیر پال۔ میں یہ عہد کرنے کو تیار ہوں۔ کنور صاحب سچ تو یہ ہے کہ آپ نے ہمیں بالکل مجبور بنا دیا۔ یہ آپ ہی کا تشدد ہے جس نے ہمیں اتنا کمزور کر دیا۔ جن جن آدمیوں پر ہمیں بھروسہ تھا وہ سب دغا دے گئے۔ دوست دشمن میں امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔ ہر شخص اپنی جان بچانے کے لئے اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے یا حکام کا اعتماد پانے کے لئے ہماری آستین کا سانپ ہوگیا۔ وہی ہیں ہوں کہ آج چوہے کی طرح بل میں چھپا ہوا ہوں۔ ہر لمحہ یہی اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں پولیس نہ آجائے۔

رانی۔ مس صوفیا کبھی مجھے یاد کرتی ہیں؟

بیر پال۔ مس صاحب کو آپ سے جتنی محبت ہے اس کا آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ (اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرکے) ان کے وار سے آ

کونسل صاحب نے ہی بچایا تھا اور مس صاحب ہی کی خاطر سے آپ اتنے دنوں تک ہمارے ہاتھوں سے بچے رہے۔ ہمیں آپ سے ملنے کا موقع نہ تھا پر ہماری بندوقوں کو تھامنے والے مس صاحب آپ کو یاد کر کے گھنٹوں رویا کرتی تھیں پر آپ کا دل آپ سے ایسا پھٹ گیا ہے کہ آپ کا کوئی نام بھی لے لیتا ہے تو چڑ جاتی ہیں۔ وہ تو کہتی ہیں کہ مجھے ایشور نے اپنا مذہب ترک کرنے کی سزا دی ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اب بھی انہیں آپ کی ذات سے گہری عقیدت ہے محبت کی طرح روٹھنا بھی گہرے تعلقات کے سبب ہوا کرتا ہے۔ آپ اُن کی جانب سے نا اُمید نہ ہوں۔ آپ راجہ ہیں۔ آپ کے لئے سب کچھ روا ہے۔ مذہب کی بندش تو چھوٹے آدمیوں کے لئے ہے۔

دفعتاً اُسی درخت کی طرف دوسری لالٹین کی روشنی دکھائی دی۔ ایک بڑھیا لوٹا لئے ہوئے آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے صوفیا تھی۔ ہاتھ میں ایک تھالی لئے ہوئے جس میں ایک گھی کا چراغ جل رہا تھا۔ وہی صوفیا تھی۔ وہی حسن منور کا مجسمہ۔ البتہ نورِ حسن کی کمی نے اُسے ایک ناقابلِ بیان صفائی اور روحانی نمود دے رکھی تھی۔ گویا اُس کا وجود عناصر سے نہیں بلکہ پاکیزہ نور کے ذرات سے ہوا تھا۔

اُسے دیکھتے ہی ولے کے دل میں ایسا حوصلہ پیدا ہوا کہ دوڑ کر اُس کے قدموں پر گر پڑوں۔ حسن پر شکوہ فریفتہ نہیں کرتا بلکہ فتح کر لیتا ہے۔

بڑھیا نے لوٹا رکھ دیا اور لالٹین لئے چلی گئی۔ بیر پال سنگھ اور اُس کا ساتھی بھی وہاں سے ہٹ کر دور چلے گئے۔ نایک رام بھی انہیں کے ساتھ ہو لئے۔ اب وہ بے خوف تھے۔

ولے نے کہا۔ صوفیا۔ آج میری زندگی کا مبارک دن ہے میں تو مایوس ہو چلا تھا۔

**صوفیا۔** میری بڑی خوش نصیبی تھی کہ آپ کے درشن ہوئے۔ آپ درشن بدا تھا ورنہ مرنے میں کوئی کسر نہ رہ گئی تھی۔

ونے کو اپنے شکوک محض موہوم سے معلوم ہونے لگے۔ اندر دت اور ببر پال نے مجھے خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ملاقات محبت کو بیدار کر دیتی ہے۔ ولی اُمنگ کے بہاؤ میں ان کی مصمم عقل کسی پھولوں کی مالا کی طرح بہتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اس فقرہ میں کتنا بڑا طنز تھا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آیا۔

صوفیا نے تھال میں سے دہی اور چاول نکال کر ونے کی پیشانی پر ٹکا لگایا۔ اور مسکرا کر بولی۔ "اب آرتی کروں گی۔"

ونے نے متاثر ہو کر کہا۔ پیاری یہ کیا ڈھکوسلا کر رہی ہو؟ تم بھی ان رسمیات کے جال میں پھنس گئیں؟

صوفیا۔ واہ۔ آپ کی خاطر تو اضع کیسے نہ کروں۔ آپ میرے نجات دہندہ ہیں۔ مجھے ان ڈاکوؤں اور قاتلوں کے پنجہ سے چھڑا رہے ہیں۔ آپ کا خیر مقدم کیسے نہ کروں؟ میرے لئے آپ نے ریاست میں اندھیر مچا دیا۔ سینکڑوں بے گناہوں کا خون کر دیا۔ کتنے ہی گھر بے چراغ کر دیئے۔ ماؤں کو بیٹوں کے سوگ کا مزہ چکھا دیا۔ سہاگ والیوں کو بیوگی کی گود میں بٹھا دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے ضمیر کا اپنے اصولوں کا اپنے زندگی کے معیار کا ستیاناس مار دیا۔ اتنی نیکنامیاں پیدا کرنے پر بھی میں آپ کی مناسب تعظیم نہ کروں؟ میں اتنی احسان فراموش نہیں ہوں۔ اب آپ ایک حقیر خادم نہیں بلکہ ریاست کا داہنا ہاتھ ہیں راجے مہاراجے آپ کی عزت کرتے ہیں۔ میں آپ کی عزت کیسے نہ کروں؟

اب ونے کی آنکھیں کھلیں۔ طنز کا ایک ایک لفظ دل میں تیر کی طرح لگا۔ بولے۔ "صوفیا میں تمہارا وہی شیدائی اور قوم کا وہی قدیم خادم ہوں۔ تم اس طرح میری تضحیک کر کے میرے ساتھ ناانصافی کر رہی ہو۔ ممکن ہے کہ سہو کے سبب میری ذات سے دوسروں کو ایذا پہنچی ہو مگر میرا اصلی مقصد محض تمہاری حفاظت کرنا تھا۔"

صوفیا نے بگڑ کر کہا۔ "بالکل جھوٹ ہے۔ غلط ہے۔ متہم کرنا ہے۔

یہ سب میری خاطر نہیں اپنی خاطر تھا۔ اس کا مقصد محض اُس کمینہ خود سری کو آسودہ کرنا تھا۔ جو تمہارے دل میں خدمت کا سوانگ بھرے بیٹھی ہوئی ہے۔ میں نے تمہاری حکومت پسندی پر اپنے کو قربان نہیں کیا تھا بلکہ تمہاری خدمت ہمدردی اور حب الوطنی پر۔ میں نے اس لئے تمہیں اپنا معبود بنایا تھا کہ تمہاری زندگی کا معیار بلند تھا۔ تم میں عیسےٰ کا رحم۔ بدھ کا تیاگ۔ لوتھر کی سچائی۔ ان اوصاف کا شائبہ نظر آتا تھا۔ کیا غریبوں کو ستانے والے ہمدرد۔ خود غرض حکام کی دُنیا میں کمی تھی؟ تمہاری معیار پرستی نے مجھے تمہارے قدموں پر جھکایا۔ جب میں ساری خلقت کو نفس پرستی میں مبتلا دیکھ کر دنیا سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اُس وقت تمہاری بے نفسی نے مجھے اپنا شیدا بنا لیا۔ لیکن اتفاقات دُنیوی کے ایک ہی پلٹے نے تمہاری اصلی حالت ظاہر کر دی۔ میرا سُراغ لگانے کے لئے تم نے بُرائی بھلائی کا خیال بھی ترک کر دیا۔ جو شخص اپنی ذاتی غرض کے لئے اس قدر زیادتی کر سکتا ہے وہ بُرا سے بُرا کام بھی کر سکتا ہے۔ تم اپنے معیار سے اُسی وقت گر گئے جب تم نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے غیر ضروری ذرائع کی بہ نسبت جبر و تشدد سے کام لینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ شیطان نے پہلی مرتبہ تم پر وار کیا اور تم پھر نہ سنبھلے۔ برابر گرتے ہی چلے گئے۔ ٹھوکر پر ٹھوکر کھاتے کھاتے اب تم اتنا گر گئے ہو کہ تم میں شرافت تمیز اور مردانگی کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ تمہیں دیکھ کر میرا سر خود بخود جھک جاتا تھا۔ میری محبت کی بنیاد عقیدت تھی۔ وہ بنیاد اب جڑ سے ہل گئی۔ تم نے میری زندگی تباہ کر دی۔ آہ مجھے جتنا مغالطہ ہوا اتنا کبھی کسی کو نہ ہوا ہوگا۔ جس شخص کے لئے اپنے والدین سے منحرف ہوئی۔ اپنا گھر بار چھوڑا۔ جس پر اپنے دیرینہ اصولوں کو قربان کر دیا۔ جس کے لئے ذلت رسوائی بدنامی سب باتیں برداشت کیں وہ اتنا خود غرض۔ اتنا نفس پرست۔ اتنا کم فہم نکلا۔ کوئی دوسری عورت تمہارے ان اوصاف پر فریفتہ ہو سکتی ہے۔ محبت کے معاملہ میں عورتیں معیار کا

لحاظ نہیں کرتیں۔ لیکن میری تعلیم، میری صحبت، میرا مطالعہ اور سب سے زیادہ میرے طبعی میلان نے مجھے ان باتوں کی قدر کرنا نہیں سکھلایا۔ اگر آج تم ریاست کے ہاتھوں ظلم ذلت اور سزا سے تکلیف پاکر میرے سامنے آتے تو میں تمہاری بلائیں لیتی۔ تمہارے پیروں کی خاک اپنے ماتھے پر لگاتی اور اپنے نصیبوں کو سراہتی۔ لیکن مجھے اس چیز سے نفرت ہے جسے لوگ کامیاب زندگی کہتے ہیں۔ کامیاب زندگی مترادف ہے۔ خوشامد ظلم اور دغا کی۔ میں جن مہاتماؤں کو دنیا میں بزرگ ترین خیال کرتی ہوں۔ ان کی زندگیاں کامیاب نہ تھیں۔ دنیاوی نقطۂ خیال سے وہ لوگ معمولی آدمیوں سے بھی گئے گذرے تھے۔ جنہوں نے تکلیفیں اٹھائیں جو جلا وطن ہوئے۔ پتھروں سے مارے گئے کوسے گئے اور بالآخر دنیا نے اُن کو بلا ایک بوند آنسو گرائے بھی اپنے یہاں سے رخصت کر دیا۔ بہشت کو بھیج دیا۔ تم پولیس کی ایک جماعت لے کر مجھے لوٹنے نکلے۔ اس کا مقصد یہی کہ رعایا پر رُعب قائم کیا جائے۔ میری رائے میں جس ریاست کا وجود ہی ظلم پر مبنی ہو اُس کا نشان جتنا ہی جلد مٹ جائے اتنا ہی اچھا۔ خیر اب ان باتوں سے کیا فائدہ ہے تمہیں اپنی یہ عزت و شوکت مبارک ہو۔ میں تو اپنے اسی حال میں خوش ہوں۔ جن کے ساتھ ہوں۔ وہ دردمند ہیں جو کسی سے کینہ نہیں رکھتے۔ جو اپنی جان تک دے سکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں تم سے کہیں زیادہ خدمت و ایثار کے جذبات موجود ہیں۔

درنے آزردہ خاطر ہو کر بولے۔ صوفیا امپیئر کے لئے میرے ساتھ اتنی بے انصافی نہ کرو۔ اگر میں منصب و وقار کا خواہشمند ہوتا تو آج میری حالت ایسی قابل رحم نہ ہوتی۔ میں نے وہی کیا جو مجھے ترین انصاف معلوم ہوا۔ میں نے لاسکان ایک لمحہ کے لئے بھی حق سے منحرف نہیں ہوا۔

صوفیا یہی تو افسوس ہے کہ تمہیں وہ بات کیوں ترین انصاف معلوم ہوئی جو خلاف انصاف تھی۔ اس سے تمہارے دلی میلان کا پتہ چلتا ہے۔

تم فطرتاً خود غرض واقع ہوئے۔ انسانوں کو سبھی چیزیں یکساں عزیز نہیں ہوتیں۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو نام کے لئے دولت کو ٹھیکروں کی طرح لٹاتے ہیں۔ وہ اپنے کو بیغرض نہیں کہہ سکتے۔ خود غرضی کا بلند معیاری سے کیا تعلق ہے جس کے ارادے اتنے کمزور ہیں اس کی کم از کم میں ذرا بھی عزت نہیں کر سکتی اور عزت کے بغیر محبت محض بدنامی کا سبب ہوتی ہے۔

وہ لوگ جن پر مخالف حالات کا کوئی اثر نہیں ہوتا اُن کے دل پر مایوسی جلد ہی قبضہ کر لیتی تھی۔ بیقرار ہو کر بولے۔ صوفی مجھے تم سے ایسی اُمید نہ تھی۔ میرے نے جو کچھ کیا ہے اُسے حق سمجھ کر یا حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر کیا ہے۔

صوفیا۔ دنیا میں جتنے کام ہوتے ہیں۔ وہ سب سوچ یا ضرورتاً ہوتے ہیں کوئی تیسرا سبب میں نے آج تک نہیں سُنا۔

وہ۔ صوفیا اگر میں جانتا کہ میری طرف سے تمہارا دل اتنا سخت ہو گیا ہے تو تمہیں منہ نہ دکھاتا۔

صوفیا۔ میں تمہارے منہ دیکھنے کی بہت شائق نہ تھی۔

وہ۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ مگر یاں دار پر نے مظالم ہی کئے تو کیا مجھے تمہارے ہاتھوں یہ سزا ملنی چاہیئے؟ یہ خوف مجھے ناشتی سے تھا تم سے نہ تھا۔ آہ صوفی! اس محبت کا یوں خاتمہ نہ ہونے دو۔ یوں میری زندگی کو برباد نہ کرو۔ اسی محبت کے تعلق سے جو تم کو کبھی میرے ساتھ تھی رحم پر یہ ظلم نہ کرو۔ یہ تکلیف میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ تمہیں اطمینان نہ آئے گا کیونکہ اس وقت تمہارا دل میری طرف سے پتھر ہو گیا ہے لیکن یہ صدمہ میرے لئے مہلک ثابت ہوگا اور اگر موت کے بعد بھی کوئی زندگی ہے تو اس زندگی میں بھی یہی صدمہ میرے دل کو تڑپاتا رہے گا۔ صوفیا میں موت سے نہیں ڈرتا۔ بھالے کی نوک کو سینہ پر لے سکتا ہوں۔ مگر تمہاری بیرخی نظر۔

تمہارا یہ سپردانہ برتاؤ واقعی سوہان روح ہے۔ اس سے تو یہ کہیں اچھا ہے کہ تم مجھے زہر دے دو۔ میں اس پیالہ کو آنکھیں بند کر کے یوں پی جاؤں گا۔ جیسے کوئی بھگت چرنامرت پیتا ہے۔ مجھے یہ اطمینان ہو جائے گا کہ یہ زندگی جسے تمہاری نذر کر چکا تھا تمہارے ہی کام آگئی۔

یہ عشقیہ الفاظ شاید اور کسی وقت دنے کے منہ سے نہ نکلتے۔ شاید انہیں پھر یاد کر کے ان کو حیرت ہوتی کہ یہ الفاظ میرے منہ سے کیوں نکلے۔ مگر اس وقت خیالات کے جوش نے انہیں زیادہ لسان بنا دیا تھا۔ صوفیا نے اعتنائی کے ساتھ سر جھکائے کھڑی رہی۔ پھر سپردانہ لہجہ میں بولی ۔" دنے میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے دل میں ابھی جو کچھ تمہاری عزت باقی ہے اسے بھی پامال نہ کرو۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ الفاظ تمہارے دل سے نہیں نکل رہے بلکہ تم سوچ رہے ہو کہ کیونکر اس سے اپنی توہین کا بدلہ لوں۔ مجھے تعجب ہوگا اگر صبح ہونے سے پہلے یہ مقام خفیہ پولیس کے سپاہیوں سے بھر نہ جائے۔ یہاں کے رہنے والے حراست میں لے لئے جائیں اور انہیں بالآخر سزائے موت نہ دی جائے۔ میری سزا کے لئے تم نے کوئی اور ہی طریقہ سوچ رکھا ہوگا۔ میں نہیں خیال کر سکتی کہ وہ کیا ہے لیکن اتنا کہہ سکتی ہوں۔ کہ اگر مجھے بدنام کر کے یا میرے چال چلن کو برا بتلا کر تم مجھ سے جسمانی خواہ روحانی تکلیف پہنچا سکو گے تو تمہیں ایسا کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ میرا یہ خیال درست نہ ہو مگر میں اس کو دل سے نہیں نکال سکتی۔ کوئی ایسا جادو کوئی ایسا معجزہ نہیں ہے جو تمہیں پھر میری نگاہوں میں قابل احترام بنا سکے جس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوں۔ اس کے لئے میرے دل میں جگہ نہیں ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ مجھے ان باتوں سے دکھ نہیں ہو رہا ہے۔ ایک ایک لفظ میرے دل پر آرے کا کام کر رہا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہیں دل سے نکال کر میں پھر کسی دوسری صورت کو اس میں جگہ دوں گی حالانکہ تمہارے

دل میں ایسا خیال ہو تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔ نہیں یہی میری محبت کا اول اور آخر دور ہے۔ اب یہ زندگی اس سے بہتر کاموں میں صرف ہوگی۔ کون جانے الیشور نے مجھے راہِ حق سے منحرف ہونے کی تمہارے ہی ہاتھوں سزا دلائی ہو۔ تمہارے لئے میں نے وہ سب کچھ کیا جو نہ کرنا چاہئے تھا۔ مکر، فریب، چالاکی، تریا چرتر ایک سے بھی عار نہیں کیا۔ کیونکہ میری معصوم نگاہوں میں تم ایک بے لوث اور پاک روحانی وجود تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مسٹر کلارک کے ساتھ آنے میں مجھے کتنی روحانی تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ میں نے سمجھا تھا کہ تم میری زندگی کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دو گے۔ میری زندگی کو سدھارو گے۔ سنوارو گے۔ کامیاب بناؤ گے۔ آخر مجھ میں کون سا ایسا وصف ہے جس پر تم مفتون ہو؟ اگر حُسن کے طالب ہو تو حُسن کی دُنیا میں کمی نہیں ہے۔ تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ حسین عورتیں مل سکتی ہیں۔ اگر میری باتیں تمہیں میٹھی معلوم ہوتی ہیں تو تمہیں مجھ سے کہیں زیادہ شیریں کلام عورتیں مل سکتی ہیں۔ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جلد یا دیر میں تمہیں اپنی پسند اور طبیعت کے موافق کوئی حسینہ مل ہی جائے گی جس کے ساتھ تم اپنی ثروت و شوکت کا لطف اٹھا سکو گے کیونکہ خادم تو مرنے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ میرا دل تو پھول کر بھی عشق کے لئے دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے گا۔ یہ اس کیریکٹر روگ کا پرتاپ ہوگا۔ تم نے مجھے تارک الدنیا بنا دیا۔ میری نفسانی خواہشات کا خاتمہ کر دیا۔ مذہبی کتب کے دائمی مطالعہ سے جو راستہ نہ ملا۔ اُسے مایوسی نے دکھلا دیا۔ اس کے لئے تمہاری ممنون ہوں۔ مذہب اور راسی کی خدمت سے کون سا موتی ہاتھ لگا؟ لامذہبی۔ اب لامذہبی کی خدمت کروں گی جانتے ہو کیا کروں گی؟ ان گناہگاروں سے خون کا انتقام لوں گی جنہوں نے رعایا کی گردنوں پر چھریاں پھیری ہیں۔ ایک ایک کو دوزخ کی آگ میں جھونک دوں گی۔ جبھی میرے دل کو تسکین ہوگی۔ جو لوگ آج بے گناہوں کا خون بہا کر عزت اور نیک نامی بھوگ رہے ہیں انہیں دوزخ کے آتشکدہ میں جلاؤں گی اور جب تک

ظالموں کی اُس جماعت کو تباہ نہ کر دوں گی۔ چین نہ لوں گی خواہ اس کام میں مجھے جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑے۔ خواہ ریاست میں انقلاب کیوں نہ رونما ہو جائے۔ خواہ ریاست کا فشان ہی کیوں نہ مٹ جائے۔ میرے دل میں یہ خوبیں ارادہ تمہیں نے پیدا کیا ہے اور اس کا الزام تمہاری ہی گردن پر ہے۔ عیسےٰ کا عفو و رحم۔ بدھ کا استقلال اور تزکیہ نفس۔ کرشن کی محبت اور بے تعلقی کی غیر فانی شہرت بھی اب میرے اس خون کی پیاس کو نہیں بجھا سکتی۔ برسوں کا غور و خوض مطالعہ اور خیال تمہاری بداعمالیوں کے ہاتھوں رائیگاں ہو گیا۔ بس اب جاؤ۔ میں جو کچھ کروں گی وہ تم سے کہہ چکی۔ تمہاری جو مرضی ہو وہ تم بھی کرو۔ میں آج سے باغیوں کے گروہ میں شامل ہوتی ہوں۔ تم خفیہ پولیس کے دامن میں پناہ لو۔ جاؤ الیشو پھر ہم کو نہ ستائے۔

یہ کہہ کر سوفیا نے طشت اٹھا لیا اور چلی گئی جیسے امید دل سے نکل جائے ونے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری جو درد بھری صدا سے کم دلسوز نہ تھی اور زمین پر بیٹھ گئے جیسے کوئی بدنصیب بیوہ اپنے پیارے شوہر کی لاش اٹھ جانے کے بعد ایک سرد آہ بھر کر بیٹھ جائے۔

تینوں آدمی جو دُور کھڑے تھے آکر ونے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ نایک رام نے کہا۔ "بھیا آج تو کھوب کھوب باتیں ہوئیں۔ تم نے بھی پکڑ پایا تو اتنے دنوں کی کسر نکال لی۔ آگئی سمجھ میں نا؟ وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ عاسک لوگ بڑے چلکھ باج ہوتے ہیں۔ پہلے تو خوب آرتی اُتاری۔ دہی چاول کا ٹیکہ لگایا۔ میم پاؤں تو کیا۔ ہم لوگوں کی رسمیں جانتی ہیں۔ کب چلنا طے ہوا؟ جلدی چلو میرا بھی کام بسے۔"

ونے کی آنکھیں اشک آلودہ تھیں مگر اس جملہ پر ہنس پڑے۔ بولے "بس اب دیر نہیں ہے۔ گھر کو خط لکھ دو تیاری کریں۔"

**نایک رام۔** بھیا آنند تو تم آئے جیب دونوں بارتیں ساتھ ہی نکلیں۔

**ونے** ۔ ہاں جی ۔ ساتھ ہی نکلیں گی ۔ پہلے تمہاری ۔ پیچھے میری ۔

**نایک رام** ۔ ٹھاکر ۔ اب سواری کا بندوبست کرو ۔ جس میں ہم لوگ کل سویرے ٹھنڈے ٹھنڈے نکل جائیں ۔ یہاں پالکی تو مل جائے گی نا ؟"

**بیرپال** ۔ سب انتظام ہو جائے گا اب بھوجن کر کے آرام کیجئے ۔ دیر ہو گئی ہے ۔

**ونے** ۔ یہاں سے جیسونت نگر کتنی دُور ہے ؟

**بیرپال** ۔ یہ پوچھ کر کیا کیجئے گا ؟

**ونے** ۔ مجھے ابھی وقت وہاں پہنچنا چاہیئے ۔

**بیرپال** ۔ (متفکر ہو کر) آپ دن بھر کے تھکے ہوئے ہیں ۔ راستہ خراب ہے ۔

**ونے** ۔ کوئی ہرج نہیں ۔ چلا جاؤں گا ۔

**نایک رام** ۔ بھیّا ۔ مس صاحب ابھی رہیں گی نا ؟ رات کو کیسے چلو گے ؟

**ونے** ۔ تمہیں تو خبط سا ہو گیا ہے ۔ مس صاحب میری کون ہوتی ہیں اور میرے ساتھ کیوں جانے لگیں ؟ اگر آج میں مر جاؤں تو شاید اُن سے زیادہ خوشی اور کسی کو نہ ہو گی ۔ تمہیں تھکاوٹ معلوم ہوتی ہو تو آرام کرو ۔ مگر میں تو یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہر سکتا ۔ مجھے کانٹوں بھری راہ بھی یہاں کی پھولوں والی سیج سے زیادہ آرام دہ ہو گی ۔ آپ لوگوں میں سے کوئی راستہ دکھلا سکتا ہے ؟

**بیرپال** ۔ چلنے کو تو میں خود حاضر ہوں لیکن راستہ نہایت خطرناک ہے ۔

**ونے** ۔ کوئی مضائقہ نہیں ۔ مجھے اسی وقت پہنچا دیجئے اور ہو سکے تو آنکھوں پر پٹی باندھ دیجئے ۔ مجھے اب اپنے اوپر ذرا بھی اعتبار نہیں رہا ۔

**بیرپال** ۔ بھوجن تو کر لیجئے ۔ اتنی خاطر تو کیجئے ۔

**ونے** ۔ اگر مہمان نوازی کرنی ہو تو مجھے گولی مار دیجئے ۔ اس سے بڑھ کر آپ میری خاطر نہیں کر سکتے ۔ میں نے آپ کے ساتھ کتنی بُرائی کی ہے ۔ اگر آپ نے اس کا سواں حصّہ بھی میرے ساتھ کیا ہوتا تو مجھے کسی ترغیب کی ضرورت نہ پڑتی ۔

میں شیطان ہوں۔ قاتل ہوں۔ زمین میرے بوجھ سے جس قدر ہلکی ہو جائے اُتنا ہی اچھا۔

نائیک رام۔ معلوم ہوتا ہے مس صاحب سچ مچ پھر نٹ ہو گئیں مگر کہے دیتا ہوں کہ وہ دو ہی چار دن میں تمہارے پیچھے پیچھے دوڑتی پھریں گی۔ عاشق کی بائے بُرا ہوتی ہے۔

بیر پال۔ کنور صاحب۔ میرا اتنا کہنا مانئے کہ ابھی نہ جائیے۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں مس صاحب آپ کے یوں چلے جانے سے گھبرا نہ جائیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ کل سورج نکلنے تک آپ جسو نت نگر پہنچ جائیں گے۔ اس وقت کچھ بھوجن کر لیجئے۔

دینے۔ میرے لئے اب یہاں کا پانی بھی حرام ہے۔ اگر تمہیں نہیں چلنا ہے تو نہ سہی۔ مجھے تم سے اتنی خاطر داری کرانے کا حق نہیں ہے۔ میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔

بیر پال مجبور ہو کر ساتھ جانے کو تیار ہوا۔ نائیک رام کا بھوک سے بُرا حال تھا۔ مگر کیا کرتے۔ دینے کو جاتا دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر سہ اشخاص روانہ ہو گئے۔

نصف گھنٹہ تک تینوں آدمی چپ چاپ چلتے رہے۔ دینے کو صوفیا اور سب باتیں تو یاد نہ تھیں مگر ان کی نسبت پیر اُس نے جملے کہے تھے اور اُن کے بارہ میں جو نفرت بھری شبیہ اُس کی تھی اس کا ایک ایک لفظ اُن کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ صوفیا مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہے۔ وقتی حالات پر ذرا بھی توجہ دینا نہ چاہتی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں چھوڑتی۔

دفعتاً اُنہوں نے بیر پال سے پوچھا۔ "تمہاری رائے میں میں جوش میں آکر یہ بے انصافی کر بیٹھا یا جیسا مس صوفیا کہتی ہیں میں فطرتاً کمینہ ہوں۔

بیر پال۔ کنور صاحب مس صوفیا کی اس وقت کی باتوں کا ذرا بھی

نہ مانئے جس طرح جوش میں آپ کے حواس بجا نہیں رہ سکے ویسے ہی وہ بھی جوش میں واہیات بک گئی ہوں گی۔ جب آپ نے سیوا اور پرا پکار کے لئے راج کو چھوڑ دیا تو کس کا منہ ہے کہ آپ کو خود غرض کہہ سکے۔

**ونے**۔ نہ جانے اس نے اتنی سخت کلامی کہاں سے سیکھ لی؟ آدمی بھکاری کو بھی جواب دے تو نرمی سے۔ اُس نے تو مجھے اس طرح دُھتکارا جیسے کتے کو۔

**نایک رام**۔ کسی انگریز کو بیاہے گی اور کیا۔ یہاں کالے آدمیوں کے پاس کیا دھرا ہے۔ مُرغی کا انڈا کہاں ملے گا؟

**ونے**۔ تم بالکل بیوقوف ہو۔ تمہیں مُرغی کے انڈے ہی کی پڑی ہے۔

**نایک رام**۔ ایک بات کہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ وہ آزادی کہاں؟ بے جا کر رانی بنا دو گے۔ پردہ میں بٹھا دو گے۔ گھوڑی پر سوار کرا کر بیکار کھیلنے تو نہ جاؤ گے؟ کمر میں ہاتھ ڈال کر تُمکم پر تو نہ بٹھاؤ گے؟ ٹوپی اُتار کر تُمہرے تو نہ کرو گے؟

**ونے**۔ پھر وہی حماقت کی باتیں۔ ارے پونگا مہاراج۔ صوفیا کو تم نے کیا سمجھا ہے۔ ہمارے رہب سے جتنی وہ واقف ہے اتنا کوئی پنڈت بھی نہ ہوگا۔ وہ ہمارے یہاں کی دیویوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اُسے تو کسی راجہ کے گھر پیدا ہونا چاہئے تھا۔ نہ جانے عیسائی گھرانے میں کیوں پیدا ہوئی؟ مجھ سے منہ پھیر کر وہ اب کسی کو منہ نہیں لگا سکتی۔ اس کا مجھے اُتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی آنکھوں کا۔ وہ اب شادی نہیں کرے گی۔

**بیر پال**۔ آپ بہت سچ کہتے ہیں۔ واقعی وہ دیوی ہیں۔

**ونے**۔ سچ کہنا۔ کبھی میرا تذکرہ بھی کرتی تھیں؟

**بیر پال**۔ اس کے سوا تو انہیں اور کوئی بات ہی نہ تھی۔ جب گھر اٹھا بیٹھتی بڑبڑاتی تھیں مگر چونک چونک کر آپ کو پکار اٹھتی تھیں۔ کہتی تھیں کہ ونے کو بلا دو انہیں دیکھ کر مروں گی۔ کبھی کبھی تو کئی کئی دن تک آپ ہی کی رٹ لگی رہتی۔

جب کسی کو دیکھتیں یہی پوچھتیں۔ وہ نے آئے ؟ کہاں ہیں؟ میرے سامنے لاؤ۔ اُن کے چرن کہاں ہیں؟ ہم لوگ اُن کی حالت دیکھ دیکھ کر رونے لگتے تھے۔ جراح نے ایسی چیر پھاڑ کی کہ آپ سے کیا کہوں۔ یاد کرکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اُس کو دیکھتے ہی سُوکھ جاتی تھیں۔ لیکن ہم جیوں ہی کہہ دیتے کہ آج وہ نے سنگھ کے آنے کی خبر ہے تو بس فوراً دل مضبوط کرکے مرہم پٹی کرا لیتی تھیں۔ جراح سے کہتی تھیں۔ جلدی کرو۔ وہ آنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو آجائیں۔ بس یہ سمجھئے کہ آپ کے نام نے انہیں موت کے منہ سے نکال لیا۔

وہ نے سنگھ نے دردناک لہجہ میں کہا۔ بس کرو۔ اب اور کچھ نہ کہو۔ یہ دُکھ بھری کہانی نہیں سنی جاتی۔ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔

بیر پال۔ ایک روز اُسی حالت میں آپ کے پاس جانے کو تیار ہو گئیں۔ رو رو کر کہنے لگیں۔ انہیں لوگوں نے گرفتار کر لیا ہے۔ میں انہیں چھڑانے جا رہی ہوں۔۔۔

وہ نے۔ رہنے دو۔ بیر پال! ورنہ دل پھٹ جائے گا۔ اُس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مجھے ذرا کہیں لٹا دو۔ نہ جانے کیوں دل ڈوبا جاتا ہے۔ آہ مجھ جیسے بدنصیب کے لئے یہی مناسب سزا ہے۔ دیوتاؤں سے میرا شکوہ دیکھا گیا۔ ان سے کسی کا کبھی بھلا نہیں ہوا۔ چلے چلو۔ نہ لیٹوں گا۔ مجھے اسی وقت جسونت نگر پہنچنا ہے۔

پھر لوگ چپ چاپ چلنے لگے۔ وہ نے اتنی تیزی سے چل رہے تھے گویا دوڑ رہے ہیں۔ دُکھتے ہوئے اعضا میں عجیب پھرتی آگئی تھی۔ بیچارے نایک رام دوڑتے دوڑتے ہانپ رہے تھے۔ رات کے دو بجے ہوں گے۔ ہوا میں جان بخش تازگی آگئی تھی۔ کم سن حسینہ شب پوری جوانی پر پہنچ گئی تھی۔ جب اُس لاشعوری دلکشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب اُس کی جادو بھری طاقت کا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نایک رام تو کئی بار وہ نگھ کر گرتے گرتے بچ گئے۔ وہ نے تو آرام کرنے کی خواہش ہونے لگی کہ بیر پال بولے لیجئے جسونت نگر پہنچ گئے

وہ نے۔ ارے اتنی جلد! ابھی تو چلتے ہوئے کل چار ہی گھنٹے ہوئے ہونگے۔

بیربل ۔ آج سیدھے آئے ۔

ونے ۔ آؤ ۔ آج یہاں کے حکام سے تمہاری صفائی کرادوں ۔

بیربل ۔ آپ سے صفائی ہوگئی تو اب کسی کا غم نہیں ہے ۔ اب مجھے یہیں سے رخصت کیجئے ۔

ونے ۔ ایک روز اکیلے تو میرے مہمان ہو جائیے ۔

بیربل ۔ ایشور نے چاہا تو جلد ہی آپ کے درشن ہوں گے ۔ مجھ پر نظرِ عنایت رکھئے گا ۔

ونے ۔ صوفیا سے میرا کچھ ذکر نہ کیجئے گا ۔

بیربل ۔ جب تک وہ خود نہ چھیڑیں گی میں نہ کروں گا ۔

ونے ۔ میری یہ گھبراہٹ یہ دیوانگی اُس کا ذکر تو بھول کر بھی نہ کیجئے گا ۔ میں نہ جانے کیا کیا بک رہا ہوں ۔ اپنی زبان اور خیالات پر مجھے ذرا بھی قابو نہیں رہا ۔ ہیجان سا ہو رہا ہوں ۔ آپ اُن سے اتنا ہی کہہ دیجئے گا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں بولے اس کا وعدہ کیجئے ۔

بیربل ۔ اگر وہ مجھ سے کچھ نہ پوچھیں گی ۔ تو میں کچھ نہ کہوں گا ۔

ونے ۔ میری خاطر سے اتنا ضرور کہہ دیجئے گا کہ آپ کا ذرا بھی ذکر نہ کرتے تھے ۔

بیربل ۔ جھوٹ تو نہ بولوں گا ۔

ونے ۔ جیسی تمہاری مرضی ۔

## (۳۱)

بھیرو کے گھر سے نکل کر سورداس اپنی جھونپڑی میں آکر سوچنے لگا ۔ کیا کروں کہ دفعتاً دیا گر آگئے اور بولے ۔۔۔ سُور داس آج تو لوگ تمہارے اوپر بہت گرم ہو رہے ہیں ۔ کہتے ہیں اسے گھمنڈ ہو گیا ہے ۔ تم اس مایا جال میں

کیوں پڑے ہو؟ کیوں نہیں میرے ساتھ کہیں تیرتھ جاترا کرنے چلتے؟

سورداس۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ چلو تو میں بھی نکل پڑوں۔

دیاگر۔ ہاں۔ چلو۔ تب تک میں بھی مندر کا کچھ ٹھکانا کر لوں۔ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے۔ جو میرے پیچھے یہاں دیا بتی کر دے۔ بھوگ لگانا تو دور رہا۔

سورداس۔ تمہیں مندر سے کبھی چھٹی نہ ملے گی۔

دیاگر۔ بھائی یہ بھی تو نہیں ہوتا کہ مندر کو یونہی بلا حفاظت چھوڑ کر چلا جاؤں۔ پھر نہ جانے کب لوٹوں۔ تب تک تو یہاں گھاس جم جائے گی۔

سورداس۔ تو جب تم آپ ہی ابھی اس مایا جال میں پھنسے ہوئے ہو تو مجھے کیونکر چھڑا سکو گے۔

دیاگر۔ نہیں جلد ہی چلوں گا۔ ذرا پوجا کے لیے پھول لیتا آؤں۔

دیاگر چلے گئے تو سورداس پھر سوچ میں پڑ گیا۔ سنسار کی بھی کیا لیلا ہے۔ کہ بھوم کرتے ہاتھ جلتے ہیں۔ میں تو نیکی کرنے گیا تھا اور اس کا یہ پھل ملا۔ محلہ والوں کو یقین آ گیا۔ بُری باتوں پر لوگوں کو کتنی جلد یقین آ جاتا ہے۔ مگر نیکی بدی کبھی چھپی نہیں رہتی۔ کبھی نہ کبھی تو اصلی بات معلوم ہی ہو جائے گی۔ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ کبھی جیتوں گا تو کبھی ہاروں گا۔ اس کی چنتا ہی کیا؟ ابھی کل بڑے بڑے لوگوں سے جیتا تھا۔ آج جیت میں بھی ہار گیا۔ یہ تو کھیل میں ہوتا ہی کرتا ہے۔ اب بیچاری سُبھاگی کہاں جائے گی؟ محلہ والے تو اب اُسے یہاں رہنے نہ دیں گے اور رہے گی کس کے سہارے پر؟ کوئی اپنا تو ہو۔ میکے میں بھی تو کوئی نہیں ہے۔ جوان عورت اکیلی کہیں رہ بھی نہیں سکتی۔ زمانہ ایسا بُرا آ گیا ہے۔ اُس کی آبرو کیسے بچے گی؟ بھیرو کو کتنا چاہتی ہے۔ سمجھتی تھی کہ میں اُسے مارنے گیا ہوں۔ اُسے ہوشیار رہنے کے لئے کتنا زور دے رہی تھی۔ وہ تو اتنا پریم کرتی ہے اور بھیرو کا کبھی منہ ہی سیدھا ہوتا۔ اُبھاگن ہے اور کیا۔ کوئی دوسرا آدمی ہوتا تو اُس کے چرن دھو دھو کر پیتا۔ پر بھیرو کو جب دیکھو اُس پر

تلوار ہی کھینچے رہتا ہے۔ میں کہیں چلا گیا تو اُس کا کوئی پوچھنے والا بھی نہ رہے گا۔ محلہ والے اُس کی چھیچھالیدر ہوتے دیکھیں گے اور ہنسیں گے۔ کہیں نہ کہیں ڈوب مرے گی۔ کہاں تک صبر کرے گی۔ اس آنکھوں والے اندھے بھیرو کو تھوڑا بھی خیال نہیں ہے کہ میں اسے نکال دوں گا تو کہاں جائے گی۔ کل کو مسلمان ہاکر سنان ہو جائے گی۔ تو سارے نگر میں پل چل مچ جائے گی پر ابھی اس کے آدمی کو کوئی سمجھانے والا نہیں ہے۔ کہیں بھرتی والوں کے ہاتھ پڑ گئی تو پتہ بھی نہ لگے گا کہ کہاں گئی۔ سبھی لوگ جان بوجھ کر انجان بنتے ہیں۔ وہ یہی سوچتا ہوا سڑک کی طرف چلا تھا کہ سبھاگی آکر بولی ــــ سورداس میں کہاں رہوں گی؟

**سُور داس** نے ظاہری بے رُخی سے کہا۔ میں کیا جانوں کہاں رہے گی۔ ابھی تو ہی تو بھیرو سے کہہ رہی تھی کہ لاٹھی لے کر جاؤ۔ تو کیا یہ سمجھتی تھی کہ میں بھیرو کو مارنے آیا ہوں؟

**سُبھاگی** ۔ ہاں سُورداس۔ جھوٹ کیوں بولوں۔ مجھے وہ کھٹکا تو ہوا تھا۔

**سُور داس** ۔ جب تیری سمجھ میں میں اتنا بُرا ہوں۔ تو پھر مجھ سے کیوں بولتی ہے؟ اگر وہ لاٹھی لے کر آتا اور مجھے مارنے لگتا تو تو تماشا دیکھتی اور ہنستی کیوں؟ تجھ سے تو بھیرو ہی اچھا کہ لاٹھی پاکھی لے کر نہیں آیا۔ جب تو نے مجھ سے بیر ٹھان رکھا ہے تو میں تجھ سے کیوں نہ بیر ٹھانوں:

**سُبھاگی** (روتی ہوئی)۔ سورداس تم بھی ایسا کہو گے تو یہاں کون ہے جس کی آڑ میں میں جھن بھر بھی بیٹھوں گی؟ اُس نے ابھی مارا ہے مگر پیٹ نہیں بھرا۔ کہہ رہا ہے کہ جا کر تھانے میں لکھائے دیتا ہوں۔ میرے کپڑے لتے سب باہر پھینک دئے ہیں۔ اس جھونپڑی کے سوا اب میرا اور کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

**سُور داس** ۔ مجھے بھی اپنے ساتھ محلہ سے نکلوائے گی کیا؟

**سُبھاگی** ۔ تم جہاں جاؤ گے میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

**سُورداس**۔ تب تو تُو مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہ رکھے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ اندھا اُسے بھگا کر لے گیا۔

**سُبھاگی**۔ تم تو بدنامی سے بچ جاؤ گے لیکن میری آبرو کیسے بچے گی؟ ہے کوئی محلہ میں ایسا جو کسی کی آبرو جاتے دیکھے تو اس کی باہ پکڑ لے؟ یہاں تو ایک ٹکڑا روٹی بھی مانگوں تو نہ ملے۔ تمہارے سوا اب میرا کوئی نہیں ہے۔ پہلے میں تمہیں آدمی سمجھتی تھی۔ اب دیوتا سمجھتی ہوں۔ چاہے تو رہنے دو نہیں تو کہہ دو کہیں منہ میں کالک لگا کر ڈوب مروں۔

**سُورداس** نے دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ سُبھاگی تو آپ سمجھ دار ہے۔ جیسا جی میں آئے کر۔ مجھے تیرا کھلانا پہنانا بھاری نہیں ہے۔ ابھی سہر میں اتنا مان ہے کہ جس کے دروازے پر کھڑا ہو وہ نا نہیں نہ کرے گا۔ لیکن میرا من کہتا ہے کہ تیرے یہاں رہنے سے ہمارا کلیان نہ ہوگا۔ ہم دونوں ہی بدنام ہو جائیں گے میں تجھے اپنی بہن سمجھتا ہوں۔ لیکن اندھا سنسار تو کسی کی نیت نہیں دیکھتا۔ ابھی تو نے دیکھا لوگ کیسی کیسی باتیں کرتے رہے۔ پہلے بھی گالی اٹھ چکی ہے۔ جب تک تو کھلم کھلا میرے گھر میں رہے گی تب تو انرتھ ہی ہو جائے گا۔ لوگ گردن کاٹنے پر اُدھار دہو جائیں گے۔ بتا کیا کروں؟

**سُبھاگی**۔ جو چاہے کرو۔ پر میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی۔

**سُورداس**۔ یہی تیری مرضی (مرضی) ہے تو یہی سہی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ کہیں چلا جاؤں۔ نہ آنکھوں دیکھوں گا نہ پیڑ ہوگی لیکن تیری پیت دیکھ کر اب جانے کا من نہیں ہوتا۔ آ۔ پڑی رہ۔ جیسی کچھ سر پر آئے گی دیکھی جائے گی تجھے منجدھار میں چھوڑ دینے سے بدنام ہونا اچھا ہے۔

یہ کہہ کر سُورداس بھیک مانگنے چلا گیا۔ سُبھاگی جھونپڑی میں آ بیٹھی۔ دیکھا تو اس مختصر گھر کی مختصر گرہستی اِدھر اُدھر پھیلی پڑی تھی۔ کہیں لوٹیا اوندھی پڑی تھی۔ کہیں کپڑے لڑھکے ہوئے تھے۔ مہینوں سے اندر صفائی نہ ہوئی تھی۔

زمین پر منوں گرد جمی ہوئی تھی۔ پھوس کے چھپر میں مکڑیوں نے جالے لگا لئے تھے۔ ایک چڑیا کا گھونسلا بھی بن گیا تھا۔ سُبھاگی تمام دن جھونپڑے کی صفائی کرتی رہی۔ شام کو وہی گھر جو "بن گھرنی گھر بھوت کا ڈیرا" والی کہاوت کو مجسم دکھلا رہا تھا صاف ستھرا لیپا پتا نظر آتا تھا کہ اُسے دیکھ کر رہنے کے لئے دیوتاؤں کا بھی جی للچائے۔ بھیرو تو اپنی دوکان پر چلا گیا تھا۔ سبھاگی گھر جا کر اپنی گٹھڑی اٹھا لائی۔ سُور داس شام کو واپس آیا تو سبھاگی نے تھوڑا سا چرن اُسے جل پان (نہانے) کرنے کو دیا۔ لوٹیا میں پانی لا کر رکھ دیا اور اُسے آنچل سے ہوا کرنے لگی۔ سُور داس کو اپنی زندگی میں کبھی ایسا سُکھ نہ ملا تھا۔ گرہستی کے سُکھ کا اُسے پہلی مرتبہ تجربہ ہُوا۔ دن بھر سڑک کے کنارے لُو اور لپٹ میں چلنے کے بعد یہ سُکھ اُس کو بیکنٹھ کا سا سُکھ معلوم ہُوا۔ ایک لمحہ کے لئے اُس کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا ہو گئی۔ سوچنے لگا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ کاش یہ میری عورت ہوتی تو زندگی کتنے مزہ سے کٹتی۔ اب تو بھیرو نے اسے گھر سے نکال ہی دیا۔ میں رکھ لوں تو اس میں کون سی بُرائی ہے؟ اس سے کہوں کیسے۔ نہ جانے اپنے دل میں کیا خیال کرے۔ میں اندھا ہوں تو کیا آدمی نہیں ہوں۔ بُرا تو نہ مانے گی؟ مجھ سے اسے محبت نہ ہوتی تو میری اتنی سیوا کیوں کرتی؟

کل انسانوں کو بلکہ کل جانداروں کو محبت کی خواہش ہوتی ہے۔ نفس پرست لوگوں کے لئے یہ نفس پرستی کا ذریعہ ہے اور سادگی پسندوں کے لئے قلبی تسکین کا۔

سُبھاگی نے سُور داس کی پوٹلی کھولی۔ تو اُس میں گیہوں کا آٹا نکلا۔ تھوڑے سے چاول کچھ چنے اور تین آنے کے پیسے۔ سُبھاگی بنئے کے یہاں سے دال لائی۔ اور روٹیاں بنا کر سُور داس کو کھانے کے لئے بُلایا۔

**سُور داس۔** مٹھو کہاں ہے؟

**سُبھاگی۔** کیا جانوں کہیں کھیلتا ہوگا۔ دن میں ایک بار پانی پینے آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر چلا گیا۔

سُورداس۔ تجھ سے شرماتا ہوگا۔ دیکھ میں اُسے بُلائے لاتا ہوں۔

یہ کہہ کر سُورداس باہر جاکر مٹھوا کو پُکارنے لگا۔ مٹھوا اور دن جب جی چاہتا تھا گھر میں جاکر دانہ نکال لاتا اور بھُنوا کر چبا تا۔ آج سارا دن بھُوکوں مرا۔ اِس وقت مندر میں پرشاد کے لالچ سے بیٹھا ہُوا تھا۔ آواز سُنتے ہی دَوڑا۔ دونوں کھانے بیٹھے۔ سبھاگی نے سُورداس کے سامنے چاول اور روٹیاں رکھ دیں اور مٹھوا کے سامنے صرف چاول۔ آٹا بہت کم تھا۔ صرف دو روٹیاں جِن سکی تھیں۔

سُورداس نے کہا۔ مٹھوا۔ اور روٹی لوگے؟

مٹھوا۔ مجھے تو روٹی ملی ہی نہیں۔

سُورداس۔ تو مجھ سے لے لو۔ میں چاول ہی کھالوں گا۔

یہ کہہ کر سُورداس نے دونوں روٹیاں مٹھوا کو دے دیں۔ سبھاگی خفا ہو کر مٹھوا سے بولی۔ دن بھر سانڈ کی طرح پھرتے ہو۔ کہیں مجوری کیوں نہیں کرتے؟ اسی چکی گھر میں کام کرو تو پانچ چھ آنے روز ملیں۔

سورداس۔ ابھی وہ کام کرنے کے لائق ہے؟ اسی عمر میں مجوری کرنے لگے گا تو کلیجہ ٹوٹ جائے گا۔

سُبھاگی۔ مجوروں کے لڑکوں کا کلیجہ اتنا نرم نہیں ہوتا۔ سبھی تو کام کرنے جاتے ہیں کسی کا کلیجہ نہیں ٹوٹتا۔

سُورداس۔ جب اس کا جی چاہے گا آپ کام کرے گا۔

سُبھاگی۔ جیسے بنا ہاتھ پیر ہلائے کھانے کو مِل جائے اس کی بَلا کام کرے۔

سُورداس۔ اُونھ مجھے کون کسی رین دھن کا سوچ ہے۔ مانگ کر لاتا ہوں کھاتا ہوں۔ جب پُورکھ نہ چلے گا تب دیکھی جائے گی۔ اُس کی چِنتا (فکر) ابھی سے کیوں کروں؟

سُبھاگی۔ میں اِسے کام پر بھیجوں گی۔ دیکھوں کیسے نہیں جاتا۔ یہ مُفت مَروی ہے کہ اندھا مانگے اور آنکھوں والے مستڈے بیٹھے کھائیں سُنتے ہو

**مٹھوا**۔ کل سے کام کرنا پڑے گا۔

**مٹھوا**۔ تیرے کہنے سے نہ جاؤں گا۔ دادا کہیں تو جاؤں گا۔

**سُبھاگی**۔ موسل کی طرح گھومنا اچھا لگتا ہے۔ اتنا نہیں سوجھتا کہ اندھا آدمی تو مانگ کر لاتا ہے اور میں چین سے کھاتا ہوں۔ بھر بھر لڑکے ہی بنے رہو گے۔

**مٹھوا**۔ تجھ سے کیا مطلب ہے میرا جی چاہے گا جاؤں گا۔ نہ جی چاہے گا نہ جاؤں گا۔

اسی طرح دونوں میں دیر تک محبت ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ **مٹھوا** جھلا کر چوکے پر سے اٹھ گیا۔ سُور داس نے بہت منایا پر وہ کھانے نہ بیٹھا۔ آخر سُور داس بھی آدھا ہی پیٹ کھا کر اٹھ گیا۔

جب وہ لیٹا تو خانہ داری کی ایک دوسری تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہاں نہ وہ سکون تھا نہ وہ آرام نہ وہ خوشی کی اُمنگ۔ پہلے ہی روز یہ جھگڑا شروع ہُوا۔ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ تو آگے کون جانے کیا ہوگا۔ اُسے سُبھاگی کی وہ سخت پسندی نامناسب معلوم ہوتی تھی۔ جب تک میں کمانے کو تیار رہوں لڑکے پر کیوں گرہستی کا بوجھ ڈالوں؟ جب میں مر جاؤں گا تو اُس کے سر پر جیسی پڑے گی ویسی جھیلے گا۔

وہ ننھا سا پودا جو ایک حقیر تمنا کی صورت میں شام کے وقت اُس کے دل میں اُگا تھا اس آگ کی لپٹ سے جل گیا۔ جل کر خاکستر ہو گیا۔

سُبھاگی کو نئی فکر سوار ہوئی۔ مٹھوا کو کام پر کیسے لگاؤں؟ میں کچھ اُس کی لونڈی نہیں ہوں کہ اُس کی خوشامد کروں۔ اُس کا کھانا پکاؤں اور وہ مسٹر گشت کرے۔ مجھے بھی کوئی بیٹھا کر نہ کھلائے گا۔ میں کھاؤں ہی کیوں؟ جب سب کام کریں گے تو یہ کیوں چھیلا بنا گھومے گا۔

صبح جب وہ جھونپڑی سے گھڑا لے کر پانی بھرنے نکلی تو گھیسو کی ماں نے دیکھ کر سینہ پر ہاتھ رکھ لیا اور بولی ۔ کیوں ری۔ آج رات تو نہیں

رہی تھی کیا؟

**سُبھاگی** نے کہا۔ ہاں رہی تو پھر ــــ

**جمنی**۔ اپنا گھر نہیں تھا؟

**سُبھاگی**۔ اب لات کھانے کا بُوتہ نہیں ہے۔

**جمنی**۔ تو تُو دو چار سر کٹا کر تب چین لے گی! اس اندھے کی بھی مت ماری گئی ہے کہ جان بوجھ کر سانپ کے منہ میں انگلی دیتا ہے۔ بھیرو گلا کاٹ لیتے والا آدمی ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ چلی جا گھر کو!

**سُبھاگی**۔ اُس گھر میں تو اب پاؤں نہ رکھوں گی چاہے کوئی مار ڈالے۔ سُور داس میں اتنی دَیا تو ہے کہ ڈوبتے ہوئے کی باہنہ پکڑ لی۔ اور دوسرا یہاں کون ہے؟

**جمنی**۔ جس گھر میں کوئی مہریا (عورت) نہیں وہاں نیارا رہنا اچھا نہیں۔

**سُبھاگی**۔ جانتی ہوں۔ پر کِس کے گھر جاؤں؟ تمہارے گھر آؤں۔ رہنے دو گی؟ جو کچھ کرنے کو کہو گی کروں گی۔ گوبر پاتھوں گی۔ بھینسوں کو گھاس چارا دوں گی۔ پانی ڈالوں گی۔ تمہارا آٹا پیسوں گی۔ رکھو گی؟

**جمنی**۔ نا بابا۔ یہاں کون بیٹھے بٹھائے رار (جھگڑا) مُول لے اپنا کھلاؤں بھی اُس پر بدنامی بھی بنوں۔

**سُبھاگی**۔ تو روج گالی مار کھایا کروں؟

**جمنی**۔ اپنا مرد ہے۔ مارتا ہی ہے تو کیا گھر چھوڑ کر کوئی نکل جاتا ہے؟

**سُبھاگی**۔ کیوں بہت بڑھ بڑھ کر باتیں کرتی ہو جمنا! مِل گیا ہے بَیل۔ جس کل چاہتی ہو بیٹھاتی ہو۔ رات دن ڈنڈا لئے سر پر سوار رہتا تو دیکھتی کہ کیسے گھر میں رہتیں۔ ابھی اُس دن دودھ میں پانی ملانے کے لئے مارنے اُٹھا تھا۔ تو چادر لے کر میکے بھاگی جاتی تھیں۔ دو سردں کو اُپدیس کرنا سہل ہے۔ جب اپنے سر پڑتی ہے تو آنکھیں کھُلتی ہیں۔

یہ کہتی ہوئی سُبھاگی کنوئیں پر پانی بھرنے چلی گئی۔ یہاں بھی اس نے نکتہ چینیوں کو ایسا ہی اکھڑ جواب دیا۔ پانی لاکر برتن دھوئے۔ چوکا لگایا اور سُور داس کو سڑک پہنچانے چلی گئی۔ اب تک وہ لاٹھی سے ٹٹولتا ہُوا اکیلے ہی جایا کرتا تھا مگر سبھاگی سے یہ نہ دیکھا گیا۔ اندھا آدمی کہیں گر پڑے تو۔ لڑکے ہی مذاق کرتے ہیں۔ میں بیٹھی ہی تو ہوں۔ اس سے پھر کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ یہ رائے قائم کر لی گئی کہ سُور داس نے اُسے اپنے گھر ڈال لیا۔ اب قیل و قال یا طعن تشنیع کی کہیں گنجائش نہ تھی۔ ہاں سُور داس سب کی نگاہوں میں سبک ہو گیا۔ لوگ کہتے — روپے نہ لوٹا دینا تو کیا کرتا؟ ڈرتا ہو گا کہ سبھاگی ایک دن بھیرو سے کہہ ہی دے گی۔ میں پہلے ہی سے کیوں نہ ہوشیار ہو جاؤں۔ مگر سبھاگی کیوں اپنے گھر سے روپے اُڑلے گئی؟ واہ اس میں تعجب کی کون سی بات ہے۔ بھیرو سے روپے پیسے نہیں دیتا۔ مالکن تو بڑھیا ہے۔ سوچا ہو گا کہ روپے اُڑا لوں۔ میرے پاس کچھ پونجی تو ہو ہی جائے گی۔ اپنے پاس کہاں رکھتی۔ سور داس کو بھلا آدمی سمجھ کر اُس کے پاس رکھ آئی ہو گی یا کون جانے دونوں میں پہلے ہی سے سانٹھ گانٹھ رہی ہو۔ سور داس نے روپے اٹھوائے ہوں پھر لوٹا آیا ہو کہ اس طرح میرا بھرم بنا رہے گا۔ اندھے پیٹ کے بڑے گہرے ہوتے ہیں۔ انہیں بڑی دور کی سُوجھتی ہے۔

اس طرح کئی دنوں تک گدّے بازیاں ہُوا کیں مگر لوگوں کی یہ عادت نہیں ہوتی کہ کسی معاملہ پر عرصہ تک رائے زنی کرتے رہیں۔ نہ انہیں اتنی فرصت ہوتی ہے کہ ان باتوں میں سر کھپائیں۔ نہ اتنی عقل ہی کہ ان گتھیوں کو سُلجھائیں۔ انسان فطرتاً عملی ہوتے ہیں۔ ان میں زیادہ چھان بین کی سکت کہاں؟ سُبھاگی سے بولنے چالنے اس کے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے میں کسی کو اعتراض نہ رہا۔ نہ کوئی اُس سے کچھ پوچھتا۔ اور نہ اُس پر آوازے کستا۔ ہاں سُور داس کی عزت میں فرق آ گیا۔ پہلے محلّہ بھر میں اُس کی دھاک تھی۔ لوگوں کو اس پر اُس کی حیثیت سے کہیں زیادہ اعتماد تھا۔ اس کا نام ادب کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ اب اُس کا شمار بھی عام آدمیوں میں ہونے لگا۔ کوئی خصوصیت نہ رہی۔

لیکن بھیرو کے دل میں یہ کانٹا ہمیشہ کھٹکا کرتا تھا۔ وہ کسی طرح اس جیتی جاگتی توہین کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ دوکان پر بہت کم جاتا۔ افسروں سے شکایت بھی ہوئی کہ یہ ٹھیکیدار دوکان نہیں کھولتا۔ تاڑی پینے والوں کو مایوس ہو کر واپس جانا پڑتا ہے۔ محکمہ آبکاری کے ملازموں نے بھیرو کو نکال دینے کی دھمکی بھی دی مگر اُس نے کہا کہ مجھے دوکان کی پرواہ نہیں ہے۔ آپ جسے چاہیں رکھ لیں لیکن وہاں کوئی دوسرا پالسی نہ ملا اور افسروں نے ایک دوکان لوٹ جانے کے خیال سے کوئی سختی کرنا مناسب نہ سمجھا۔

رفتہ رفتہ بھیرو کو سورداس ہی سے نہیں بلکہ سارے محلہ سے عداوت ہو گئی۔ اُس کے خیال میں محلہ والوں کا یہ فرض تھا اُس کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتے۔ اور سورداس کو کوئی ایسی سزا دیتے کہ وہ تمام عمر یاد رکھتا۔ ایسے محلہ میں کوئی کیا رہے جہاں انصاف اور بے انصافی دونوں ایک ہی بھاؤ بکیں۔ بُرے کام کرنے والوں سے کوئی بولتا ہی نہیں۔ سورداس اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ یہ چڑیل آنکھوں میں کاجل لگائے پھرا کرتی ہے۔ کوئی ان دونوں کے منہ میں کالک نہیں لگاتا۔ ایسے گاؤں میں تو آگ لگا دینی چاہئے۔ مگر کسی وجہ سے اس کی عملی قوت سُست پڑ گئی تھی۔ وہ راستہ میں سبھاگی کو دیکھ لیتا تو کترا کر نکل جاتا۔ سورداس کو دیکھتا تو ہونٹ چبا کر رہ جاتا۔ وار کرنے کی ہمت نہ ہوتی۔ وہ اب کبھی مندر میں بھجن گانے نہ جاتا۔ میلوں تماشوں سے بھی اُسے نفرت ہو گئی۔ نشہ کا چسکا خود بخود چھوٹ گیا۔ توہین سے پیدا ہونے والا تیز درد دل میں برابر رہتا۔ اُس نے سوچا تھا کہ سبھاگی منہ بند کا لکھ سنا کر کہیں نکل جائے گی۔ میرے کلنک کا داغ مٹ جائے گا۔ مگر وہ ابھی تک وہاں اُس کی چھاتی پر مونگ ہی نہیں دل رہی تھی بلکہ اسی شخص کے ساتھ عیش کر رہی تھی جو اُس کا خاص مخالف تھا۔ سب سے زیادہ رنج اُسے اس بات کا تھا کہ محلہ کے لوگ اُن دونوں کے ساتھ پہلا ہی کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ نہ کوئی اُنہیں ڈانٹتا تھا نہ پھٹکارتا تھا۔ اُسے اپنی ذلت سامنے بیٹھی منہ

پڑتی آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب اُسے گالی گلوچ سے تسکین نہ ہو سکتی تھی۔ وہ فکر میں تھا کہ ان دونوں کا کام تمام کر دوں۔ اس طرح مارو کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پانی کی بوند بھی نہ ملے لیکن اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑاتا پر کہیں سے مدد ملنے کی اُمید نظر نہ آتی۔ محلہ میں ایسے جیوٹے کا کوئی آدمی نہ تھا سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ اندھے نے چتاری کے راجہ صاحب کو بہت بدنام کیا تھا۔ کارخانہ والے صاحب کو بھی بدنام کرتا پھرتا تھا۔ بس انہیں لوگوں سے چل کر فریاد کروں۔ اندھے سے دل میں تو دونوں خار کھائے بیٹھے ہی ہوں گے۔ چھوٹے آدمی کے منہ لگنا اپنی شان کے خلاف سمجھ کر چپ رہ گئے ہوں گے۔ میں جو سامنے کھڑا ہو جاؤں تو میری آڑ سے وہ ضرور نشانہ ماریں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ وہاں تک پہنچنا مشکل ہے لیکن جو کہیں میری پہنچ ہو گئی اور انہوں نے میری سُن لی تو پھر ان بچہ کی ایسی خبر لیں گے کہ سارا اندھا پن نکل جائے گا۔ (اندھے پن کے سوا وہاں اور رکھا ہی کیا تھا!)

کئی دن تک وہ اسی حیض بیض میں پڑا رہا۔ کہ ان لوگوں کے پاس کیسے پہنچوں۔ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ کہیں اُٹھا بھی کو مار بیٹھیں نکلوا دیں تو اور بھی بھد ہو۔ آخر ایک دن وہ دل مضبوط کر کے راجہ صاحب کے پاس گیا اور سائیس کے دروازہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سائیس نے دیکھا تو کرخت لہجہ میں بولا۔ کون ہو؟ یہاں کیا اُچکوں کی طرح جھانک رہے ہو؟

بھیرو نے نہایت عاجزی سے کہا۔ بھیا۔ ڈانٹو مت۔ غریب دُکھی آدمی ہوں۔

سائیس۔ غریب دُکھی ہو تو کسی سیٹھ ساہوکار کے گھر جاتے۔ یہاں کیا رکھا ہے۔

بھیرو۔ غریب ہوں پر بھیک منگا نہیں ہوں۔ اِجت آبرو سبھی کی ہوتی ہے۔ تمہاری ہی برادری میں کوئی کسی کی بہو بیٹی لے کر نکل جائے تو کیا اُسے

پنچایت یوں ہی چھوڑ دے گی؟ کچھ نہ کچھ دنڈ تو دے ہی گی۔ پنچایت نہ دے گی تو عدالت کچہری سے تو کچھ ہوگا۔

سائیس ذات کا چمار تھا جہاں اس قسم کے ناگوار واقعے روز ہی ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان کی وجہ سے برادری کو نشہ پانی کا سامان ملتا رہتا ہے۔ اس کے گھر میں روز یہی چرچا رہتی تھی اور ان باتوں سے اُسے جتنی دلچسپی تھی اُتنی اور کسی بات سے نہ ہو سکتی تھی۔ بولا۔ آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کون بھائی ہو؟

بھیرو۔ پاسی ہوں۔ یہیں پانڈے پور میں رہتا ہوں۔

وہ سائیس کے پاس جا بیٹھا اور دونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں گویا کوئی وہاں کان لگائے اُن کی باتیں سُن رہا ہو۔ بھیرو نے اپنی پوری داستان سُنائی اور کمر سے ایک روپیہ نکال کر سائیس کے ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ بھائی کوئی ایسی جُگت لگاؤ کہ راجہ صاحب کے کانوں میں یہ بات پڑ جائے پھر تو میں اپنا سب حال آپ ہی کہہ لوں گا۔ تمہاری دَیا سے بولنے چالنے میں ایسا بُدھو نہیں ہوں۔ درد گا سے تو کبھی ڈرا ہی نہیں۔

سائیس کو نقرئی سکّہ کے درشن نصیب ہوئے تو مگن ہو گیا۔ آج سبیرے سبیرے اچھی بوہنی ہوئی۔ بولا "میں راجہ صاحب سے تمہاری اطلاع کرائے دیتا ہوں۔ بلاویں تو چلے جانا۔ راجہ صاحب کو گھمنڈ تو چھو ہی نہیں گیا۔ مگر دیکھنا بہت دیر نہ لگانا نہیں تو مالک چڑھ جائیں گے۔ بس جو کچھ کہنا ہو صاف صاف کہہ ڈالنا۔ بڑے آدمیوں کو بات چیت کرنے کی چھٹی نہیں رہتی۔ میری طرح تھوڑے ہی ہیں کہ دن بھر بیٹھے ہوئے گپیں لڑایا کریں۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ راجہ صاحب اس وقت حجامت بنوا رہے تھے جو اُن کا روزانہ معمول تھا۔ سائیس نے پہنچ کر سلام کیا۔

راجہ۔ کیا کہتے ہو؟ میرے پاس طلب کے لئے مت آیا کرو۔

سائیس۔ نہیں حجور طلب کے لئے نہیں آیا تھا۔ وہ جو سُور داس پانڈے پور

میں رہتا ہے۔

راجہ۔ اچھا وہ بدمعاش اندھا۔

سائیس۔ ہاں ہجور وہ ایک عورت کو نکال لے گیا ہے۔

راجہ۔ اچھا۔ اُسے تو لوگ کہتے تھے کہ بڑا بھلا آدمی ہے۔ اب یہ سوانگ رچنے لگا۔

سائیس۔ ہاں ہجور۔ اس عورت کا آدمی پھریاد کرنے آیا ہے حکم ہو تو لاؤں۔

راجہ صاحب نے سر ہلا کر منظوری دے دی اور ایک لمحہ میں بھیرو دیکھتا ہوا سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

راجہ۔ تمہاری عورت ہے؟

بھیرو۔ ہاں ہجور ابھی کچھ دن پہلے تو میری ہی تھی۔

راجہ۔ پہلے سے کچھ آنا درفت تھی؟

بھیرو۔ ہو گی سرکار۔ مجھے معلوم نہیں۔

راجہ۔ لے کر کہاں چلا گیا؟

بھیرو۔ کہیں گیا نہیں سرکار۔ اپنے گھر میں ہے۔

راجہ۔ بڑا ڈھیٹ ہے۔ محلہ والے کچھ نہیں بولتے؟

بھیرو۔ کوئی نہیں بولتا۔ ہجور۔

راجہ۔ عورت کو مارتے بہت ہو؟

بھیرو۔ سرکار۔ عورت سے بھول چوک ہوتی ہے۔ تو کون نہیں مارتا؟

راجہ۔ بہت مارتے ہو کم؟

بھیرو۔ ہجور گُسائیں یہ بچارا کہاں رہتا ہے؟

راجہ۔ کیسی عورت ہے؟ خوب صورت؟

بھیرو۔ ہاں ہجور۔ دیکھنے سُننے میں بُری نہیں ہے۔

راجہ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ خوب صورت عورت نے اندھے کو کیوں پسند کیا۔ ایسا تو نہیں ہُوا کہ تم نے دال میں نمک زیادہ ہو جانے پر عورت کو مار کر نکال دیا ہو اور

اندھے نے اُسے رکھ لیا ہو؟

**بھیرو۔** سرکار۔ عورت میرے روپے چُرا کر سُور داس کو دے آئی بیچارہ داس روپے لوٹا گیا۔ میں نے چکمہ دے کر پوچھا تو اُس نے چور کو بھی بتا دیا۔ اس بات پر مارتا نہ تو کیا کرتا؟

**راجہ۔** اور کچھ ہو پر اندھا ہے دل کا صاف۔

**بھیرو۔** مجبور نیت کا اچھا نہیں۔

اگرچہ مہندر کمار سنگھ بہت منصف مزاج تھے اور اپنے بُرے خیالوں کو ظاہر کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے جیسا کہ شہرت یافتہ انسان کو عموماً اپنی زبان پر پورا قابو ہوتا ہے۔ مگر وہ سور داس سے اتنے جلے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھوں انہیں روحانی تکلیفیں انہیں ملی تھیں کہ وہ اس وقت اپنے خیالات کو پوشیدہ نہ رکھ سکے۔ بولے "اجی اُس نے یہاں مجھے اتنا بدنام کیا کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔ کلاں کا صاحب نے اُسے ذرا منہ کیا لگا لیا کہ وہ سر چڑھ گیا۔ یوں میں کسی غریب کو ستانا نہیں چاہتا مگر یہ بھی نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بھلے آدمیوں کے بال نوچے۔ اجلاس تو میرا ہی ہے۔ تم اس پر دعوے کر دو۔ گواہ تو مل جائیں گے نا؟"

**بھیرو۔** مجبور سارا محلہ جانتا ہے۔

**راجہ۔** سب کو پیش کر دو۔ یہاں لوگ اُس کے مرید ہو گئے ہیں۔ سمجھتے ہیں یہ کوئی دیوتا ہے۔ میں اُس کی قلعی کھول دینا چاہتا ہوں۔ اتنے دنوں کے بعد یہ موقع میرے ہاتھ لگا ہے۔ میں نے اگر اب تک کسی سے پنجا دیکھا تو اسی اندھے سے۔ اُس پر نہ پولیس کا زور تھا نہ عدالت کا۔ اُس کی بیکسی اور کمزوری اُس کی زرہ بکتر بنی ہوئی تھی۔ یہ مقدمہ اُس کے لئے گہرا گڑھا ہو گا جس میں سے وہ نکل نہ سکے گا۔ مجھے اُس کی جانب سے اندیشہ تھا۔ مگر ایک بار یہاں پر وہ کھلا کہ میں بے فکر ہو جاؤں گا۔ زہر کے دانت ٹوٹ جانے پر سانپ سے کون ڈرتا ہے؟ ہو سکے تو جلد ہی یہ مقدمہ داخل کر دو۔

کسی بڑے آدمی کو روتے دیکھ کر ہمیں اُس سے محبت ہو جاتی ہے۔ اُسے ذی اقتدار سمجھ کر ہم تھوڑی دیر کے لئے بھول جاتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہے۔ ہم اُسے عام انسانی کمزوریوں سے بالا خیال کرتے ہیں۔ وہ ہمارے لئے ایک حیرت کی چیز بن جاتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ وہ نہ جانے کیا کھاتا ہوگا۔ نہ جانے کیا پڑھتا ہوگا۔ نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ اس کے دل میں ہمیشہ اونچے اونچے خیالات آتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف تو اُس کا دھیان ہی نہ جاتا ہوگا۔ اسی حیرت کی پاکیزہ شکل ہی احترام ہے۔

بھیرو کو راجہ صاحب کے سامنے جاتے ہوئے خوف معلوم ہوتا تھا لیکن اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ بھی ہمیں جیسے انسان ہیں۔ گویا اُسے آج ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ ذرا بیدھڑک ہو کر بولا "مجبور ہے، تو اندھا پر ڈا گھنڈی ہے۔ اپنے آگے تو کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ محلہ والے جرا سُور داس سُور داس کہہ دیتے ہیں تو بس پھول اُٹھتا ہے۔ سمجھتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ ہوں میں ہی ہوں۔ مجور اُس کی ایسی سجا (سزا) کر دیں۔ کہ چکی پیسے پیستے دن جائیں۔ تب اُس کی عقل ٹھکانے ہو گی"۔ راجہ صاحب نے تیور بدلے۔ دیکھا کہ یہ گنوار اب زیادہ بہکنے لگا۔ بولے — اچھا اب جاؤ۔

بھیرو دل میں سمجھ رہا تھا کہ میں نے راجہ صاحب کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔ اگر اُسے چلے جانے کا حکم نہ ہوا ہوتا تو ایک لمحہ میں اُس کا مجور آپ میں بدل جاتا۔ شام تک اُس کی باتوں کا سلسلہ نہ ختم ہوتا۔ وہ نہ جانے کتنی جھوٹی باتیں گھڑتا۔ غلبیت کا انسان کی زبان پر کبھی اتنا قابو نہیں چلتا جتنا بڑے لوگوں کے سامنے۔ نہ جانے کیوں ہم اُن کی نظر نوازش کے اتنے متمنی ہوتے ہیں؟ ہم ایسے لوگوں پر بھی جن سے ہمیں ذرا بھی رنجش نہیں ہے حملے کرنے لگتے ہیں۔ کوئی غرض نہ رکھتے ہوئے ہم اُن کی نگاہوں میں رسوخ پانا چاہتے ہیں۔ ان کا اعتماد حاصل کرنے کی ہمارے دل میں ایک بے اختیارانہ تحریک ہوتی ہے۔ ہماری زبان اس وقت قابو سے باہر ہو جاتی ہے۔

بھیرو یہاں سے کچھ نادم ہو کر نکلا۔ مگر اُسے اب اس بات میں شبہ نہ تھا کہ میری مرضی پوری ہو گئی۔ گھر جا کر اُس نے بجرنگی سے کہا — تمہیں گواہی دینی ہوگی۔

نکل نہ جانا۔

**بجرنگی** ۔ کیسی گواہی؟

بھیرو ۔ یہی میرے معاملے کی۔ اس اندھے کی ہیکڑی اب نہیں دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں تک صبر کئے بیٹھا رہا۔ کہ اب بھی وہ سیدھی کو نکال دے۔ اُس کا جہاں جی چاہے چلی جائے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دُور ہو جائے۔ پر دیکھتا ہوں۔ تو دن دن اُس کی ہٹ بڑھتی جاتی ہے۔ اندھا چھیلا بنا جاتا ہے۔ مہینوں بدن پر پانی نہیں پڑتا تھا۔ اب تب نہاتا ہے۔ وہ پانی لاتی ہے۔ اُس کی دھوتی چھانٹتی ہے۔ اُس کے سر میں تیل لگاتی ہے۔ یہ اندھیر نہیں دیکھا جاتا۔

**بجرنگی** ۔ اندھیر تو ہے ہی۔ آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ سُور داس کو اتنا چھچھورا نہ سمجھتا تھا۔ پر میں کہیں گواہی سواکھی کرنے نہ جاؤں گا۔

**جمنی** ۔ کیوں کچہری میں کوئی تمہارے کان کاٹ لے گا؟

**بجرنگی** ۔ اپنا سوہے نہیں جاتے۔

**جمنی** ۔ اچھا تمہارا من ہے۔ بھیرو تم گواہی لکھا دو۔ میں چل کر گواہی دوں گی۔ سانچ کو آنچ کیا؟

**بجرنگی** ۔ (ہنس کر) تو کچہری جائے گی؟

**جمنی** ۔ کیا کروں گی؟ جب مردوں کی وہاں جائے چوڑیاں میلی ہوتی ہیں۔ تو عورتیں ہی جائیں گی۔ کسی طرح اس کمینے کے مُنہ میں کالکھ تو لگے۔

**بجرنگی** ۔ بھیرو بات یہ ہے کہ سُور داس نے بُرائی بَرُور کی پر تم بھی تو بُری راہ پر ہی چلتے تھے۔ کوئی اپنے گھر کے آدمی کو اتنی بیدردی سے نہیں مارتا۔ پھر تم نے مارا ہی نہیں مار کر نکال بھی دیا۔ جب گائے کے پگہیا نہ رہے گی تو وہ دوسروں کے کھیت میں بجرُور ہی جائے گی۔ اس میں اُس کا کیا دُکھ؟

**جمنی** ۔ تم انہیں بکنے دو بھیرو۔ میں تمہاری گواہی دوں گی۔

**بجرنگی** ۔ تو سوچتی ہوگی۔ یہ دھمکی دینے سے میں کچہری جاؤں گا۔ تو میں اتنا

بُدھو نہیں ہوں۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ سُور داس لاکھ بُرا ہو۔ مگر اب بھی ہم سبوں سے اچھا ہے۔ روپیوں کی تھیلی لوٹا دینا کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔

جمنی۔ بھی چپ رہو۔ میں تمہیں کھوب جانتی ہوں۔ تم بھی جا کر چار گال سنا بول آنے ہونا۔ کیا اتنی یاری بھی نہ نبا ہو گے؟ سُبھاگی کو سجا ہو گئی تو تمہیں بھی تو فخر (نظر) لڑانے کے لئے کوئی نہ رہے گا۔

بجرنگی یہ سُن کر تلملا اُٹھا (جمنی اسے راہ پر لانا جانتی تھی) بولا ۔۔۔ منہ پر کپڑے پڑ جائیں گے۔

جمنی۔ تو پھر گواہی دینے کیوں کر رہتی ہے؟

بجرنگی۔ لکھا دو بھیرو میرا نام۔ یہ چڑیل مجھے جینے نہ دے گی۔ میں اگر مارتا ہوں تو اسی سے۔ میری پیٹھ میں اگر دھول لگتی ہے تو یہی۔ نہیں تو یہاں کبھی کسی سے دب کر نہیں چلے۔ جاؤ۔ لکھا دو۔

بھیرو یہاں سے ٹھاکر دین کے پاس گیا اور یہی بات کہی۔

ٹھاکر دین نے کہا "ہاں ہاں۔ میں گواہی دینے کو تیار ہوں۔ میرا نام سب سے پہلے لکھا دو۔ اندھے کو دیکھ کر میری تو اب آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ جرور (ضرور) کوئی جادو جانتا ہے۔ نہیں تو کیا سبھاگی اُس کے پیچھے یوں دوڑی دوڑی پھرتی"۔

بھیرو۔ چکی پیسیں گے تو سچ کو معلوم ہو گا۔

ٹھاکر دین۔ نا بھیا۔ اس کا اِکبال بھاری ہے۔ وہ کبھی چکی نہ پیسے گا۔ وہاں سے بھی بے لاگ لوٹ آئے گا۔ ہاں گواہی دینا میرا دھرم ہے۔ وہ میں جرور کروں گا۔ جو آدمی جادو سے دوسروں کو اَن بھل کرے اُس کی گردن کاٹ لینی چاہیئے۔ نہ جانے بھگوان کیوں سنسار میں چوروں اور پاپیوں کو جنم دیتے ہیں۔ یہی سمجھ لو کہ جب سے میری چوری ہوئی کبھی نیند بھر نہیں سویا۔ رہ رہ کر وہی چنتا بنی رہتی ہے۔ یہی کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں پھر نہ وہی نوبت آ جائے۔ تم کو ایک

حساب سے مجھے (مزہ) میں رہے کہ روپے سب مل گئے۔ یوں تو کہیں کا نہ رہا۔

**بھیرو** ۔ تو تمہاری گواہی کچی رہی۔

**ٹھاکر دین** ۔ ہاں ایک بار نہیں۔ سو بار پکی۔ ارے میرا بس چلتا تو بیڑا اسے زمین کھود کر گاڑ دیتا۔ یوں مجھ سے سیدھا کوئی نہیں ہے۔ لیکن بدمعاشوں کے حق میں مجھ سے ٹیڑھا بھی کوئی نہیں ہے۔ ان کو ڈنڈ دلانے کے لئے میں جھوٹی گواہی بھی دینے کو تیار ہوں۔ مجھے تو تعجب ہوتا ہے کہ اس اندھے کو ہو کیا گیا۔ کہاں تو دھرم کرم کا اتنا بچار اور کہاں یہ بُرا کام۔

بھیرو یہاں سے جگدھر کے پاس گیا جو ابھی خوانچہ فروش کر کے واپس آیا تھا اور دھوتی لئے نہانے جا رہا تھا۔

**بھیرو** ۔ تم بھی میرے گواہ ہو نہ؟

**جگدھر** ۔ تم حق ناحق (حق ناحق) بیچارے سور داس پر ڈالا رہے ہو۔ سور داس بے گناہ ہے۔

**بھیرو** ۔ کسم کھاؤ گے۔

**جگدھر** ۔ ہاں چوکسم کہو کھا جاؤں۔ تم نے سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ سُورداس نے اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ نہیں تو اب تک وہ نہ جانے کس گھاٹ لگی ہوتی۔ جوان عورت ہے۔ سُندر ہے۔ اُس کے سینکڑوں گاہک ہیں۔ سُور داس نے تو اُس کے ساتھ نیکی کی کہ کہیں بہکنے نہ دیا۔ اگر تم پھر اُسے گھر میں لا کر رکھنا چاہو اور وہ اُسے نہ آنے دے۔ تم سے لڑنے پر تیار ہو جائے تب میں کہوں گا کہ اُس کا کسور ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے اُسے سُبھاگی کو سمجھاتے سُنا ہے۔ وہ آتی نہیں تو بیچارہ کیا کرے؟

**بھیرو** سمجھ گیا کہ لوٹا جل سے آسودہ ہونے والا دیوتا نہیں ہے۔ اسے کچھ بھینٹ دینی پڑے گی۔ اس کے لالچی سُبھاؤ سے وہ واقف تھا۔ بولا ۔ "بھائی۔ ناحق اجت کا ہے۔ ایسی اُڑن گھاٹیاں نہ بتاؤ۔ پڑوسی کا حق بہت ہوتا ہے۔

پر میں تم سے باہر نہیں ہوں۔ جو کچھ دس بیس کہو۔ حاجر ہے پر گواہی تمہیں دینی پڑے گی۔"

**جگدھر۔** بھیرو۔ میں بہت نیچ ہوں۔ لیکن اتنا نہیں کہ جان بوجھ کر کسی بھلے مانس کو بے کسور پھنساؤں۔

**بھیرو** نے بگڑ کر کہا۔ "تو کیا تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ہی نام کھدائی (خدائی) لکھ گئی ہے۔ جس بات کو سارا گاؤں کہے گا اُسے ایک تم نہ کہو گے تو کیا بگڑ جائے گا؟ بڈھی کے روپے آندھی نہیں رُک سکتی۔

**جگدھر۔** تو بھائی اُسے پیسے کر پی جاؤ۔ میں کب کہتا ہوں کہ میں اُسے بچا لوں گا۔ ہاں میں اُسے پیسے میں تمہاری مدد نہ کروں گا۔

**بھیرو** تو اُدھر گیا اِدھر وہی خود غرض۔ لالچی۔ حاسد۔ بدمزاج جگدھر اُس کے گواہوں کو پھوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُسے سُورداس سے اتنی عقیدت نہیں تھی جتنا بھیرو سے حسد۔ بھیرو اگر کسی نیک کام میں بھی اُس سے مدد مانگتا تو بھی وہ اتنی ہی سرگرمی سے اُس کی مخالفت کرتا۔

اُس نے بجرنگی کے پاس جا کر کہا۔ "کیوں بجرنگی تم بھی بھیرو کی گواہی کر رہے ہو؟"

**بجرنگی۔** ہاں جاتا تو ہوں۔

**جگدھر۔** تم نے اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھا ہے؟

**بجرنگی۔** کیسی باتیں کرتے ہو؟ روج ہی دیکھتا ہوں۔ کوئی بات چھپی تھوڑے ہی ہے۔

**جگدھر۔** کیا دیکھتے ہو یہی نہ کہ سبھاگی سُورداس کے جھونپڑے میں رہتی ہے؟ اگر کوئی ایک انا تھ (بے کس) عورت کا پالن کرے تو کوئی بُرائی ہے؟ اندھے آدمی کے جیوٹ کی سراہنا تو نہ کرو گے کہ جو کام کسی سے نہ ہو سکا وہ اُس نے کر دکھایا۔ اُلٹا اُس سے اور بیر کرتے ہو۔ جانتے ہو۔ سُورداس اُسے گھر سے

نکال دے گا تو اُس کی کیا گت ہو گی ؛ محلّہ کی آبرو پتلی گھر کے مجوروں کے ہاتھ بکے گی۔ دیکھ لینا۔ میرا کہنا مانو۔ گواہی ساکھی کے پھیر میں نہ پڑو۔ بھلائی کے بدلے بُرائی ہو جائے گی۔ بھیرو تو سبھاگی سے اس لئے جل رہا ہے کہ اُس نے اُس کے چُرائے ہوئے روپے سُور داس کو کیوں لوٹا دئے۔ بس ساری جلن اسی کی ہے۔ ہم بنا جانے بُوجھے کیوں کسی کی بُرائی کریں۔ ہاں گواہی دینے ہی جاتے ہو تو پہلے کھوب پتہ لگا لو۔ کہ دونوں کیسے رہتے ہیں۔

**بجرنگی** ۔ (جمنی کی طرف اشارہ کر کے) اسی سے پوچھو۔ یہی سب کے مَن کی جانتی ہے۔ اسی نے مجھے مجبور کیا ہے۔

**جمنی** ۔ ہاں کیا تو ہے۔ کیا اب بھی دل کانپ رہا ہے ؟

**جگدھر** ۔ عدالت میں جا کر گواہی دینا کیا تم نے ہنسی سمجھ لی ہے ؛ گنگا جلی اٹھانی پڑتی ہے۔ تلسی دل لینا پڑتا ہے۔ بیٹے کے سر پہ ہاتھ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی سے تو بال بچّے والے لوگ ڈرتے ہیں کہ اور کچھ۔

**جمنی** ۔ سچ کہو۔ یہ سب کسمیں بھی کھانی پڑتی ہیں ؟

**جگدھر** ۔ بنا کسم کے تو گواہی لگتی ہی نہیں۔

**جمنی** ۔ تو بھیّا۔ باج آئی ایسی گواہی سے کان پکڑتی ہوں۔ چُولھے میں جائے سُور داس اور بھاڑ میں جائے بھیرو۔ کوئی بُرے دن کام نہ آئے گا۔ تم رہنے دو۔

**بجرنگی** ۔ سور داس کو لڑکپن سے دیکھ رہے ہیں۔ ایسی عادت تو اُس میں نہیں تھی۔

**جگدھر** ۔ نہ تھی نہ ہے اور نہ ہو گی۔ اس کی بُرائی نہیں کرتا پر اُسے لاکھ روپے بھی دو تو بُرائی میں ہاتھ نہ ڈالے گا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو گیا ہُوا دھن پا کر چپکے سے رکھ لیتا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ نہیں تو جا کر سب روپے دے آیا۔ اُس کی سچائی تو اتنے ہی سے ہو جاتی ہے۔

بجرنگی کو چھوڑ کر جگدھر نے ٹھاکر دین کو گھیرا۔ وہ پوجا کر کے کھانا کھانے جا

رہا تھا۔ جگدھر کی آواز سُن کر بولا ــــ بیٹھو، بھوجن کر کے آتا ہوں۔

**جگدھر۔** میری بات سُن لو تو کھانے بیٹھو۔ کھانا کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ تم بھی بھیرو کی گواہی دینے جا رہے ہو؟

**ٹھاکر دین۔** ہاں جانتا ہوں۔ بھیرو نے نہ کہا ہوتا تو آپ ہی جانتا۔ مجھ سے یہ رَنیت (بُرا کام) نہیں دیکھا جاتا۔ جمانا دوسرا ہے۔ نہیں تو ابھی ہوتی تو ایسے آدمی کا سر کاٹ لیا جاتا۔ کسی کی بہو بیٹی کو نکال لے جانا کوئی ہنسی ٹھٹھا ہے؟

**جگدھر۔** جانا پڑتا ہے۔ دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے تم بھی انتر جامی (عالم الغیب) ہو گئے ہو۔ پوچھتا ہوں۔ کس بات کی گواہی دو گے؟

**ٹھاکر دین۔** کوئی لکی چھپی بات ہے۔ سارا دیس تو جانتا ہے۔

**جگدھر۔** سُور داس بڑا گیانی پرُوش ہے۔ اسی سے سُندری کا من اُس پر لوٹ پوٹ ہو گیا ہو گا۔ یا اُس کے گھر میں روپے پیسے گہنے جیور کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اسی سے عورت لالچ میں پڑ گئی ہو گی۔ بھگوان کو دیکھا نہیں پر اکل سے تو پہچانا ہے۔ آہ کیا دیکھ کر سُبھاگی نے بھیرو کو چھوڑ دیا اور سُور داس کے گھر پڑ گئی؟

**ٹھاکر دین۔** کوئی کسی کے من کی بات کیا جانے اور عورت کے من کی بات تو بھگوان بھی نہیں جانتے۔ اس سے دیوتا لوگ تک نراہ نراہ کرتے ہیں۔ (پناہ مانگتے ہیں)۔

**جگدھر۔** اچھا تو جاؤ، پر کہے دیتا ہوں کہ اس کا پھل بھوگنا پڑے گا۔ کسی گریب پر جھوٹھا اپرادھ لگانے سے بڑا دوسرا پاپ نہیں ہوتا۔

**ٹھاکر دین۔** جھوٹھا اپرادھ ہے؟

**جگدھر۔** جھوٹا ہے۔ سراسر جھوٹا۔ رتی بھر بھی سچ نہیں۔ بے بس کی وہ ہائے پڑے گی کہ عمر بھر یاد کرو گے۔ جو آدمی اپنا گیا ہُوا دھن پا کر لوٹا دے۔ وہ اتنا نیچ نہیں ہو سکتا۔

**ٹھاکر دین۔** (ہنس کر) یہی تو اندھے کی چالاکی ہے۔ کیسی دُور کی سُوجھی

ہے کہ جو سُنے چکر میں آجائے۔

**جگدھر۔** بیرے نے بتا دیا۔ آگے تم جانو تمہارا کام جانے رکھو گے سُبھاگی کو اپنے گھر بیٹھے میں اُسے سُورداس کے گھر سے لوائے لاتا ہوں۔ اگر پھر بھی سُورداس کو اس سے باتیں کرتے دیکھنا تو جو چاہنا وہ کرنا۔ بولو۔ رکھو گے؟

**ٹھاکر دین۔** میں کیوں رکھنے لگا؟

**جگدھر۔** تو اگر مہادیو جی نے سنسار بھر کا بس (زہر) ماتھے چڑھا لیا تو کیا بُرا کیا؟ جس کے لئے کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ اُسے سُورداس نے اپنے گھر میں جگہ دی۔ اس نیکی کی اُسے یہ سزا ملنی چاہیئے؟ یہی نیاے ہے؟ اگر تم لوگوں کے دباؤ میں پڑکر سُورداس نے سبھاگی کو گھر سے نکال دیا اور اُس کی آبرو بگڑی تو اس کا پاپ تمہارے سر بھی پڑے گا۔ یہ خوب یاد رکھنا۔

ٹھاکر دین شنکی اور ڈرپوک تھا۔ پس وپیش میں پڑ گیا۔ جگدھر نے یہ بات تاڑ لی۔ اسی دھنگ کی دو چار باتیں اور کہیں۔ آخر ٹھاکر دین گواہی دینے سے انکار کرنے لگا۔ جگدھر کا حسد کسی سادھو کی نصیحت کا کام کر گیا۔ شام ہوتے ہوتے بھیرو کو معلوم ہو گیا کہ محلہ میں کوئی گواہ نہ ملے گا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔ چراغ جل رہے تھے۔ بازار کی اور دوکانیں بند ہو رہی تھیں۔ تاڑی کی دوکان کھولنے کا وقت قریب آرہا تھا۔ گاہک جمع ہوتے جا رہے تھے۔ بڑھیا گزک کے لئے مٹر کی دال موٹ اور چرپھری پکوڑیاں بنا رہی تھی اور بھیرو دروازہ پر بیٹھا ہُوا جگدھر کو محلہ والوں کو اور ساری دُنیا کو صلواتیں سُنا رہا تھا۔ سب کے سب نامرد ہے ہیں۔ آنکھ کے اندھے جبھی تو یہ دُردسا ہو رہی ہے۔ کہتے ہیں سُوکھا کیوں پڑتا ہے۔ پلیگ کیوں آتی ہے۔ ہیضہ کیوں پھیلتا ہے؟ جہاں ایسے ایسے بے ایمان۔ پاپی دُشٹ بسیں گے۔ وہاں اور ہو گا ہی کیا؟ بھگوان اس دیس کو گارت کیوں نہیں کر دیتے۔ یہی اچرج (تعجب) ہے۔ گھیر۔ جند گانی ہے تو ہم اور جگدھر اسی جگہ رہتے ہیں۔ دیکھی جائے گی۔

غصہ کے جوش میں اپنی نیکیاں بہت یاد آتی ہیں۔ بھیرو اُن احسانات کا بیان کرنے لگا۔ جو اُس نے جگدھر پر کئے تھے ـــــ اس کی گھر والی مر رہی تھی۔ کسی نے بتا دیا کہ تاجی تاڑی پیئے تو بچ جائے۔ منہ اندھیرے پیڑ پر چڑھتا تھا۔ اور تاجی تاڑی اُتار کر اُسے پلاتا تھا۔ کوئی پانچ روپے بھی دیتا تو اُتنے تڑکے پیڑ پر نہ چڑھتا۔ مٹکوں تاڑی پلا دی ہوگی۔ تمباکو پینا ہوتا ہے تو یہیں آتا ہے۔ روپے پیسے کا کام لگتا ہے تو یہیں ہی کام آتا ہوں۔ اور میرے ساتھ یہ گھات! جمانا ہی ایسا ہے۔

جگدھر کا گھر ملا ہوا تھا۔ یہ سب سُن رہا تھا اور منہ نہ کھولتا تھا۔ وہ سامنے سے وار کرنے میں نہیں۔ پیچھے سے وار کرنے میں طاق تھا۔

اتنے میں مل کا ایک مستری نیم آستین پہنے کوئلے کی بھبھوت لگائے اور کوئلہ ہی کا سا رنگ۔ ہاتھ میں ہتھوڑا لئے جھروددھا جوتہ ڈالے آکر بولا ـــــ چلتے ہو دوکان پر کہ اسی جھنجھٹ میں پڑے رہوگے؟ دیر ہو رہی ہے ـــ ابھی صاحب کے بنگلہ پر جانا ہے۔

بھیرو۔ اجی جاؤ، تمہیں دوکان کی پڑی ہوئی ہے۔ یہاں ایسا جی جل رہا ہے۔ کہ گاؤں میں آگ لگا دوں۔

مستری۔ کیا ہے کیا؟ کس بات پر بگڑ رہے ہو؟ میں بھی تو سُنوں۔

بھیرو نے مختصر اُساری داستان سُنا دی اور گاؤں والوں کی بزدلی اور کمینہ پن کا دُکھڑا رونے لگا۔

مستری۔ گاؤں والوں کو مار دو گولی۔ تمہیں کتنے گواہ چاہئے۔ جتنے گواہ کہو دے دُوں۔ ایک۔ دو۔ دس۔ بیس بھلے آدمی۔ پہلے ہی کیوں نہ کہا؟ آج ہی ٹھیک ٹھاک کئے دیتا ہوں۔ بس سبوں کو بھر بھر پیٹ پلا دینا۔

بھیرو کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا ـــ تاڑی کی کون بات ہے۔ دوکان تمہاری ہے۔ جتنی چاہو پیو پر جرا معتبر گواہ دلانا۔

مستری۔ اجی کہو تو بابو لوگوں کو حاضر کر دوں۔ بس ایسی پلا دینا۔ کہ

سب یہیں سے گرتے پڑتے گھر پہنچیں۔

بھیرو۔ اجی کہو تو اتنی پلا دوں کہ دو چار لاشیں اُٹھ جائیں۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں دوکان پر پہنچے۔ وہاں بیس پچیس آدمی جو اسی کارخانہ کے ملازم تھے۔ بڑے شوق سے بھیرو کی راہ دیکھ رہے تھے۔ بھیرو نے تو پہنچتے ہی تاڑی ناپنی شروع کی اور اِدھر مستری نے گواہوں کو تیار کرنا شروع کیا۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔

ایک۔ موقع اچھا ہے۔ اندھے کے گھر سے نکل کر جائے گی کہاں؟ بھیرو اب اُسے نہ رکھے گا۔

دوسرا۔ آخر ہمارے دل بہلاؤ کا بھی تو کوئی سامان ہونا چاہیے۔

تیسرا۔ بھگوان نے آپ ہی بھیج دیا۔ بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

ادھر یہ مشورے ہو رہے تھے۔ اُدھر سبھاگی سُور داس سے کہہ رہی تھی۔ "تمہارے اوپر دعوے ہو رہا ہے۔" سُور داس نے گھبرا کر پوچھا — "کیسا دعوے؟"

سبھاگی۔ مجھے بھگا لانے کا۔ گواہ ٹھیک کئے جا رہے ہیں۔ گاؤں کا تو کوئی آدمی نہیں ملا۔ لیکن پتلی گھر کے بہت سے مجورے تیار ہیں۔ مجھ سے ابھی جگدھر کہہ رہے تھے کہ پہلے گاؤں کے سب آدمی گواہی دینے جا رہے تھے۔

سُور داس۔ پھر رُک کیسے گئے؟

سبھاگی۔ جگدھر نے سب کو سمجھا بجھا کر روک لیا۔

سُور داس۔ جگدھر بڑا بھلا مانس ہے۔ مجھ پر بڑی مہربانی کرتا رہتا ہے۔

سبھاگی۔ تو اب کیا ہوگا؟

سُور داس۔ دعوے کرنے دو۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تو یہی کہہ دینا کہ میں بھیرو کے ساتھ نہ رہوں گی۔ کوئی وجہ پوچھے تو صاف صاف کہہ دینا کہ مجھے بہت مارتا ہے۔

سبھاگی۔ مگر اس میں تمہاری کتنی بدنامی ہوگی۔

سُور داس۔ بدنامی کی چنتا نہیں۔ جب تک وہ تجھے رکھنے کو راجی نہ ہوگا میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا۔

سبھاگی۔ وہ راجی بھی ہوگا تو اُس کے گھر نہ جاؤں گی۔ وہ دل کا بڑا کھوٹا آدمی ہے۔ اُس کی کسر ضرور نکالے گا۔ تمہارے گھر سے بھی چلی جاؤں گی۔

سُور داس۔ میرے گھر سے کیوں چلی جائے گی؟ میں تو تجھے نہیں نکالتا۔

سُبھاگی۔ میرے کارن تمہاری کتنی جگ ہنسائی ہوگی۔ محلہ والوں کا تو مجھے کوئی ڈر نہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ کسی کو تمہارے اوپر سُبھا (شبہ) نہ ہوگا۔ اور ہوگا بھی تو چھن بھر میں دُور ہو جائے گا۔ لیکن یہ پتلی گھر کے اوجڈ مجورے تمہیں کیا جانیں۔ بھیرو کے یہاں سب کے سب تاڑی پیتے ہیں۔ وہ انہیں ملا کر تمہاری آبرو بگاڑ دے گا۔ میں یہاں نہ رہوں گی تو اُس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ بس کی گانٹھ تو میں ہی ہوں۔

سُور داس۔ جائے گی کہاں؟

سُبھاگی۔ جہاں اس کے مُنہ میں کالِکھ لگا سکوں۔ جہاں اس کی چھاتی پہ مونگ دَل سکوں۔

سُور داس۔ اُس کے منہ میں کالِکھ لگے گی تو میرے منہ میں پہلے ہی نہ لگ جائے گی۔ تو میری بہن ہی تو ہے۔

سُبھاگی۔ نہیں میں تمہاری کوئی نہیں ہوں۔ مجھے بہن بیٹی نہ بناؤ۔

سُور داس۔ میں کہے دیتا ہوں کہ اس گھر سے نہ جانا۔

سُبھاگی۔ میں اب تمہارے ساتھ رہ کر تمہیں بدنام نہ کروں گی۔

سُور داس۔ مجھے بدنامی قبول ہے۔ لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ تو کہاں جائے گی۔ تب تک میں تجھے جانے ہی نہ دوں گا۔

بھیرو نے رات تو کسی طرح کاٹی۔ علی الصباح کچہری دوڑا۔ وہاں ابھی دروازے بند تھے۔ مہتر جھاڑو لگا رہے تھے۔ بس وہ ایک درخت کے نیچے دھیان لگا کر

بیٹھ گیا۔ نو بجے سے عملے بستے بغل میں دبائے ہوئے آنے لگے اور بھیرو دوڑ دوڑ کر انہیں سلام کرنے لگا۔ گیارہ بجے راجہ صاحب اجلاس پر تشریف لائے۔ اور بھیرو نے محرر سے لکھا کر اپنا استغاثہ دائر کر دیا۔ شام کو گھر والپس آیا تو پچھرنے لگا۔ اب دیکھتا ہوں۔ کون مائی کا لال ان کی مدد کرتا ہے۔ دونوں کے منہ میں کالکھ لگوا کر یہاں سے نکال نہ دیا تو اپنے باپ کا نہیں۔

پانچویں دن سورداس اور سبھاگی کے نام سمن آگیا۔ تاریخ پڑ گئی۔ جیوں جیوں پیشی کا دن نزدیک آتا جاتا تھا سبھاگی کے ہوش اڑے جاتے تھے۔ وہ بار بار سورداس سے الجھتی۔ تمہیں یہ سب کرا رہے ہو۔ اپنی مٹی خراب کر رہے ہو اور اپنے ساتھ مجھے بھی گھسیٹ رہے ہو۔ مجھے چلا جانے دیا ہوتا تو کوئی تم سے کیوں بیر ٹھانتا۔ وہاں بھری کچہری میں جانا سب کے سامنے کھڑی ہونا مجھے زہر ہی سا لگ رہا ہے۔ میں اس کا منہ نہ دیکھوں گی چاہے عدالت مجھے مار ہی ڈالے۔

آخری پیشی کی مقررہ تاریخ آگئی۔ محلہ میں اس مقدمہ کی اتنی دھوم تھی کہ لوگوں نے اپنے اپنے کام بند کر دئے اور عدالت میں جا پہنچے۔ مل کے مزدور سینکڑوں کی تعداد میں گئے۔ شہر میں سورداس کو کتنے ہی لوگ جان گئے تھے۔ ان کی رائے میں سورداس بے گناہ تھا۔ ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے کی غرض سے عدالت میں گئے۔ پر بھو سیوک پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رانی اندو اور اندر دت بھی مقدمہ پیش ہوتے ہوتے آپہنچے۔ عدالت میں یونہی کیا کم بھیڑ رہتی ہے اور پھر وہاں عورت کا آنا تو منڈوے میں دولہن کا آنا ہے۔ عدالت میں ایک بازار سا لگا ہوا تھا۔ اجلاس پر دو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تو چتاری کے راجہ صاحب تھے۔ دوسرے ایک مسلمان جنہوں نے یورپ کی جنگِ عظیم میں رنگروٹ بھرتی کرنے میں سعی بلیغ کی تھی۔ بھیرو کی طرف سے ایک وکیل بھی تھا۔

بھیرو کا بیان ہوا۔ گواہوں کا بیان ہوا۔ پھر وکیل نے دعوے کی تائید میں اُن سے اپنی مرضی کے موافق سوالات کئے۔ ازاں بعد سورداس کا بیان ہوا۔ اس

نے کہا۔ میرے ساتھ ادھر کچھ دنوں سے بھیرو کی گھر والی رہتی ہے۔ میں کسی کو کیا کھلاؤں پلاؤں گا۔ کھلانے پلانے والا بھگوان ہے۔ وہ میرے گھر میں رہتی ہے۔ اگر بھیرو اُسے رکھنا چاہے اور وہ رہے تو آج ہی چلی جائے۔ یہی تو میں چاہتا ہوں۔ اسی لئے میں نے اُسے اپنے یہاں رکھا ہے۔ نہیں تو نہ جانے کہاں ہوتی۔

بھیرو کے وکیل نے مسکرا کر کہا۔ سُور داس تم بڑے فیاض معلوم ہوتے ہو۔ لیکن نوجوان اور خوب صورت عورتوں کے ساتھ اکثر ایسی فیاضیاں کی جاتی ہیں۔

سُور داس۔ اسی سے یہ معاملہ چلا ہے۔ میں نے کوئی برائی نہیں کی۔ ہاں دُنیا جو چاہے سمجھے۔ میں تو بھگوان کو جانتا ہوں۔ وہی سب کی کھری کھوٹی کا پرکھنے والا ہے۔ اگر بھیرو اُسے اپنے گھر نہ رکھے گا اور نہ سرکار ہی کوئی ایسی جگہ بتا دیگی۔ جہاں یہ عورت اِجّت آبرو کے ساتھ رہ سکے تو میں اُسے اپنے گھر سے نکلنے نہ دونگا۔ وہ نکلنا بھی چاہے گی تو نہ جانے دُوں گا۔ اس نے تو جب سے اس مکدمے کی خبر سُنی ہے یہی کہا کرتی ہے کہ مجھے جانے دو پر میں اُسے جانے نہیں دیتا۔

وکیل۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں نے اُسے رکھ لیا ہے؟

سُور داس۔ ہاں رکھ لیا ہے۔ جیسے بھائی اپنی بہن کو رکھ لیتا ہے۔ باپ اپنی بیٹی کو رکھ لیتا ہے۔ اگر سرکار نے جبر جبتی میرے گھر سے نکال دیا تو اُس کی آبرو کی جواب دہی اُسی کے سر ہوگی۔

سُبھاگی کا بیان ہُوا۔ بھیرو مجھے بیکسور مارتا ہے اور گالیاں دیتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ نہ رہوں گی۔ سُور داس بھلا آدمی ہے۔ اس لئے اُس کے ساتھ رہتی ہوں بھیرو یہ نہیں دیکھ سکتا۔ سُور داس کے گھر سے مجھے نکالنا چاہتا ہے۔

وکیل۔ تو پہلے بھی سُور داس کے گھر آتی جاتی تھی؟

سُبھاگی۔ جبھی اپنے گھر رکھاتی تھی جبھی جان بچا کر اُس کے گھر بھاگ جاتی تھی۔ وہ میرے آڑے آجاتا تھا۔ میرے کارن اُس کے گھر میں آگ لگی تھی پر مار پڑی۔ اُس کی کون کون سی دُرگت نہیں ہوئی۔ عدالت کی کسر تھی وہ بھی پوری ہوگئی۔

راجہ۔ بھیرو تم اپنی عورت کو رکھو گے؟

بھیرو۔ ہاں سرکار۔ رکھوں گا۔

راجہ۔ مارو گے تو نہیں۔

بھیرو۔ بُری چال نہ چلے گی تو کیوں ماروں گا؟

راجہ۔ سبھاگی، تو اپنے آدمی کے ہمراہ کیوں نہیں جاتی؟ وہ کہتا ہے نہ ماروں گا۔

سبھاگی۔ اس پر مجھے بسواس نہیں ہے۔ آج ہی مار مار کر بے حال کر دے گا۔

وکیل۔ حضور معاملہ صاف ہے۔ اب مزید ثبوت کی ضرورت نہیں سُورداس پر جُرم ثابت ہو گیا۔

عدالت نے فیصلہ سُنا دیا۔ سُورداس پر دو سو روپیہ جُرمانہ اور جرمانہ نہ ادا کرنے پر چھ ماہ کی قید سخت۔ سُبھاگی پر سو روپیہ جُرمانہ اور جُرمانہ نہ دے سکنے پر تین ماہ کی قید سخت۔ روپے وصول ہوں تو بھیرو کو دے جائیں۔

تماشائیوں میں اس فیصلہ پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

ایک۔ مجھے تو سُورداس بے قصور معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا۔ سب راجہ صاحب کی کرامات ہے۔ سُورداس نے زمین کے بارہ میں انہیں بدنام کیا تھا نا؟ یہ اُسی کی کسر نکالی گئی ہے۔ یہ ہمارے معزز اور نیک نام لیڈروں کے کارنامے ہیں۔

تیسرا۔ عورت تو چریا نک (شوخ) نہیں معلوم ہوتی۔

چوتھا۔ بھری عدالت میں باتیں کرتی ہے۔ چریا نک نہیں تو اور کیا ہے؟

پانچواں۔ وہ تو یہی کہتی ہے کہ میں بھیرو کے پاس نہ رہوں گی۔

سُورداس۔ میری اپیل پنچوں سے ہوگی۔ ایک آدمی کے کہنے سے میں گنہگار نہیں ہو سکتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو۔ حاکم نے سزا دے دی۔ سزا کاٹ لوں گا پر پنچوں کا فیصلہ بھی سُن لینا چاہتا ہوں۔

یہ کہہ کر اُس نے تماشائیوں کی طرف رُخ کیا اور دردناک لہجہ میں بولا۔ دہائی

ہے بچو۔ آپ اتنے آدمی جمع ہیں۔ آپ لوگوں نے بھیرو اور اُس کے گواہوں کے بیان سُنے۔ میرا اور بھائی کا بیان سُنا۔ حاکم کا فیصلہ بھی سُن لیا۔ اب آپ لوگوں سے میری عقل ماؤدیا ) عرض ہے کہ کیا آپ بھی مجھے اپرادھی (مجرم) سمجھتے ہیں؟ کیا آپ کو بسواس ہو گیا کہ میں نے بھائی کو بہکایا اور اُسے اپنی عورت بنا کر رکھے ہوئے ہوں؟ اگر آپ کو بسواس ہو گیا ہے تو میں اسی میدان میں سر جھکا کر بیٹھتا ہوں۔ آپ سب لوگ مجھے پانچ پانچ لات ماریں۔ اگر میں لات کھانے کے ڈر بھی جاؤں تو مجھے دُکھ نہ ہوگا۔ ایسے پاپی کا یہی دنڈ ہے۔ کید سے کیا ہوگا؟ اور اگر آپ کی سمجھ میں میں بیکسور ہوں تو پکار کر کہہ دیجئے۔ کہ ہم تجھے بیکسور سمجھتے ہیں۔ پھر میں کڑی سے کڑی کید بھی ہنس کر کاٹ دوں گا۔

عدالت کے کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ راجہ صاحب۔ وکیل۔ عملے۔ تماشائی لوگ سب کے سب متحیر ہو گئے۔ کسی کو ہوش نہ رہا کہ اس وقت کیا کرنا چاہئے۔ سپاہی درجنوں تھے مگر بُت بنے کھڑے تھے۔ معاملہ نے ایک عجیب صورت اختیار کر لی تھی۔ جس کی عدالت کی تاریخ میں کوئی نظیر نہ تھی۔ دشمن نے ایسا چھپا ہُوا وار کیا تھا کہ مخالف فوج کا تجویز شدہ پروگرام اکھڑ گیا تھا۔

سب سے پہلے راجہ صاحب سنبھلے۔ حکم دیا۔ اسے باہر لے جاؤ۔ سپاہیوں نے دونوں ملزموں کو گھیر لیا اور عدالت کے باہر لے چلے۔ ہزاروں تماشائی پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔

کچھ دور چل کر سُور داس زمین پر بیٹھ گیا اور بولا ۔ میں بچوں کا حکم سُن کر تبھی آگے بڑھوں گا!

عدالت کے باہر عدالت کی توہین کا خوف نہ تھا۔ کئی ہزار لوگوں نے ہم آہنگ ہو کر کہا۔ تم بے قصور ہو۔ ہم سب تمہیں بے قصور سمجھتے ہیں۔

اندردت ۔ عدالت بے ایمان ہے۔

کئی ہزار آوازوں نے مکرر کہا۔ ہاں عدالت بے ایمان ہے!

اندردت ۔ عدالت نہیں ہے ۔ غریبوں کی قربان گاہ ہے!

کئی ہزار گلوں سے ایک گونج پیدا ہوئی۔ امیروں کے ہاتھ میں ظلم کا آلہ ہے۔
سپاہیوں نے دیکھا کہ ہر لحظہ بھیڑ بڑھتی جاتی ہے اور لوگ مشتعل ہوتے جاتے ہیں تو انہوں نے لپک کر ایک یکہ والے کو پکڑا اور ہر دو ملزمین کو اُس میں بٹھا کر روانہ ہو گئے۔ لوگوں نے کچھ دُور تک تو گاڑی کا پیچھا کیا۔ اُس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

اِدھر بھیرو اپنے گواہوں کے ساتھ گھر چلا تو راستہ میں عدالت کے اردلی نے گھیرا۔ اُسے دو روپے نکال کر دئے۔ دوکان میں پہنچتے ہی منکے کھل گئے اور تاڑی کا دور چلنے لگا۔ بڑھیا پکوڑیاں اور پکانے لگی۔

ایک بولا۔ بھیرو۔ یہ بات ٹھیک نہیں۔ تم بھی بیٹھو۔ پیو اور پلاؤ۔ ہم تم برابر کر لیں۔

دوسرا۔ آج انتی پیوں گا کہ چاہے یہیں ڈھیر ہو جاؤں۔ بھیرو یہ کُلھڑ بھر بھر کیا دیتے ہو۔ ہانڈی ہی بڑھا دو۔

بھیرو۔ اجی تمکے میں منہ ڈال دو۔ ہانڈی کلھڑ کی کیا بساط ہے! آج مدعی کا سر نیچا ہوا ہے۔

تیسرا۔ دونوں حوالات میں پڑے رو رہے ہوں گے۔ مگر بھئی سورداس کو سجا ہو گئی تو کیا وہ ہے بے کسور۔

بھیرو۔ آگئے تم بھی اس کے دھوکے میں۔ اسی سوانگ کی تو وہ روٹی کھاتا ہے۔ دیکھو بات کی بات میں کیسا ہمارے آدمیوں کا من پھیر دیا۔

چوتھا۔ اُسے کسی ویدیا کا اشٹ ہے۔

بھیرو۔ اشٹ تو تب۔ جب جانیں کہ جیل سے نکل آئے۔

پہلا۔ میں بر کر کہتا ہوں۔ وہ کل ہمارے جیل سے نکل آئے گا۔

دوسرا۔ بڑھیا۔ پکوڑیاں لا!

تیسرا۔ ابے بہت نہ پی۔ نہیں تو مر جائے گا۔ ہے کوئی گھر میں رونے والا؟

چوتھا۔ کچھ گانا ہو۔ تارو ڈھول بجیرا۔

سب نے ڈھول بجیرا سنبھالا اور کھڑے ہو کر گانے لگے۔ "چھتیسی کیا نیتا جھمکاوے"

تھوڑی دیر میں ایک بڈھا سرسری اٹھ کر ناچنے لگا۔ بڑھیا سے اب نہ رہا گیا۔ اُس نے بھی گھونگٹ نکال لیا اور ناچنے لگی۔ نیچ ذاتوں میں گانا ناچنا عیب نہیں۔ داخل ہے سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ بڈھا اور بڑھیا دونوں فحش طریقہ سے ہلا ہلا کر ٹھمکنے لگے۔ اُن کے اعضاء کی لچک تعجب انگیز تھی۔

بھیرو۔ محلہ والے سمجھتے تھے کہ بچے گواہی نہ لیں گے۔

ایک۔ سب گیدڑ ہیں گیدڑ

بھیرو۔ چلو۔ ذرا سیدوں کے منہ میں کالکھ لگا آئیں۔

سب کے سب چلا اٹھے۔ ہاں ہاں۔ ناچ ہونا چاہیے۔

ایک گھنٹہ میں جلوس چلا۔ سب کے سب ناچتے گاتے ڈھول بجاتے تھے۔ ہر چند کرتے اکھڑاتے ہوئے جاتے تھے۔ پچھلے بجیرنی کا گھونگھٹ سرکتا۔ سب رُک گئے اور سب نے یوں گایا۔

"گوالن کی لیا ہیرا نی تب دودھ میں ڈالے پانی"

رات زیادہ جا چکی تھی۔ بجیرنی کے دروازے بند تھے۔ لوگ یہاں سے ٹھاکر دین کے دروازے پر گئے۔ پھر سب نے گایا۔

"تمولن کے تیہار سیلے یاروں سے بجر ملاوے"

ٹھاکر دین کھانا کھا رہا تھا۔ تکلف کے مارے باہر نہ نکلا۔ جلوس آگے بڑھا۔ تو سورداس کی جھونپڑی ملی۔ بھیرو بولا۔ بس یہیں ڈھول ڈھیلا پڑ گئی۔

"ڈھول ڈھیلا پڑ گئی"

"سینکو سینکو۔ جھونپڑے میں سے پھوس لے لو"

ایک آدمی نے تھوڑا سا پھوس نکالا۔ دوسرے نے اور زیادہ نکالا۔ تیسرے

نے ایک بوجھ کھینچ لیا۔ پھر کیا تھا۔ نشہ کی سنگ مشہور ہے۔ ایک نے جلتا ہوا اپلہ اس جھونپڑی میں ڈال دیا اور بولا "ہولی ہے ہولی ہے" اکثر آدمیوں نے کہا ——— ہولی ہے۔ ہولی ہے!"

بھیرو۔ یارو۔ یہ تم لوگوں نے کیا کیا۔ بھاگ چلو نہیں تو جل مرو گے۔

توفی نشہ میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سب کے سب سراسیمہ ہو گئے۔ ادھر آگ زیادہ تیز ہوئی تو محلہ کے لوگ دوڑ پڑے۔ لیکن پھونس کی آگ کس نے بجھائی تھی۔ بھونپڑا جل رہا تھا اور لوگ کھڑے ہوئے رنج اور غصہ سے یوں باتیں کر رہے تھے:

ٹھاکر دین۔ یہ تو بھونچال پر بیٹھا تھا سیوں کو آتے دیکھا۔

بجرنگی۔ ایسا ہی چاہتا ہے کہ جا کر بھیرو کو مارتے مارتے بھرتا بنا دوں۔

جگدھر۔ جب تک ایک دفعہ اچھی طرح مار نہ کھا جائے گا۔ اس کے کپڑے بھوت نہ اتارے گا۔

بجرنگی۔ ہاں اب یہی ہوگا۔ گھسوا۔ بڑا تھا، تو نکال نا۔ آج دو چار کھون ہو جائیں گے۔ تھانہ پر آگ پہنچے گی۔

جینی۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ چل کر لیٹو۔ جو جیسا کرے گا۔ ویسا پھل آپ بھگوان سے پاوے گا۔

بجرنگی۔ بھگوان چاہے پھل دیں یا نہ دیں پر میں اب تو نہیں مانتا۔ جیسے بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔

جگدھر۔ آگ لگنے کی بات ہی ہے۔ ایسے پاپی کا تو سر کاٹ لینا بھی پاپ نہیں ہے۔

ٹھاکر دین۔ جگدھر آگ پر تیل چھڑکنا اچھی بات نہیں ہے۔ اگر تم کو بھیرو سے بیر ہے تو آپ جا کر لڑ سکتے ہیں نہیں للکارتے؟ دوسروں کو کیوں اکساتے ہو؟ یہی چاہتے ہو کہ یہ دونوں لڑیں مریں اور میں تماشا دیکھوں۔ ہو بڑے نیچ۔

جگدھر۔ اگر کوئی بات کہنا اکسانا ہے تو لو چپ رہوں گا۔

ٹھاکر دین۔ ہاں چپ رہنا ہی اچھا ہے۔ تم بھی جاکر سو رہو۔ کہیں بھگوان آپ پاپی کو ڈنڈ دیں گے۔ انہوں نے تو راون جیسے پرتاپی راجہ کو نہ چھوڑا۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے؟ یہ اندھیر ان سے بھی نہ دیکھا جائے گا۔

بجرنگی۔ مارے گھمنڈ کے پاگل سا ہو گیا ہے۔ چلو جگدھر ذرا ان سبوں سے دو دو باتیں کر لیں۔

جگدھر۔ نا بھیا۔ مجھے ساتھ نہ لے جاؤ۔ کون جانے۔ وہاں ہاتھا پائی ہو جائے تو سارا الجام میرے سر جائے گا۔ اسی نے لڑا دیا۔ میں تو آپ جھگڑے سے کوسوں دور رہتا ہوں۔

اتنے میں مٹھو دوڑا ہوا آیا۔ بجرنگی نے پوچھا۔ کہاں سویا تھا رے؟

مٹھو۔ پنڈا جی کے دالان میں تو۔ ارے یہ تو میری جھونپڑی جل رہی ہے! کس نے آگ لگائی؟

ٹھاکر دین۔ اتنی دیر میں جاگے ہو۔ سن نہیں رہے ہو۔ گانا بجانا ہو رہا ہے۔

مٹھو۔ بھیرو نے لگائی ہے کیا؟ اچھا بچا سمجھوں گا۔

جب لوگ اپنے اپنے گھر لوٹ گئے تو مٹھو آہستہ آہستہ بھیرو کی دوکان کی طرف گیا۔ محض برخاست ہو چکی تھی۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جاڑے کی رات۔ سناٹا کھڑکھڑا رہا تھا۔ دوکان کے دروازہ پر اوپلے جل رہے تھے۔ ناری خانوں میں آگ بھی نہیں بجھتی۔ پارسی مجاور بھی اتنی ہوشیاری سے آگ کی حفاظت نہ کرتا ہوگا۔ مٹھو نے ایک جلتا ہوا اوپلا اٹھایا اور دوکان کے چھپر پر پھینک دیا۔ چھپر میں آگ لگ گئی تو مٹھو جگ مگ کھا گا اور پنڈا جی کے دالان میں منہ ڈھانپ کر سو رہا۔ گویا اسے کچھ خبر نہیں۔ ذرا دیر میں آگ کے شعلے بلند ہوئے۔ سارا محلہ روشن ہو گیا۔ چڑیاں درختوں پر سے اڑ اڑ کر بھاگنے لگیں۔ پیڑوں کی ڈالیاں ہلنے لگیں۔ تالاب کا پانی سنہرا ہو گیا۔ اور انسانوں کی گاتھیں زور زور سے چیخنے لگیں۔ نصف گھنٹہ تک لنکا داہ

کا تماشا ہوتا رہا مگر وہاں اس کا دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ دوکان آبادی سے فاصلہ پہ تھی۔ بھیرو نشہ میں بے خبر پڑا تھا۔ بڑھیا ناچتے ناچتے تھک گئی تھی۔ اور کون تھا جو اس وقت آگ بجھانے جاتا؟ آگ نے بلا کسی روک ٹوک کے اپنا کام ختم کیا۔ مٹکے ٹوٹ گئے۔ ہانڈی بہہ گئی۔ جب ذرا آگ ٹھنڈی ہوئی۔ تو کئی کتوں نے جا کر اپنا ڈیرا جما یا۔

علی الصباح بھیرو اُٹھا تو دوکان سامنے نظر آئی۔ دوکان اور اُس کے گھر کے درمیان دو فرلانگ کا فاصلہ تھا مگر کوئی درخت نہ ہونے کے سبب دوکان صاف نظر آتی تھی۔ اُس کو تعجب ہوا کہ دوکان کہاں گئی۔ ذرا اور آگے بڑھا تو راکھ کا ڈھیر دکھائی دیا۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ دوڑا۔ دوکان میں ہانڈی کے علاوہ مٹکوں کے روپے بھی تھے۔ ڈھول مجیرا بھی وہیں رکھا تھا۔ ہر چیز جل کر خاک ہو گئی تھی۔ والے اُدھر تالاب میں منہ ہاتھ دھونے جایا کرتے تھے سب آ پہنچے۔ دوکان سڑک پر تھی۔ راہ گیر بھی کھڑے ہو گئے۔ میلہ لگ گیا۔

بھیرو نے رو کر کہا۔ میں تو مٹی میں مل گیا۔

ٹھاکر دین۔ بھگوان کی لیلا ہے۔ اُدھر وہ تماشا دکھایا۔ اِدھر یہ تماشا دکھایا۔ دھنیہ ہو مہاراج۔

بجرنگی۔ کسی مستری کی سرارت ہوگی۔ کیوں بھیرو کسی سے عداوت تو نہ تھی؟

بھیرو۔ عداوت تو سارے محلہ سے ہے۔ کس سے نہیں ہے؟ میں جانتا ہوں۔ جس کی یہ بدماسی ہے۔ بندھوا نہ دیا تو کہنا۔ ابھی ایک کو لیا ہے۔ اب دوسرے کی باری ہے۔

جگدھر دُھن ہی سے لطف اٹھا رہا تھا۔ نزدیک نہ آیا کہ کہیں بھیرو کچھ کہہ نہ بیٹھے تو بات بڑھ جائے۔ ایسی دلی مسرت اُسے اپنی زندگی میں کبھی نہ نصیب ہوئی تھی۔

اتنے میں مل کے کئی مزدور آ گئے۔ کالا مستری بولا۔ بھائی کوئی مانے یا نہ مانے۔

میں تو یہی کہوں گا کہ اندھے کو کسی کا اشت ہے۔

**ٹھاکر دین** ۔ اشت کیوں نہیں ہے۔ میں برابر یہی کہتا آتا ہوں۔ اُس سے جیو نے بیر ٹھانا اُس نے نیچا دیکھا۔

**بھیرو** ۔ اُس کے اشت کو میں جانتا ہوں۔ جو تھانہ دار آجائیں تو بتا دوں کون اشت ہے۔

**بجرنگی** ۔ جل کر بولا۔ اپنی بیر کبھی سُوجھ رہی ہے۔ کیا وہ جھونپڑا نہ تھا جس میں پہلے آگ لگی۔ اینٹ کا جواب پتھر ملتا ہی ہے۔ جو کسی کے لئے گڑھا کھودے گا اُس کے لئے کنواں تیار ہے۔ کیا اُس جھونپڑے میں آگ لگاتے وقت تجھے یہ سُوجھا تھا کہ سُورداس کا کوئی ہے ہی نہیں؟

**بھیرو** ۔ اُس کے جھونپڑے میں میں نے آگ لگائی؟

**بجرنگی** ۔ اور کس نے لگائی؟

**بھیرو** ۔ جھوٹ ہے۔

**ٹھاکر دین** ۔ کیوں سینہ زوری کرتے ہو؟ تم نے لگائی یا تمہارے کسی یار نے لگائی۔ ایک ہی بات ہے۔ بھگوان نے اُس کا بدلہ چکا دیا تو روتے کیوں ہو؟

**بھیرو** ۔ سب کو دیکھوں گا۔

**ٹھاکر دین** ۔ یہاں کوئی تیرا دیس نہیں ہے۔

**بھیرو ہونٹ** چبا کر چلا گیا۔ انسانی فطرت کتنی پیچیدہ ہے۔ ہم دوسروں کا نقصان کرتے ہوئے ذرا بھی نہیں جھجکتے مگر دوسروں کے ہاتھوں ہمیں کوئی نقصان پہنچتا ہے تو ہمارا خون اُبلنے لگتا ہے۔

## (۳۲)

سُورداس کے مقدمہ کا فیصلہ سُننے کے بعد اندر وقت چلے تو راستے میں برجھو سیوک سے ملاقات ہو گئی۔ باتیں ہونے لگیں۔

اندر دت ۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ سُور داس بے قصور ہے یا نہیں؟

پرکھو سیوک ۔ بالکل بے قصور۔ میں تو آج اُس کی پاک نفسی کا قائل ہو گیا۔ فیصلہ سُنانے کے وقت تک مجھے یقین تھا کہ اندھے نے ضرور اس عورت کو بہکایا ہے مگر اُس کے آخری الفاظ نے جادو کا سا کام کیا۔ میرا ارادہ ہے کہ اُس کے متعلق ایک نظم لکھوں۔

اندر دت ۔ صرف نظم لکھ ڈالنے سے کام نہ چلے گا۔ راجہ صاحب کو رنک دینی ہوگی۔ انہیں اس بات سے مطمئن نہ ہونے دینا چاہئے کہ میں نے اندھے سے بھی پیسوئی۔ وہ سمجھ رہے ہوں گے کہ نذرانہ ہمارے پاس سے لائے گا۔ دونوں پر تین سو روپیہ جرمانہ ہُوا ہے۔ ہمیں کسی طرح جرمانہ آج ہی ادا کر دینا چاہئے۔ سُور داس جیل سے نکلے۔ تو سارے شہر میں اُس کا جلوس نکالنا چاہئے۔ اُس کے لئے دو سو کی اور ضرورت ہوگی۔ کل پانچ سو ہوں تو کام چل جائے گا۔ بولو۔ کیا دیتے ہو؟

پرکھو سیوک ۔ جو مناسب سمجھو۔ لکھ لو۔

اندر دت ۔ تم پچاس روپے بغیر کسی دقت کے دے سکتے ہو۔

پرکھو سیوک ۔ اور تم نے اپنے نام کتنا لکھا ہے؟

اندر دت ۔ میری حیثیت دس روپے سے زیادہ دینے کی نہیں۔ رانی جانکوی سے سو روپے لے لوں گا۔ کنور صاحب زیادہ نہیں تو دس دیں ہی گے۔ جو کچھ بھی کمی رہ جائے گی وہ دوسروں سے مانگ کر پوری کر لی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ڈالٹن گنجوی سب روپے خود ہی دے دیں کسی سے کچھ مانگنا ہی نہ پڑے۔

پرکھو سیوک ۔ سُور داس کے محبّ دالوں سے بھی کچھ مل جائے گا۔

اندر دت ۔ اُسے سارا شہر جانتا ہے۔ اُس کے نام پر دو چار ہزار روپے مل سکتے ہیں۔ مگر میں اس چھوٹی سی رقم کے لئے کسی کو تکلیف نہیں دینا چاہتا۔

یوں باتیں کرتے ہوئے دونوں آگے بڑھے کہ دفعتاً اندو اپنی فلٹن پر آتی ہوئی دکھائی دی۔ اندر دت کو دیکھ کر رُک گئی اور بولی۔ تم کب لوٹے؟ میرے یہاں

نہیں آئے۔

اندر دت۔ آپ آسمان پر ہیں۔ میں زمین پر ہوں۔ کیا باتیں ہوں؟

اندو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔

اندر دت فرش پر جا بیٹھا۔ پربھو سیوک نے جیب سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور چپکے سے اندر دت کے ہاتھ میں رکھ کر کلب کو چل دئے۔

اندر۔ اپنے دوستوں سے بھی کہنا۔

پربھو سیوک۔ نہیں بھئی میں اس کام کا نہیں ہوں۔ مجھے مانگنا نہیں آتا۔ کوئی دیتا بھی ہو گا تو میری صورت دیکھ کر مٹھی بند کرے گا۔

اندر دت۔ (اندو سے) آج تو یہاں خوب تماشا ہوا۔

اندو۔ مجھے تو ناٹک کا سا لطف۔ سٹور داس کے بارہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟

اندر۔ مجھے تو وہ سادہ سچا اور صاف دل معلوم ہوتا ہے۔

اندو۔ بس بس یہی میرا بھی خیال ہے۔ میں سمجھتی ہوں۔ اُس کے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ فیصلہ سناتے وقت تک میں اُسے قصوروار سمجھتی تھی۔ مگر اُس کی اپیل نے میرے خیالات میں تبدیلی پیدا کر دی۔ میں اب تک اُسے مکار۔ فریبی۔ لگا ہوا سیار سمجھتی تھی۔ دونوں نے ہم لوگوں کو کتنا بدنام کیا۔ جیجی سے مجھے اُس سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں اُسے مزہ چکھانا چاہتی تھی۔ لیکن آج معلوم ہوا کہ میں نے اُس کا چارجلن سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ وہ اپنی دُھن کا پکا نڈر بے لوث اور سچا آدمی ہے۔ کسی سے دبنا نہیں جانتا۔

اندر دت۔ تو اس ہمدردی کا کچھ عملی اظہار بھی کیجئے گا۔ ہم لوگ آپس میں چندہ کر کے جرمانہ ادا کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ بھی اس کارِ خیر میں مدد دیں گی؟

اندو نے مسکرا کر کہا۔ میں زبانی ہمدردی کا اظہار ہی کافی سمجھتی ہوں۔

اندر دت۔ آپ ایسا کریں گی تو میرا یہ خیال پختہ ہو جائے گا کہ ہمارے رئیسوں میں اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ ہمارے رؤسا ہر ایک جائز کام میں حکام کی مدد

کرتے رہتے ہیں اسی لئے عوام کا اُن پر سے اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ وہ اُنہیں اپنا دوست نہیں دشمن سمجھتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کا شمار بھی اُنہیں رؤسا میں ہو۔ کم از کم میں نے آپ کو اب تک اُن رؤسا سے الگ سمجھا ہے۔

اندو نے متانت سے کہا۔ اندردت۔ میں ایسا کیوں کر رہی ہوں۔ اس کا سبب تمہیں معلوم ہے۔ راجہ صاحب سُنیں گے تو انہیں کتنا رنج ہوگا۔ میں اُن سے چھپا کر کوئی کام نہیں کرنا چاہتی۔

اندردت۔ راجہ صاحب سے اس بارہ میں مجھ سے ابھی گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اُن کے خیالات بھی ہمارے خیالات کے مشابہ ہوں گے۔ انہوں نے اُس وقت قانونی فیصلہ کیا ہے۔ سچا فیصلہ تو اُن کے دل نے کیا ہوگا۔ شاید اُن کی طرح عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو انہوں نے کیا۔ لیکن وہ میرے دل کا فیصلہ نہیں بلکہ صرف قانون کا فیصلہ ہوتا۔ مجھے اُن سے اتنی بے لگنی نہیں ہے ورنہ اُن سے بھی کچھ نہ کچھ لے ہی لیتا۔ اُن کے لئے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

اندو۔ ممکن ہے۔ راجہ صاحب کے متعلق تمہارا قیاس درست ہو۔ میں آج ان سے دریافت کروں گی۔

اندردت۔ دریافت کیجئے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے نہ کھلیں گے۔

اندو۔ تمہیں اندیشہ ہے اور مجھے یقین ہے۔ لیکن یہ جانتی ہوں کہ ہمارے دلی جذبات مشابہ حالتوں میں مشابہ ہوا کرتے ہیں۔ اس لئے آپ کو انتظار کی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ یہ بیجئے۔ یہ میرا نا چیز ہدیہ ہے۔

یہ کہہ کر اندو نے ایک سادرن نکال کر اندردت کو دے دیا۔

اندردت۔ اسے لیتے ہوئے مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔

اندو۔ کس بات کا؟

اندردت۔ کہیں راجہ صاحب کے خیالات کچھ اور ہی ہوں۔
اندو نے غرور سے سر اونچا کر کے کہا "اس کی کچھ پرواہ نہیں۔
اندردت۔ ہاں آپ نے اس وقت رانیوں سی بات کہی۔ یہ ساورن سوورس کی اخلاقی فتح کا نشان ہے۔ آپ کا دلی شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ ابھی بہت چکر لگانا ہے۔ جرمانے کے علاوہ اور جو کچھ مل جائے۔ اسے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔

اندردت اُتر کر جانا ہی چاہتے تھے کہ اندو نے جیب سے دوسرا ساورن نکال کر دیتے ہوئے کہا۔ یہ لو۔ شاید اس سے تمہارے چکر میں کچھ کمی ہو جائے۔

اندردت نے ساورن جیب میں رکھا اور خوش خوش روانہ ہوئے لیکن اندو کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اُسے خیال آیا کہ کہیں راجہ صاحب واقعی سوردا اس کو قصوروار سمجھتے ہوں تو مجھے ضرور آڑے ہاتھوں لیں گے۔ خیر ہو گا۔ میں اتنا دبنا بھی نہیں چاہتی۔ میرا کام ہے اچھے کاموں میں اُن سے دبنا۔ اگر وہ بدنیتی سے رعایا پر ظلم کرنے لگیں تو مجھے اُن سے اختلاف کرنے کا پورا حق ہے۔ بُرے کاموں میں دبنا تو انسان کے درجہ سے گر جانا ہے۔ میں پہلے انسان ہوں اور پیچھے بیوی۔ ماں۔ بہن یا بیٹی۔

اندو انہی خیالات میں محو تھی کہ مسٹر جان سیبوک معہ مسز سیبوک کے مل گئے۔ جان سیبوک نے ٹوپ اُتار کر مسز سیبوک بولیں۔ ہم لوگ تو آپ ہی کی طرف جا رہے تھے۔ ادھر کئی روز سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ جی لگا ہوا تھا چھٹا ہوا۔ راستہ ہی میں مل گئیں۔

اندو۔ جی نہیں۔ میں راستہ میں نہیں ملی۔ یہ دیکھئے جاتی ہوں۔ آپ یہاں جاتی ہوں وہاں جائیے۔

جان سیبوک۔ میں تو ہمیشہ (COMPROMISE) (سمجھوتہ) پسند کرتا ہوں۔ یہ آگے پارک ہے۔ آج بینڈ بھی ہو گا۔ بس وہیں جا بیٹھیں۔

اندو۔ یہ آپ کے (COMPROMISE) کمپرومائز غیر جانبدارانہ نہیں ہے لیکن خیر۔

پارک میں تینوں آدمی اُترے اور کرسیوں پر جا بیٹھے۔ اندو نے پوچھا صوفیا کا کوئی خط آیا تھا؟

مسز سیلوک۔ میں نے تو سمجھ لیا کہ وہ مر گئی۔ مسٹر کلارک جیسا آدمی اُسے نہ ملے گا۔ جب تک یہاں رہی حیلہ حوالہ کرتی رہی۔ وہاں جا کر باغیوں سے مل بیٹھی۔ نہ جانے اس کی تقدیر میں کیا ہے۔ کلارک سے رشتہ نہ قائم ہونے کا غم مجھے ہمیشہ رولاتا رہے گا۔

جان سیلوک۔ میں تم سے ہزار بار کہہ چکا وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ وہ زن و شوئی کی زندگی کے لئے بنائی ہی نہیں گئی۔ وہ معیار پسند ہے اور معیار پسند ہمیشہ خوشی کے خواب ہی دیکھا کرتا ہے۔ اُسے خوشی ملتی نہیں۔ اگر وہ شادی کرے گی بھی تو کنور دنے سنگھ سے۔

مسز سیلوک۔ تم میرے سامنے کنور دنے سنگھ کا نام نہ لیا کرو۔ معاف کیجئے رانی اندو مجھے ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی پسند نہیں۔

جان سیلوک۔ ایسی بے جوڑ شادیاں کبھی کبھی ہو ہی جاتی ہیں۔

مسز سیلوک۔ میں تم سے کہے دیتی ہوں اور رانی اندو آپ گواہ رہئے گا کہ صوفیا کی شادی کبھی دنے سنگھ سے نہ ہوگی۔

جان سیلوک۔ آپ کا اس معاملہ میں کیا خیال ہے۔ رانی اندو؟ دل کی بات کہئے گا۔

اندو۔ میں خیال کرتی ہوں کہ لیڈی سیلوک کا قیاس صحیح ہے۔ دنے کو صوفیا سے کتنی ہی محبت ہو مگر وہ ماتا جی کی اتنی دل شکنی نہ کریں گے۔ ماتا جی جیسی دُکھی عورت آج دنیا میں نہ ہوگی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اُنہیں زندگی میں اب کوئی اُمید ہی نہیں رہی۔ گم سم رہتی ہے۔ اگر کسی نے بھول کر بھی

[illegible] بیٹھ کر دوسرے ان کے بیوروں پر جلے ہیں۔ اپنے فرصت والے تصویر الگ کرادی ہے۔ اُن کے کمرہ کا دروازہ بھی بند کر دیا ہے۔ نہ کبھی آپ اُس میں جاتی ہے نہ اور کسی کو جانے دیتی ہے اور مس صوفیا کا نام لینا تو انہیں چٹکی کاٹ لینے کے برابر ہے۔ پتاجی کو بھی اب رضا کاروں کی جماعت سے کوئی محبت نہیں رہی۔ قومی کاموں سے انہیں کچھ نفرت سی ہو گئی ہے۔ آہا۔ آج بہت اچھی سات سے گھر سے چلی تھی۔ وہ ڈاکٹر گنگولی چلے آرہے ہیں۔ کہئے ڈاکٹر صاحب ملہ سے کب لوٹے۔

گنگولی۔ سردی پڑنے لگی۔ اب وہاں سے سب کوئی کا کوچ ہو گیا۔ ہم تو ابھی آپ کی ماتاجی کے پاس گیا تھا۔ کنور دنے سنگھ کے حال پر اُن کو بڑا دُکھ ہے۔

جان سیبوک۔ اب کے تو آپ نے کونسل میں دھوم مچا دی۔

گنگولی۔ اگر وہاں کی تقریر کرنا۔ سوالات کرنا۔ بحث کرنا کام ہے تو آپ ہمارا جتنی بڑائی کرنا چاہتا ہے کریں۔ پر میں تو اُسے کام نہیں سمجھتا۔ یہ تو پانی پیڑنا ہے۔ کام اُس کو کہنا چاہئے جس سے دیس اور جاتی کا اُپکار ہو۔ ایسا تو ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ ہمارا تو اب وہاں جی نہیں لگتا۔ پہلے تو سب آدمی ایک نہیں ہوتا اور کبھی ہو بھی گیا تو گورنمنٹ ہمارا تجویز خارج کر دیتا ہے۔ ہمارا محنت کھراب ہو جاتا ہے۔ یہ تو لڑکوں کا کھیل ہے۔ ہم کو نئے قانون سے بڑا اُمید تھا۔ پر تین چار سال کام کر کے دیکھ لیا کہ اُس سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہم جہاں تب تھا وہیں اب بھی ہے۔ ملٹری کا خرچ بڑھتا جاتا ہے۔ اس پر کوئی عذر کرے۔ تو سرکار بولتا ہے۔ آپ کو ایسا بات نہیں کہنا چاہئے۔ بجٹ بنانے لگتا ہے۔ تو ہر ایک (item) (مد) میں دو چار لاکھ جیادہ لکھ دیتا ہے۔ ہم کونسل میں جب بہت زور دیتا ہے تو ہمارا بات رکھنے کے لئے وہی پھالتو روپیہ نکال دیتا ہے۔ ممبر کھوسی سے پھول جاتا ہے۔ ہم جیت گیا ہم جیت گیا۔ پوچھو تم کیا جیت

گیا؟ تم کیا جیتے گا؟ تمہارے پاس جیتنے کا سادھن (ذریعہ) ہی نہیں ہے۔ تم کیسے جیت سکتا ہے؟ کبھی ہمارے بہت بل دینے پر کفایت کیا جاتا ہے تو ہمارے ہی بھائیوں کا نکسان ہوتا ہے۔ جیسے اب کی ہم نے پولیس کی مدد میں پانچ لاکھ کاٹ دیا۔ مگر یہ کمی بڑے بڑے حاکموں کے جیتے یا طلب میں نہیں کیا گیا۔ بچارہ چوکی دار۔ کانسٹیبل۔ تھانہ دار کا طلب گھٹائے۔ جگہ توڑے گا۔ اس سے اب کپھایت کا بات کہتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے کہ اس سے ہمارے ہی بھائیوں کا گردن کٹتا ہے۔ سارا کونسل جو دیتا رہا کہ بنگال کے باڑھ کے ستائے ہوئے آدمیوں کی مدد کو بیس لاکھ منجور کیا جائے۔ سارا کونسل کہتا رہا کہ کلارک کا اودے پور سے بدلی کر دیا جائے۔ پر سرکار نے نہیں مانا۔ کونسل کچھ نہیں کر سکتا۔ ایک پتی تک نہیں توڑ سکتا۔ جو آدمی کونسل کو بنا سکتا ہے وہی اس کو لاگار بھی سکتا ہے۔ بھگوان جلاتا ہے تو بھگوان ہی مارتا ہے۔ کونسل کو سرکار بناتا ہے اور وہ سرکار کی مٹھی میں ہے۔ جب دیس کے لوگ کونسل بنا دیں گے تب اس سے دیس کا کلیان (بھلا) ہوگا۔ یہ سب جانتا ہے پر کچھ نہ کرنے سے تو کچھ کرتے رہنا اچھا ہے۔ مرنا بھی مرنا ہے اور کھاٹ پر پڑے رہنا بھی مرنا ہے لیکن ایک حالت میں کوئی اُمید نہیں رہتا۔ دوسری حالت میں کچھ اُمید رہتا ہے۔ بس اتنا ہی پھرک ہے اور کچھ نہیں۔

اندو نے چھیڑ کر پوچھا۔ جب آپ جانتے ہیں کہ وہاں جانا بیفائدہ ہے تو کیوں جاتے ہیں؟ کیا آپ باہر رہ کر کچھ کر نہیں سکتے؟

گنگولی۔ (ہنس کر) وہی بات تو ہے۔ اندو رانی۔ ہم کھاٹ پر پڑا ہے۔ ہل نہیں سکتا۔ بات نہیں کر سکتا کھا نہیں سکتا۔ لیکن بابا جمراج کو دیکھ کر ہم تو اُٹھ بھاگے گا۔ روئے گا کہ مہاراج کچھ دن اور رہنے دو۔ ہمارا چندگانی کونسل میں بیت گیا۔ اب ہم کو کوئی دوسرا رستہ نہیں دکھائی دیتا۔

اندو۔ میں تو ایسی زندگی سے مر جانا بہتر سمجھوں۔ کم سے کم یہ تو اُمید ہوگی کہ شاید آگے والی زندگی اس سے اچھی ہو۔

گنگولی ۔ (ہنس کر) ہم کو کوئی کہہ دے کہ مر کر تم پھر اسی دیس میں آئے گا۔ اور پھر کونسل میں جا سکے گا تو ہم جراح سے بولے گا ۔ بابا جلدی کر! پر ایسا کہتا نہیں۔

جان سیبوک ۔ میرا ارادہ ہے کہ نئے چناؤ میں لیبر تجارت کی طرف سے کھڑا ہو جاؤں۔

گنگولی ۔ آپ کس پارٹی میں رہے گا؟

جان سیبوک ۔ میری تو نہ کوئی پارٹی ہے اور نہ ہوگی ۔ میں اسی ارادہ اور مقصد سے جاؤں گا کہ ملکی تجارت کی حفاظت کر سکوں ۔ میں کوشش کروں گا۔ کہ غیر ملکی اشیاء پر بھاری ٹیکس عاید کیا جائے ۔ اس طریقہ پر کام کئے بغیر ہماری تجارت کو کبھی فروغ نہ ہوگا ۔

گنگولی ۔ انگلینڈ کو کیا کرے گا؟

جان سیبوک ۔ اُس کے ساتھ بھی غیر ملکوں کا سا برتاؤ ہونا چاہئے ۔ میں تجارتی غلامی کا سخت مخالف ہوں ۔

گنگولی ۔ (گھڑی دیکھ کر) بہت اچھا بات ہے ۔ آپ کھڑا ہو۔ ابھی ہم کو یہاں سے اکیلا جانا پڑتا ہے ۔ تب دو آدمی ساتھ ساتھ جائے گا ۔ اچھا اب جانا ہے۔ کئی لوگوں سے ملنا ہے ۔

ڈاکٹر گنگولی کے بعد جان سیبوک نے بھی گھر کی راہ لی ۔

انڈرو مکان پر پہنچی تو راجہ صاحب بولے ۔ تم کہاں رہ گئیں؟

انڈرو ۔ راستہ میں ڈاکٹر گنگولی اور مسٹر جان سیبوک مل گئے ۔ باتیں ہونے لگیں۔

مہیندر ۔ گنگولی کو ساتھ کیوں نہ لائیں؟

انڈرو ۔ جلدی میں تھے ۔ آج تو اس اندھے نے کمال کر دیا۔

مہیندر ۔ ایک ہی مکار ہے ۔ جو اس کے مزاج سے واقف نہ ہوگا ضرور دھوکے میں آگیا ہوگا ۔ اپنی بیگناہی کا اعلان کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کوئی طریقہ دھیان

ہی میں نہیں آ سکتا۔ اسے معجزہ کہنا چاہیئے۔ ماننا پڑے گا کہ وہ انسانی فطرت سے خوب واقف ہے۔ اُس پر مرکھ ہو کر بھی آج اُس نے کتنے ہی پڑھے لکھے لوگوں کو اپنا معتقد بنا لیا۔ یہاں لوگ اُس کا جنم استھان ادا کرنے کے لئے چندہ جمع کر رہے ہیں۔ سُنا ہے جلوس بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ مگر میرا تو یقین واثق ہے کہ اس نے اس عورت کو بہکایا اور مجھے افسوس ہے کہ میں نے زیادہ سخت سزا کیوں نہ دی۔

اندو۔ تو آپ نے چندہ بھی نہ دیا ہوگا؟

مہیندر۔ تمہیں کبھی کبھی تم سے سرپیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ چندہ کیسے دیتا؟ اپنے منہ میں آپ طمانچہ مارتا؟

اندو۔ لیکن میں نے تو دیا ہے۔ مجھے . . . .

مہیندر۔ اگر تم نے دیا ہے تو بُرا کیا ہے۔

اندو۔ مجھے یہ کیا معلوم تھا کہ . . . . .

مہیندر۔ فضول باتیں نہ بناؤ۔ اپنا نام پوشیدہ رکھنے کو تو کہہ دیا ہے؟

اندو۔ نہیں میں نے کچھ نہیں کہا۔

مہیندر۔ تو تم سے زیادہ بیوقوف آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔ تم نے اندر دت کو روپے دیئے ہوں گے۔ اندر دت یوں تو بہت ہی منکسر المزاج اور غریب دوست نوجوان ہے اور میں اس کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ لیکن اس موقع پر وہ مجھ سے چندہ وصول کرنے کے لئے وہ تمہارا نام تمثیلاً پیش کرتا پھرے گا۔ ذرا دل میں سوچو۔ لوگ کیا سمجھیں گے؟ افسوس! اگر میں اس وقت دیوار سے سر نہیں ٹکرا لیتا تو سمجھ لو کہ بڑے ضبط سے کام لے رہا ہوں۔ تمہارے ہاتھوں مجھے ہمیشہ ذلت ہی ملی اور تمہارا یہ کام تو میرے ماتھے پر کلنک کا وہ نشان ہے جو کبھی مٹ نہیں سکتا۔

یہ کہہ کر مہیندر کمار کرسی پر لیٹ گئے اور چھت کی طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیوار سے سر ٹکرانے میں چاہے انتہائی ضبط سے کام لیا ہو یا نہ لیا ہو مگر اندو نے اپنے دلی جذبات کے دبانے میں انتہائی ضبط سے ضرور کام لیا۔ جی میں آتا تھا۔

کہہ دوں کہ میں آپ کی غلام نہیں ہوں۔ مجھے یہ بات ممکن ہی نہیں معلوم ہوتی کہ کوئی ایسا انسان بھی ہو سکتا ہے جس کے دل پر ایسی دردناک اپیل کا کچھ اثر ہی نہ ہو۔ مگر اندیشہ ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ اُس نے چاہا کہ کمرہ سے چلی جاؤں اور بیدرد قسمت کو جس نے میرے سکون میں خلل ڈالنے کا اجارہ سا لے لیا ہے۔ پیروں تلے کچل ڈالوں اور دکھا دوں کہ ضبط و تحمل سے قسمت کے سخت ترین حملوں کی مدافعت کی جا سکتی ہے لیکن جوں ہی وہ دروازہ کی طرف چلی۔ مہیندر کمار پھر تن کر بیٹھ گئے اور بولے۔ جاتی کہاں ہو؟ کیا میری صورت سے بھی نفرت ہو گئی؟ میں تم سے بہت صفائی سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم اتنی خود رائی سے کیوں کام کرتی ہو؟ میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ جن باتوں کا تعلق مجھ سے ہو وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہ کی جایا کریں۔ ہاں اپنے ذاتی معاملوں میں تم خود مختار ہو۔ مگر تمہارے اوپر میری منت و سماجت کا کوئی اثر کیوں نہیں ہوتا؟ کیا تم نے قسم کھالی ہے کہ مجھے بدنام کر کے میری عزت کو خاک میں ملا کر میرے وقار کو پیروں سے کچل کر جیہی دم لو گی؟

اندو نے گردن اکڑ کر کہا۔ ایشور کے لئے اس وقت مجھے کچھ کہنے پر مجبور نہ کیجئے۔ مجھ سے غلطی ہوئی یا نہیں۔ اُس پر میں کچھ بحث نہیں کرنا چاہتی۔ میں مانے لیتی ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوئی اور ضرور ہوئی۔ میں اس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔ اگر اب بھی آپ کی طبیعت نہ آسودہ ہوئی ہو تو لیجئے بیٹھی جاتی ہوں۔ آپ جتنی دیر تک اور جو کچھ جی چاہے کہیں۔ میں سر نہ اُٹھاؤں گی۔

مگر غصہ نہایت بیدرد ہوتا ہے۔ وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرا ایک ایک لفظ نشانہ پر بیٹھتا ہے یا نہیں۔ وہ خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی طاقت لامحدود ہے۔ ایسا کوئی مہلک سے مہلک ہتھیار نہیں ہے جس سے بڑھ کر مہلک ہتھیار اس کے اسلحہ خانہ میں نہ ہوں۔ لیکن خاموشی وہ منتر ہے جس کے آگے اُس کی تمام طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ خاموشی اس کے لئے ناقابل فتح ہے۔

مہیندر کمار چڑ کر بولے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ مجھے بکواس کا روگ ہو گیا ہے اور کبھی کبھی اُس کا دورہ ہو جایا کرتا ہے!

اندو۔ یہ آپ خود کہتے ہیں۔

اندو سے غلطی ہوئی کہ وہ اپنی بات کو نبھا نہ سکی۔ غصہ کو ایک تازیانہ اور ملا۔ مہیندر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ یہ میں نہیں کہتا۔ تم کہتی ہو۔ آخر بات کیا ہے؟ میں تم سے تحقیق کرنے کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ تم کیوں بار بار وہی کام کرتی ہو جن سے میری بدنامی اور تضحیک ہو۔ میری عزت و آبرو خاک میں مل جائے۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہوں؟ میں جانتا ہوں۔ تم ضد سے ایسا نہیں کرتیں۔ میں یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ تم میری مرضی کے مطابق چلنے کی کوشش بھی کرتی ہو لیکن پھر بھی چوک ہو جاتی ہے اُس کا کیا سبب ہے؟ کیا یہ بات تو نہیں کہ اگلے جنم میں ہم اور تم ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ یا تقدیر نے میری تمام آرزوؤں اور حوصلوں کو برباد کرنے کے لئے تمہیں میرے دامن سے وابستہ کر دیا ہو؟ میں اکثر اسی سوچ میں پڑا رہتا ہوں۔ پر بھید نہیں کھلتا۔

اندو۔ مجھے علم غیب جاننے کا دعوے تو نہیں۔ ہاں اگر آپ کی مرضی ہو۔ تو میں جا کر اندر دت کو تاکید کر دوں کہ میرا نام نہ ظاہر ہونے پائے۔

مہیندر۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہو! تمہیں یہ سوچنا چاہیئے تھا کہ یہ چندہ کس نیت سے جمع کیا جا رہا ہے۔ اس کا مقصد ہے میرے انصاف کی تحقیر کرنا۔ میری نیکنامی کی جڑ کھود دینا۔ اگر میں اپنے ملازم کو سخت سُست کہوں اور تم اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرو تو میں اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا ہوں کہ تم مجھے بدنام کرنا چاہتی ہو۔ چندہ تو خیر ہو گا ہی۔ مجھے اُس کے روکنے کا اختیار نہیں ہے۔ جب تمہارے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے تو دوسروں کا کیا کہنا۔ لیکن میں جلوس کبھی نہ نکلنے دوں گا۔ میں اُسے اپنے حکم سے بند کر دونگا اور اگر لوگوں کو زیادہ آمادہ دیکھوں گا تو فوجی امداد لینے میں بھی دریغ نہ

نہ کروں گا۔

اندو۔ آپ جو چاہیں کریں۔ مجھ سے یہ سب باتیں کیوں کہتے ہیں؟

مہیندر۔ تم سے اس لئے کہتا ہوں۔ کہ تم بھی اس اندھے کے عقیدتمندوں میں ہو کون کہہ سکتا ہے کہ تم نے اس سے گرو منتر لینے کا ارادہ نہیں کر لیا ہے؟ آخر رمیداس بھگت کے چیلے اونچی ذاتوں میں بھی تو ہیں۔

اندو۔ میں گرو منتر کو نجات کا ذریعہ نہیں سمجھتی اور شاید کبھی وہ منتر نہ لونگی۔ مگر ہاں۔ آپ چاہے جتنا بُرا سمجھیں مگر بدقسمتی سے مجھے پورا یقین ہو گیا ہے کہ سوداس بے قصور ہے۔ اگر یہی اس سے عقیدت کرنا ہے تو میں ضرور عقیدتمند ہوں۔

مہیندر۔ تم کل جلوس میں نہ جاؤ گی؟

اندو۔ جانا تو چاہتی تھی۔ پر اب آپ کی خاطر سے نہ جاؤں گی۔ اپنے سر پر ہمیشہ ننگی تلوار لٹکتے نہیں دیکھ سکتی۔

مہیندر۔ اچھی بات ہے۔ اس کے لئے میں تمہارا بیحد ممنون ہوں۔

اندو اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ گئی۔ وہ بہت آزردہ خاطر ہو رہی تھی۔ وہ دیر تک راجہ صاحب کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ پھر آپ ہی بولی۔ بھگوان یہ زندگی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ یا تو تم اُن کے دل کو زیادہ فراخ بناؤ یا مجھے دُنیا سے اٹھا لو۔ اندر دت اس وقت نہ جانے کہاں ہوگا۔ کیوں نہ اُس کے پاس رقعہ بھیج دوں کہ خبردار۔ میرا نام ظاہر نہ ہونے پاوے۔ میں نے اُن سے ناحق کہہ دیا کہ چندہ دیا۔ کیا جانتی تھی کہ یہ گل کھلے گا۔

اس نے فوراً گھنٹی بجائی۔ نوکر اندر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اندو نے رقعہ لکھا۔ ڈیر اندر۔ میرے چندہ کو کسی پر ظاہر نہ کرنا ورنہ مجھے رنج ہوگا۔ مجھے بہت ہو کر یہ الفاظ لکھنے پڑے ہیں۔ آئے۔

پھر رقعہ نوکر کو دے کر بولی۔ اندر دت بابو کا مکان جانتا ہے؟

نوکر۔ ہوئی تو کہوں سہر سے ماں نا؟ پوچھ لیے۔

اندو۔ شہر میں تو شاید عمر بھر اُن کے گھر کا پتہ نہ لگے۔
نوکر۔ اب چیٹھی تو دیں بتا تو ہم لگا دب۔ لگی نا کا کہی۔
اندو۔ تانگہ لے لینا۔ کام جلدی کا ہے۔
نوکر۔ ہمار گوڑ تانگہ سے کم کھوڑے ہیں۔ کا ہم کو توتا لگا سُر سے کم چلت ہے؟
اندو۔ بازار چوک سے ہوتے ہوئے میرے گھر تک جانا میں بسوے وہ تمہیں میرے گھر ہی پر ملیں گے۔ اندر سے کو دیکھا ہے۔ پہچانتا ہے نا؟
نوکر۔ جبہ کا ایک بیر دیکھ لیٹی دی کا جلم کھیر نہ بھولی۔ اندر بابو کا تو سیکرن بیر دیکھا ہے۔
اندو۔ کسی کو یہ خط مت دکھانا۔
نوکر۔ کو دیکھی کسس؟ پہلے وہکی آنکھی نہ پھوڑ ڈارب۔
اندو نے رقعہ دیا۔ نوکر لے کر چلا گیا۔ وہ پھر لیٹ گئی اور وہیں باتیں سوچنے لگی۔ میری یہ ذلت انہی کے سبب ہو رہی ہے۔ اندر اپنے دل میں کیا سوچے گا؟ یہی نہ کہ راجہ صاحب نے اسے ڈانٹا ہوگا۔ گویا میں لونڈی ہوں۔ جب چاہتے ہیں ڈانٹ بتا دیتے ہیں۔ مجھے کوئی کام کرنے کی آزادی نہیں ہے۔ انہیں اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ میں اُن کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوں۔ کتنی ذلت ہے!
یہ سوچتے وہ تیزی سے اُٹھی۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔ نوکر آکر کھڑی ہوئی۔
اندو بولی — دیکھ بھیکا چلا تو نہیں گیا۔ میں نے اُسے ایک رقعہ دیا ہے لانگ لا۔ اب نہ بھیجوں گی۔ چلا گیا ہو تو کسی کو سائیکل پر دوڑا دینا۔ طرف مل جائے گا۔
نوکر چلی گئی اور ذرا دیر میں بھیکا کو لئے ہوئے آپہنچی۔ بھیکا بولا۔ جو حضور نہ جات تو ہم گھر ماں نا ملت۔

اندو۔ کام تو تم نے جرمانہ کا لیا ہے کہ اتنا ضروری خط اور تم گھر میں پڑے رہے لیکن اس وقت یہی اچھا ہوا۔ وہ رقعہ اب نہ جائے گا۔ مجھے دو۔

اُن سے رقعہ لے کر چاک کر ڈالا۔ پھر آج کا روزنامہ کھول کر دیکھنے لگی۔ پہلی ہی سُرخی تھی "شاستری جی کی معرکتہ الآرا تقریر"۔ اندو نے اخبار کو نیچے ڈال دیا۔ اور کہنے لگی۔ یہ مہاشے تو شیطان سے زیادہ مشہور ہو گئے۔ جہاں دیکھو شاستری جی! ایسے آدمیوں کی قابلیت کی خواہ کتنی تعریف کی جائے مگر اُس کی تو تعریف نہیں کی جا سکتی۔ شاستری کا نام آتے ہی مجھے ان کی یاد آجاتی ہے جو آدمی ذرا ذرا سے اختلافات پر بھی سر ہو جائے۔ دل میں ذرا سا شک زیادہ ہو جانے پر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ جسے دوسروں کے دلی جذبات کا ذرا بھی لحاظ نہ ہو جسے ذرا بھی خیال نہ ہو کہ میری باتوں سے کسی کے دل پر کیا گزرے گی۔ وہ بھی کوئی آدمی ہے! ہو سکتا ہے کہ کل کو کہنے لگیں۔ اپنے پتا سے ملنے نہ جاؤ۔ گویا میں ان کے ہاتھوں بک گئی ہوں۔

دوسرے روز علی الصباح اُس نے گاڑی تیار کرائی اور دوشالا اوڑھ کر گھر سے نکلی۔ مہیندر کمار باغ میں ٹہل رہے تھے۔ یہ اُن کا ہر روز کا معمول تھا۔ اندو کو جاتے دیکھا تو پوچھا۔ اتنے سویرے کہاں؟ اندو نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جاتی ہوں آپ کے حکم کی تعمیل کرنے۔ اندر دت سے روپے واپس لینے

مہیندر۔ اندو۔ سچ کہتا ہوں تم مجھے پاگل بنا دو گی۔

اندو۔ آپ مجھے کٹھ پتلیوں کی طرح نچانا چاہتے ہیں۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔

یکایک اندر دت سامنے سے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ اندو اُن کی طرف لپک کر چلی اور پوچھا تک پہنچ کر بولی۔ اندر دت۔ سچ کہنا تم نے کاسے میرے چندے کا ذکر تو نہیں کیا؟

اندر سہم سا گیا جیسے کوئی شخص دوکاندار کو پیسے کی جگہ روپے دے آئے بولا۔ "آپ نے مجھے منع تو نہیں کیا تھا؟"

اندو۔ تم جھوٹے ہو۔ میں نے منع کیا تھا۔

اندر دت۔ اندو رانی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے منع نہیں کیا تھا۔ ہاں مجھے خود ہی عقل سے کام لینا چاہئے تھا۔ اتنی غلطی ضرور میری ہے۔

اندو۔ (آہستہ سے) تم مہیندر سے اتنا کہہ سکتے ہو کہ میں نے ان کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا؟ مجھ پر تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ میں روحانی عذاب میں مبتلا ہوں۔

یہ کہتے کہتے اندو کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ اندر دت موقع تاڑ گیا بولا — ہاں کہہ دوں گا۔ آپ کی خاطر سے۔

ایک لمحہ میں اندر راجہ صاحب کے پاس جا پہنچا۔ اندو گھر چلی گئی۔

مہیند کمار نے پوچھا — کہئے مہاشے۔ اس وقت آپ نے کیسے تکلیف کی؟

اندر دت۔ مجھے تو تکلیف نہیں ہوئی۔ آپ کو تکلیف دینے آیا ہوں۔ اگرچہ خلاف قاعدہ ہے مگر میری آپ سے التجا ہے کہ سورداس اور سبھاگی کا قصور معاف فرما کر آپ اسی وقت مجھ سے لے لیں اور ان دونوں کی رہائی کا حکم دے دیں۔ کچہری ابھی دیر میں کھلے گی۔ میں اسے آپ کی خاص عنایت سمجھوں گا۔

مہیند رکمار۔ ہاں، خلاف قاعدہ تو ہے لیکن تمہارا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ روپے منیم کو دے دو۔ میں رہائی کا حکم لکھے دیتا ہوں۔ کتنے روپے جمع کئے؟

اندر دت۔ بس شام کو خاص خاص آدمیوں کے پاس گیا تھا۔ کوئی پانچ سو روپے ہو گئے۔

مہیند رکمار۔ تب تو تم اس فن میں ماہر ہو۔ اندو رانی کا نام دیکھ کر نہ دینے والوں نے بھی دئے ہوں گے۔

اندر دت۔ میں اندو رانی کے نام کی اس سے زیادہ عزت کرتا ہوں۔ اگر ان کا نام دکھاتا تو پانچ سو روپے نہ لاتا۔ پانچ ہزار لاتا۔

مہیند رکمار۔ اگر یہ سچ ہے تو تم نے میری آبرو رکھ لی۔

**اندر دت۔** مجھے آپ سے ایک التجا اور کرنی ہے۔ کچھ لوگ سُور داس کو عزت کے ساتھ اُس کے گھر پہنچانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے دو چار سو لوگ جمع ہو جائیں۔ میں آپ سے اُس کی اجازت چاہتا ہوں۔

**مہیندر کمار۔** جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بدامنی واقع ہونے کا احتمال ہے۔

**اندر دت۔** میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پتّا تک نہ ہلے گا۔

**مہیندر کمار۔** یہ غیر ممکن ہے۔

**اندر دت۔** میں اس کی ضمانت دے سکتا ہوں۔

**مہیندر کمار۔** یہ نہیں ہو سکتا۔

اندر دت سمجھ گیا کہ راجہ صاحب سے اب زیادہ اصرار کرنا بیفائدہ ہے۔ جا کر منیم کو روپے دیئے اور تانگہ کی طرف چلا۔ دفعتاً راجہ صاحب نے پوچھا ــــ جلوس تو نہ نکلے گا نہ؟

**اندر دت۔** نکلے گا۔ میں روکنا چاہوں تو بھی رُک نہیں سکتا۔

اندر دت وہاں سے اپنے دوستوں کو خبر دینے چلے۔ جلوس کا انتظام کرنے میں گھنٹوں کی دیر ہو گئی۔ اِدھر اُن کے جاتے ہی راجہ صاحب نے جیل کے داروغہ کو ٹیلیفون کر دیا کہ سُور داس اور سبھاگی چھوڑ دئے جائیں اور اُنہیں بند گاڑی میں بٹھا کر اُن کے گھر پہنچا دیا جاوے۔ جب اندر دت سواری باجے وغیرہ لئے ہوئے جیل پہنچے۔ تو معلوم ہوا کہ پنچھی اڑ چکا ہے۔ چڑیاں اُڑ گئیں۔ وہ کفِ افسوس مل کر رہ گئے۔ اُنہیں پاؤں پانڈو پور کو چلے۔ دیکھا تو سُور داس ایک نیم کے نیچے راکھ کے ڈھیر کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ ایک طرف سبھاگی سر جھکائے کھڑی ہے۔ اندر دت کو دیکھتے ہی جگدھر اور دیگر کئی اشخاص اِدھر اُدھر سے آ کر جمع ہو گئے۔

**اندر دت۔** سُور داس تم نے بڑی جلدی کی۔ وہاں لوگ تمہارا جلوس

نکالنے کی تیاریاں سے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب نے بازی مار لی۔ اب بتاؤ ان روپیوں کا کیا کیا جائے جو جلوس کے لئے جمع کئے گئے تھے؟

سُورداس۔ اچھا ہی ہُوا کہ میں یہاں چپکے سے آ گیا۔ نہیں تو سہر بھر میں گھُومنا پڑتا۔ جلوس بڑے بڑے آدمیوں کا نکلتا ہے کہ اندھے بھکاریوں کا؟ آپ لوگوں نے جو بیانہ دے کر چھڑا دیا یہی کون کم پُن کیا۔

اندردت۔ اچھا بتاؤ یہ روپے کیا کئے جائیں۔ تمہیں دے دوں؟

سُورداس۔ کتنے روپے ہوں گے؟

اندردت۔ کوئی تین سو ہوں گے۔

سُورداس۔ بہت ہیں۔ اتنے میں بھیرو کی دوکان مجے میں بن جائے گی۔

جگدھر کو بُرا معلوم ہُوا۔ بولا۔ پہلے اپنے گھوڑے کی تو پھکر کرو۔

سورداس۔ میں اسی پیڑ کے نیچے پڑ رہا کروں گا یا پنڈا جی کے دالان میں

جگدھر۔ جس کی دوکان جلی ہے وہ بنوائے گا۔ تمہیں کیا چنتا ہے؟

سورداس۔ جلی تو ہے میرے کارن۔

جگدھر۔ تمہارا گھر بھی تو جلا ہے۔

سُورداس۔ یہ بھی بنے گا مگر پیچھے سے۔ دوکان نہ بنی تو بھیرو کو کتنا گھاٹا ہوگا۔ میری بھیک تو ایک دن بھی بند نہ ہوگی۔

جگدھر۔ بہت سراہنے سے بھی آدمی کا من بگڑ جاتا ہے۔ تمہاری قبل منسی کا لوگ بکھان کرنے لگے تو اب تم سوچتے ہوگے کہ ایسا کام کروں جس میں اور بڑائی ہو۔ اس طرح دوسروں کی تالی پر ناچنا نہ چاہیئے۔

اندردت۔ سُورداس تم ان لوگوں کو پکنے دو۔ تم گیانی ہو۔ یہ روپے تمہارے پاس چھوڑے جاتا ہوں۔ جو جی میں آوے کرنا۔

اندردت چلا گیا تو سبھاگی نے سُورداس سے کہا۔ اُس کی دوکان بنوانے کا نام نہ لینا۔

**سُور داس** - میرے گھر سے پہلے اس کی دوکان بنے گی۔ بدنامی سر پر کون لے کہ سُور داس نے بھیرو کا گھر جلوا دیا؟ میرے من میں یہ بات سما گئی ہے کہ تمہیں میں سے کسی نے اُس کی دوکان جلائی۔

**سُبھاگی** - اُس سے کہتے ہی دل پر بوجھ تمہارا دُشمن ہی بنا رہے گا۔ کُتّے کی پُونچھ کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔

**سُور داس** - تم دونوں پھر ایک ہو جاؤ گے تب تجھ سے پُوچھوں گا۔

**سُبھاگی** - بھگوان مار ڈالیں پر اُس کا منہ نہ دکھاویں۔

**سُور داس** - میں کہے دیتا ہوں تو ایک دن بھیرو کے گھر کی دیہی بنے گی۔

سور داس روپے لئے ہوئے بھیرو کے گھر کی طرف چلا۔ بھیرو رپٹ کرنے کو جانا تو چاہتا تھا پر ڈرتا تھا کہ کہیں سُور داس کے جھونپڑے کی بھی بات چلی تو کیا جواب دوں گا۔ بار بار ارادہ کر کے رُک جاتا تھا۔ اتنے میں سُور داس کو سامنے آتے دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔ تعجب سے بولا۔ ارے کیا جریبانہ دے آیا کیا؟

**بُڑھیا** بولی۔ بیٹا۔ اِسے جرور کسی دیوتا کا اِشٹ ہے نہیں تو وہاں سے کیسے بھاگ آتا؟

**سُور داس** نے بڑھ کر کہا۔ بھیرو میں ایشور کو ساکھی دے کر کہتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ تمہاری دوکان کس نے جلائی۔ تم مجھے چاہے جتنا نیچ سمجھو پر میری جانکاری میں یہ بات کبھی نہ ہونے پاتی۔ ہاں اتنا کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ کسی میرے ہتو (خیر خواہ) کا کام ہے۔

**بھیرو** - پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم چھوٹے کیسے آئے؟ مجھے تو یہی بڑا اچرج ہے۔

**سُور داس** - بھگوان کی اچھا۔ سہر کے کچھ دھرماتما لوگوں نے آپس میں چندہ کر کے میرا جریبانہ بھی دے دیا۔ اور کوئی تین سو روپے جو بچ رہے ہیں مجھے دئے گئے ہیں میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ یہ روپے لے کر اپنی دوکان بنواؤ جس میں تمہارا ہرج نہ ہو۔ میں سب روپے لے آیا ہوں۔

بھیرو ششدر ہو کر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے کوئی آدمی آسمان سے موتیوں کی بارش ہوتی ہوئی دیکھے۔ اُسے اندیشہ ہو رہا تھا کہ ان کولوں یا نہیں۔ ان میں کوئی بھید تو نہیں ہے۔ ان میں کوئی زہریلا کیڑا تو نہیں چھپا ہے۔ کہیں اُن کے لینے سے مجھ پر کوئی آفت تو نہ آئے گی؟ اُس کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ اندھا سچ مچ مجھے روپے دینے کو لایا ہے یا مجھے طعنہ دے رہا ہے۔ ذرا اس کا دل ٹٹولنا چاہئے۔ بولا۔ تم اپنے روپے رکھو۔ یہاں کوئی روپوں کے بھوکے نہیں ہیں۔ پیاسوں مرتے بھی ہوں تو دشمن کے ہاتھ سے پانی نہ پئیں۔

سُورداس۔ بھیرو تمہاری دشمنی کیسی؟ میں تو کسی کو اپنا دشمن نہیں دیکھتا۔ چار دن کی چاندنی کے لئے کیا کسی سے دشمنی کی جائے! تم نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ تمہاری جگہ میں ہوتا اور سمجھتا کہ تم میری گھر والی کو بہکائے لئے جاتے ہو تو میں بھی یہی کرتا جو تم نے کیا۔ اپنی آبرو کس کو پیاری نہیں ہوتی؟ جسے اپنی آبرو پیاری نہ ہو اُس کی گنتی آدمیوں میں نہیں۔ جانوروں میں ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے تمہارے ہی لئے یہ روپے لئے ہیں نہیں تو میرے لئے تو سیر بھر چنا بہت تھی۔ میں جانتا ہوں کہ ابھی تمہیں میرے اوپر شبہ ہو رہا ہے پر کبھی نہ کبھی تمہارا من میری طرف سے صاف ہو جائے گا۔ یہ روپے لو اور بھگوان کا نام لے کر دوکان بنوانے میں ہاتھ لگا دو۔ کم پڑیں گے تو جس بھگوان نے اتنی سہائتا دی ہے وہی بھگوان اور بھی سہائتا دیں گے۔

بھیرو کو ان الفاظ میں ہمدردی اور شرافت کی جھلک دکھائی دی۔ سچائی اعتبار کو پیدا کر دیتی ہے۔ نرم ہو کر بولا نہ آؤ بیٹھو۔ چلم پیو۔ کچھ باتیں ہوں تو سمجھ میں آئے۔ تمہارے من کا بھید نہیں کھلتا۔ دشمن کے ساتھ تو کوئی بھلائی نہیں کرتا۔ تم میرے ساتھ کیوں اتنی مہربانی کرتے ہو؟

سُورداس۔ تم نے میرے ساتھ کون سی دشمنی کی؟ تم نے وہی کیا جو تمہارا دھرم تھا۔ میں رات بھر حوالات میں بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ تم کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔

میں نے تو تمہارے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کی تو مجھے معلوم ہُوا کہ تم میرے ساتھ کوئی بُرائی نہیں کر رہے ہو۔ یہی تمہارا دھرم ہے۔ عورت کے پیچھے تو کھُون ہو جاتا ہے۔ تم نے نا بس ہی کر دی تو کون بُرا کام کیا۔ بس اب تم سے میری یہی بنتی ہے کہ جس طرح کل بھری عدالت میں پنچوں نے مجھے بے کسور کہہ دیا۔ اسی طرح تم بھی میری طرف سے اپنا مَن صاف کر لو۔ میری اس سے بھی اَدھک (زیادہ) دُرگت ہو اگر میں نے تمہارے ساتھ کوئی گھات کیا ہو۔ ہاں مجھ سے ایک ہی بات نہیں ہو سکتی۔ میں سبھاگی کو اپنے گھر سے نکال نہیں سکتا۔ ڈرتا ہوں کہ کوئی آڑ نہ رہے گی۔ تو نہ جانے اُس کی کیا دسا ہو۔ میرے یہاں رہے گی۔ تو کون جانے کبھی تمہیں اُسے رکھ لو۔

بھیرو کا کدورت بھرا دل اس باطنی صفائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ آج پہلی مرتبہ اُسے سُورداس کی نیک نیتی کا یقین ہو گیا۔ سوچا۔ اگر اس کا دل صاف نہ ہوتا تو مجھ سے ایسی باتیں کیوں کرتا؟ میرا کوئی ڈر تو اسے ہے ہی نہیں۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا کر چکا۔ اس کے ساتھ تو سارا شہر ہے۔ سبھوں نے جرمانہ ادا کر دیا۔ اوپر کئی سو روپے اور دے گئے۔ محلہ میں بھی اس کی دھاک پھر بیٹھ گئی۔ چاہے تو بات کی بات میں مجھے لبگاڑ سکتا ہے۔ نیت صاف نہیں ہوتی تو اب سبھاگی کے ساتھ آرام سے رہتا۔ اندھا ہے۔ اپاہج ہے۔ بھیکھ مانگتا ہے۔ پر اُس کی کتنی مرجاد ہے۔ بڑے بڑے آدمی اُس کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ میں کتنا کمینہ نیچ آدمی ہوں کہ پیسے کے لئے رات دن دَگا پھریب کرتا رہتا ہوں۔ کون سا پاپ ہے جو میں نے نہیں کیا اس بیچارے کا گھر جلایا۔ ایک بار نہیں دوبار۔ اس کے روپے اُٹھا لے گیا۔ یہ میرے ساتھ نیکی ہی کرتا چلا آتا ہے۔ سبھاگی کے بارہ میں مجھے شک ہی شک تھا۔ اگر کچھ نیت بد ہوتی تو اس کا ہاتھ کس نے پکڑا تھا۔ سبھاگی کو کھُلے کھجانے رکھ لیتا۔ اب تو عدالت کچہری کا بھی ڈر نہیں رہا۔ یہ سوچتا ہُوا وہ سُورداس کے پاس آکر بولا۔ سُورداس اب تک میں نے

تمہارے ساتھ جو کچھ بھلائی برائی کی اُسے ماپھ کرو۔ آج سے اگر تمہارے ساتھ کوئی بُرائی کروں تو بھگوان مجھ سے سمجھیں۔ یہ روپے مجھے مت دو۔ میرے پاس روپے ہیں۔ دوکان بنوالوں گا۔ سبھاگی پر بھی اب مجھے کوئی شک نہیں رہا۔ میں بھگوان کو بیچ میں ڈال کر کہتا ہوں کہ اب میں کبھی اُسے کوئی کڑی بات تک نہ کہوں گا۔ میں اب تک دھوکے میں پڑا ہُوا تھا۔ سبھاگی کو میرے یہاں آنے پر راجی کردو۔ وہ تمہاری بات کو نا نہیں کرے گی۔

سُور داس۔ راجی ہی ہے بس اُسے یہی ڈر ہے کہ تم پھر مارنے پیٹنے لگو گے۔

بھیرو۔ نہیں سُور داس۔ اب میں اُسے بھی پہچان گیا۔ میں اُس کے لائق نہیں تھا۔ اُس کا بیاہ تو کسی دیوتا آدمی سے ہونا چاہئے تھا۔ (آہستہ) آج تم سے کہتا ہوں پہلی بار بھی میں نے ہی تمہارے گھر میں آگ لگائی تھی اور تمہارے روپے چُرائے تھے۔

سُور داس۔ ان باتوں کو بھول جاؤ بھیرو۔ مجھے سب معلوم ہے۔ دُنیا میں کون ہے جو کہے کہ میں گنگا جل ہوں۔ جب بڑے بڑے سادھو سنیاسی مایا موہ میں پھنسے ہوئے ہیں تو ہماری تمہاری کیا بات ہے۔ ہماری بڑی بھول یہی ہے کہ کھیل کو کھیل کی طرح نہیں کھیلتے۔ کھیل میں دھاندلی کرکے کوئی جیت ہی جائے تو کیا ہاتھ آئے گا۔ کھیلنا تو اس طرح چاہئے کہ نگاہ جیت پر رہے پر ہار سے گھبرائے نہیں۔ ایمان کو نہ چھوڑے۔ جیت کر اتنا نہ اترائے کہ اب کبھی ہار ہوتی ہی نہیں۔ یہ ہار جیت تو زندگانی کے ساتھ ہی ہے۔ ہاں ایک صلاح کی بات کہتا ہوں تم تاڑی کی دوکان چھوڑ کر کوئی دوسرا روجگار کیوں نہیں کرتے؟

بھیرو۔ جو کہو وہ کروں۔ وہ روجگار ہے کھراب۔ رات دن جُواری، چور، بدماس آدمیوں ہی کا ساتھ رہتا ہے۔ انہیں کی باتیں سُنو۔ انہیں کے ڈھنگ سیکھو۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اسی روجگار نے مجھے چوپٹ کیا۔ بتاؤ کیا کروں؟

**سُورداس** ۔ لکڑی کا روجگار کیوں نہیں کر لیتے ؟ بُرا نہیں ہے ۔ آج کل یہاں پردیسی بہت آئیں گے ۔ بکری بھی اچھی ہوگی ۔ جہاں تاڑی کی دوکان تھی ۔ وہیں ایک بانڑا بنوا دو اور ان روپوں سے لکڑی کا کام کرنا شروع کر دو ۔

**بھیرو** ۔ بہت اچھی بات ہے ۔ مگر یہ روپے اپنے ہی پاس رکھو میرے من کا کیا ٹھکانا ۔ روپے پاکر کوئی اور بُرائی نہ کر بیٹھوں ۔ میرے جیسے آدمی کو تو کبھی آدھے پیٹ کے سوا بھوجن نہ ملنا چاہیئے ۔ پیسے ہاتھ میں آئے اور سنگ سوار ہوئی ۔

**سُورداس** ۔ میرے گھر نہ دوار ۔ رکھوں گا کہاں ؟

**بھیرو** ۔ اس سے کہو اپنا گھر بنوا لو ۔

**سُورداس** ۔ تمہیں لکڑی کی دوکان سے نپٹا ہو تو بنوا دینا ۔

**بھیرو** ۔ سمجھا کی کہ سمجھا دوں ۔

**سُورداس** ۔ سمجھا دُوں گا ۔

سُورداس چلا گیا ۔ بھیرو گھر میں گیا تو بڑھیا بولی ۔ کچھے میل کرنے آیا تھا نا ؟

**بھیرو** ۔ ہاں کیوں نہ میل کرے گا ۔ میں بڑا لاٹ ہوں نا ۔ بڑھاپے میں تجھے اور کچھ نہیں سوجھتا ۔ یہ آدمی نہیں سادھو ہے ۔

## (۳۳)

فیکٹری (کارخانہ) قریب قریب تیار ہوگئی تھی ۔ اب مشینیں گڑنے لگیں ۔ پہلے تو مزدور مستری وغیرہ گودام کے برآمدوں ہی میں رہتے تھے ۔ وہیں پیڑوں کے نیچے کھانا پکاتے اور سوتے تھے ۔ لیکن جب ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ۔ تو محلہ میں مکان لے لے کر رہنے لگے ۔ پانڈے پور چھوٹی سی بستی تو تھی ہی ۔ وہاں اتنے مکانات کہاں تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ محلہ والے کرایہ کی لالچ سے پردیسیوں کو اپنے اپنے گھروں میں ٹھہرانے لگے ۔ کوئی پردہ کی دیوار کھینچوا لیتا تھا کوئی خود جھونپڑا بنا کر اس میں رہنے لگتا اور مکان کرایہ داروں کو دے دیتا ۔ بھیرو نے لکڑی کی

دوکان کھول لی تھی۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ وہیں رہنے لگا۔ اور اپنا رہائشی مکان کرایہ پر اُٹھا دیا۔ ٹھاکر دین نے اپنی دوکان کے سامنے ایک ٹٹی لگا کر گزر کرنا شروع کیا۔ اُس کے گھر میں ایک اودرسیر آجے۔ جگدھر سب سے زیادہ لالچی تھا۔ اُس نے سارا مکان اٹھا دیا اور اب ایک پھوس کے چھپر میں نباہ کرنے لگا۔ نایک رام کے برآمدہ میں تو رند۔ ایک بارات ٹھہرتی تھی۔ لالچ نے لوگوں کو یہاں تک گھیرا کہ کبرنگی نے بھی مکان کا ایک حصہ اٹھا دیا۔ ہاں سُورداس نے کسی کو نہیں ٹھہرایا۔ وہ اپنے نئے مکان میں جو رانی اندو کے مخفی عطیہ سے بنا تھا سبھاگی کے ساتھ رہتا تھا۔ سبھاگی ابھی تک بھیرو کے ساتھ رہنے میں راضی نہ ہوئی تھی۔ ہاں بھیرو کی آمد و رفت اب سُورداس کے گھر میں زیادہ تر رہتی تھی۔

کارخانہ میں ابھی مشینیں نہ لگی تھیں۔ مگر اس کی وسعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ سُورداس کی بقیہ پانچ بیگھہ زمین بھی اسی قاعدہ کے مطابق مل کے تصرف میں آگئی۔ سُورداس نے سُنا تو ہاتھ مل کر رہ گیا۔ پچھتانے لگا کہ جان صاحب ہی سے کیوں نہ سودا کر لیا۔ پانچ ہزار دیتے تھے۔ اب بہت ملیں گے تو دو چار سو مل جائیں گے۔ اب کسی قسم کی تحریک کرنا اُسے بیفائدہ معلوم ہوتا تھا۔ جب پہلے ہی کچھ نہ کر سکا تو اب کیا کریں گا۔ پہلے ہی یہ اندیشہ تھا وہ دُرست نہ نکلا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سُورداس ایک درخت کے نیچے بیٹھا جھپکیاں لے رہا تھا۔ کہ تحصیل کے ایک چپڑاسی نے آکر اُسے پکارا اور ایک سرکاری پروانہ دیا۔ سُورداس سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو زمین ہی کا کچھ جھگڑا ہے۔ پروانہ لئے ہوئے مل میں آیا کہ کسی بابو سے پڑھوئے۔ مگر کچہری کی خوشخط تحریر میں کے بابوؤں سے کیا پڑھی جاتی۔ کوئی کچھ نہ بتلا سکا۔ مجبوراً واپس آرہا تھا۔ کہ پرھو سیوک نے دیکھ لیا۔ فوراً اپنے کمرہ میں بُلا لیا اور پروانہ کو دیکھا۔ لکھا ہوا تھا۔ اپنی زمین کے معاوضہ کے ایک ہزار روپے تحصیل میں آکر لے جاؤ۔

سُور داس۔ کل ایک ہزار ہے؟

پربھو سیوک۔ ہاں اتنا ہی تو لکھا ہے۔

سُور داس۔ تو میں روپے لینے نہ جاؤں گا۔ صاحب نے پانچ ہزار دینے کہے تھے اُس کے ایک ہی ہزار رہے گھوس کھاؤں میں سرکار اس روپے اور اُٹھ جائیں گے۔ سرکار کا کھجانا کھالی ہے۔ بھر جائے گا

پربھو سیوک۔ روپے نہ لوگے تو ضبط ہو جائیں گے۔ یہاں تو سرکار ہی آک ہیں وہی ہے کہ کسی طرح رعایا کا دھن اُڑا لے۔ کچھ ٹیکس کے بہانے سے کچھ روزگار کے بہانے سے کچھ کسی بہانے سے ہتھم کر لیتی ہے۔

سور داس۔ گر یوں ہی چھین لیتی ہے تو بجا رہا ہے دام نہ دینا چاہئے ایک تو چھین جھپٹ دھرتی لے لی اُس پر سے مانا دام دے دیا۔ یہ کوئی نیائے نہیں ہے۔

پربھو سیوک۔ سرکار یہاں نیائے کرنے نہیں آئی ہے۔ بھائی راج کرنے آئی ہے۔ نیائے کرنے سے اُسے کچھ ملتا ہے؟ کوئی وقت وہ تھا جب نیائے کو راج کی بنیاد سمجھا جاتا تھا۔ اب وہ وقت نہیں ہے۔ اب تجارت کا راج ہے اور جو اس راج کو مضبوط نہ کرے۔ اس کے لئے ستاروں کا نشانہ مارنے والی توپیں ہیں۔ تم کیا کر سکتے ہو؟ دیوانی میں مقدمہ دائر کروگے؟ وہاں بھی سرکار ہی کے ٹوکرچا کر انصاف کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

سُور داس۔ میں کچھ نہ لوں گا۔ جب راجہ ہی دھرم کرنے لگا تو پرجا کہاں تک جان بچانی پھرے گی؟

پربھو سیوک۔ اس سے فائدہ کیا؟ ایک ہزار ملتے ہیں لے لو۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی بھلی۔

یکایک اندر دت آ پہنچے اور بولے۔ پربھو۔ آج ڈیرا کوچ ہے۔ راجپوتانہ جا رہا ہوں۔

پربھو سیوک۔ فضول جاتے ہو۔ ایک تو ایسی سخت گرمی دوسرے وہاں

کی حالت اب بہت نازک ہو رہی ہے۔ ناحق کہیں پھنس پھنسا جاؤ گے۔

اندر دت۔ میں ایک بار رنے سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اُن کے مزاج اخلاق اور اصول میں اتنا تغیر بلکہ انقلاب کیسے واقع ہو گیا۔ پر بھو یوگ۔ ضرور کوئی نہ کوئی راز ہے۔ طمع میں پڑنے والا آدمی نہیں ہے۔ میں تو اُس کا دل و جان سے معتقد ہوں۔ اگر وہ منحرف ہوئے تو میں سمجھ جاؤں گا کہ مذہب و راستی کا دنیا سے نقدان ہو گیا۔

اندر دت۔ یہ نہ کہو بھیو۔ انسانی فطرت ایک معمہ ہے۔ اس کا جاننا نہایت دشوار ہے۔ مجھے تو ہنسی آتی ہے کہ پانڈے تو گولی مار دو۔ ہاں اطمینان کی بات یہ ہے کہ اُن کے نکل جانے کا اس جماعت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ تمہیں تو معلوم ہے۔ ہم لوگوں نے بنگال میں مصیبت زدوں کو قرار واقعی مدد دینے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ کئی کئی دنوں تک تو ہم لوگوں کو ایک دانہ تک میسر نہ ہوتا تھا۔

سُور داس۔ بھیا کون لوگ اس طرح گریبوں کا پالن کرتے ہیں؟

اندر دت۔ ارے سُور داس۔ تم یہاں گوشہ میں کھڑے ہو۔ میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں۔ کہو سب خیریت ہے نا؟

سُور داس۔ سب بھگوان کی دَایا ہے۔ تم ابھی کن آدمیوں کی بات کر رہے تھے؟

اندر دت۔ اپنے ہی ساتھیوں کی۔ کنور بھرت سنگھ نے کچھ نوجوانوں کو جمع کر کے ایک ٹولی بنا دی ہے۔ اور اس کے خرچ کے لئے تھوڑی سی زمین بھی دان کر دی ہے۔ آج کل ہم لوگ کوئی سو آدمی ہیں۔ دیش کی جتنے المقدور خدمت کرنا ہی ہم لوگوں کا خاص فرض ہے۔ اس وقت ہم میں سے کچھ لوگ تو راجپوتانہ کو گئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ پنجاب کو۔ جہاں سرکاری فوج نے رعایا پر گولیاں چلا دی ہیں۔

سُورداس۔ بھیا یہ تو بڑے پُن کا کام ہے۔ ایسے مہانما لوگوں کے تو درسن کرنا چاہئے تو بھیا تم لوگ چندے بھی اکٹھے ہوئے؟

اندرودت۔ ہاں جس کی مرضی ہوتی ہے چندہ بھی دے دیتا ہے لیکن ہم لوگ خود نہیں مانگتے پھرتے۔

سُورداس۔ میں آپ لوگوں کے ساتھ چلوں تو آپ مجھے رکھیں گے؟ یہاں پڑے پڑے اپنا پیٹ پالتا ہوں۔ آپ کے ساتھ رہوں گا تو آدمی ہو جاؤں گا۔

اندرودت نے پرھو سیوک سے انگریزی میں کہا۔ کتنا بھولا آدمی ہے۔ خدمت اور ایثار کا مجسم نمونہ ہونے پر بھی غرور چھو تک نہیں گیا۔ اپنے نیک کاموں کی کچھ قدر ہی نہیں سمجھتا۔ پرُاپکار اب اس کے لیے کوئی اختیاری فعل نہیں رہا۔ وہ اس کی عادت ہی میں داخل ہو گیا ہے۔

سُورداس نے پھر کہا۔ اور کچھ تو نہ کر سکوں گا۔ اپنے گنوار بھائیوں پر جس کے سر پر بیٹھا دیجئے گا پنکھا جھلتا رہوں گا۔ بیٹھ پر جو کچھ لاد دیجئے گا لئے پھروں گا۔

اندرودت۔ تم معمولاً جو کچھ کرتے ہو وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ جسے ہم لوگ کبھی کبھی خاص موقعوں پر کرتے ہیں۔ دھن کے ساتھ تن کی کرنا مریضوں کی تیمارداری سے کسی طرح کم نہیں بلکہ زیادہ اچھا ہے۔

سُورداس کا چہرہ شگفتہ ہو گیا جیسے کسی شاعر نے کسی سخن فہم سے داد پائی ہو۔ بولا ــــ بھیا ہماری کیا بات چلاتے ہو؟ جو آدمی پیٹ پالنے کے لیے بھیک مانگے گا وہ پُن دھرم کیا کرے گا؟ بُرا نہ مانو تو ایک بات کہوں۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے مگر آپ کا حکم ہو تو مجھے ماہوار (معاوضہ) کے جو روپے ملے ہیں انہیں آپ کی سنگت کے بھینٹ کر دوں؟

اندرودت کیسے روپے۔

پرھو سیوک۔ اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ پالپانے راجہ نہیندر کمار کی مدد سے اُس کی جوڑ بین لے لی تھی اُس کا ایک ہزار روپیہ معاوضہ

اسے دیا گیا ہے۔ یہ دل اُسی لوٹ کے مال پر پل رہی ہے۔

اندرونٹ۔ تم نے اپنے پاپا کو منع نہیں کیا؟

پربھو سیوک۔ قسم خدا کی میں اور صوفی دونوں ہی نے پاپا کو بہت روکا۔ پر تم اُن کی عادت جانتے ہی ہو۔ کوئی دھن سوار ہو جاتی ہے۔ تو کسی کی نہیں سُنتے

اندرونٹ۔ میں تو اپنے باپ سے لڑ جاتا۔ دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا۔ ایسی حالت میں تمہارا کم از کم یہ فرض تھا کہ دل سے بالکل علیحدہ رہتے۔ باپ کا حکم ماننا بیٹے کا فرض ہے۔ یہ میں جانتا ہوں لیکن جب باپ بے انصافی کرنے لگے تو بیٹے کو اس کی تلافی کرنے کے لیے مجبور نہیں۔ تمہاری نظموں کے تو ایک ایک لفظ سے (اقتباس) ٹپکتا ہے اپنی پرواز کرنے سے کہیں زیادہ حسین بھی بات ہو جاتی ہے۔ مگر مجھ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری ساری طاقت نظموں کی بندش ہی میں صرف ہو جاتی ہے۔ مضمون کچھ بھی باقی نہیں بچتا۔ واقعی بات تو یہ ہے کہ تم اپنے کلام کی آڑ کو بھی نہیں پہنچتے۔ اس زبان ہی کے نہیں بلکہ دیس کے ہم لوگ تم جیسے غریبوں سے چندہ نہیں لیتے۔ ہمارے داتا امیر لوگ ہیں۔

سُورداس۔ بھیا تم ناراض ہو گئے تو کوئی چور لے جائے گا میرے پاس روپوں کا کام ہی کیا ہے؟ تمہاری دیا سے پیٹ بھر اناج مل ہی جاتا ہے۔ رہنے کو جھونپڑی بنا ہی گئی ہے۔ اور کیا چاہئے؟ کسی اچھے کام میں لگ جانا اس سے کہیں اچھا ہے کہ چندہ اٹھائے جائیں۔ میرے اوپر اتنی دیا کرو۔

اندرونٹ۔ اگر دینا ہی چاہتے ہو۔ تو کوئی کنواں کھدوا دو۔ بہت دنوں تک تمہارا نام رہے گا۔

سُورداس۔ بھیا مجھے نام کی بھوک نہیں ہے۔ بہانے مت کرو۔ یہ روپے لے کر اپنی سنگت میں دے دو۔ میرے سر سے بوجھ ٹل جائے گا۔

پربھو سیوک۔ (انگریزی میں) دوست اس کے روپے لے لو ورنہ اسے چین نہ آئے گا۔ اس فیاضی کو فرشتوں کی فیاضی کہنا اس کی تحقیر کرنا ہے۔ میرا تو

تخیل بھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔ ایسے ایسے لوگ بھی دنیا میں پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ اپنے بھرے ہوئے تھال میں سے ایک نوالہ اُٹھا کر پھینک دیتے ہیں۔ تو دوسرے روزنامجاروں میں اپنا نام دیکھنے کو دوڑتے ہیں۔ اڈیٹر وگرا اس خبر کو جلی عنوان میں نہ شائع کرے تو اُسے گولی مار دیں۔ یہ واقعی مقدس ہستی ہے!

اندر دت۔ سُورداس اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو میں روپے دے دوں گا مگر اس شرط پر کہ تمہیں جب کبھی کوئی ضرورت ہو ہمیں فوراً اطلاع کر دو گے تو دیا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی ہی تمہاری کٹی ایک یادگار کا مقام ہو جائے گی اور لوگ تمہارے درشن کرآیا کریں گے۔

سُورداس۔ تو میں آج روپے لاؤں گا۔

اندر دت۔ اکیلے نہ جانا۔ ورنہ کچہری کے گُنڈے تمہیں بہت دق کریں گے۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

سُورداس۔ اب ایک بنتی (عرض) آپ سے بھی ہے صاحب۔ آپ پتلی گھر کے بھوروں کے لئے گھر کیوں نہیں بنوا دیتے۔ ساری بستی میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور روز اودھم مچاتے رہتے ہیں۔ ہمارے محلہ میں کسی نے کوروں کو نہیں چھیڑا تھا۔ نہ کبھی اُنکے دھرنے سے جوا ہوا۔ نہ سراہیوں کا دیا جلا رہا۔ جب تک بھورے لوگ یہاں کام پر نہیں آجاتے۔ عورتیں گھروں سے پانی بھرنے نہیں نکلتیں۔ رات کو اتنا سور ہوتا ہے کہ نیند نہیں آتی۔ کسی کو تعجب ہائے تو بڑے پرتاپ (آباد) ہو جاتا ہے۔

یہ کہہ کر سُورداس چپ ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں نے بات کر بہت بڑھا کر تو نہیں کہا۔ اندر دت نے پرجھو سیوک کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ بھئی یہ تو اچھی بات نہیں۔ اپنے پاپا سے کہو۔ اس کا جلد بندوبست کریں۔ نہ جانے تمہارے وہ اصول کیا ہو گئے؟ بیٹھے بٹھائے یہ ساری بُرائیاں دیکھ رہے ہو اور کچھ کرتے دھرتے نہیں۔

پرجھو سیوک۔ مجھے تو یک دم اس کام سے نفرت ہے۔ میں نہ اسے

پسند کرتا ہوں۔ نہ اس کے قابل ہوں میری زندگی کا مسرت انگیز بہشت تو یہی ہے کہ کسی پہاڑی کے دامن میں ایک چشمہ کے کنارہ پر چھوٹی سی جھونپڑی بنا کر پڑا رہوں۔ نہ دنیا کی فکر ہو نہ عاقبت کی۔ نہ اپنے نام کو کوئی رونے والا ہو نہ ہنسنے والا۔ یہی میری زندگی کی معراج ہے۔ مگر اُس معراج پر پہنچنے کے لیے جس باقاعدگی اور کوشش کی ضرورت ہے اس سے محروم ہوں خیر سچ بات تو یہ ہے کہ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ میرا تو یہاں آنا نہ آنا دونوں برابر ہیں۔ صرف پاپا کے لحاظ سے چلا آتا ہوں۔ وقت کا زیادہ حصّہ یہی سوچنے میں صرف کرتا ہوں کہ اس قید سے کیونکر نجات ملے۔ آج ہی پاپا سے کہوں گا۔

اندرودت۔ ہاں آج ہی کہنا۔ تمہیں تامّل ہو تو میں کہہ دوں۔

پربھو سیوک۔ نہیں جی۔ اس میں کیا تامّل ہو سکتا ہے۔ اس سے تو میرا رنگ اور جم جائے گا۔ پاپا کو خیال ہوگا کہ اب اس کا جی لگنے لگا۔ کچھ اس نے کہا تو اُن کا تو مجھ سے یہی رونا ہے۔ کہ میں کسی بات میں بولتا ہی نہیں۔

اندرودت یہاں سے چلے تو سُورداس بہت دُور تک اُن کے ساتھ اسی خدمت جماعت کی باتیں پوچھتا ہُوا چلا گیا۔ جب اندرودت نے بہت اصرار کیا تو لوٹا۔ اندرودت وہیں سڑک پر کھڑا ہُوا اُس نحیف عاجز انسان کو ہوا کے جھونکوں سے لڑکھڑاتے اور درختوں کے سایہ میں غائب ہوتے دیکھتا رہا۔ شاید یہ تحقیق کرنا چاہتا تھا۔ کہ یہ انسان ہے یا فرشتہ!

## (۳۴)

پربھو سیوک نے گھر آتے ہی مکانوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ جان سیوک یہ سُن کر بہت خوش ہوئے کہ اب اس نے کارخانہ کی طرف دھیان دینا شروع کیا۔ بولے — ہاں مکانوں کا بنانا بہت ضروری ہے۔ انجنیئر سے کہو ایک نقشہ بنائیں میں انتظامی کمیٹی کے سامنے اس تجویز کو پیش کروں گا۔ قلیوں کے لیے علیحدہ علیحدہ

مکانات بنوانے کی ضرورت نہیں لمبی لمبی بارکیں بنوا دی جائیں تاکہ ایک ایک کمرہ میں دس دس بارہ مزدور رہ سکیں۔

**پرشھو سیوک**۔ لیکن بہت سے قلی ایسے بھی تو ہوں گے جو بال بچوں کے ساتھ رہنا چاہیں گے۔

**مسز سیوک**۔ قلیوں کے بال بچوں کو وہاں جگہ دی جائے گی تو ایک شہر آباد ہو جائے گا۔ تمہیں اُن سے کام لینا کہ انہیں آباد کرنا ہے جیسے فوج کے سپاہی رہتے ہیں اُسی طرح قلی لوگ بھی رہیں گے۔ ایک چھوٹا سا چرچ ضرور ہونا چاہیئے۔ پادری کے لئے ایک مکان کا ہونا بھی ضروری ہے۔

**الیشور سیوک**۔ خدا تجھے سلامت رکھے بیٹی۔ تیری یہ رائے مجھے بہت پسند آئی۔ قلیوں کے لئے روحانی غذا جسمانی غذا سے کم ضروری نہیں۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں چھپا کتنی عمدہ تجویز ہے۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ وہ دن کب آئے گا جب قلیوں کے دل مسیح کے کلام پاک سے آسودہ ہو جائیں گے۔

**جان سیوک**۔ لیکن تو جانتی کیجئے کہ میں اس مذہبی تحریک کی تجویز کو کمیٹی کے سامنے کیوں کر رکھ سکوں گا؟ میں اس کا نمائندہ تو نہیں ہوں۔ دیگر ممبران کمیٹی نے مخالفت کی تو اُس کا کیا جواب دوں گا۔ میرے سوا کمیٹی میں اور کوئی عیسائی نہیں ہے۔ میں اس تجویز کو کمیٹی کے روبرو ہرگز نہ رکھوں گا۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس تجویز میں کتنی مذہبی جانبداری ہے۔

**مسز سیوک**۔ جب کوئی مذہبی مسئلہ پیش ہوتا ہے تو تم خواہ مخواہ اس میں اعتراض کرتے ہو۔ ہندو قلی تو جلد ہی کسی درخت کے نیچے دو چار اینٹ بچھا رکھ کر انہیں پوجنا شروع کر دیں گے۔ مسلمان لوگ بھی کھلے میدان میں نماز پڑھ لیں گے۔ تو پھر چرچ سے کسی کو کیا خصومت ہو سکتی ہے۔

**الیشور سیوک**۔ خداوند یسوع مجھ پر اپنی برکتوں کی بارش کر! بائیبل مقدس کی بشارتیں تو ہر شخص کے لئے راحت بخش ہیں۔ ان کی اشاعت میں کسی کو کچھ

اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کچھ اعتراض ہو بھی تو تم اس دلیل سے اُسے رد کر سکتے ہیں۔ بادشاہ کا مذہب بھی مذہبوں کا بادشاہ ہے۔ آخر سرکار نے مذہبی اشاعت کا محکمہ کھولا ہے تو کون اعتراض کرتا ہے اور کرے بھی تو کون اُسے سُنتا ہے؟ میں آج ہی اس معاملہ کو چرچ میں پیش کروں گا اور حکام کو مجبور کروں گا کہ وہ کمپنی پر دباؤ ڈالیں۔ مگر یہ تمہارا کام ہے میرا نہیں۔ تمہیں خود ان باتوں کا خیال ہونا چاہیئے۔ نہ ہوئے مسٹر کلارک اس وقت!

مسز سیلوک۔ وہ ہوتے تو پھر کوئی دقت ہی نہ ہوتی۔

جان سیلوک۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس تجویز کو کیسے پیش کروں گا۔ مگر کہیں کوئی مندر یا مسجد بنوانے کی تجویز کرتی تو میں بھی چرچ کی تعمیر پر زور دیتا لیکن جب تک اور لوگ پیش قدمی نہ کریں میں کچھ نہیں کر سکتا اور نہ کرنا مناسب ہی سمجھتا ہوں۔

الیشوا سیلوک۔ ہم اداروں کے پیچھے پیچھے کیوں چلیں؟ ہمارے ہاتھوں میں چراغ ہے۔ کندھے پر لاٹھی ہے۔ کمر میں تلوار ہے۔ پیروں میں طاقت ہے۔ ہم کیوں نہ آگے چلیں؟ کیوں دوسروں کا منہ تاکیں؟

مسٹر جان سیلوک نے اپنے والد سے زیادہ بحث مباحثہ فضول سمجھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ آدھی رات تک پرمھو سیلوک کے ساتھ بیٹھے ہوئے مختلف طریقوں پر نقشے بناتے اور بگاڑتے رہے۔ کہ شہر کا زمین لی جائے کتنی زمین کافی ہوگی۔ کتنا صرفہ ہوگا۔ کتنے مکان بنیں گے۔ پرمھو سیلوک "ہاں ہاں" کہتا جاتا تھا۔ ان باتوں میں جی نہ لگتا تھا۔ کبھی اخبار دیکھنے لگتا۔ کبھی کوئی کتاب اٹھانے پلٹنے لگتا۔ کبھی اُٹھ کر برآمدہ میں چلا جاتا۔ لیکن انہماک باریک بینی نہیں ہوتا۔ مقرر اپنی تقریر کے جوش میں یہ کب دیکھتا ہے کہ سامعین میں کتنوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ پرمھو سیلوک کو اس وقت ایک نیا عنوان سوجھا تھا اور اُس پر نظم لکھنے کے لیے وہ بیتاب ہو رہا تھا۔ نئی نئی تشبیہیں نئی نئی بندشیں

کسی چشمہ پر پیہم کرآنے والے پھولوں کی طرح اُس کے دماغ میں دوڑتی چلی آرہی تھیں۔ وہ اُن کو جمع کرنے کے لئے بیقرار تھا۔ کیونکہ وہ ایک بار آکر۔ ایک بار اپنی جھلک دکھاکر ہمیشہ کے لئے غائب ہوجاتی ہیں۔ بارہ بجے تک وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہا۔ نہ بیٹھتے بنتا تھا۔ نہ اُٹھتے۔ یہاں تک کہ اُسے جھپکیاں آنے لگیں۔ جان سیوک نے بھی اب آرام کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن جب پرجھ سیوک پلنگ پر گیا تو نیند روٹھ چکی تھی۔ کچھ دیر تک تو اُس نے اُسے منانے کی کوشش کی۔ پھر لیمپ کے سامنے بیٹھ کر اسی عنوان پر نظم لکھنے لگا۔ ایک لمحہ بعد وہ کسی دوسری ہی دنیا میں تھا۔ وہ دیہاتیوں کی طرح صرف میں پہنچ کر اُس کی چمک دمک پر فریفتہ نہ ہوجاتا تھا۔ اگر اُس دنیا کی ہر چیز مزین معطر۔ دلکش اور خوشگوار معلوم ہوتی تھی۔ مگر کتنی ہی چیزوں کو غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر صرف سُنہرا پرت چڑھا ہوا ہے۔ اصل میں وہ یا تو پرانی ہے یا مصنوعی۔ ہاں جب اُسے واقعی کوئی نیا جواہر مل جاتا تھا تو اُس کا چہرہ شگفتہ ہوجاتا تھا۔ صناع اپنی صنعت کا بہترین نقاد ہوتا ہے۔ پرجھ سیوک کے تخیل نے کبھی اتنی بلند پرواز نہ دکھائی تھی۔ ایک ایک شعر لکھ کر وہ اُسے گا گا کر پڑھتا اور جھومتا۔ جب نظم ختم ہوگئی تو وہ سوچنے لگا۔ دنیا میں شعرائے وقت اسے کتنا پسند کرتے ہیں۔ اڈیٹروں کی تعریف کی تو کوئی وقعت نہیں۔ ان میں بہت کم ایسے ہیں جو سخن فہم ہوں۔ کسی نئے نا آشنا شاعر کی پڑھیا سے پڑھیا نظم قبول نہ کریں گے۔ مگر پرانے شعراء کی سڑی گلی۔ گھٹیا اور بھرتی والی نظمیں بھی منظور کرلیں گے۔ شعراء کا یہ حال کہ وہ سخن فہم ہوتے ہوئے بھی کنجوس ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے موٹے تک بندوں کی چاہے تعریف کردیں مگر جسے اپنا مخالف سمجھتے ہیں اس کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔ کنور صاحب تو ضرور بھڑک جائیں گے۔ کاش وہ سنگھ یہاں ہوتے تو میری نظم چوم لیتے۔ کل کنور صاحب سے کہوں گا کہ میرے کلام کا مجموعہ شائع کرا دیجئے۔ زمانہ حال کے نئے طرز والے شعراء میں تو کسی کو مجھ سے مقابلہ کرنے کا دعوے ہو نہیں سکتا اور پرانے طرز کے شعراء سے میرا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔

میرے اور اُن کے تخیل کے دائرے جُدا جُدا ہیں۔ اُن کے یہاں زبان کی دلکشی ہے۔ عروض کی کوئی غلطی نہیں۔ کھوجنے پر بھی کوئی نقص نہ ملے گا۔ لیکن مضمون آفرینی کا نام ہی نہیں۔ اصلیت کا کہیں پتہ نہیں۔ وہی پرانی زمینیں ہیں۔ وہی پامال مضامین خیالات کی تازگی عموماً نظر نہیں آتی۔ دس بیس اشعار پڑھئے پر کہیں ایک بات ملتی ہے۔ یہاں تک کہ تشبیہیں بھی وہی پرانی جو پُرانے شاعروں نے باندھ رکھی ہیں۔ میری زبان اتنی شستہ نہ ہو لیکن بھرتی کے لئے تو میں نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ ایسا لکھنے سے فائدہ کیا؟

صبح وہ منہ ہاتھ دھوکر مسودہ نظم کو جیب میں رکھکر بلا ناشتہ کئے ہوئے گھر سے چلا۔ تو جان سیوک نے پوچھا۔ کیا ناشتہ نہ کرو گے۔ اتنے سویرے کہاں جاتے ہو؟

**پربھو سیوک** نے بیرخی سے جواب دیا۔ ذرا کنور صاحب کی طرف جا رہا ہوں۔

**جان سیوک**۔ تو اُن سے کل کی چوپڑ کے متعلق گفتگو کرنا۔ اگر وہ متفق ہو جائیں۔ تو پھر کسی کو مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہو

**مسز سیوک**۔ وہی چرچ کے بارہ میں نا؟

**جان سیوک**۔ جی نہیں۔ تمہیں اپنے چرچ ہی کی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے تجویز کیا ہے کہ پانڈے پور کی بستی خالی کرالی جائے اور وہیں قلیوں کے مکانات تعمیر کرائے جائیں۔ اس سے بہتر وہاں کوئی دوسری جگہ نظر نہیں آتی۔

**پربھو سیوک**۔ رات کو تو آپ نے اُس بستی کے لینے کا تذکرہ نہ کیا تھا۔

**جان سیوک**۔ نہیں، آؤ۔ ذرا یہ نقشہ دیکھو۔ بستی کے باہر کی طرف کافی زمین نہیں ہے۔ ایک طرف سرکاری پاگل خانہ ہے۔ دوسری طرف رائے صاحب کا باغ۔ تیسری طرف ہماری مِل۔ بستی کے سوا اور جگہ ہی کہاں ہے؟ اور پھر بستی ہی کون سی بڑی مشکل سے پندرہ بیس یا زیادہ سے زیادہ تیس گھر ہوں گے۔ اُن کا معاوضہ دے کر زمین لینے کی کیوں نہ کوشش کی جائے؟

**پربھو سیوک**۔ اگر بستی کو اُجاڑ کر مزدوروں کے لئے مکانات بنوانے ہیں۔

تو رہتے ہی دیکھئے کسی نہ کسی طرح گزر تو ہو ہی رہا ہے۔

جان سیوک۔ اگر ایسی بستیوں کی حفاظت کا خیال کیا گیا ہوتا تو آج یہاں ایک بنگلہ بھی نہ نظر آتا۔ یہ بنگلے اُس میں نہیں بنے ہیں۔

پربھو سیوک۔ مجھے ایسے بنگلے سے جھونپڑا ہی پسند ہے جس کے لئے کئی غریبوں کے گھر گرانے پڑیں۔ میں کنور صاحب سے اس بارہ میں کچھ نہ کہوں گا۔ آپ خود کہئے گا۔

جان سیوک۔ یہ تمہاری پسند حماقت ہے۔ میں اسے قناعت اور صبر کہہ کر تمہیں دھوکے میں نہ ڈالوں گا۔ تم زندگی کی آسائشیں تو چاہتے ہو لیکن اُن آسائشوں کے لئے جن ذرائع کی ضرورت ہے اُن سے دُور بھاگتے ہو۔ ہم نے تمہیں عملی طریقہ پر کبھی دولت و اقتدار سے متنفر ہوتے نہیں دیکھا۔ تم اچھے سے اچھا مکان اچھے سے اچھا کھانا۔ اچھے سے اچھا کپڑا چاہتے ہو لیکن بغیر ہاتھ پیر ہلائے ہی چاہتے ہو کہ تمہارے لئے کوئی شہد اور شربت ٹپکا دے۔

پربھو سیوک۔ رسم و رواج سے مجبور ہو کر انسان کو اکثر اپنے ضمیر کے خلاف عمل کرنا پڑتا ہے۔

جان سیوک۔ جب آسائشوں کے لئے تم رسم و رواج سے مجبور ہو جاتے ہو تو آسائشوں کے وسائل کے لئے کیوں انہیں باتوں سے مجبور نہیں ہوتے؟ تم دل اور زبان سے موجودہ طرزِ معاشرت کی کتنی ہی بُرائی کیوں نہ کرو۔ مجھے ذرا بھی اعتراض نہ ہوگا۔ تم اس بارہ میں لکچر دو۔ نظمیں لکھو۔ مضامین تیار کرو۔ میں خوش ہو کر نہیں پڑھوں گا اور تمہاری تعریف کروں گا۔ لیکن عملی دائرہ میں آکر اُن خیالات کو اُسی طرح بھول جاؤ جیسے اچھے سے اچھا سوٹ پہن کر موٹر پر سیر کرتے وقت تم قناعت ایثار اور نفس کشی کے اصولوں کو بھول جاتے ہو۔

پربھو سیوک اور کتنے ہی آسائش پسندوں کی طرح اصولاً جمہوریت کے قائل تھے۔ جن حالات میں اُن کی پرورش ہوئی تھی۔ جن طریقوں سے اُن کے دماغی اور روحانی تربیت ہوئی تھی اُن سے آزاد ہو جانے کے لئے جس اخلاقی جرأت کی، جس

طاقت کی ضرورت ہے اس سے وہ محروم تھے۔ وہ خیالی دائرہ میں ایثار کے جذبات کو جگہ دے کر خوش ہوتے تھے اور اُن پر فخر کرتے تھے۔ اُنہیں شاید کبھی سُوجھا ہی نہ تھا کہ ان جذبات کو عملی جامہ بھی پہنایا جا سکتا ہے۔ وہ باقاعدگی کے اتنے پابند نہ تھے کہ اپنی آسائشوں کو اُن جذبات پر قربان کر دیتے۔ جمہوریت اُن کے لیے نظریۂ کا ایک مسئلہ تھا اور بس۔ آج تک کبھی کسی نے اُن کے طرزِ عمل کی تنقید نہ کی تھی کسی نے انہیں تنقید کا نشانہ نہ بنایا تھا۔ اور دوستوں پر اپنی آزاد خیالی کی دھاک جمانے کے لئے اُن کے دبے خیالات ہی کافی تھے۔ مگر حضرت مسیح کے ترکِ تعلق اور ایثار کا اُن پر اس سے اثر نہ ہوا تھا کہ وہ اُن کو زیادہ سے زیادہ درجہ کا انسان سمجھتے تھے اشرفیوں کی تھیلی محض کی ہو یا کھدر کی زیادہ فرق نہیں۔ والد کی تدریس سے یہ طفلِ سُست کیا بگڑتا تھا۔ گویا تازیانہ لگایا گیا ہو۔ آگ چاہے پھونس کو نہ جلا سکے۔ آہنی کیل چاہے مٹی میں نہ گاڑ سکے۔ کانچ پیالہ چاہے پتھر کی چوٹ سے نہ ٹوٹ سکے۔ مگر شاید ہی کبھی دل کو تڑپ کر نے اُس میں چبھنے اور اُسے چوٹ پہنچانے میں اتنا کامیاب ہوتا ہے۔ خصوصاً جب وہ اُس آدمی کی زبان سے نکلے جو ہماری زندگی کو بنا یا بگاڑ سکتا ہو۔ یہ جملہ سیلون کے کوئو یا کالی ناگن نے ڈنس لیا جس کے کاٹے کو لہر بھی نہیں آتی۔ اُن کی سوئی ہوئی غیرت جاگ اُٹھی۔ اُنہیں اپنی ہستی کا علم ہوا۔ کنور صاحب کے یہاں جانے کو تیار ہو گئے۔ گاڑی تیار کرنے کی تھی۔ سُدھ بُدھ نہ رہی۔ آکر اپنے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ وہ تو یہ ہو گئے۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں اتنے دنوں تک مغالطہ میں پڑا رہا بلکہ اس خیال سے کہ دوسرا کیا میرا ہمدرد ہو سکتا ہے۔ "ان باتوں کے سُننے پر اب میرے لئے زندگی سے مرنے کی بات ہوئی۔ اگر میں اُن پر اپنی زندگی کا بار ڈالوں۔ مجھے خود اپنی معاش کا مسئلہ حل کرنا چاہیئے۔ انہیں کیا معلوم نہیں تھا کہ میں رسم و رواج سے قطع تعلق کر چکا ہوں اس عیش پسندی میں پڑا ہوا ہوں؟ ایسی حالت میں مجھے اُن کا طعنہ دینا سراسر بے انصافی ہے۔ اتنے دنوں تک نقلی زندگی بسر کرنے کے بعد اب میرے لئے یکایک اپنا طرزِ معاشرت تبدیل کرنا غیر ممکن ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ میرے دل میں ایسے

خیالات پیدا ہوئے۔ ان خیالات کے ہوتے ہوئے میں کم از کم اوروں کی طرح خود غرض اور لالچی تو نہیں ہو سکتا۔ لیکن میں بفائدہ اس قدر افسوس کر رہا ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیئے کہ پا پانے وہ کام کر دیا جو ارادہ اور اصول سے ممکن نہ ہوا تھا۔ اب مجھے ان سے کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ انہیں شاید میرے چلے جانے سے رنج بھی نہ ہوگا۔ انہیں تو اب معلوم ہو گیا ہے۔ میری ذات سے ان کو دولت پرستی آسودہ نہیں ہو سکتی۔ آج یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ چل کر کنور صاحب سے کہتا ہوں کہ مجھے بھی رعنا کاروں میں شامل کر لیجئے۔ کچھ دنوں تک اس زندگی کا لطف بھی حاصل کروں۔ دیکھوں مجھ میں اور بھی کسی کام کی قابلیت ہے یا صرف قلم ہی گھسنا ہوں۔ اب کوہستانی چڑیوں کی سیر کروں گا۔ دیہاتوں میں گھوموں گا۔ دیہاتی مناظر کو دیکھوں گا۔ روز نیا دانہ نیا پانی نئی تفریح سے منظر اس سے زیادہ مسرت خیز اور کونسی زندگی ہو سکتی ہے۔ تکلیف بھی ہوگی۔ دھوپ ہے۔ بارش ہے۔ سردی ہے۔ خوف ناک جانور ہیں۔ مگر تکلیفوں سے تو میں کبھی خوف زدہ نہیں ہوا۔ انھیں تو مجھے فاقہ داری کے صحبتوں سے ہوتی ہے۔ یہاں کتنی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ روٹیوں کے لئے دوسروں کی غلامی بچی خواہش کو دوسروں کا محتاج بنا دیا۔ لوگ اپنے فاقہ کو کیسا دبک جاتا ہے۔ اس کے چہرہ پر کتنا انکسار کتنی خوشامد چھا جاتی ہے۔ میں اپنی آزادی کی اب سے زیادہ قدر کرنا سیکھوں گا۔"

دوپہر کو جب گھر کے سب لوگ پنکھوں کے نیچے آرام سے سو رہے تھے تو کنور پھر سیوک نے چپکے نکل کر کنور صاحب کے گھر کا راستہ لیا۔ پہلے تو جی میں آیا کہ کپڑے اتار دوں اور صرف ایک کرتہ پہن کر چلا جاؤں۔ مگر ایسے پھٹے حالوں گھر سے کبھی نہ نکلا تھا۔ کپڑے بدل ڈالنے کے لئے شاید خیالات بدل ڈالنے سے زیادہ اخلاقی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے صرف اپنی نظموں کے بیاض لے لی اور چل کھڑا ہوا۔ اسے ذرا بھی ملال نہ ہوا۔ ذرا بھی پشیمانی نہ تھی۔ ایسا خوش تھا جیسے قید سے چھوٹا ہو۔ "آپ لوگوں کو اپنی دولت مبارک ہو۔ پا پانے مجھے بالکل بے غیرت۔ بیحس اور آرام پسند

سمجھ رکھا ہے۔ جبھی تو ذرا سی بات پر اُبل پڑے۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ میں بالکل مُردہ نہیں ہوں"۔

کنور صاحب دوپہر کو سونے کے عادی نہ تھے۔ فرش پر لیٹے کچھ سوچ رہے تھے۔ پربھو سیوک جا کر بیٹھ گئے۔ کنور صاحب نے کچھ نہ پوچھا۔ کیسے آئے کیوں اُداس ہو۔ نصف گھنٹہ تک بیٹھے رہنے کے بعد بھی پربھو سیوک کو اُن سے اپنے بارہ میں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ کوئی تمہید نہ سوجھتی تھی۔ "کنور صاحب آج تم گم گم کیوں ہیں؟ کیا میری صورت سے تاڑ تو نہیں گئے۔ کہ کچھ حاجت لے کر آیا ہے؟ یوں تو مجھے دیکھتے ہی خوش ہو جاتے تھے۔ دوڑ کر سینہ سے لگاتے تھے۔ آج مخاطب ہی نہیں ہوتے۔ دوسروں کا مسئلہ تاکنے کی یہی سزا ہے۔ میں بھی گھر سے چلا تو ٹھیک دوپہر کو۔ جب چڑیاں تک گھونسلوں سے نہیں نکلتیں۔ آنا تھا تو شام کو آتا۔ اس جلتی ہوئی دھوپ میں کوئی غرض کا باؤلا ہی گھر سے نکل سکتا ہے۔ خیر یہ پہلا تجربہ ہے"۔ وہ مایوس ہو کر پیچھے کے لئے اُٹھے کہ بھرت سنگھ بولے۔ کیوں کیوں جلدی کیا ہے؟ کیا اس بیٹے کہ میں نے باتیں نہیں کیں؟ باتوں کی کمی نہیں ہے۔ اتنی باتیں تم سے کرنی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شروع کیونکر کروں۔ تمہاری رائے میں دنے سنگھ نے ریاست کا پلہ پکڑنے میں غلطی کی؟

پربھو سیوک نے پس و پیش میں پڑ کر کہا۔ اس پر مختلف پہلوؤں سے غور کیا جا سکتا ہے۔

کنور۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس نے بُرا کیا۔ اُس کی ماں کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ تو اتنی برہم ہیں کہ اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اُس نے جو روش اختیار کی ہے اُس پر شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ شاید ان حالتوں میں میں بھی یہی کرتا۔ صوفیا سے اُسے محبت نہ ہوتی تو بھی اس موقع پر رعایا نے جو بغاوت کی وہ اُس کے جمہوریت کے اصولوں کو متزلزل کر دینے کے لئے کافی تھی۔ مگر جب یہ مسلمہ ہے کہ صوفیا کی محبت اُس کی رگ رگ میں سرائت کر

گئی ہے تو اُس کا طرزِ عمل صرف قابلِ عفو نہیں بلکہ قابلِ ستائش ہے۔ وہ مذہب تو محض جماعتی ہے جس کی مدد سے اپنی برادری کے باہر شادی کرنا ممنوع ہو کیونکہ اس سے اُسے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مذہب اور معرفت دونوں مترادف ہیں اور اس نقطۂ خیال سے دُنیا میں صرف ایک مذہب ہے۔ ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی۔ بدھ یہ مذہب نہیں ہیں۔ بلکہ مختلف اغراض والی گروہ بندیاں ہیں جن سے نقصان کے سوا آج تک کسی کو نہیں پہنچا۔ اگر وہ اتنا خوش نصیب ہو کہ صوفیا سے رشتۂ عقد قائم کر سکے، تو کم از کم مجھے خدا بھی اعتراض نہ ہوگا۔

پرکھو سیوک۔ مگر آپ جانتے ہیں اس معاملہ میں رانی صاحبہ جس قدر سخت ہیں اُتنا ہی میری ماتا بھی ہیں۔

کنور۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دونوں کی زندگی برباد ہو جائے گی۔ یہ دونوں انمول جواہر مذہب کے ہاتھوں مٹی میں مل جائیں گے۔

پرکھو سیوک۔ میں تو خود ان جھگڑوں سے اُکتا گیا ہوں کہ میں نے گھر سے الگ ہو جانے کا مصمم قصد کر لیا ہے۔ گھر کی مذہبی آب و ہوا معاشرتی قیود سے میری روح کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ گھر سے نکل جانے کے سوا اب مجھے اور کچھ نہیں سُوجھتا۔ مجھے تجارت سے پیشتر ہی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور اب اتنے دنوں کے تجربہ کے بعد تو مجھے اس سے نفرت ہی ہو گئی ہے۔

کنور۔ لیکن تجارت تو کئی تہذیب کا سب سے بڑا جزو ہے۔ تمہیں اُس سے کیوں اس قدر نفرت ہے؟

پرکھو سیوک۔ اس لئے کہ تجارت میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے جتنی خود غرضی اور مردم آزاری کی ضرورت ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ مجھ میں اتنا انہماک ہی نہیں ہے۔ میں فطرتاً تنہائی پسند واقع ہوا ہوں۔ اور زندگی کی کشمکش میں اُس سے زیادہ نہیں پڑنا چاہتا جتنا میرے فن کی تکمیل اور اس میں واقفیت کا رنگ لانے کے لئے کافی ہو۔ شعراء بالعموم تنہائی پسند ہی ہوا کئے ہیں مگر اس سے

ان کی شاعری میں کوئی نقصان نہیں آنے پایا ممکن تھا کہ وہ زندگی کا وسیع اور کافی تجربہ حاصل کرکے اپنے کلام کو زیادہ دلچسپ بنا سکتے لیکن اُس کے ساتھ یہ اندیشہ بھی تھا کہ زندگی کی کشمکش میں پڑ جانے سے اُن کے تخیل میں کمی واقع ہو جاتی۔ ہومر اندھا تھا۔ سُورداس بھی اندھا تھا۔ ملٹن بھی اندھا تھا۔ مگر یہ سبھی آسمان کے روشن ستارے ہیں۔ والمیک اور تلسی جیسے شہرۂ آفاق شعراء دُنیا سے الگ کُٹیوں میں بیٹھنے والے لوگ تھے۔ مگر کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کی گوشہ نشینی سے اُن کے کلام میں نقص آگیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ میرے خیالات کیسے ہوں گے۔ مگر اُس وقت دولت پرستی سے بیزار ہو رہا ہوں۔

کنور۔ تم تو اتنے بیزار کبھی نہ تھے۔ آخر بات کیا ہے؟

پربھو سیوک نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔ اب تک عملی زندگی کے رموز سے واقف نہ تھا مگر اب دیکھ رہا ہوں کہ واقعی حالت اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔ تجارت کچھ نہیں ہے۔ اگر مردم آزاری نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک انسانوں کو جانور سمجھنا اور اُن سے اُسی طریقہ پر برتاؤ کرنا اس کا اصل اصول ہے۔ جو یہ نہیں کر سکتا وہ کامیاب تاجر نہیں ہو سکتا۔ کارخانہ ابھی بن کر تیار نہیں ہوا اور توسیع اراضی کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ مستری اور کاریگروں کے لیے بستی میں رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ مزدوروں کی تعداد بڑھے گی تو وہاں گھر بھی نہ ہو سکے گا۔ اس لئے پاپا کی رائے ہے کہ اُسی قانونی دفعہ کے مطابق پانڈے پور پر بھی قبضہ کر لیا جائے۔ راجہ مہیندر کمار کی پاپا سے دوستی ہے۔ اور موجودہ حاکم ضلع مسٹر سینا بہت رئیسوں سے اتنا ہی ربط ضبط رکھتے ہیں۔ جتنا مسٹر کلارک اُن سے دور رہتے تھے۔ پاپا کی تجویز بلا کسی دقت کے منظور ہو جائے گی اور محلہ والے جبراً نکال دئے جائیں گے۔ مجھ سے یہ ظلم نہیں دیکھا جاتا۔ میں اسے روک نہیں سکتا مگر اتنا تو کر سکتا ہوں کہ اُس سے بالکل الگ رہوں۔

کنور۔ تمہارے خیال میں کمپنی کو نفع ہوگا؟

پربھو سیلوک۔ میں سمجھتا ہوں کہ پہلے ہی سال ۲۵ فیصدی نفع ہوگا۔

کنور۔ تو کیا تم نے کارخانہ سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا؟

پربھو سیلوک۔ ہاں پورا فیصلہ کر لیا۔

کنور۔ تمہارے پاپا کام سنبھال سکیں گے؟

پربھو سیلوک۔ پاپا تو اس قسم کے نصف درجن کارخانوں کو سنبھال سکتے ہیں۔ [illegible] عجیب قابلیت ہے۔ زمین کی تجویز بہت جلد انتظامیہ کمیٹی کے سامنے پیش ہوگی [illegible] آپ سے یہ خاص التجا ہے کہ آپ اُسے منظور نہ ہونے دیں۔

کنور۔ (مسکرا کر) بڈھا آدمی اتنی آسانی سے نئی تعلیم نہیں حاصل کر سکتا۔ بوڑھا طوطا رام رام کہنا نہیں سیکھتا مجھے تو اس میں کوئی ہرج نہیں معلوم ہوتا۔ کہ بستی والوں کو معاوضہ دے کر زمین لے لی جاوے۔ ہاں معاوضہ مناسب ہونا چاہئے۔ جب تم کارخانہ سے الگ ہی ہو رہے ہو تو تمہیں ان جھگڑوں سے کیا واسطہ یہ تو دنیا کے دھندے ہیں۔ ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

پربھو سیلوک۔ تو آپ اس تجویز کی مخالفت نہ کریں گے؟

کنور۔ میں کسی ایسی تجویز کی مخالفت نہ کروں گا جس سے کارخانہ کا نقصان ہو۔ کارخانہ سے میری غرض کا تعلق ہے۔ میں اس کی ترقی میں روکاوٹ نہیں ڈال سکتا ہاں تمہارا وہاں سے نکل آنا میری سیوا سمتی کے لئے مبارک فال ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ سمتی کے مینیجر ڈاکٹر گنگولی ہیں مگر کچھ تو سن رسیدہ ہونے کے سبب اور کچھ تونسل کے کاموں میں زیادہ مصروف رہنے کے باعث وہ اس بارے سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ تم اس بار کو اپنے کندھوں پر لے سمتی کی کشتی اس وقت منجھدار میں ہے۔ وقت کی روش نے اُسے اس خوفناک حالت میں ڈال دیا ہے۔ تمہیں ایشور نے علم عقل حوصلہ سب کچھ دیا ہے۔ تم چاہو تو سمتی کو بچا سکتے ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کرو گے۔

پربھو سیوک کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ وہ اپنے کو اس عزت کے قابل نہ سمجھتے تھے۔ بولے۔ میں اتنی بڑی ذمہ داری لینے کے قابل نہیں ہوں مجھے خوف ہے کہ مجھ جیسا ناتجربہ کار اور سست آدمی سمتی کو ترقی نہیں دے سکتا۔ یہ آپ کی نوازش ہے کہ مجھے اس قابل خیال کرتے ہیں۔ میرے لئے تو صف ہی کافی ہے۔

کنور صاحب نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ تم جیسے آدمیوں کو صف میں رکھوں تو افسر کہاں سے لاؤں؟ مجھے یقین ہے کہ کچھ دنوں ڈاکٹر گنگولی کے ساتھ رہ کر تم اس کام میں ہوشیار ہو جاؤ گے۔ شریف لوگ ہمیشہ اپنی قابلیت کی بیقدری کرتے ہیں۔ پر میں تمہیں خوب پہچانتا ہوں۔ تم میں عجیب برقی قوت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ جتنی تم سمجھتے ہو۔ عربی گھوڑا ہل میں نہیں چل سکتا۔ اس کے لئے تو میدان ہی چاہئے۔ تمہاری آزاد روح کارخانہ میں تنگ ہوتی جا رہی تھی۔ دنیلکر وسیع میدان میں نکل کر اس کے پرزے جائیں گے۔ میں نے وہ کو اس عہدہ کے لئے منتخب کر رکھا تھا۔ مگر اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر مجھے اب اس پر اعتماد نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس جماعت کو ایسی عمدہ حالت میں چھوڑ جاؤں کہ وہ بلا کسی روکاوٹ کے اپنا کام کرتی رہے۔ ایسا نہ ہوا تو میں اطمینان سے مر بھی نہ سکوں گا۔ تمہارے اوپر مجھے بھروسہ ہے کیونکہ تم بیغرض ہو۔ پربھو سیوک۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت برا استعمال کیا ہے۔ اب پیچھے پھر کر اس پر نظر ڈالتا ہوں تو کوئی جگہ ایسی نہیں دکھائی دیتا جس پر میں فخر کر سکوں۔ ایک ریگستان ہے۔ جہاں سبزی کا نشان نہیں۔ اس جماعت پر میری زندگی بھر کی بداعمالیوں کا بار لدا ہوا ہے۔ یہی میرے کفارہ کا ذریعہ اور میری نجات کا وسیلہ ہے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ میرا یہ خدمتی گروہ دنیا میں کچھ کر دکھائے۔ اس میں خدمت کا جوش، قربانی کی لگن ہو۔ قومی عزت کا گھمنڈ ہو۔ جب میں ایسے لوگوں کو ملک پر قربان ہوتے دیکھتا ہوں جن کے پاس جان کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو مجھے اپنے اوپر رونا آتا ہے کہ میں نے سب کچھ رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کیا۔ میرے لئے اس سے زیادہ مہلک

ئی صدمہ نہیں ہے کہ یہ جماعت اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ میں اس کے لئے اپنا
کچھ ایثار کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے دس لاکھ روپے اس کھاتہ میں جمع کر دئے ہیں
ارادہ ہے کہ اس پر ایک لاکھ سالانہ کا اضافہ کرتا رہوں۔ کم از کم پانچ سو آدمیوں
ناضروری ہے۔ اگر میں دس سال بھی اور زندہ رہا تو شاید میری یہ مراد پوری ہو
جاوے۔ اندر دو تین ہیں اور سب اوصاف تو ہیں مگر وہ متحمل مزاج نہیں ہے۔
وجہ سے میرا دل اُس پر نہیں جمتا۔ میں تم سے باصرار۔ . . .

ڈاکٹر گنگولی آپ بھی اور پر بھو سیوک کو دیکھ کر بولے۔ اچھا تم یہاں کنور صاحب
تردد دے رہا ہے۔ تمہارا پاپا مہیندر کمار کو پٹی پڑھا رہا ہے۔ پر میں نے تو صاف
پھ کہہ دیا کہ ایسا بات نہیں ہو سکتا۔ تمہارا میل ہے۔ اس کا پھائدہ نکسان
لو اور تمہارے حصہ والوں کو ہو گا۔ گریبوں کو کیوں اُن کے گھر سے نکالتا ہے۔
ہری کوئی نہیں سنتا۔ ہم کڑوا بات کہتا ہے نا۔ وہ کاہے کو اچھا لگے گا۔ ہم کونسل
اس پر سوال کرے گا۔ یہ کوئی بات نہیں ہے کہ آپ لوگ اپنے پھائدہ کے لئے
سروں پر اضائے کرے۔ سہر کا رئیس لوگ ہم سے ناراج ہو جائے گا۔ ہم کو پڑاہ
یسے۔ ہم تو وہاں وہی کرے گا جو ہمارا آتما کہے گا۔ تم کو دوسرے کمیم کا آدمی
ہئے تو پاپا ہم سے استیپھا (استعفا) لے لو۔ پر ہم پانڈے پور کو اُوٹنے نہ دے گا۔

کنور۔ یہ بیچارے تو خود ہی اس تجویز کی مخالفت کرتے ہیں۔ آج اسی بات پر
پ بیٹے میں بدمزگی بھی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ گھر سے چلے آئے ہیں اور کارخانہ سے کوئی
لق نہیں رکھنا چاہتے۔

گنگولی۔ اچھا ایسا بات ہے۔ بہت اچھا ہوا۔ ایسا بچار وان و عقلمند لوگ
کا کام نہیں کر سکتا۔ ایسا لوگ میل میں جائے گا تو ہم لوگ کہاں سے آدمی لائے گا؟
بھو سیوک۔ ہم بوڑھا ہو گیا۔ کل مر جائے گا۔ تم ہمارا کام کیوں نہیں سنبھالتا؟
لا وانٹیر لوگ تمہارا رسپکٹ کرتا ہے۔ تم ہمیں اس بوجھ سے ہلکا کر سکتا ہے۔
چھا آدمی اور سب کچھ کر سکتا ہے۔ جوش تو اُس کے بس کا بات نہیں ہم تم کو

اب نہ چھوڑے گا۔ کونسل میں اتنا کام ہے کہ ہم کو اس کام کے لئے فرصت ہی نہیں ملتا۔ ہم کاؤنسل میں نہ گیا ہوتا تو اوڈے پور میں یہ سب کچھ نہیں ہونے پاتا۔ ہم جاکر سب کو شانت کر دیتا۔ تم اتنا وِدیا پڑھ کر اس کو دھن کمانے میں لگائے گا۔ چھی چھی!

پربھو سیوک۔ میں تو خادموں میں بھرتی ہونے کے لئے گھر سے چلا ہی آیا ہوں پر میں سمتی کا افسر ہونے کے قابل نہیں ہوں۔ وہ عہدہ تو آپ ہی کے لئے موزوں ہے۔ مجھے سپاہیوں ہی میں رہنے دیجئے۔ میں اسی کو اپنے لئے عزت کی بات سمجھوں گا۔

گنگولی۔ (ہنس کر) ہا ہا کام تو نا کابل لوگ ہی کرتا ہے۔ کابل آدمی نہیں کرتا۔ وہ بس باتیں کرتا ہے۔ کابل آدمی کا مطلب ہے۔ باتونی آدمی کھالی بات بات۔ جو جتنا ہی بات کرتا ہے اُتنا ہی کابل ہوتا ہے۔ وہ کام کا ڈھنگ بتا دے گا۔ کہاں کون بھوُل ہو گیا۔ یہ بتا دے گا پر کام نہیں کر سکتا۔ ہم ایسا کابل آدمی نہیں چاہتا۔ ہمارے یہاں باتیں کرنے کا کام نہیں ہے۔ ہم تو ایسا آدمی چاہتا ہے۔ جو موڑا کھلے۔ موٹا پہنے۔ گلی گلی اور نگر دوڑے۔ گریبوں کا اُپکار کرے مُصیبت میں اُن کا ساتھ دے۔ تو کب سے آئے گا؟

پربھو سیوک۔ میں تو ابھی سے حاضر ہوں۔

گنگولی۔ (مسکرا کر) تو پہلا لڑائی تم کو اپنے پاپا سے لڑنا پڑے گا۔

پربھو سیوک۔ میرا خیال ہے کہ پاپا خود ہی اس بات کو ترک کر دیں گے۔

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ وہ کبھی اپنا بات نہیں چھوڑے گا۔ ہم کو اُس سے لڑائی کرنا پڑے گا۔ تم کو اُس سے لڑنا پڑے گا۔ ہماری سمتی نیائے کو سب سے اُوپر مانتا ہے۔ نیائے ہم کو ماں باپ سے دھن دولت سے۔ نام اور حسن (رینک نامی) سے۔ سب سے بڑھ کر پیارا ہے۔ ہم اور سب کچھ چھوڑ دے گا پر نیائے کو نہ چھوڑے گا۔ یہی ہمارا برت (عہد) ہے۔ تم کو خوب سوچ بچار کر تب

یہاں آنا ہوگا۔

پربھو سیوک۔ میں نے خوب سوچ بچار لیا ہے۔

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ جلدی نہیں ہے۔ کھوب سوچ بچار لو۔ یہ تو اچھا نہیں ہوگا کہ ایک بار آکر تم پھر بھاگ جائے۔

پربھو سیوک۔ ہا۔ اب موت ہی مجھے اس جماعت سے جُدا کر سکتی ہے۔

گنگولی۔ مسٹر جان سیوک تم سے کہے گا۔ ہم نیائے انیائے کے جھگڑے میں نہیں پڑتا۔ تم ہمارا بیٹا ہے۔ ہمارا حکم ماننا تمہارا دھرم ہے تو تم کیا جواب دے گا؟ (ہنس کر) میرا باپ ایسا کہتا تو میں تو اُس سے کبھی نہ کہہ سکتا۔ کہ ہم تمہارا بات نہ مانے گا۔ وہ ہم سے بولا تم بیرسٹر ہو جائے۔ ہم انگلینڈ چلا گیا۔ وہاں سے بیرسٹر ہو کر آگیا۔ کئی سال تک کچہری جا کر پیپر (کاغذ) پڑھا کرتا تھا۔ جب فادر (باپ) کا ڈیتھ (وفات) ہو گیا تو ڈاکٹری پڑھنے لگا۔ باپ کے سامنے ہم کو یہ کہنے کا ہمت نہیں ہُوا کہ ہم کانون نہیں پڑے گا۔

پربھو سیوک۔ باپ کی عزت کرنا دوسری بات ہے اور اصول پہ کاربند ہونا دوسری بات۔ اگر آپ کے فادر کہتے کہ جا کر کسی کے گھر میں آگ لگا دو۔ تو آپ آگ لگا دیتے؟

گنگولی۔ نہیں نہیں۔ کبھی نہیں۔ ہم کبھی آگ نہ لگاتا۔ چاہے ہمارا باپ ہمیں کو کیوں نہ جلا دیتا۔ لیکن باپ ایسا حکم دے بھی تو نہیں سکتا۔

وقفہ۔ رانی جانہوی وارد ہوئیں۔ غم اور غصہ کی تصویر۔ بھوئیں تنی ہوئیں ماتھے پہ شکن۔ گویا نہا کر پوجا کرنے کے لیے جاتے وقت کسی نے چھو لیا ہو۔ گنگولی کو دیکھ کر بولیں۔ آپ کی طبیعت کا رنسل سے نہیں تھکتی۔ میں تو زندگی سے تھک گئی۔ جو چاہتی ہوں وہ نہیں ہوتا۔ جو نہیں چاہتی وہی ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب! سب کچھ سہا جاتا ہے پر بیٹے کا بُرا برتاؤ نہیں سہا جاتا۔ خاص کر ایسے بیٹے کا جس کے بنانے میں کوئی بات اٹھا نہ رکھی گئی ہو۔ نالائق جسونت نگر کے ہنگامہ

میں مر گیا ہوتا تو مجھے اتنا رنج نہ ہوتا۔

کنور صاحب اور زیادہ نہ سُن سکے۔ اُٹھ کر باہر چلے گئے۔ رانی نے اسی لہجہ میں کہا یہ میرا دُکھ کیا سمجھیں گے۔ ان کی ساری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوئی ہے نفس پرستی کے سامنے انہوں نے کبھی معیار کی پرواہ نہیں کی۔ دیگر رؤسا کی طرح تن پروری میں مشغول رہے۔ میں نے تو دنے کے لئے سخت ریاضت کی ہے۔ اُسے ہاتھ لے کر مہینوں پہاڑوں میں پیدل چلی ہوں۔ صرف اس لئے کہ بچپن ہی سے اُسے مشکلات کا عادی بناؤں۔ اُس کی ایک ایک بات اُس کے ایک ایک کام کو غور سے دیکھتی رہی ہوں کہ اُس میں برائیاں نہ آجائیں۔ اگر وہ کبھی نوکر پر بگڑا ہے تو اُسے سمجھایا ہے۔ کبھی سچائی سے منہ موڑتے دیکھا ہے تو فوراً تنبیہ کی ہے۔ یہ میرے ہی دُکھ کا حال کیا جانیں گے!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ کی نگاہ پربھو سیوک پر پڑ گئی جو گوشہ میں کھڑا کتابیں اُلٹ پلٹ رہا تھا۔ اُن کی زبان بند ہو گئی۔ آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔ صوفیا کے متعلق جو سخت باتیں دل میں تھیں۔ وہ دل ہی میں رہ گئیں۔ صرف گنگا دیوی سے اتنا کہا کہ جاتے وقت مجھ سے مل لیجئے گا اور چلی گئیں۔

## (۳۵)

دنے سنگھ آبادی میں داخل ہوئے تو سویرا ہو گیا تھا۔ تھوڑی ہی دُور چلے تھے ایک بُڑھیا لاٹھی ٹیکتی سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ انہیں دیکھ کر بولی۔ بیٹا غریب ہوں۔ بن پڑے تو کچھ دے دو۔ دھرم ہو گا۔

نایک رام۔ سبیرے سبیرے رام نام نہیں لیتی۔ بھیک مانگنے چل کھڑی ہوئی ہے۔ تجھے تو جیسے رات کو نیند ہی نہیں آئی۔ مانگنے کو تو دن بھر ہے۔

بُڑھیا۔ بیٹا دُکھیا ہوں۔

نایک رام۔ یہاں سُکھیا کون ہے؟ رات بھر بھوکوں مرے معسوک

کی گھڑکیاں کھائیں۔ پیر تو سیدھے پڑتے نہیں تمہیں پیسے کہاں سے دے دیں؟

بڑھیا۔ بیٹا دھوپ میں مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ سر میں چکر آجاتا ہے۔ نئی نئی بپتا ہے بھیا۔ بھگوان اُس ادھم پاپی دونے سنگھ کا بُرا کرے۔ اُسکے کارن بڑھاپے میں یہ دن دیکھنا پڑا۔ نہیں تو بیٹا دوکان کرتا تھا۔ گھر میں رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ نوکر چاکر تھے۔ کون سا سُکھ نہیں تھا؟ تم پردیسی ہو۔ نہ جانتے ہوگے۔ یہاں دنگا ہو گیا تھا۔ میرا لڑکا دوکان سے بلا تک نہیں پر اُس نگوڑے دونے سنگھ نے گواہی دے دی کہ یہ بھی دنگے میں بلا ہوا تھا۔ پولیس ہمارے اوپر بہت دنوں سے دانت لگائے تھی۔ کوئی داؤں نہ پاتی تھی۔ یہ گواہی پاتے ہی دوڑ آگئی۔ لڑکا پکڑ لیا گیا۔ اُسے تین سال کی سجا ہو گئی۔ ایک ہجار جریبانہ ہوا۔ گھر کی بیس ہزار کی گرہستی نہیں نہس ہو گئی۔ گھر میں بہو ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اسی طرح مانگ جانچ کر انہیں پالتی پوستی ہوں۔ نہ جانے اُس کل مُنہے نے کب کا بیر نکالا۔

دونے نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر بڑھیا کو دیا اور آسمان کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔ ایسی روحانی تکلیف انہیں کبھی نہ ہوئی تھی۔

بڑھیا نے روپیہ دیکھا تو چونک پڑی۔ سمجھی۔ شاید بھول سے دے دیا ہے۔ بولی — بیٹا یہ تو روپیہ ہے۔

دونے سنگھ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ہاں لے جاؤ۔ میں نے بھول سے نہیں دیا ہے۔

بڑھیا دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی۔ دونوں آدمی اور آگے بڑھے تو راستہ میں ایک کنواں ملا۔ اس پر ایک پیپل کا درخت تھا۔ ایک چھوٹا سا مندر بھی بنا ہوا تھا۔ نائک رام نے سوچا۔ یہیں ہاتھ منہ دھولیں۔ دونوں آدمی کنوئیں پر گئے تو دیکھا کہ ایک پنڈت جی پیپل کے نیچے بیٹھے پاٹ کر رہے ہیں۔ جب وہ پاٹ کر چکے تو دونے نے پوچھا۔ آپ کو معلوم ہے۔ سردار نیلکنٹھ آج کل کہاں ہیں؟

پنڈت جی نے سخت لہجہ میں کہا۔ ہم نہیں جانتے۔

دنے ۔ پولیس کے انسپکٹر تو ہوں گے ؟

پنڈت ۔ کہہ دیا ۔ میں نہیں جانتا ۔

دنے ۔ مسٹر کلارک تو دورہ پر ہوں گے ؟

پنڈت ۔ میں کچھ نہیں جانتا ۔

نائک رام ۔ پوجا پاٹ میں دیس دنیا کی سُدھ ہی نہیں ۔

پنڈت ۔ ہاں ۔ جب تک منو کا منا (دلی خواہش) نہ پوری ہو جائے ۔ تب تک مجھے کسی سے کچھ سروکار نہیں ۔ سبیرے سبیرے تم نے بیچھوں کا نام سُنا دیا ۔ نہ جانے دن کیسے کٹے گا ؟

نائک رام ۔ وہ کون سی منو کا منا ہے ؟

پنڈت ۔ اپنے (بھگوان اوتاروں) کا بدلہ ۔

نائک رام ۔ کس سے ؟

پنڈت ۔ اُس کا نام نہ لوں گا ۔ کسی بڑے رئیس کا لڑکا ہے ۔ کاسی سے گرمیوں کی سہاپتا (ردو) کرنے آیا تھا ۔ سینکڑوں گھر اُجاڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا ۔ اُسی کے لئے یہ اُتشٹھان (پوجا) کر رہا ہوں ۔ یہاں آدھا سہر میرا بھگت تھا ۔ سیٹھ ساہوکار میرا آدر (عزت) کرتے تھے ۔ لڑکوں کو پڑھایا کرتا تھا ۔ ہاں بُرائی یہ تھی کہ نادم کو سلام کرنے نہ جاتا تھا ۔ عملوں کی کوئی بُرائی دیکھتا تو اُن کے مُنہ پر کہہ دیتا ۔ اِسی سے سب عملے مجھ سے جلتے تھے ۔ پچھلے دنوں جب یہاں دنگا ہوا ۔ تو سبھوں نے اُسی بنارس کے گنڈے سے مجھ پر بغاوت کا اپرادھ لگوا دیا ۔ سجا ہو گئی ۔ بنیت پڑ گئے ۔ جریبانہ ہو گیا ۔ آبرو مٹی میں مل گئی ۔ اب نگر میں کوئی ورولجے پر کھڑا نہیں ہونے دیتا ۔ نراس ہو کر دیوی کی شرن آیا ہوں ۔ پورشچرن کا پاٹ کر رہا ہوں ۔ جس دن سُنوں گا کہ اس ہتیارے پر دیوی نے کوپ کیا ۔ اسی دن میری تپسیا پوری ہو جائے گی ۔ براہمن ہوں ۔ لڑنا جھگڑنا نہیں جانتا ۔ میرے پاس اس کے سوا اور کون سا ہتھیار ہے ؟

وے کسی شراب خانے سے نکلتے ہوئے پکڑے جاتے تو بھی اتنے شرمندہ نہ ہوتے۔ انہیں اب اس براہمن کی صورت یاد آئی۔ یاد آیا کہ میں نے ہی پولیس کی ترغیب سے اسے پکڑوا دیا تھا۔ جیب سے پانچ روپے نکالے اور پنڈت جی سے بولے۔ یہ لیجیے میری طرف سے بھی اُس بدمعاش کے لئے پوسٹ کارڈ کا جاپ کروا دیجئے گا۔ اُس نے مجھے بھی تباہ کر دیا ہے۔ میں بھی اُس کے خون کا پیاسا ہو رہا ہوں۔

پنڈت۔ مہاراج آپ کا بھلا ہوگا۔ میری کے دیہہ (جسم) میں کیڑے نہ پڑ جائیں تو کہیئے گا کہ کوئی کہتا تھا۔ کتوں کی موت مرے گا۔ یہاں سارا نگر اُس کا دشمن ہے۔ اب تک اس لئے اُس کی جان بچی کہ پولیس اُس کو گھیرے رہتی ہے۔ مگر کب تک؟ جس دن اکیلا گھر سے نکلا۔ اُسی دن دیوی کا اُس پر کوپ (قہر) گرا۔ ہے وہ اسی راج میں۔ کہیں باہر نہیں گیا ہے اور نہ اب بچ کر جا ہی سکتا ہے۔ کال اس کے سر پر کھیل رہا ہے۔ اتنے دُکھیوں کی ہائے کیا اکارتھ جائے گی؟

جب یہاں سے اور آگے چلے تو وے نے کہا۔ پنڈا جی۔ اب جلد ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر لو۔ مجھے خوف ہو رہا ہے کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ اپنی جان کا اتنا خوف مجھے کبھی نہ ہوا تھا۔ اگر ایسے ہی دو ایک نظارے اور سامنے آئے تو شاید میں خودکشی کر لوں۔ آہ میں کتنا گر گیا ہوں۔ اور اب تک میں یہی سمجھ رہا تھا کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میں نے خدمت کا عہد کیا تھا۔ گھر سے دوسروں کی بھلائی کرنے چلا تھا۔ خوب بھلائی کی۔ شاید یہ لوگ مجھے تمام عمر نہ بھولیں گے۔

نائیک رام۔ بھیا۔ بھول چوک آدمی ہی سے تو ہوتی ہے۔ اب اُس کا پچھتاوا نہ کرو۔

وے۔ نائیک رام۔ یہ بھول چوک نہیں۔ ایشور کا قانون ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایشور پاک عہد کرنے والوں کا سخت امتحان لیا کرتے ہیں۔ خادم قوم کا درجہ ان امتحانات میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں ملتا۔ میں امتحان میں فیل ہو گیا۔ بُری طرح فیل ہو گیا!

نایک رام نے سوچا تھا کہ ذرا جیل کے داروغہ صاحب سے خیر و عافیت کا حال دریافت کرتے چلیں۔ لیکن موقع نہ دیکھا تو فوراً موٹر سروس کے دفتر میں گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ دربار نے سب موٹروں کو ایک ہفتہ کے لئے روک لیا ہے۔

مسٹر کلارک کے کئی دوست باہر سے شکار کھیلنے کو آئے ہوئے تھے۔ اب کیا ہو؟ نایک رام کو گھوڑے پر سوار ہونا نہ آتا تھا اور دونے کو یہ مناسب نہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ تو سوار ہو کر چلے اور وہ پیدل۔

نایک رام۔ بھیّا۔ تم سوار ہو جاؤ۔ میری کون؟ ابھی موقع پڑ جائے۔ تو دس کوس چل سکتا ہوں۔

دونے۔ تو مَیں ایسا کون مَرا جاتا ہوں۔ اب رات کی تھکاوٹ دُور ہو گئی۔

دونوں آدمیوں نے کچھ ناشتہ کیا اور اودے پور کو روانہ ہوئے۔ آج دونے نے جتنی باتیں کیں۔ اتنی شاید اور کبھی نہ کی تھیں۔ اور وہ بھی نایک رام جیسے لٹھ گنوار سے۔ صوفیا کی کڑی باتیں اب اُنہیں بالکل واجبی معلوم ہوتی تھیں۔

بولے — پنڈاجی۔ سمجھ لو۔ کہ اگر دربار نے ان سب قیدیوں کو چھوڑ نہ دیا تو میری شہادت سے سزایاب ہوئے ہیں۔ تو میں اپنا منہ کسی کو نہ دکھلاؤں گا۔ میرے لئے یہی ایک اُمید باقی رہ گئی ہے۔ تم گھر جا کر ماتا جی سے کہہ دینا کہ وہ اپنی غلطی پر کتنا ملول کتنا نادم تھا۔

نایک رام۔ بھیّا۔ تم گھر نہ جاؤ گے تو میں بھی نہ جاؤں گا۔ اب تو جہاں تم ہو وہیں میں بھی ہوں۔ جو کچھ بیتے گی دونوں ہی پر بیتے گی۔

دونے۔ بس تمہاری یہی بات بُری معلوم ہوتی ہے۔ تمہارا اور میرا کونسا ساتھ ہے؟ میں پاپی ہوں۔ مجھے اپنے پاپوں کا پرائشچت کرنا ہے۔ تمہارے ماتھے پر کوئی کلنک نہیں ہے۔ تم اپنی زندگی کیوں برباد کرو گے؟ میں نے اب تک صوفیا کو نہیں پہچانا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ وہ کتنی فراخ دل ہے۔ مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ہاں شکایت صرف اس بات کی ہے کہ اس نے مجھے اپنا نہ سمجھا۔ وہ

اگر سمجھتی کہ یہ میرے ہیں تو میری ایک ایک بات کیوں پکڑتی۔ ذرا ذرا سی باتوں پر کیوں جاسوسوں کی طرح کڑی نگاہ ڈالتی؟ وہ یہ جانتی ہے کہ میں ٹھکرا دوں گی تو یہ جان پر کھیل جائیں گے۔ یہ جانتے ہوئے بھی اُس نے میرے ساتھ اتنی بیدردی کیوں کی؟ وہ یہ کیوں بھول گئی کہ انسان سے خطائیں ہوتی ہی ہیں۔ ممکن ہے کہ اپنا سمجھ کر ہی اُس نے مجھے یہ سخت سزا دی ہو۔ دوسروں کی بُرائیوں کی ہمیں پرواہ نہیں ہوتی۔ اپنوں ہی کو بُری راہ چلتے دیکھ کر سزا دی جاتی ہے۔ مگر بیگانوں کو سزا دیتے وقت اس کا تو خیال رکھنا چاہیئے کہ لگائی بجھائی کا رشتہ نہ ٹوٹنے نہ پائے۔ یہ سوچ کر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا دل مجھ سے ہمیشہ کے لئے پھر گیا۔

نائیک رام۔ عیسائن ہے نا؟ کسی انگریز کو گانٹھے گی!

ونے۔ تم بالکل بیوقوف ہو۔ بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میں کہتا ہوں۔ وہ اب عمر بھر کنواری رہے گی۔ تم اُسے کیا جانو؟ بات سمجھو نہ بوجھو۔ جھٹ کہہ اُٹھے کہ کسی انگریز کو گانٹھے گی۔ میں اُسے کچھ کچھ جانتا ہوں۔ میرے لئے اُس نے کیا کیا نہیں کیا۔ کیا کیا نہیں سہا؟ جب اُس کی محبت یاد آتی ہے تو دل و جگر میں ایسا درد ہوتا ہے کہ کہیں پتھر سے سر ٹکرا کر جان دے دینے کو جی چاہتا ہے۔ اب وہ ناقابلِ فتح ہے۔ اُس نے اپنی محبت کا دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اُس جنم میں نہ جانے کون سی تپسیا کی تھی۔ جس کا اچھا پھل اتنے دنوں تک میں نے بھوگا۔ اب کوئی دیوتا بن کر بھی اُس کے سامنے آئے تو وہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی۔ جنم سے عیسائن بھلے ہی ہو مگر عادات و اطوار سے وہ آریہ استری ہے۔ میں نے اُسے کہیں کا نہ رکھا۔ آپ بھی ڈوبا۔ اُسے بھی لے ڈوبا۔ اب تم دیکھنا کہ ریاست کو کیسا وہ ناکوں چنے چبواتی ہے۔ اس کی زبان میں وہ طاقت ہے کہ آن کی آن میں ریاست کا نام و نشان مٹا سکتی ہے۔

نائیک رام۔ ہاں ہے تو ایسی ہی آفت کی پرکالہ۔

ونے۔ پھر وہی حماقت! میں تم سے کتنی ہی بار کہہ چکا کہ میرے سامنے

اس کا نام عزت سے لیا کرو۔ میں اُس کے متعلق کسی کی زبان سے ایک بھی نامناسب لفظ نہیں سُن سکتا۔ وہ اگر مجھے برچھیوں سے چھیدے تو اُس کے لئے میرے دل میں نفرت کا خیال نہ پیدا ہوگا۔ محبت میں انتقام نہیں ہوتا۔ محبت تو بیحد عفو۔ بیحد فیاضی۔ بیحد تحمل سے معمور ہوتی ہے۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں نے دوپہر تک نصف منزل طے کی۔ دوپہر کو آرام کرنے لگے تو ایسے سوئے کہ شام ہوگئی۔ رات کو وہیں ٹھہرنا پڑا۔ سرائے موجود تھی۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ ہاں نایک رام کو آج زندگی میں پہلی دفعہ بھنگ نہ ملی۔ اور وہ بہت بیچین رہے۔ ایک تولہ بھنگ کے لئے ایک سے دس روپے تک دینے کو تیار تھے۔ مگر آج نصیبوں میں فاقہ ہی لکھا تھا۔ ہر طرح مجبور ہو کر وہ سر پکڑے ہوئے کنوئیں کی جگت پر آ بیٹھے۔ گویا گھر سے کسی آدمی کو کریا کرم کر کے آئے ہوں۔

دُنے نے کہا۔ ایسی عادت کیوں ڈالتے ہو کہ بھنگ کے بغیر ایک روز بھی رہنا مشکل ہو؟ چھوڑو ایسے بھلے آدمی۔ مُفت جان دیتے ہو۔

نایک رام۔ بھیّا۔ اس جنم میں تو چھوٹتی نہیں۔ آگے کی رام جانے۔ یہاں تو مرتے وقت بھی ایک لوٹا سرہانے رکھ لیں گے۔ وصیت کر جائیں گے کہ ایک سیر بھنگ ہماری چتا میں ڈال دینا۔ کوئی پانی دینے والا تو ہے نہیں۔ پر جو کبھی بھگوان نے وہ دن دکھایا تو لڑکوں سے کہہ جاؤں گا کہ پنڈے کے ساتھ بھنگ کا پنڈا بھی ضرور دینا۔ اس کا مجا وہی جانتا ہے جو اسے پیتا ہے۔

نایک رام کو آج کھانا اچھا نہ معلوم ہوا۔ نیند نہ آئی۔ بدن ٹوٹتا رہا۔ غصہ میں سرائے والے کو خوب گالیاں دیں۔ مارنے دوڑے۔ بنئے کو ڈانٹا کہ صاف شکر کیوں نہیں دی۔ حلوائی سے اُلجھ پڑے کہ مٹھائیاں کیوں خراب دیں؟ دیکھ تو تیری کیا گت بناتا ہوں۔ چل کر سیدھے سردار صاحب سے کہتا ہوں۔ بچّا۔ دوکان نہ لُٹوا لوں تو کہنا۔ جانتے ہو میرا نام ہے نایک رام! یہاں تیل کی بُو سے کھن ہے۔ حلوائی پیروں پڑنے لگا پر انہوں نے ایک نہ سُنی۔ یہاں تک کہ دھمکا کر اُس سے پچیس روپے

اینٹھ لئے۔ لیکن چلتے وقت ونے نے روپے واپس کرادئے۔ ہاں حلوائی کو تاکید کر دی کہ ایسی خراب مٹھائیاں نہ بنایا کرے۔ اور تیل کی چیز کے گھی کے دام نہ لیا کرے۔

دوسرے روز دونوں آدمی دس بجتے بجتے اودے پور پہنچ گئے۔ پہلا آدمی جو انہیں نظر پڑا وہ خود سردار صاحب تھے۔ وہ ٹہلتے ہوئے دربار سے آرہے تھے۔ ونے کو دیکھتے ہی گھوڑا روک دیا اور پوچھا آپ کہاں؟

ونے نے کہا۔ یہیں تو آرہا تھا۔

سردار۔ کوئی موٹر نہ ملا؟ ہاں نہ ملا ہوگا۔ ٹیلی فون کیوں نہ کر دیا؟ یہاں سے سواری بھیج دی جاتی۔ فضول ہی اتنی تکلیف اٹھائی۔

ونے۔ مجھے پاپیادہ چلنے کا محاورہ ہے۔ کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ میں آج آپ سے ملنا چاہتا ہوں اور تنہائی میں۔ آپ کب مل سکیں گے؟

سردار۔ آپ کے لئے وقت مقرر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب جی چاہے چلے آئیے گا بلکہ وہیں ٹھہریئے گا بھی۔

ونے۔ اچھی بات ہے۔

سردار صاحب نے گھوڑے کو چابک لگائی اور روانہ ہوگئے۔ یہ نہ ہوسکا کہ ونے کو بھی بٹھا لیتے کیونکہ اُن کے ساتھ نایک رام کو بھی بٹھانا پڑتا۔ ونے سنگھ نے ایک تانگا لیا اور ذرا دیر میں سردار صاحب کے مکان پر جا پہنچے۔

سردار صاحب نے دریافت کیا۔ ادھر کئی روز سے آپ کی کوئی خبر نہیں ملی۔ آپ کے ساتھ کے اور لوگ کہاں ہیں؟ کچھ مسز کلارک کا پتہ چلا؟

ونے۔ ساتھ کے آدمی تو بچھے ہیں۔ لیکن مسز کلارک کا کہیں پتہ نہ چلا۔ ساری محنت رائیگاں ہوئی۔ ہیرا لال سنگھ کا تو میں نے پتہ لگا لیا بلکہ اُس کا گھر بھی دیکھ آیا۔ پر مسز کلارک کا سُراغ نہیں ملا۔

سردار صاحب نے تعجب سے کہا — یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو جو اطلاع ملی ہے اُس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے مسز کلارک کی ملاقات ہوئی

اور اب مجھے آپ سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ دیکھیئے میں وہ خط آپ کو دکھلاتا ہوں۔
یہ کہہ کر سردار صاحب میز کے پاس گئے اور ایک موٹے بادامی کاغذ پر لکھا ہوا خط اُٹھا لائے۔ لاکر ونے کے ہاتھ میں رکھ دیا۔

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ونے نے دروغگوئی سے کام لیا تھا۔ اُن کے چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنی بات کس طرح بنائیں۔ یہ سمجھ میں نہ آیا۔ نایک رام بھی فرش پر بیٹھے تھے سمجھ گئے کہ یہ پریشان ہیں۔ وہ خود جھوٹ بولنے اور باتیں بنانے میں کافی مشاق تھا۔ بولا۔ کنور صاحب ذرا مجھے دیجیئے کس کا خط ہے؟

ونے۔ اندردت کا۔

نایک رام۔ اوہو۔ اُس پاگل کا خط ہے! وہی لونڈا نا۔ جو سیوا سمتی میں آ کر گایا کرتا تھا؟ اُس کے ماں باپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ سرکار لگا ہے۔ ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں کیا کرتا ہے۔

سردار۔ نہیں کسی پاگل لونڈے کی تحریر ایسی نہیں ہو سکتی۔ بڑا ہوشیار اس میں کوئی شک نہیں۔ اُس کے خطوط اِدھر کئی روز سے میرے پاس برابر آ رہے ہیں۔ کبھی مجھے دھمکاتا ہے۔ کبھی اُپدیش دیتا ہے۔ لیکن جو کچھ کہتا ہے مہذب پیرایہ میں۔ ایک لفظ بھی اہانت آمیز نہیں ہوتا۔ اگر یہ وہی اندردت ہے جسے آپ جانتے ہیں تو اور بھی تعجب ہے۔ ممکن ہے اُس کے نام سے کوئی دوسرا ہی آدمی خط لکھتا ہو۔ یہ کوئی معمولی تعلیمیافتہ شخص نہیں معلوم ہوتا۔

ونے سنگھ تو ایسے سیٹ پٹائے جیسے کوئی نوکر مالک کا صندوق کھولتا ہوا پکڑ لیا جائے۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے کہ میں نے کیوں جھوٹ کہا؟ مجھے چھپانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ لیکن اندردت کا اِس خط سے کیا مقصد ہے؟ کیا مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے؟

نایک رام۔ کوئی دوسرا ہی آدمی ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے حاکموں کو کنور صاحب سے بھڑکا دیں۔ کیوں بھیّا! سمتی میں کوئی اچھا پڑھا

آدمی تھا؟

ولنے۔ سبھی پڑھے لکھے تھے۔ اُن میں جاہل ایک بھی نہیں۔ اندرون بھی اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ شخص ہے۔ پر مجھے یہ نہ معلوم تھا کہ اُس کے دل میں میری جانب سے اتنی کدورت ہے۔

یہ کہہ کر انہوں نے سردار صاحب کو منفعل نگاہوں سے دیکھا۔ جھوٹ کی شکل ہر لمحہ زیادہ خوفناک اور اُس کی تاریکی اور بھی زیادہ گھنی ہوتی تھی۔

ولنے نے شرماتے ہوئے کہا۔ سردار صاحب معاف فرمائیے گا کہ میں آپ سے جھوٹ کہہ رہا تھا۔ اس خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ لفظ بلفظ صحیح ہے۔ بلاشک میری ملاقات مسز کلارک سے ہوئی۔ میں اس واقعہ کو آپ سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا کیونکہ میں نے اُن سے اس بات کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ وہاں بہت آرام سے ہیں یہاں تک کہ میرے بیحد اصرار پر بھی وہ میرے ساتھ نہ آئیں۔

سردار صاحب نے بے پروائی سے کہا۔ سیاسی معاملات میں وعدہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ اب مجھے آپ سے واقعی ہوشیار رہنا پڑے گا۔ اگر اس خط سے مجھے ساری باتوں کی خبر نہ مل گئی ہوتی تو آپ نے تو مجھے مغالطہ دینے میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آج کل اُس کے متعلق گورنمنٹ سے کتنی دھمکیاں مل رہی ہیں۔ یوں کہیئے کہ مسز کلارک کے بخیریت واپس آجانے پر ہی ہماری جملہ کارگزاریوں کا انحصار ہے۔ خیر یہ کیا بات ہے؟ مسز کلارک آئیں کیوں نہیں؟ کیا یہ معاشوں نے انہیں آنے نہ دیا؟

ولنے۔ بیرپال سنگھ تو بڑی خوشی سے اُنہیں بھیجنا چاہتا تھا یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی جان کی حفاظت کر سکتا ہے۔ لیکن وہ خود ہی آنے پر تیار نہ ہوئیں۔

سردار۔ مسز کلارک سے ناراض تو نہیں ہیں؟

ولنے۔ ہو سکتا ہے۔ جس روز بغاوت ہوئی تھی مسز کلارک نشہ میں بیہوش پڑے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ چڑھ گئی ہو۔ ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اُن

سے ملاقات ہو جانے سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ہم نے جسونت نگر کے باشندوں پر تشدد کر
میں بہت سی نامنصفانہ باتوں سے کام لیا۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ باغیوں نے مسز کلارک
کو یا تو قید کر رکھا ہے یا قتل کر ڈالا ہے۔ اسی خوف کی بنا پر ہم نے جبر و تشدد سے کام
لیا۔ سب کو ایک لاٹھی سے ہانکا۔ مگر دو باتوں میں سے ایک بھی سچ نہ نکلی۔ مسز کلارک
زندہ ہیں اور خوش ہیں۔ وہ وہاں سے خود ہی نہیں آنا چاہتیں۔ جسونت نگر کے لوگ
بلاوجہ ہمارے عتاب کے مورد ہوئے۔ میں آپ سے باصرار التجا کرتا ہوں کہ اُن غریبوں
پر رحم ہونا چاہیئے۔ سینکڑوں بے گناہوں کا خون ہو رہا ہے۔

سردار صاحب دیدہ دانستہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کرنا چاہتے تھے۔ مگر
ایسا کر چکنے پر انہیں اپنی غلطی کو تسلیم کر لینے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ انصاف کرنا اتنا
مشکل نہیں ہے جتنا بے انصافی کی تلافی کرنا۔ صوفیا کے گم ہو جانے سے انہیں صرف
گورنمنٹ کی کج نگاہی کا خوف تھا۔ مگر صوفیا کا پتہ مل جانا تو تمام ملک کے سامنے
اپنی نااہلیت اور ناانصافی کا اعلان کرنا تھا۔ مسٹر کلارک کو خوش کر کے گورنمنٹ کو
خوش کیا جا سکتا تھا مگر رعایا کا منہ اتنی آسانی سے بند نہ کیا جا سکتا تھا۔

سردار صاحب نے تامل سے کہا۔ یہ تو میں مان سکتا ہوں کہ مسز کلارک
صحیح و سالم ہیں۔ لیکن آپ تو کیا اگر کوئی فرشتہ بھی آ کے کہے کہ وہ وہاں خوش ہیں۔
اور لوٹنا نہیں چاہتیں تو بھی میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ یہ بچوں کی سی بات
ہے۔ کسی کو اپنے گھر سے اتنی نفرت نہیں ہوتی کہ وہ دشمنوں کے ساتھ رہنا پسند
کرے۔ باغیوں نے مسز کلارک کو یہ کہنے کے لئے مجبور کیا ہوگا۔ وہ مسز کلارک
کو اُس وقت تک نہ چھوڑیں گے جب تک ہم تمام قیدیوں کو آزاد نہ کر دیں
یہ اُن کی چالاکی ہے اور میں اُسے باور نہیں کر سکتا۔ مسز کلارک کو سخت سے
سخت اذیتیں دی جا رہی ہیں اور انہوں نے اذیتوں سے نجات پانے کے
لئے آپ سے یہ سفارش کی ہے۔ بس اور کوئی بات نہیں ہے۔

ونے۔ میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں ہو سکتا۔ مسز کلارک کافی

خوش و خرم نظر آتی تھیں۔ دُکھتا ہُوا دل کبھی اتنا مطمئن نہیں ہو سکتا۔

سردار۔ یہ آپ کی آنکھوں کا نقص ہے۔ اگر مسز کلارک خود آکر مجھ سے کہیں کہ میں بڑے آرام سے ہوں تو بھی مجھے یقین نہ آئے گا۔ آپ نہیں جانتے یہ لوگ کن حکمتوں سے آزادی پر جان دینے والے لوگوں پر بھی اپنا رعب جما لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کے پنجہ سے چھٹکارا پا جانے پر بھی قیدی اُنہیں کی سی کہتا ہے۔ اور انہیں کی سی کرتا ہے۔ میں ایک زمانہ میں پولیس کا ملازم تھا۔ آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میں نے کتنے ہی سیاسی مقدمات میں بڑے بڑے ریاضت کشوں سے ایسے ایسے جرائم کا اقبال کرا دیا جن کا انہیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ہیریال سنگھ اس معاملہ میں ہم سے کہیں زیادہ ہوشیار ہے۔

میں نے۔ سردار صاحب اگر ذرا دیر کے لئے مجھے یہ یقین بھی ہو جائے کہ مسز کلارک نے دباؤ میں پڑ کر مجھ سے یہ باتیں کہی ہیں تو بھی اب ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہمیں اتنی بیدردی سے تشدد نہ کرنا چاہئے تھا۔ اب ان ملزموں کے ساتھ کچھ رعایت ضروری ہونی چاہئے؟

سردار۔ سیاسی معاملات میں رعایت کرنا اپنی ہار مان لینا ہے۔ اگر میں یہ بھی مان لوں کہ مسز کلارک وہاں آرام سے ہیں اور آزاد ہیں اور ہم نے جسونت نگر کے لوگوں پر واقعی بڑا ظلم کیا ہے۔ پھر بھی میں رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ رعایت کرنا اپنی کمزوری اور غلطی کا اعتراف کرنا ہے۔ آپ جانتے ہیں رعایت کا انجام کیا ہوگا۔ باغیوں کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ اُن کے دلوں سے ریاست کا خوف جاتا رہے گا اور جب خوف نہ رہا تو سلطنت بھی نہیں رہ سکتی۔ خوف کو آپ نکال دیجئے اور سلطنت تباہ ہو جائے گی۔ پھر ارجن کی بہادری اور بدھشٹر کا انصاف بھی اُسے محفوظ نہیں رکھ سکتا۔ سو دو سو بیگناہوں کا جیل میں رہنا سلطنت کے نہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔ مگر میں اُن باغیوں کو بیگناہ کیوں کر تسلیم کر لوں؟ کئی ہزار آدمیوں کا مسلح ہو کر جمع ہونا یہ ثابت کرتا ہے۔ کہ وہاں لوگ بغاوت کرنے ہی

کے خیال سے جمع ہوئے تھے۔

ونے۔ لیکن جو لوگ اُس میں شامل نہ تھے وہ تو بے قصور ہیں؟

سردار۔ ہرگز نہیں؛ اُن کا فرض تھا کہ حکام کو پہلے ہی سے آگاہ کر دیتے۔ ایک چور کسی کے گھر میں نقب زنی ہوتے دیکھ کر آپ گھر والوں کو جگانے کی کوشش نہ کریں تو وہ خود چور کی اعانت کر رہا ہے۔ اکثر حالتوں میں اغماض جُرم سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

ونے۔ کم از کم اتنا تو کیجئے کہ جو لوگ میری شہادت پر قید کئے گئے ہیں انہیں رہا کر دیجئے۔

سردار۔ ناممکن ہے۔

ونے۔ میں طرزِ حکومت کے تعلق سے نہیں بلکہ رحم اور شرافت کی بنا پر آپ سے یہ التجا کرتا ہوں۔

سردار۔ کہہ دیا بھائی جان! کہ یہ ناممکن ہے۔ آپ اُس کے انجام پر غور نہیں کر رہے ہیں۔

ونے۔ لیکن میری التجا کو منظور نہ کرنے کا انجام بھی اچھا نہ ہوگا۔ آپ مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ بنا رہے ہیں۔

سردار۔ میں کھلی ہوئی بغاوت سے نہیں ڈرتا۔ ڈرتا ہوں صرف قومی خادموں سے۔ رعایا کے ہوا خواہوں سے اور اُن سے یہاں کی رعایا کا جی بھر گیا ہے۔ مدت گزر جائے گی اس کے قبل کہ رعایا کو قومی خادموں کا پھر اعتبار ہو۔

ونے۔ اگر اسی نیت سے آپ نے میرے ہاتھوں رعایا کو تباہ و برباد کرایا تو آپ نے میرے ساتھ واقعی دغا کیا۔ لیکن میں آپ کو متنبہ کئے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے میرا کہنا نہ مانا تو آپ ریاست میں ایسا انقلاب برپا کریں گے جو ریاست کی جڑ ہلا دے گا۔ میں یہاں سے مسٹر کلارک کے پاس جاتا ہوں۔ ان سے بھی یہی التجا کروں گا اور اگر وہ بھی نہ سنیں گے تو مہارانا کی خدمت میں یہی تجویز پیش کروں گا۔ اگر انہوں نے

بھی نہ سُنا تو پھر اس ریاست کا مجھ سے بڑا اور کوئی دشمن نہ ہوگا۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ اُٹھ کھڑے ہوئے اور نایک رام کو ہمراہ لیے مسٹر کلارک کے بنگلے پر جا پہنچے۔ وہ آج ہی اپنے شکاری احباب کو رخصت کر کے واپس آئے تھے۔ اور اس وقت آرام کر رہے تھے۔ ونے نے اردلی سے پوچھا تو معلوم ہوا۔ کہ صاحب کچھ کام کر رہے ہیں۔ ونے باغ میں ٹہلنے لگے۔ جب نصف گھنٹہ تک صاحب نے نہ بُلایا تو اُٹھے اور سیدھے مسٹر کلارک کے کمرہ میں چلے گئے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھے اور بولے۔ آیئے آیئے۔ آپ ہی کی یاد کر رہا تھا۔ کہیئے کیا خبر ہے؟ صوفیا کا پتہ تو آپ لگا ہی آئے ہوں گے؟

ونے۔ جی ہاں لگا آیا۔

یہ کہہ کر ونے سنگھ نے مسٹر کلارک سے بھی وہی داستان کہی جو اُنہوں نے سردار صاحب سے کہی تھی اور اُن سے بھی وہی اصرار آمیز التجا کی۔

کلارک۔ مس صوفیا آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟

ونے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن وہاں انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہے۔

کلارک۔ تو پھر آپ نے نئی کھوج کیا کی؟ میں نے تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کے آنے سے اس معاملہ پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یہ دیکھیئے صوفیا کا خط ہے۔ آج ہی آیا ہے۔ اسے آپ کو دکھا تو نہیں سکتا مگر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ اس وقت میرے سامنے آجائے تو اُسے پستول کا نشانہ بنانے میں ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کروں گا۔ اب مجھے معلوم ہُوا کہ مذہب پرستی مکر اور دغا کا دوسرا نام ہے۔ اُس کی مذہبیت نے مجھے بڑا دھوکا دیا۔ شاید کبھی کسی نے اتنا بڑا دھوکا نہ کھایا ہوگا۔ میں نے سمجھا تھا کہ مذہبیت سے خلوص پیدا ہوتا ہے مگر یہ میرا وہم تھا۔ میں اس کی مذہبیت پر دیوانہ ہو گیا۔ میں انگلینڈ کی رنگیلی عورتوں کی طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔ صوفیا کی سادگی اور مذہبیت دیکھ کر میں نے سمجھا کہ مجھے جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی۔ اپنی سوسائٹی کی پیشکش کر کے میں اس کے پاس آنے جانے لگا۔ اور بالآخر شادی کے لیے کہا۔

صوفیا نے منظور تو کر لیا۔ مگر کچھ دنوں تک شادی کو ملتوی رکھنا چاہا۔ میں کیا جانتا تھا کہ اُس کے دل میں کیا ہے۔ راضی ہو گیا۔ اُسی حالت میں وہ میرے ساتھ یہاں آئی۔ بلکہ یوں کہیے کہ وہی مجھے یہاں لائی۔ دُنیا سمجھتی ہے وہ میری بیوی تھی۔ اوہ۔ ہرگز نہیں۔ ہماری تو منگنی بھی نہ ہوئی تھی۔ اب جائز بھید کھُلا کہ وہ تو بولشویکوں کی ایجنٹ ہے۔ اُس کے ایک ایک لفظ سے اُس کے فطرت کا اظہار ہوتا ہے۔ محبت کا سوانگ بھر کر وہ انگریزوں کے باطنی خیالات سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ اُس کا یہ مقصد پورا ہو گیا۔ مجھ سے جو کام نکل سکتا تھا وہ نکال کر اُس نے مجھے دھتا بتا دیا۔ دنے سنگھ تم نہیں اندازہ کر سکتے کہ میں اُس سے کتنی محبت کرتا تھا؟ اس ہمتیال حُسن کی تہ میں یہ زبردست دغا! مجھے دھمکایا ہے کہ جتنے دنوں میں انگریزی معاشرت کا مجھے جو کچھ تجربہ ہُوا ہے اُسے میں ہندوستانیوں کے نفسِ طبع کے لئے یہ کم و کاست شایع کر دوں گی۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتی ہے اُسے میں خود ہی کیوں نہ ظاہر کر دوں۔ انگریز قوم ہندوستان کو لامحدود زمانہ تک اپنی وسیع سلطنت کا جُزو بنائے رکھنا چاہتی ہے۔ کنسرویٹو ہو یا لبرل۔ ریڈیکل ہو یا لیبر۔ نیشنلسٹ ہو یا سوشلسٹ۔ اس ایک بات پر سبھی متفق ہیں۔ صوفیا کے پہلے ہی میں صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ ریڈیکل اور لیبر کے لیڈروں کے دھوکے میں نہ آؤ۔ کنسرویٹو جماعت میں خواہ کتنی ہی بُرائیاں ہوں۔ مگر وہ بے خوف ہے۔ وہ کڑوے سچ سے نہیں ڈرتا۔ ریڈیکل اور لیبر اپنے پاک و صاف اصولوں کی تائید کرنے میں ایسی اُمید افزا باتیں کہہ ڈالتے ہیں جن پر عمل کرنے کی جرأت اُن میں نہیں ہے۔ اختیار ترک کی چیز نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ صرف اسی ایک لفظ "اختیار پسندی" پر ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی فطرت اب بھی وہی ہے جو آغازِ دُنیا کے وقت تھی۔ انگریز قوم ترک کے لئے یا بلند اصولوں پر قربان ہو جانے کے لئے کبھی مشہور نہیں رہی۔ ہم سب کے سب (میں لیبر ہوں) سلطنت پسند واقع ہوئے ہیں۔ فرق صرف اُس طرزِ عمل میں ہے جسے مختلف جماعتیں اس قوم پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے

اختیار کرتی ہیں۔ کوئی فوج سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ کوئی ہمدردی سے۔ کوئی چکنی چپڑی باتوں سے کام نکال کر۔ بس اصل میں کوئی مقررہ طرزِ حکومت نہیں ہے بلکہ صرف مقصد ہے اور وہ یہ کہ کیونکر ہمارے اختیار و اقتدار میں روز افزوں ترقی ہوتی رہے۔ یہی وہ مخفی راز ہے جسے ظاہر کر دینے کی دھمکی دی گئی ہے۔ اگر یہ خط مجھے نہ ملتا تو میری آنکھوں پر پردہ ہی پڑا رہتا اور میں صوفیا کے لئے کیا کچھ نہ کر ڈالتا۔ مگر اس خط نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور اب میں آپ کی کوئی مدد نہ کروں گا بلکہ آپ سے بھی اصرار کرتا ہوں کہ اس بالشویک تحریک کو نیست و نابود کر دینے میں ریاست کی مدد کیجئے۔ صوفیا جیسی ذہین مستعد اور دلیر عورت کے ہاتھوں میں پڑ کر یہ تحریک کتنی خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ کر لینا مشکل نہیں ہے۔

وہ یہاں سے بھی مایوس ہو کر باہر نکلے تو سوچنے لگے کہ اب مہاراناصاحب کے پاس جانا بے فائدہ ہے۔ وہ صاف کہہ دیں گے کہ جب دلوان اور ایجنٹ کچھ نہیں کر سکتے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ لیکن جی نہ مانا۔ تانگہ والے کو شاہی محل کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

تانگہ والا۔ صاحب گیٹ پٹ کرتار ہا؟ آیا راہ پر؟

وہ۔ نہیں یہی راہ پر آجاتا تو مہاراناصاحب کے پاس کیوں چلتے؟

تانگہ والا۔ ہجار روپیہ ہار مانگتا ہو تو دے کیوں نہیں دیتے؟ افسر چھوٹے ہوں یا بڑے سبھی لالچی ہوتے ہیں۔

وہ۔ کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ انگریزوں میں اگر یہ برائیاں ہوتیں۔ تو اس ملک سے کب کے چلے گئے ہوتے۔ یوں انگریز بھی رشوت لیتے ہیں۔ دیوتا نہیں ہیں۔ پہلے پہلے جو انگریز یہاں آئے تھے وہ تو پورے ڈاکو تھے مگر اپنی سلطنت کا نقصان کر کے یہ لوگ کبھی اپنا فائدہ نہیں سوچتے۔ رشوت لیں گے تو اسی حالت میں جب سلطنت کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

نائیک رام خاموش ہو گئے۔ تانگہ شاہی محل کی طرف جا رہا تھا۔ راستہ میں کئی سڑکیں، کئی مدرسے کئی شفاخانے ملے۔ ان سب کے نام انگریزی تھے۔ یہانتک کہ ایک پارک ملا۔ وہ بھی کسی انگریز ایجنٹ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی شہر نہیں بلکہ انگریزوں کی بستی ہے۔ جب تانگہ محل کے سامنے پہنچا تو وہ سنگھ اتر پڑے۔ اور مہاراجا صاحب کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس گئے۔ وہ ایک انگریز تھا۔ وہ نے سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ مہاراجہ صاحب تو ابھی پوجا پر ہے۔ گیارہ بجے بیٹھا تھا۔ چار بجے اٹھے گا۔ کیا آپ لوگ اتنی دیر تک پوجا کیا کرتا ہے؟

وہ نے۔ ہمارے یہاں ایسے ایسے پوجا کرنے والے ہیں جو کئی کئی دنوں تک مراقبہ میں غرق رہتے ہیں۔ پوجا کا وہ حصہ جس میں پرماتما سے یا دیگر دیوتاؤں سے اپنی بھلائی کی استدعا کی جاتی ہے جلد ہی ختم ہو جاتی ہے لیکن وہ حصہ جس میں مراقبہ کے ذریعہ روح کو پاک بنایا جاتا ہے بہت بڑا ہوتا ہے۔

سیکرٹری۔ ہم جس راجہ کے ساتھ پہلے تھا۔ وہ سویرے سے دو بجے تک پوجا کرتا تھا۔ تب کھانا کھاتا تھا اور چار بجے سوتا تھا۔ پھر نو بجے پوجا پر بیٹھ جاتا تھا۔ اور دو بجے رات کو اٹھتا تھا۔ وہ سورج ڈوبنے کے وقت آدھ گھنٹہ کے لئے باہر نکلتا تھا۔ مگر اتنی لمبی پوجا تو میرے خیال میں بالکل غیر قدرتی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ نہ تو عبادت ہے اور نہ دل کی صفائی کا کام۔ بلکہ ایک قسم کا بیکاری ہے۔

وہ نے اسوقت اتنا پریشان ہو رہے تھے کہ انہوں نے اس طنز کا کوئی جواب نہ دیا۔ سوچنے لگے ــــ "اگر راجہ صاحب نے بھی صاف جواب دیا تو میرے لئے کیا کرنا مناسب ہوگا؟ ابھی اتنے بیگناہوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں۔ کہیں صوفیا نے خفیہ قتل کا کھیل شروع کر دیا تو وہ خون بھی میری گردن پر ہوگا۔" اس خیال سے وہ اتنے پریشان ہوئے کہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آرام کرسی پر لیٹ گئے اور آنکھیں بند کر لیں۔ یوں وہ روزانہ سندھیا کرتے تھے پر آج پہلی بار ایشور سے رحم کی پرارتھنا

کی۔ رات بھر کے جاگے۔ دن بھر کے تھکے تھے ہی۔ ایک جھپکی آگئی۔ جب آنکھیں کھلیں تو چار بج چکے تھے۔ سکرٹری سے پوچھا۔ اب تو ہز ہائنس پوجا پر سے اُٹھ گئے ہونگے۔

سیکرٹری۔ آپ نے تو ایک لمبو نیند لے لیا۔

یہ کہہ کر اس نے ٹیلی فون کے ذریعہ کہا۔ گنور وسنگھ ہز ہائینس سے ملنا چاہتے ہیں۔

ایک لمحہ میں جواب ملا۔ آنے دو۔

ونے سنگھ مہاراجہ کے دیوان خاص میں پہنچے۔ وہاں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف دیواروں پر دیوتاؤں کی تصویریں آویزاں تھیں۔ قالین کے فرش پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ مہاراجہ صاحب مسند پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے جسم پر صرف ایک ریشمی چادر تھی اور گلے میں ایک تلسی کی مالا۔ چہرہ پر نقرو غنا کا رنگ نمودار تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی بولے۔ آؤ جی۔ بہت دن لگا دئے۔ مسٹر کلارک کی مہم کا کچھ پتہ چلا؟

ونے۔ جی ہاں۔ بیر پال سنگھ کے گھر میں ہے۔ اور بڑے آرام سے۔ دراصل ابھی مسٹر کلارک سے اُس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ صرف منگنی ہوئی ہے۔ اُن کے پاس آنے پر راضی نہیں ہوتی ہے۔ کہتی ہے۔ میں یہیں بڑے آرام سے ہوں اور مجھے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

مہاراجہ۔ ہری ہری۔ یہ تم نے تو عجیب بات سُنائی۔ اُن کے پاس آتی ہی نہیں! سمجھ گیا۔ اُن سب نے بسی کرن کر دیا ہوگا۔ شیو شیو۔ ان کے پاس آتی ہی نہیں؟

ونے۔ اب خیال فرمائیے کہ وہ تو زندہ ہے اور آرام سے۔ اور یہاں ہم لوگ نے کتنے ہی بیگناہوں کو جیل میں ڈال دیا۔ کتنے ہی گھروں کو برباد کر دیا اور کتنے ہی کو جسمانی سزائیں دیں۔

مہاراجہ۔ شیو شیو۔ بڑا انرتھ (ظلم) ہُوا۔

ونے۔ غلطی سے ہم لوگوں نے غریبوں پر کیسے کیسے ظلم کئے کہ اُن کی بادہی سے

رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مہاراج بہت ٹھیک فرماتے ہیں۔ کہ بڑا اثر تھا ہُوا۔ جیوں ہی یہ بات لوگوں کو معلوم ہو جائے گی تو رعایا میں بڑا واویلا مچ جائے گا۔ اِس لئے اب یہی مناسب ہے کہ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کریں اور قیدیوں کو رہا کر دیں۔

مہاراجہ۔ ہری ہری۔ یہ کیسے ہوگا بیٹا۔ راجاؤں سے بھی کہیں غلطیاں ہوتی ہیں؟ شیو شیو۔ راجہ تو ایشور کا اوتار ہے۔ ہری ہری۔ وہ ایک بار جو کر دیتا ہے اُسے پھر نہیں مٹا سکتا۔ شیو شیو۔ راجہ کی بات نوشتۂ تقدیر ہے۔ وہ نہیں مٹ سکتا۔ شیو شیو۔

دتے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں جو نیک نامی و عزت ہے وہ ناانصافی و ظلم کو عرصہ تک قائم رکھنے میں نہیں ہے۔ راجاؤں کے لیے عفو ہی زیبا ہے۔ قیدیوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا جائے۔ جُرمانہ کے روپے لوٹا دئے جائیں اور جنہیں جسمانی سزائیں دی گئی ہیں اُنہیں انعام دے کر خوش کیا جائے۔ اِس سے آپ کا بڑا نام ہوگا۔ لوگ آپ کی تعریف کریں گے اور آپ کو دعائیں دیں گے۔

مہاراجہ۔ شیو شیو۔ بیٹا تم راج نیت (سیاست) کی باتیں نہیں جانتے۔ یہاں ایک قیدی بھی چھوڑا گیا اور ریاست پر ایک بلا نازل ہوئی۔ سرکار کہے گی۔ کہ میم کو نہ جانے کس نیت سے چھپائے ہوئے ہے۔ شاید اُس پر فریفتہ ہے۔ تبھی تو پہلے سزا کا سوانگ رچ کر اب باغیوں کو چھوڑے دیتا ہے۔ شیو شیو۔ ریاست خاک میں مل جائے گی۔ پاتال (تحت الثریٰ) کو چلی جائے گی۔ کوئی نہ پوچھے گا کہ یہ بات سچ ہے یا جھوٹ۔ کہیں بھی اس پر خیال نہ ہوگا۔ ہری ہری۔ ہماری حالت معمولی مجرموں سے بھی گئی گذری ہے۔ اُنہیں تو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ عدالت میں اُن پر کوئی قانونی دفعہ عائد کی جاتی ہے اور اُسی دفعہ کے مطابق اُنہیں سزا دی جاتی ہے۔ ہم سے کون صفائی لیتا ہے؟ ہمارے لئے کون سی عدالت ہے؟ ہری ہری۔ ہمارے لئے نہ کوئی قانون ہے۔ نہ کوئی دفعہ۔ جو جُرم چاہا لگا دیا۔ جو سزا چاہی دے دی۔ نہ کہیں اپیل ہے نہ نگرانی۔ راجے عیاش مشہور ہی ہیں۔ ان پر یہ الزام لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ کہا جائے گا کہ تم نے کلارک کی نہایت

حسین میم کو اپنے رلو اس میں چھپا لیا اور چھوٹ موٹ اڑا دیا کہ وہ گم ہو گئی۔ ہری ہری۔ شیو شیو۔ سُنتا ہوں۔ بڑی خوب صورت عورت ہے۔ چاند کا ٹکڑا ہے۔ پری ہے بیٹا۔ اس حالت میں مجھے کلنک نہ لگاؤ۔ صنعیفی کی عمر بھی ہمیں ایسے بُرے الزامات سے نہیں بچا سکتی۔ یہ مشہور ہی ہے کہ راجا لوگ کشتوں وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں اس لئے تمام عمر قوی و مضبوط بنے رہتے ہیں۔ شیو شیو! یہ راج نہیں ہے۔ اپنے اعمال کی سزا ہے۔ ٹکٹا جیا بُرے احوال! شیو شیو! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ سو پچاس بیگناہوں کا جیل میں پڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ وہاں بھی تو کھانا کپڑا ملتا ہی ہے۔ اب تو جیل خانوں کی حالت بہت اچھی ہے۔ نئے نئے کُرتے دئے جاتے ہیں۔ خوراک بھی عمدہ دی جاتی ہے۔ ہاں تمہاری خاطر اتنا کر سکتا ہوں کہ جن گھرانوں کا کوئی سرپرست نہ رہ گیا ہو یا جو جُرمانوں کے سبب سے مفلس و نادار ہو گئے ہوں۔ اُنہیں پوشیدہ طور سے کچھ مدد دی جائے۔ ہری ہری! تم ابھی کلارک کے پاس تو نہیں گئے تھے؟

دلنے۔ گیا تھا۔ وہیں سے تو آ رہا ہوں۔

مہاراجہ۔ (گھبرا کر) اُن سے یہ تو نہیں کہہ دیا کہ میم صاحب بڑے آرام سے ہیں اور آنے پر راضی نہیں ہیں؟

دلنے۔ یہ بھی کہہ دیا۔ چھپانے کی کوئی بات نہ تھی کسی طرح انہیں صبر تو ہو۔

مہاراجہ۔ (زانو پر ہاتھ ٹیک کر) چوپٹ کر دیا۔ ہری ہری! بالکل چوپٹ کر دیا شیو شیو! آگ تو لگا دی۔ اب میرے پاس کیوں آئے ہو؟ شیو شیو! کلارک کہے گا کہ قیدی قید میں بھی آرام سے ہے تو اس میں کچھ راز ضرور ہے۔ ضرور ہی کہے گا۔ ایسا کہنا قدرتی بات بھی ہے۔ میرے دن بُرے آ گئے شیو شیو! میں اس اعتراض کا کیا جواب دوں گا؟ بھگوان۔ تم نے بڑی مصیبت میں ڈال دیا۔ اسی کو کہتے ہیں لڑکپن کی عقل۔ وہاں نہ جانے کون سی خوشخبری سُنانے کو دوڑے تھے۔ پہلے رعایا کو بھڑکایا۔ ریاست میں آگ لگا دی۔ اب یہ دوسری چوٹ کی۔ نادان۔

تجھے کلارک سے کہنا چاہئے تھا کہ وہاں میم کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں۔ وہ طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں۔ اوہ۔ شیوشیلو!

دفعتاً پرائیویٹ سکرٹری نے ٹیلی فون میں کہا۔ مسٹر کلارک آ رہے ہیں۔

مہاراجہ نے کھڑے ہو کر کہا۔ آ گیا ملک الموت۔ آ گیا۔ کوئی ہے؟ کوٹ پتلون لاؤ۔ تم جاؤ ونے چلے جاؤ۔ ریاست سے چلے جاؤ۔ پھر مجھے منہ نہ دکھانا۔ جلدی پگڑی لاؤ۔ یہاں سے ارگالدان ہٹا دو۔

ونے کو آج راجہ سے نفرت ہو گئی۔ سوچا اتنی اخلاقی گراوٹ۔ اتنی بزدلی! یوں راج کرنے سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ وہ باہر نکلے تو نایک رام نے پوچھا۔ کیسی چھنی؟

ونے۔ ان کی تو مارے دہشت کے آپ ہی جان نکلی جاتی ہے۔ ایسا ڈرتے ہیں گویا مسٹر کلارک کوئی شیر ہیں اور انہیں آتے ہی آتے نگل جائیں گے۔ مجھ سے تو اس حالت میں ایک دن بھی نہ رہا جاتا۔

نایک رام۔ بھیا۔ میری تو اب صلاح ہے کہ گھر لوٹ چلو۔ اس جنجال میں کب تک جان کھپاؤ گے؟

ونے نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ پنڈا جی کون منہ لے کر گھر جاؤں؟ میں اب گھر جانے کے قابل نہیں رہا۔ ماتا جی میرا منہ نہ دیکھیں گی۔ آپا تھانوم کی خدمت کرنے جاتا ہوں سینکڑوں خاندانوں کو تباہ کر کے۔ میرے لئے تو اب ڈوب مرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ نہ گھر کا رہا نہ گھاٹ کا۔ میں سمجھ گیا نایک رام۔ مجھ سے کچھ نہ ہو گا۔ میرے ہاتھوں کسی کی بھلائی نہ ہو گی۔ میں زہر اپنے ہی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ میں سانپ ہوں جو کاٹنے کے سوا اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ جس کم بخت کو علاقہ کا علاقہ گالیاں دے رہا ہو جس کی بربادی کے لئے پوجا پاٹ کئے جا رہے ہوں۔ اُسے دُنیا پر بوجھ کی طرح رہنے کا کیا حق ہے؟ آج مجھ پر کتنے بیکسوں کا صبر پڑ رہا ہے۔ میری وجہ سے جتنا آنسو بہا ہے اُس

ہیں میں ڈوب سکتا ہوں۔ مجھے زندگی سے ڈر لگ رہا ہے جتنا ہی جیئوں گا اتنا ہی اپنے اوپر گناہوں کا بار چڑھاؤں گا۔ اس وقت اگر یکایک میری موت ہو جائے تو سمجھوں کہ ایشور نے مجھے بچا لیا۔

اس طرح رنج و پشیمانی میں ڈوبے ہوئے ونے اُس مکان میں پہنچے جو ریاست کی جانب سے انہیں قیام کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ ونے کو دیکھتے ہی نوکر چاکر دوڑے۔ کوئی پانی کھینچنے لگا۔ کوئی جھاڑو دینے لگا۔ کوئی برتن دھونے لگا۔ ونے تانگہ سے اُتر کر سیدھے دیوان خانہ میں گئے۔ اندر قدم رکھا ہی تھا کہ میز پر ایک بند لفافہ ملا۔ ونے کا دل دھڑکنے لگا۔ یہ رانی جانھوئی کا خط تھا۔ لفافہ کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔ کوئی ماں پردیس میں پڑے ہوئے اپنے بیمار بیٹے کا تار پا کر اتنی غمگین نہ ہوتی ہوگی۔ لفافہ ہاتھ میں لئے ہوئے سوچنے لگے۔ اس میں میری ملامت کے سوا اور کیا ہوگا؟ اندر دت نے جو کچھ زبانی کہا ہے۔ وہی بات زیادہ سخت الفاظ میں یہاں دوہرائی گئی ہوگی۔ لفافہ جیبوں کا تیوں رکھ دیا اور سوچنے لگے۔ اب کیا کرنا چاہیئے؟ کیوں نہ یہاں بازار میں کھڑے ہو کر عوام کو مطلع کر دوں۔ کہ دربار تمہارے ساتھ بے انصافی کر رہا ہے؟ لیکن اس وقت غمزدہ عوام کو مدد کی ضرورت ہے۔ روپیہ کہاں سے گئے؟ والد صاحب کو لکھوں کہ آپ اس وقت مجھے جتنے روپے بھیج سکیں بھیج دیجئے؟ روپے آجائیں تو یہاں یتیموں کو تقسیم کر دوں۔ نہیں۔ سب سے پہلے وائسرائے سے ملوں اور یہاں کی واقعی حالت اُن سے بیان کروں۔ ممکن ہے کہ وہ دربار پر دباؤ ڈال کر قیدیوں کو آزاد کرا دیں۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ اب مجھے سب کام چھوڑ کر وائسرائے سے ملنا چاہیئے۔

وہ سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔ لیکن رانی جی کے خط کی یاد سر پر لٹکتی برہنہ شمشیر کی طرح انہیں مضطرب کر رہی تھی۔ آخر اُن سے ضبط نہ ہو سکا۔ خط کھول کر پڑھنے لگے:۔

وہ نے آج سے کئی ماہ قبل میں تمہاری ماں ہونے پر فخر کرتی تھی۔ مگر آج تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ تم کیا تھے کیا ہو گئے! اور اگر یہی حالت رہی تو ابھی اور نہ جانے کیا ہو جاؤ گے! اگر میں جانتی کہ تم اسی طرح مجھے خفیف کرو گے تو آج تم اس دنیا میں نہ ہوتے۔ بیدرد! اس لئے تو نے میری کوکھ سے جنم لیا تھا؟ اس لئے میں نے تجھے اپنے دل کا خون پلا پلا کر پالا پوسا تھا؟ مصور جب کوئی تصویر بناتے بناتے دیکھتا ہے کہ اس سے میرے دلی جذبات کا انکشاف نہیں ہوتا تو وہ فوراً اُسے مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح میں تجھے بھی مٹا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے ہی تمہیں بنایا ہے۔ میں نے ہی تمہیں یہ جسم دیا ہے۔ روح کہیں سے آئی ہے۔ پر جسم میرا ہی ہے۔ میں اُسے تم سے واپس مانگتی ہوں۔ اگر تم میں اب بھی کچھ خودداری ہے تو میری امانت مجھے واپس کر دو۔ تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے رنج ہوتا ہے۔ جس کانٹے سے دل میں کسک ہو رہی ہے اُسے نکال سکوں تو کیوں نہ نکال ڈالوں؟ کیا تم میری یہ آخری خواہش پوری کرو گے؟ یا دیگر خواہشات کی طرح اسے بھی خاک میں ملا دو گے؟ میں تمہیں اب بھی اتنا بے غیرت نہیں سمجھتی ورنہ میں خود آتی اور تمہارے دل سے وہ چیز نکال لیتی جس نے تمہاری طبیعت کو بُرائی کی طرف مائل کر دیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے؟ وہ خودداری ہے۔ اگر تمہارے جیسے میرے سو لڑکے ہوتے تو میں ان سبوں کو اُس کے تحفظ کے لئے قربان کر دیتی! تم سمجھتے ہو گے میں غصہ سے پاگل ہو گئی ہوں۔ یہ غصہ نہیں ہے۔ اپنی دلی تکلیف کا رونا ہے جس ماں کے قلم سے ایسے بیدردانہ الفاظ نکلیں اُس کے غم یاسی اور ندامت کا اندازہ تم جیسا کمزور انسان نہیں کر سکتا۔ اب میں اور کچھ نہ لکھوں گی۔ تمہیں سمجھانا بے سود ہے۔ جب عمر بھر کی تعلیم رائیگاں گئی تو ایک خط کی تعلیم کا کیا اثر ہوگا۔ اب صرف دو تمنائیں ہیں۔ ایشور سے تو یہ کہ تم جیسی نالائق اولاد سا تویں دشمن کو بھی نہ دے اور تم سے یہ کہ اپنی زندگی کے اس بُرے کھیل کو ختم کرو۔

وہ نے یہ خط پڑھ کر روئے نہیں۔ ناراض نہیں ہوئے مغموم بھی نہیں ہوئے۔

اُن کی آنکھیں غرور سے چمک اٹھیں چہرہ پر جوش کی سُرخی نمودار ہوگئی جیسے کسی شاعر کی زبان سے اپنے آباواجداد کے بہادرانہ کارنامے سُن کر کسی منچلے راجپوت کا جوش اُمڈ اُٹھے۔ ماتا! تمہیں دھنیہ ہے! بہشت میں بیٹھی ہوئی بہادر راجپوتنیوں کی رُوحیں تمہاری معیار پسندی پر فخر کرتی ہوں گی۔ میں اب تک تمہاری لاثانی شجاعت سے واقف نہ تھا۔ تم نے بھارت کی قابل عورتوں کا سر اونچا کر دیا۔ دیوی! میں خود اپنے کو تمہارا بیٹا کہتے ہوئے شرمندہ ہوں۔ ہاں میں تمہارا بیٹا کہلانے کے قابل نہیں ہوں۔ تمہارے فیصلہ کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ اگر میرے قالب میں سو جانیں ہوتیں تو اُن سبوں کو تمہاری خودداری کے تحفظ کے لئے قربان کر دیتا۔ ابھی اتنا بے عزت نہیں ہوا ہوں لیکن یوں نہیں۔ میں تمہیں اتنا اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ تمہارا بیٹا جینا نہیں جانتا پر مرنا جانتا ہے۔ اب دیر کیوں؟ زندگی میں جو کچھ کرنا تھا وہ سب کر چکا۔ اُس کے ختم کر دینے کا اس سے بہتر اور کون موقع ہوگا۔ یہ سر صرف ایک بار تمہارے قدموں پر تڑپے گا۔ ممکن ہے کہ آخر وقت تمہارا پاک آشیرواد پا جاؤں۔ شاید تمہاری زبان سے یہ پاک الفاظ ادا ہو جائیں کہ تم سے ایسی ہی اُمید تھی۔ تو نے جینا نہ جانا۔ پر مرنا جانتا ہے۔ اگر مرتے وقت بھی تمہارے منہ سے "پیارے بیٹے" یہ دو الفاظ سُن سکا۔ تو میری روح مطمئن ہو جائے گی اور دوزخ میں بھی سُکھ چین سے رہ سکے گی۔ کاش البشور نے پر دئے ہوتے تو اُڑ کر تمہارے پاس پہنچ جاتا۔

دیوی نے باہر کی طرف دیکھا۔ سورج کسی غیرت کے مارے انسان کی طرح اپنا اُترا ہوا چہرہ پہاڑوں کی آڑ میں چھپا رہا تھا۔ نایک رام چارز انو بیٹھے ہوئے بھجن گھونٹ رہے تھے۔ یہ کام وہ خدمتگاروں سے نہیں لیتے تھے۔ کہتے "یہ بھی ایک پدیا ہے۔ کوئی بلدی دھنیا تو ہے نہیں کہ جو چاہے پیس دے۔ اس میں باتھی کھرچ کرنا پڑتی ہے۔ تب جاکر بوٹی بنتی ہے" کل نا نہ بھی ہو گیا تھا۔ محو ہو کر بھجن پیتے اور رامائن کی دو چار چوپائیاں جو یاد تھیں لے سے گاتے جاتے تھے۔ اتنے میں دیوی نے بُلایا۔

نایک رام ۔ کیا ہے بھیا؟ آج مجادار بُوٹی بن رہی ہے ۔ تم نے کبھی کہے کو پی ہوگی۔ آج تھوڑی سی لے لینا۔ ساری تھکاوٹ بھاگ جائے گی ۔

ونے ۔ اچھا۔ اس وقت بُوٹی رہنے دو۔ ناناجی کا خط آیا ہے۔ گھر چلنا ہے۔ ایک تانگہ ٹھیک کر لو۔

نایک رام ۔ بھیا۔ تمہارے تو سب کام جلدی کے ہوتے ہیں۔ گھر چلنا تو کل آرام سے چلیں گے۔ بُوٹی چھان کر رسوئی بناتا ہوں۔ تم نے بہت کا شمیری رسوئیوں کا بنا ہُوا بھوجن کھایا ہے۔ آج جرا میرے ہاتھ کے بھی بھوجن کا سُواد لو۔

ونے ۔ اب گھر پہنچ کر ہی تمہارے ہاتھ کے بھوجن کا سُواد لوں گا۔

نایک رام ۔ ناناجی نے بلایا ہوگا؟

ونے ۔ ہاں ۔ بہت جلد۔

نایک رام ۔ اچھا۔ بُوٹی تو تیار ہو جائے ۔ گاڑی تو نو بجے رات کو جاتی ہے ۔

ونے ۔ نو بجنے میں دیر نہیں ہے۔ سات تو بج ہی گئے ہوں گے ۔

نایک رام ۔ جب تک اسباب بندھواؤ۔ میں جلدی سے چھانے لیتا ہوں تقدیر میں اتنا سُکھ بھی نہیں لکھا ہے کہ بے پھکر ہو کر بُوٹی تو چھا نتا۔

ونے ۔ اسباب کچھ نہیں چلے گا۔ میں گھر سے کوئی اسباب لے کر نہیں آیا تھا۔ یہاں سے چلتے وقت گھر کی کنجی سردار صاحب کو دے دیتی ہوگی۔

نایک رام ۔ اور یہ سارا اسباب؟

ونے ۔ کہہ دیا کہ میں کچھ نہ لے جاؤں گا ۔

نایک رام ۔ بھیا تم کچھ نہ لو۔ پر میں تو یہ دوسالا اور یہ صندوق ضرور لوں گا ۔ جدھر سے دوسالا اُٹھ کر نکل جاؤں گا ۔ دیکھنے والے لوٹ جائیں گے ۔

ونے ۔ ایسی مہلک چیزیں لے کر کیا کرو گے جسے دیکھ کر ہی سُتھراؤ پڑ جائے ؟ یہاں کی کوئی چیز نہ چھُونا ۔ جاؤ۔

نایک رام بھاگ کو گستے ہوئے گھر سے نکلے تو گھنٹہ بھر تک گاڑی کا کرایہ

طے کرتے رہے۔ آخر جب یہ پیچیدہ مسئلہ کسی طرح حل نہ ہوا تو ایک کو جبراً پکڑ لائے۔ تانگہ والا بھنبھناتا ہوا آیا۔ "سب حاکم ہی حاکم تو ہیں۔ مُدا جنور کے پیٹ کو بھی تو کچھ ملنا چاہیئے۔ کوئی مائی کا لال یہ نہیں سوچتا کہ دن بھر تو بیگار میں مرے گا۔ کیا آپ کھائے گا۔ کیا جنور کو کھلائے گا۔ کیا بال بچوں کو دے گا؟ اُس پر نرکھ نامہ لکھ کر گلی گلی لٹکا دیا۔ بس تانگہ والے ہی سب کو لوے کھاتے ہیں اور تو جتنے عملے ملاحم ہیں۔ سب دودھ کے دھوئے ہوئے ہیں۔ بکچہ ڈھولے۔ بھیک مانگ کھائے پر تانگہ کبھی نہ چلائے۔

جیوں ہی تانگہ دروازہ پر آیا۔ دنے جاکر بیٹھ گئے لیکن نایک رام اپنی آدھ گھنٹی ٹوٹی کیونکر چھوڑتے؟ جلدی جلدی رگڑی۔ چھان کر پی۔ تمباکو کھائی۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر پگڑی باندھی۔ لوگوں سے رام رام کہی اور دوشالہ کو گرسنہ لگاہوں سے تکتے ہوئے باہر نکلے۔ تانگہ چلا۔ سردار صاحب کا گھر راستہ ہی میں تھا۔ وہاں جاکر نایک رام نے گنجی اُن کے دربان کے حوالہ کی اور آٹھ بجتے بجتے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ نایک رام نے سوچا۔ کہ راہ میں تو کچھ کھانے کو ملے ہی گا نہیں اور گاڑی پر کھانا کھائیں گے کیسے۔ دوڑ کر پوریاں لیں۔ پانی لائے اور کھانے بیٹھ گئے۔ دنے نے کہا ابھی میرا جی نہیں چاہتا۔ وہ کھڑے گاڑیوں کا ٹائم ٹیبل دیکھ رہے تھے کہ یہ گاڑی اجمیر کب پہنچے گی۔ اور دلی میں کون سی گاڑی ملے گی۔ یکایک کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بڑھیا روتی پیٹتی ہوئی چلی آرہی ہے اور دو تین آدمی اُسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ دنے سنگھ کے سامنے ہی آکر بیٹھ گئی۔ دنے نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُس کا لڑکا جسونت نگر کی جیل کا داروغہ تھا۔ اُسے دن دہاڑے کسی نے قتل کر ڈالا۔ ابھی خبر ملی ہے اور یہ بیچاری غمزدہ ماں یہاں سے جسونت نگر جا رہی ہے۔ موٹر والے کرایہ زیادہ مانگتے تھے۔ اس لئے ریل گاڑی سے جاتی ہے۔ راستہ میں اُتر کر بیل گاڑی کرلے گی۔ ایک ہی لڑکا تھا۔ بیچاری کو بیٹے کا منہ بھی دیکھنا بدا نہ تھا۔

دنے سنگھ کو بہت رنج ہوا۔ "داروغہ بڑا سیدھا سادہ آدمی تھا۔ قیدیوں پر

بڑی مہربانی کرتا تھا۔ اُس سے کسی کو کیا دشمنی ہو سکتی تھی؟ اُنہیں معاً شبہ ہوا کہ یہ بھی بیر پال سنگھ کی جماعت کی مجرمانہ کارروائی ہے۔ صوفیا نے خالی دھمکی نہ دی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے خفیہ قتل کے ذرائع جمع کر لئے ہیں۔ الیشور۔ میری بدعملیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ ان قتل کی وارداتوں کا عذاب بھی میری ہی گردن پر ہے۔ صوفیا کی گردن پر نہیں۔ صوفیا جیسی رحیم۔ عقیل۔ فرض شناس عورت نے میری ہی کمزوریوں سے متاثر ہو کر یہ خونریزی کا وطیرہ اختیار کیا ہے۔ الیشور کیا ابھی میری تکالیف اپنی انتہائی حد کو نہیں پہنچ گئیں؟ میں پھر صوفیا کے پاس جاؤں گا۔ ضرور جاؤں گا اور اُس کے قدموں پر سر رکھ کر مؤدبانہ عرض کروں گا۔ دیوی میں اپنے کئے کی سزا پا چکا۔ اب یہ کارروائیاں بند کر دو۔ ورنہ یہیں تمہارے سامنے جان دے دوں گا۔ لیکن صوفیا کو پاؤں کہاں؟ کون مجھے اُس قلعہ کے دشوار گزار راستہ پر لے جائے گا؟

جب گاڑی آئی تو ونے نے بڑھیا کو اپنے ہی پاس بٹھلایا۔ نایک رام دوسرے خانہ میں بیٹھے کیونکہ ونے کی موجودگی میں اُنہیں مسافروں سے آزادانہ گفتگو کرنے کا موقع نہ ملتا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ آج پولیس کے سپاہی ہر اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے نظر آتے تھے۔ دربار نے مسافروں کی حفاظت کے لئے یہ خاص انتظام کیا تھا۔ کسی اسٹیشن پر مسافر سوار ہوتے نظر نہ آتے تھے۔ باغیوں نے کئی جاگیرداروں کو لوٹ لیا تھا۔

پانچویں اسٹیشن سے تھوڑی ہی دُور پر گاڑی اچانک رُک گئی۔ وہاں کوئی اسٹیشن نہ تھا لائن کے نیچے کئی آدمیوں کی بات چیت سُنائی دی۔ پھر کسی نے دروازے کے کمرہ کا دروازہ کھولا۔ ونے نے پہلے تو آنے والے کو روکنا چاہا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اُن کی جمہوریت خود غرضی کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ یہ بھی شک ہوا کہ ڈاکو نہ ہوں۔ لیکن قریب جا کر دیکھا تو کسی عورت کے ہاتھ تھے۔ الگ ہٹ گئے اور ایک لمحہ میں ایک عورت گاڑی پر چڑھ آئی۔ ونے دیکھتے ہی پہچان گئے۔

وہ مس صوفیا تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی گاڑی پھر چلنے لگی۔

صوفیا نے گاڑی میں آتے ہی سونے کو دیکھا تو چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ جی میں آیا۔ گاڑی سے اتر جاؤں۔ مگر گاڑی چل چکی تھی۔ ایک لمحہ تک وہ ساکت کھڑی رہی۔ سونے کے ساتھ اس کی آنکھیں نہ اٹھتی تھیں۔ پھر اس بڑھیا کے پاس بیٹھ گئی اور کھڑکی کی طرف تاکنے لگی۔ تھوڑی دیر تک دونوں بت بنے بیٹھے رہے۔ کسی کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

بڑھیا نے صوفیا سے پوچھا۔ کہاں جاؤ گی بیٹی؟

صوفیا۔ بڑی دور جانا ہے۔

بڑھیا۔ یہاں کہاں سے آ رہی ہو؟

صوفیا۔ یہاں سے تھوڑی دور ایک گاؤں ہے۔ وہیں سے آتی ہوں۔

بڑھیا۔ تم نے گاڑی کھڑی کرا دی تھی کیا؟

صوفیا۔ اسٹیشنوں پر آج کل ڈاکے پڑ رہے ہیں۔ اسی لئے درمیان میں گاڑی رکوا لی۔

بڑھیا۔ تمہارے ساتھ اور کوئی نہیں ہے کیا؟ اکیلے کیسے جاؤ گی؟

صوفیا۔ آدمی نہ ہو تو ایشور تو ہے۔

بڑھیا۔ ایشور ہیں کہ نہیں۔ کون جانے؟ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ سنسار کا کرتا دھرتا کوئی نہیں ہے جبھی تو دن دہاڑے ڈاکے پڑتے ہیں۔ خون ہوتے ہیں۔ کل میرے بیٹے کو ڈاکوؤں نے مار ڈالا۔ (رو کر) گئو ہتھا گئو۔ کبھی مجھے جواب نہیں دیا۔ جیل کے قیدی اس کو دعائیں دیا کرتے تھے کہ بھلے مانس کو نہیں ستایا۔ اس پر یہ آفت آئی تو کیسے کہوں کہ کوئی ایشور ہے۔

صوفیا۔ کیا جیونت نگر کے جیلر آپ کے بیٹے تھے؟

بڑھیا۔ ہاں بیٹی۔ وہی ایک لڑکا تھا سو بھگوان نے ہر لیا۔

یہ کہہ کر بڑھیا سسکنے لگی۔ صوفیا کا چہرہ کسی مرتے ہوئے مریض کے چہرہ

کی طرح بے رونق ہو گیا۔ ذرا دیر تک وہ ضبط کئے ہوئے کھڑی رہی۔ پھر کھڑکی سے باہر سر نکال کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُس کا کمینہ انتقام ٹھوس شکل میں اُس کے سامنے تھا۔

صوفیا آدھ گھنٹہ تک منہ چھپائے روتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ اسٹیشن آ گیا جہاں بڑھیا اُترنا چاہتی تھی۔ جب وہ اُترنے لگی تو ونے نے اُس کا اسباب اُتارا اور اُسے تسلی دے کر رخصت کیا۔

ابھی ونے گاڑی میں بیٹھے بھی نہ تھے کہ صوفیا نیچے جا کر بڑھیا کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اور بولی۔ ماتا تمہارے بیٹے کا خون کرنے والی میں ہوں۔ جو سزا چاہو دو۔ تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔

بڑھیا نے حیرت سے کہا۔ کیا تو ہی وہ ڈائن ہے جس نے دربار سے لڑنے کے لئے ڈاکوؤں کو جمع کیا ہے؟ نہیں۔ تو نہیں ہو سکتی! تو تو مجھے رحم و مہربانی کی مورت سی نظر آتی ہے۔

صوفیا۔ ہاں ماتا۔ میں ہی وہ ڈائن ہوں!

بڑھیا۔ جیسا تو نے کیا ویسا تیرے آگے آئے گا۔ میں تجھے اور کیا کہوں؟ میری طرح تیرے دن بھی روتے ہی کٹیں۔

انجن نے سیٹی دی۔ صوفیا بیحس سی کھڑی تھی۔ وہاں سے ہلی تک نہیں۔ گاڑی چلی۔ صوفیا اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ دفعتاً ونے گاڑی سے کود پڑے۔ صوفیا کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اور آپ بھی بڑی مشکل سے گاڑی میں چڑھے۔ ایک لمحہ کی دیر ہوتی تو وہیں رہ جاتے۔

صوفیا نے معصوم لہجہ میں کہا۔ ونے تم میرے کہنے کا یقین کر دیا نہ کرو۔ میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے بیر پال کو ایک آدمی کے قتل کی بھی صلاح نہیں دی۔ میں اُس کی قاتلانہ رغبت کو روکنے کی حتے المکان کوشش کرتی رہی۔ مگر وہ اس وقت بدلہ لینے کی دُھن میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ کسی نے میری نہ سُنی۔ یہی سبب ہے کہ میں اب

یہاں سے جا رہی ہوں۔ میں نے اس رات کو ایک جنون کی سی حالت میں تم سے نہ جانے کیا کیا باتیں کیں۔ لیکن افسوس جانتا ہے کہ اس کا مجھے کتنا رنج و افسوس ہے۔ ٹھنڈے دل سے غور کرنے پر مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ ہمیشہ دوسروں کو مارنے اور دوسروں کے ہاتھوں مارے جانے کے لئے ہم سخت مصیبت کے وقت ہی آمادہ ہو سکتے ہیں۔ یہ حالت ہمیشہ نہیں قائم رہ سکتی۔ انسان فطرتاً امن پسند ہوتا ہے۔ پھر جب سرکاری تشدد نے کمزور رعایا کو انتقام لینے پر آمادہ کر دیا تو کیا طاقتور سرکار اس سے بھی زیادہ تشدد کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے گی؟ لیکن میں تم سے ایسی باتیں کر رہی ہوں گویا تم گھر ہی کے آدمی ہو۔ میں بھول گئی تھی کہ تم سرکاری ہوا خواہ ہو۔ مگر اتنی مہربانی کرنا کہ مجھے پولیس کے حوالہ نہ کر دینا۔ پولیس سے بچنے ہی کے لیے میں نے راستہ میں گاڑی ٹھہرا کر سوار ہونے کا بندوبست کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت بھی تم میری ہی تلاش میں ہو۔

ولنے سنگھ کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ ملامت آمیز لہجہ میں بولے صوفیا تمہیں اختیار ہے کہ مجھے جتنا کمینہ اور ذلیل سمجھو۔ مگر ایک دن آئے گا جب تمہیں ان باتوں پر پچھتانا پڑے گا اور تم سمجھو گی کہ تم نے مجھ پر کتنی زیادتی کی ہے۔ لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔ کیا گھر سے یہاں آنے کے قبل میرے گرفتار ہونے کی خبر پا کر تم نے بھی وہی وطیرہ اختیار نہ کیا تھا؟ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے دوسروں کو برباد کیا اور تم اپنے ہی کو برباد کرنے کے لئے تیار ہو گئیں۔ میں نے تمہارے طرز عمل کو قابل عفو سمجھا۔ وہ مصیبت کے وقت کا طرز عمل تھا۔ تم نے میرے طرز عمل کو معافی کے ناقابل سمجھا۔ اور سخت سے سخت چوٹ جو تم پہنچا سکتی تھیں اسے پہنچانے کی کوشش کی۔ لیکن بات ایک ہی ہے۔ مجھے پولیس کی مدد کرتے دیکھ کر تمہیں اتنا تعجب و افسوس نہ ہوا ہوگا جتنا مجھ کو تمہیں مسٹر کلارک کے ساتھ دیکھ کر ہوا۔ اس وقت بھی تم وہی انتقامی وطیرہ اختیار کر رہی ہو یا کم از کم تم مجھ سے ایسا کہہ چکی ہو۔ اتنے پر بھی تمہیں مجھ پر رحم نہیں آتا۔

تمہاری جھڑکیاں سن کر مجھے جتنا روحانی کوفت ہوئی ہے وہی میرے لئے کافی سے زیادہ ہے۔ اس میں تم نے اس وقت اور اضافہ کر دیا تبھی تم اپنی اس بیدردی پر خون کے آنسو بہاؤ گی۔ خیر۔

یہ کہتے کہتے ونے کا گلا بھر آیا۔ پھر وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔

صوفیا نے آنکھوں سے اپنی دلی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ آؤ اب ہمارا تمہارا میل ہو جائے۔ میری ان باتوں کو بھول جاؤ۔

ونے نے آواز کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ میں کچھ کہتا ہوں؟ اگر طبیعت آسودہ نہ ہوئی تو اور جو چاہے کہہ ڈالو۔ جب بُرے دن آتے ہیں تو کوئی سنتا نہیں ہوتا۔ تمہارے یہاں سے آکر میں نے قیدیوں کو آزاد کرانے کے لئے حکام سے سر کھپایا۔ یہاں تک کہ مہاراجا صاحب سے بھی جتنی منت سماجت کی وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مگر کسی نے میری بات تک نہ سنی۔ ہر طرف سے مایوس ہی ہونا پڑا۔

صوفیا۔ یہ تو میں جانتی تھی۔ اس وقت کہاں جا رہے ہو؟

ونے۔ جہنم کو۔

صوفیا۔ مجھے بھی لیتے چلو۔

ونے۔ تمہارے لئے بہشت ہے۔

ایک لمحہ بعد پھر بولے۔ گھر جا رہا ہوں۔ ماں جی نے بُلایا ہے مجھے دیکھنے کی خواہش مند ہیں۔

صوفیا۔ اندر دت تو کہتے تھے تم سے بہت ناراض ہیں۔

ونے نے جیب سے رانی صاحبہ کا خط نکال کر صوفیا کو دے دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ یہ تو مجھ اتنا کھینچ رہی ہے اور میں خواہ مخواہ اُس کی طرف دوڑا جاتا ہوں۔ دفعتاً صوفیا نے خط کو چاک کر کے کھڑکی کے باہر پھینک دیا اور فرطِ محبت سے بیقرار ہو کر بولی۔ "میں

تمہیں نہ جانے دوں گی۔ ایشور جانتا ہے۔ میں تمہیں نہ جانے دوں گی۔ تمہارے عوض میں خود ہی رانی جی کے پاس جاؤں گی۔ اور ان سے کہوں گی۔ تمہاری خطاوار میں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" یہ کہتے کہتے اس کا گلا بھر آیا۔ بول نہ سکی۔ دنے کے کندھے پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگی۔ آواز ہلکی ہوئی۔ تو پھر بولی ۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ نہ جاؤں گا۔ تم نہیں جا سکتے۔ نہ ہی آپ اور انصافاً تمہیں جا سکتے۔ بولو وعدہ کرتے ہو؟

اُن اشک آلود آنکھوں میں کتنی نرمی، کتنی التجا کتنی عاجزی۔ کتنی خدشہ تھی!

دنے نے کہا۔ نہیں صوفیا۔ مجھے جانے دو۔ تم مانا جی کو خوب جانتی ہو۔ میں نہ جاؤں گا۔ تو وہ اپنے دل میں مجھے بے عزت۔ بے حیا۔ بزدل سمجھیں گی۔ اور اس جنونانہ حالت میں وہ نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔

صوفیا۔ نہیں دنے مجھ پر اتنا ظلم نہ کرو۔ للہ رحم کرو۔ میں رانی جی کے پاس جا کر دوں گی۔ ان کے پیر پڑوں گی اور ان کے دل میں تمہاری طرف سے جو کدورت ہے اُسے اپنے آنسوؤں سے دھو ڈالوں گی۔ مجھے وعدہ ہے کہ میں اُن کی مامتا والے جذبات متحرک کر دوں گی۔ میں ان کے مزاج سے واقف ہوں۔ اُن کا دل دیا کا بھنڈار ہے۔ جس وقت میں ان کے قدموں پر سر رکھ کر کہوں گی۔ اماں تمہارا بیٹا میرا مالک ہے۔ میری خاطر اسے معاف کر دو۔" اس وقت وہ مجھے پیروں سے ٹھکرائیں گی نہیں۔ وہاں سے جھلائی ہوئی اُٹھ کر چلی جائیں گی لیکن ایک لمحہ بعد مجھے بلائیں گی اور محبت سے گلے لگائیں گی۔ میں ان سے تمہاری جان کی امان مانگوں گی۔ پھر تمہیں بھی مانگ لوں گی۔ ماں کا دل کبھی اتنا سخت نہیں ہو سکتا۔ وہ اس خط کو لکھ کر شاید اس وقت پچھتا رہی ہوں گی۔ منا رہی ہوں گی کہ خط نہ پہنچے۔ بولو۔ وعدہ کرو۔

ایسے محبت میں ڈوبے ہوئے الفاظ دنے کے کانوں نے کبھی نہ سنے تھے۔

ہیں اپنی زندگی بامعنی معلوم ہونے لگی۔ آہ۔ صوفیا اب بھی مجھے چاہتی ہے۔ اُس نے مجھے معاف کر دیا۔ وہ زندگی جو پہلے ریگستان کی طرح بے آب غیر آباد اور سنسان تھی اب وحشی و بیلوں، چشموں اور نہروں بیل بوٹوں اور پودوں سے معمور ہو کر ایک دلکشی کا مرقع بن گئی۔ خوشی کے دروازے کھل گئے تھے اور اُس کے اندر سے میٹھے گیتوں کی تان، برقی بتیوں کی روشنی۔ ہوائے معطر کی خوشبو باہر نکل نکل کر دل کو جبراً اپنی طرف کھینچنے لگیں۔ وِنے سنگھ کو اس منظرِ دلفریب نے بالکل وارفتہ بنا دیا۔ اصل میں زندگی کا سکھ زندگی کا دُکھ ہے۔ ترکِ تعلق اور دلی کلفت زندگی کے لیے قابلِ قدر جواہر ہیں۔ ہماری پاک خواہش۔ ہماری بے لوث خدمات۔ ہمارے نیک ارادے۔ سبھی ہماری کشتِ غم کی پیداوار ہیں۔

وِنے نے نوش کھلاتے ہوئے کہا۔ صوفیا۔ ماتا جی کے پاس ایک بار مجھے جانے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب تک وہ کچھ صاف طور پر نہ کہیں گی میں۔۔۔۔

صوفیا نے وِنے کی گردن میں ہاتھوں کو حمائل کرتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں۔ مجھے تم پر اعتماد نہیں ہے۔ تم تنہا اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ تم میں ہمت ہے خودداری ہے مروّت ہے سب کچھ ہے پر صبر نہیں۔ پہلے میں اپنے لیے تمہیں ضروری سمجھتی تھی۔ اب تمہارے لیے اپنے کو ضروری سمجھتی ہوں۔ وِنے نرمی کی طرف کیوں تاکتے ہو؟ میری طرف دیکھو! میں نے تمہیں جو سخت الفاظ کہے اُس پر نادم ہوں۔ خدا گواہ ہے۔ سچے دل سے نادم ہوں۔ اُن باتوں کو بھول جاؤ۔ محبت میں جتنی معیار پسندی ہوتی ہے اُتنا ہی عفو بھی ہوتا ہے۔ بولو۔ وعدہ کرو۔ اگر تم مجھ سے گلا چھڑا کر چلے جاؤ گے تو پھر۔۔۔۔ تمہیں صوفیا نہ ملے گی۔

وِنے نے محبت کے جوش میں آکر کہا۔ تمہاری مرضی ہے تو نہ جاؤں گا۔

صوفیا۔ تو ہم اگلے سٹیشن پر اُتر پڑیں گے۔

وِنے۔ نہیں۔ پہلے بنارس چلیں۔ تم ماتا جی کے پاس جانا۔ اگر وہ مجھے معاف کر دیں گی

**صوفیا۔** دنے ابھی بنارس نہ چلو۔ ذرا دل کو سکون ہونے دو۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہونے دو۔ پھر رانی جی کا تم پر کیا اختیار ہے؟ تم میرے ہو۔ اُن سبھی قاعدوں کے مطابق جنہیں خدا اور انسان نے بنایا ہے۔ تم میرے ہو۔ میں رعایت نہیں اپنا حق چاہتی ہوں۔ ہم اگلے اسٹیشن پر اُتر پڑیں گے۔ اس کے بعد سوچیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ کہاں جانا ہے؟

**دنے** نے لجاتے ہوئے کہا۔ "مگر سبر کیسے ہوگا؟ میرے پاس جو کچھ ہے وہ نائیک رام کے پاس ہے۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں ہے۔ اگر اُسے خبر ہو گئی۔ تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا۔"

**صوفیا۔** اُس کی کیا پروا ہے؟ نائیک رام کو جانے دو۔ محبت جنگلوں میں بھی سکھی رہ سکتی ہے۔

اندھیری رات میں گاڑی کوہ و بیابان کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ باہر دوڑتی ہوئی کوہستانی قطاروں کے سوا اور کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ دونے تاروں کی دوڑ دیکھ رہے تھے۔ صوفیا دیکھ رہی تھی کہ آس پاس کوئی گاؤں ہے یا نہیں۔

اتنے میں اسٹیشن نظر آیا۔ صوفیا نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اور دونوں چھکے سے اتر پڑے جیسے چڑیوں کا جوڑا گھونسلے سے دانہ کی کھوج میں اُڑ چلے۔ اُنہیں اس کی فکر نہیں کہ آگے صیاد بھی ہے۔ شکاری چڑیاں بھی ہیں اور کسان کی غلیل بھی ہے۔ اُس وقت تو دونوں اپنے خیالات میں مگن ہیں۔ دور سے لہراتے ہوئے کھیتوں کی بہار دیکھ رہے ہیں۔ مگر وہاں تک پہنچنا بھی اُن کے نصیبوں میں ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

## (۳۶)

مسٹر جان سیبوک نے طاہر علی کی محنت اور ایمانداری سے خوش ہو کر کھالوں پر کچھ کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ اس سے اب اُن کی آمدنی میں معقول اضافہ ہو

گیا تھا جس سے بل کے مزدوروں پر اُن کا رعب تھا اور اور سیر تیز اور نے درجہ کے کلرک بھی ان کا کافی لحاظ کرتے تھے۔ لیکن آمدنی میں ترقی ہونے کے ساتھ ہی ان کے اخراجات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ جب یہاں اُن کے مساوی درجہ کے لوگ نہ ملتے تو وہ پھٹے پرانے کپڑوں پر ہی بسر کر لیا کرتے۔ خود ہی بازار سے سودا خرید لاتے اور کبھی کبھی تو پانی بھی بھر لیتے تھے۔ کوئی ہنسنے والا نہ تھا۔ اب بل کے ملازموں کے سامنے انہیں زیادہ سان سے رہنا پڑتا تھا اور کوئی موٹا کام اپنے ہاتھ سے کرتے شرم معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے انہوں نے مجبوراً ایک بڑھیا ملازمہ رکھ لی تھی۔ پان الائچی وغیرہ کا خرچ پہلے سے کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ [illegible] دوستوں کی دعوت بھی کرنی پڑتی تھی۔ تنہا رہنے والے سے کوئی دعوتوں کا خواہش مند نہیں ہوتا۔ جانتا ہے کہ اس طرح دعوت [illegible] لیکن عیالدار لوگوں کے لئے تو کوئی عذر نہیں سمجھا جاتا۔ کہا۔ خاں صاحب آج ذرا زردہ پکوائیے۔ روٹی دال کھاتے کھاتے زبان موٹی پڑ گئی۔ اس کے جواب میں خانصاحب حاضر علی کو کہنا ہی پڑتا۔ ہاں ہاں بیٹے۔ آج ہی پکواتا ہوں۔ کبھی ایک ہی وقت ہوتی تو اس کی بیماری کا حیلہ کر کے ٹالنے کی کوشش کرتے۔ مگر یہاں تو گھر میں ایک کیا بائیس تین عورتیں تھیں۔ پھر اس کے علاوہ طاہر علی دل کے چھوٹے نہ تھے۔ انہیں کھلانے پلانے کا شوق تھا اور دوستوں کی خاطر مدارت میں اُن کو خاص لطف آتا۔ خلاصہ یہ کہ ضرورت کے بناء میں اُن کی کھایہ بگڑی جاتی تھی۔ بازار میں تو اب اُن کا دمڑی کا اعتبار نہ تھا۔ وہ نامہند مشہور ہو گئے تھے۔ یہاں وہ تو نہیں کوئی چیز بھی ادھار نہ ملتی۔ دوستوں سے دستگردوں سے قرض لے کر کام چلایا کرتے۔ بازار والوں نے نا اُمید ہو کر تقاضا کرنا چھوڑ دیا۔ سمجھ گئے کہ اس کے پاس ہی نہیں ہے دے گا کہاں سے۔ تحریری قرض جان دار اور غیر فانی ہوتا ہے۔ [illegible] قرض بے جان اور فانی۔ ایک عربی گھوڑا ہے بوجھ نہیں برداشت کر سکتا۔ یا تو سوار کا خاتمہ کر دے گا یا اپنا۔ دوسرا

لنڈورا ٹٹو ہے جسے اُس کے سپر نہیں بلکہ کوڑے چلاتے ہیں۔ کوڑا لوٹا یا سوار کا ہاتھ رُکا اور ٹٹو بیٹھا۔ پھر نہیں اُٹھ سکتا۔

لیکن اگر صرف دوستوں کی خاطر مدارات ہی تک بات ہوتی تو شاید طاہر علی کسی طرح کھینچ تان کر جُوں بٹھانے میں کامیاب ہوتے۔ مصیبت یہ تھی کہ اُن کے چھوٹے بھائی ماہر علی ان دنوں مراد آباد کے پولیس ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گئے تھے۔ تنخواہ پاتے ہی اُس کا نصف حصہ آنکھیں بند کر کے مراد آباد بھیج دینا پڑتا تھا۔ طاہر علی خرچ سے ڈرتے تھے۔ مگر اُن کی دونوں ماؤں نے طعنے دے دے کر انہیں گھر میں رہنا مشکل کر دیا تھا۔ دونوں ہی کی یہ دلی تمنا تھی کہ ماہر علی پولیس میں ملازم ہو کر داروغہ بنے۔ بیچارے طاہر علی مہینوں تک حکام کے بنگلوں کی خاک چھانتے رہے۔ یہاں جا وہاں جا۔ انہیں ڈالی دے۔ انہیں نذرانہ پیش کر۔ اونہوں سفارش لا۔ ان کی چھٹی منگا۔ بالآخر مسٹر جان سبروک کی سفارش کام کر گئی۔ یہ سب مرحلے طے ہو گئے۔ آخری مرحلہ ڈاکٹری معائنہ تھا۔ یہاں سفارش اور خوشامد کا گزر نہ تھا۔ پینتیس روپے سول سرجن کے لیے سولہ روپے اسسٹنٹ سرجن اور آٹھ روپے کلرک اور چپڑاسیوں کے لیے کل چھپن روپے کی میزان کی۔ یہ رقم کہاں سے آئے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر طاہر علی کلثوم کے پاس آئے اور بولے۔ تمہارے پاس کوئی زیور ہو تو دے دو۔ میں بہت جلد چھڑا دوں گا۔ اس نے تنگ کے صندوقچہ ان کے سامنے ٹپک دیا اور کہا یہاں زیوروں کی ہوس نہیں ہے۔ سب آس پوری ہو چکی۔ روٹی دال مل جائے یہی غنیمت ہے۔ تمہارے گہنے تمہارے آگے ہیں۔ جو چاہے کرو — طاہر علی کچھ دیر تک تو شرم سے سر نہ اُٹھا سکے۔ پھر صندوقچہ کی طرف دیکھا۔ ایسی ایک بھی چیز نہ تھی جس سے اُس کی چوتھائی رقم بھی مل سکتی۔ ہاں تمام زیورات سے کام چل سکتا تھا۔ شرماتے ہوئے کل چیزیں نکال کر رومال میں باندھیں اور باہر آ کر اسی فکر میں بیٹھے ہی تھے۔ کہ انہیں کیونکر لے جاؤں کہ اتنے میں خادمہ آئی۔ طاہر علی کو سوجھی کہ کیوں نہ اس

کے معرفت روپے منگواؤں۔ مامائیں ان کاموں میں مشاق ہوتی ہیں۔ خیر چپکے سے بلا کر اُس سے یہ بات کہی۔ بڑھیا نے کہا ــــ میاں یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چیز تو رکھنی ہے کوئی کسی سے خیرات مانگتے ہیں۔ میں روپے لا دوں گی۔ آپ مطمئن رہیں۔ خادمہ گہنوں کی پوٹلی لے کر چلی تو زینب نے دیکھا۔ بلا کر بولیں۔ تو کہاں لئے لئے پھرے گی؟ میں روپے منگوائے دیتی ہوں۔ اُن کا ایک دوست مہاجنی کا کام کرتا ہے مامانے پوٹلی اُسے دے دی۔ دو گھنٹہ بعد اپنے پاس سے چھپن روپے نکال کر دئے۔ اس طرح یہ مشکل مسئلہ حل ہوا۔ ماہر علی مراد آباد گئے اور جب سے وہیں تعلیم پا رہے تھے۔ تنخواہ کا نصف حصہ وہاں چلے جانے کے بعد بقیہ نصف حصہ میں گھر کا خرچ بڑی مشکل سے پورا پڑتا۔ کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی۔ اُدھر ماہر علی نصف ہی پر قناعت نہ کرتے۔ کبھی لکھتے کہ کپڑوں کے لئے روپے بھیجے۔ کبھی بٹیر لڑانے کے لئے سوٹ کی فرمائش کرتے۔ طاہر علی کو کمیشن کے روپوں سے بھی کچھ نہ کچھ وہاں بھیج دینا پڑتا تھا۔

ایک روز تمام رات فاقہ کرنے کے بعد علی الصباح زینب نے آکر کہا۔ آج روپوں کی کچھ فکر کی یا آج بھی روزہ رہے گا؟

طاہر علی نے چڑھ کر کہا۔ میں اب کہاں سے لاؤں؟ تمہارے سامنے ہی کمیشن کے روپے مراد آباد نہیں بھیجے گئے تھے؟ بار بار لکھتا ہوں کہ کفایت سے خرچ کرو۔ میں بہت تنگ ہوں۔ لیکن وہ حضرت فرماتے ہیں کہ یہاں ہر ایک لڑکا گھر سے سینکڑوں روپے منگواتا ہے اور بیدریغ خرچ کرتا ہے۔ اس سے زیادہ کفایت کرنا میرے امکان میں نہیں۔ جب اُدھر کا یہ حال ہے اور کا یہ حال تو روپے کہاں سے لاؤں؟ دوستوں میں بھی تو کوئی ایسا نہیں بچا جس سے کچھ مانگ سکوں۔

زینب سُنتی ہو رقیہ اُن کی باتیں؟ لڑکے کو خرچ کیا دے رہے ہیں گویا میرے اوپر کوئی احسان کر رہے ہیں۔ سمجھے کیا تم اُسے خرچ بھیجو یا بُلاؤ۔ اُس کے

وہاں پڑھنے سے یہاں پیٹ تھوڑا ہی بھر جائے گا۔ تمہارا بھائی ہے پڑھاؤ یا نہ پڑھاؤ۔ مجھ پر کیا احسان؟

طاہر علی۔ تو تمہیں بتاؤ۔ روپے کہاں سے لاؤں؟

زینب۔ مردوں کے ہزار ہاتھ ہوتے ہیں۔ تمہارے ابا جان دس ہی روپے پاتے تھے کہ زیادہ؟ بیس تو سنے کے کچھ دن پہلے ہو گئے تھے۔ آخر کنبہ کی پرورش کرتے تھے کہ نہیں؟ کبھی فاقوں کی نوبت نہیں آئی۔ موٹا مہینہ دن میں دو بار ضرور میسر ہو جاتا تھا۔ تمہاری تعلیم ہوئی۔ شادی ہوئی۔ کپڑے وغیرہ بھی آتے تھے۔ اللہ کے فضل سے بساط کے مطابق کھٹے بھی بنتے تھے۔ وہ تو مجھ سے کبھی نہ پوچھتے تھے۔ کہاں سے روپے لاؤں؟ آخر کہیں سے لاتے ہی تو تھے۔

طاہر علی۔ پولیس کے محکمہ میں ہر طرح کی گنجائش ہوتی ہے یہاں کیا ہے؟ گنتی کی بوٹیاں۔ نپا شوربا۔

زینب۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو دکھا دیتی کہ اسی نوکری میں کیسے سونا برستا ہے۔ سینکڑوں چمار ہیں۔ کیا کہو تو ایک ایک گٹھا لکڑی کا نہ لائیں؟ سبزوں کے یہاں مچھان چھپر پر نرکا۔ یاں لگی ہوں گی۔ کیوں نہیں توڑو منگاتے؟ کھالہ کی قیمت میں بھی کمی بیشی کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔ کوئی یہاں بیٹھا دیکھ نہیں رہا ہے۔ دس کے پورے دس لکھ دو تو کیا ہرج ہو؟ روپوں کی رسیدوں پر انگوٹھے کا نشان ہی نہ بنواتے ہو۔ نشان پکارنے جاتا ہے کہ میں دس ہوں یا پورے دس؟ پھر اب تمہارا اعتبار جم گیا۔ صاحب کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ آخر اس اعتبار سے کچھ اپنا فائدہ بھی تو ہو کہ ساری عمر دوسروں ہی کا پیٹ بھرتے رہو گے؟ اس وقت بھی تمہاری کوٹھی میں سینکڑوں روپے ہوں گے۔ جتنی ضرورت سمجھو اس وقت نکال لو۔ جب ہاتھ میں روپے آئیں تو رکھ دینا۔ روزانہ آمدنی خرچ کا میزان ہی ملنا چاہئے نا؟ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ آج کھال کا دام نہ دیا۔ کل دیا۔ اس میں کیا تردد ہے۔ چمار کہیں فریاد کرنے نہ جائے گا۔ سبھی ایسا

کرتے ہیں اور اسی طرح دنیا کا کام چلتا ہے۔ ایمان درست رکھنا ہو تو انسان کو چاہئے کہ فقیر ہو جائے۔

رقیہ۔ بہن ایمان ہے کہاں؟ دنیا کا کام تو اسی طرح چلتا ہے۔

طاہر علی۔ بھئی جو لوگ کرتے ہیں۔ وہ جانیں۔ میری تو ان ہتھکنڈوں سے روح فنا ہوتی ہے۔ امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔ آخر خدا کو بھی تو منہ دکھانا ہے۔ جیسی بھی اُس کی مرضی ہو۔ رزق رکھے یا مار ڈالے۔

زینب۔ واہ رے مرد ہونے۔ قربان جاؤں تیرے ایمان پر۔ ہمارا ایمان سلامت رہے پیٹ کے گھر والے بھوکوں مر جائیں۔ تمہاری مشکل ہی ہے کہ یہ سب مصیبتیں کالکے لگا کر کیوں نکل جائیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ مگر تو دنیا کو اپنے بیوی بچوں کی ہوتی ہے۔ اُن کے لئے بازار موجود ہی ہے۔ فاقہ تو ہمارے لئے ہے۔ اُن کا دین تو محض نمائش ہے۔

طاہر علی نے اس الزام بیجا پر مغموم ہو کر کہا۔ کیوں جلاتی ہو بی جان؟ خدا گواہ ہے جو بچے کے لئے دھیلے کی بھی کوئی چیز لی ہو۔ میری نیت تو کبھی ایسی نہ تھی نہ ہے اور نہ ہو گی۔ یوں تمہاری طبیعت ہے جو چاہے سمجھو۔

رقیہ۔ دونوں بچے رات بھر تڑپتے رہے "اماں روٹی۔ اماں روٹی" پوچھو اماں کیا آپ روٹی بن جائے۔ تمہارے بچے اور نہیں تو اور سیر کے گھر چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کچھ کھا پی آتے ہیں۔ یہاں تو میری جان ہی کھاتے ہیں۔

زینب۔ اپنے بال بچوں کو کھلانے نہ کھلانے کا تمہیں اختیار ہے۔ کوئی تمہارا حساب لینے والا تو ہے نہیں۔ خواہ مردہ کھلاؤ خواہ بھوکا رکھو۔ ہمارے بچوں کو تو گھر کی رُوکھی سُوکھی روٹیوں کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔ یہاں کوئی دلی نہیں ہے جو فاقوں سے رندہ رہے۔ جا کر کچھ انتظام کرو۔

طاہر علی باہر آ کر بڑی دیر تک متفکر کھڑے رہے۔ آج پہلی مرتبہ انہوں نے امانت کے روپوں کو ہاتھ لگانے کی جرأت کی۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی کھڑا

تو نہیں ہے۔ پھر بہت آہستگی کے ساتھ آہنی صندوق کو کھولا۔ یوں دن میں سینکڑوں بار وہ صندوق کھولتے اور بند کرتے تھے مگر اس وقت اُن کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔ آخر انہوں نے روپے نکال لئے۔ پھر صندوق کو بند کر دیا۔ روپے لاکر زینب کے سامنے پھینک دئے اور بغیر کچھ کہے باہر چلے گئے۔ اپنے دل کو یوں سمجھایا۔ "اگر خدا کو منظور ہوتا کہ میرا ایمان سلامت رہے تو کیوں اتنے آدمیوں کا بوجھ میرے سر پر ڈالتا۔ یہ بوجھ سر پر رکھا تھا تو اُس کے اُٹھانے کی طاقت بھی تو دینی چاہئے تھی۔ میں زور زبردستی کر سکتا ہوں پر دوسروں کو تو مجبور نہیں کر سکتا۔ اگر اس مجبوری کی حالت میں خدا مجھے سزا کے قابل سمجھے تو وہ منصف ہی نہیں ہے۔" اس دلیل سے انہیں کچھ تسکین ہوئی۔ لیکن مسٹر جان سیبوک تو اس دلیل سے مان جانے والے آدمی نہ تھے۔ طاہر علی سوچنے لگے۔ کون چمار سب سے موٹا ہے جسے آج روپے نہ دوں تو چیں بجبیں نہ کرے۔ نہیں موٹے آدمی کے روپے روکنا مناسب نہیں کیونکہ وہ زبردست ہوتے ہیں۔ جو سب سے غریب سب سے سیدھا ہو اُسی کے روپے روکنا چاہئے۔ اس میں کوئی خوف نہیں ہے۔ چپکے سے بُلا کر انگوٹھے کا نشان بنوالوں گا۔ اس کی ہمت ہی نہ پڑے گی کہ کسی سے کہے۔ اُس دن سے انہیں جب ضرورت پڑتی تحویل سے روپے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔ رفتہ رفتہ روپوں کو پورا کر دینے کا خیال کم ہونے لگا۔ تحویل کے روپوں میں کمی واقع ہونے لگی۔ دل مضبوط ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ چھٹا مہینہ گزرتے گزرتے وہ تحویل کے پورے ڈیڑھ سو روپے صرف کر چکے تھے۔

اب طاہر علی کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی کہ کہیں راز فاش نہ ہو جائے۔ چماروں سے خوشامد آمیز باتیں کرتے کوئی ایسی تدبیر سوچ نکالنا چاہتے تھے کہ تحویل میں ان روپوں کا پتہ نہ چلے۔ لیکن بہی کھاتہ میں ردّ و بدل کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ گھر میں بھی کسی سے یہ بات نہ کہتے۔ بس خدا سے یہی دعا کرتے کہ ماہر علی آجائیں۔ انہیں سو روپے ماہوار ملیں گے دو ماہ میں ادا کر دوں گا۔ اتنے دن

صاحب حساب کی جانچ نہ کریں تو پھر بیڑا پار ہے۔

انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ اب کچھ ہی ہو مگر اور روپے نہ نکالوں گا لیکن ساتویں مہینہ پھر پچیس روپے نکالنے پڑے۔ اب ماہر علی کا سال بھی پورا ہونے کو تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کی اور کسر تھی۔ سوچا آخر مجھے اسی کی بدولت تو یہ زیر باری ہو رہی ہے۔ جیوں ہی آیا۔ میں نے گھر اُسے سونپا۔ کہہ دوں گا۔ "بھائی! اتنے دنوں تک میں نے سنبھالا۔ جو کچھ بن پڑا تمہاری تعلیم میں صرف کیا۔ تمہیں برسر روزگار کر دیا۔ اب کچھ دنوں کے لئے مجھے اس فکر سے نجات دو۔" اُس کے آنے تک یہ پردہ ڈھکا رہ جائے تو پھر دُم جھاڑ کر نکل بھاگوں گا۔

پہلے وہ ایسی ہی کوئی ضرورت پڑنے پر صاحب کے یہاں جاتے تھے۔ اب دن میں ایک بار اُن سے ضرور ہی ملتے۔ ملاقاتوں سے اُن کے شک کو دبا ہوا رکھنا چاہتے تھے۔ جس چیز سے ٹکر لینے کا خوف ہوتا ہے اُس سے ہم اور بھی زیادہ چمٹ جاتے ہیں۔ کلثوم ان سے بار بار پوچھتی کہ آج کل تم اتنے روپے کہاں پا جاتے ہو؟ سمجھاتی۔ "دیکھو نیت خراب نہ کرنا۔ تکلیف اور تنگی سے بسر کرنا اتنا بُرا نہیں ہے جتنا خدا کے سامنے گنہگار بننا۔" لیکن طاہر علی اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اُسے بہلا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح کو طاہر علی نماز سے فارغ ہو کر دفتر میں آئے تو دیکھا کہ ایک چمار کھڑا رو رہا ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ بولا۔ "کیا بتاؤں کھاں صاحب۔ رات گھر والی گجر گئی۔ اب اُس کا کریا کرم کرنا ہے۔ میرا جو کچھ حساب ہو دے دیجئے۔ دوڑا ہوا آیا ہوں۔ کفن کے لئے بھی روپیہ پاس نہیں ہے۔" طاہر علی کی تحویل میں روپے کم تھے۔ کل اسٹیشن سے مال روانہ کیا تھا۔ محصول ادا کرنے میں روپے خرچ ہو گئے تھے۔ آج صاحب کے سامنے حساب پیش کر کے روپیہ لانے والے تھے۔ انہیں اس چمار کو کئی کھالوں کی قیمت دینی تھی۔ کوئی بہانہ نہ کر سکتے۔ کچھ روپے لا کر اُسے دئے۔

چمار نے کہا۔ ہجور۔ اتنے میں تو کچھ بھی پورا نہ ہوگا۔ مرنے والی اب پھر سے تو آئے گی نہیں۔ اس کا کریا کرم تو دل کھول کر کر دوں۔ میرے جتنے روپے آتے ہیں۔ سب دے دیجئے۔ یہاں تو جب تک دس بوتل وارو نہ ہوگی۔ لہاس (لاش) دروجے سے نہ اٹھے گی۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت روپے نہیں ہیں۔ پھر لے جانا۔

چمار۔ واہ کھاں صاحب واہ۔ انگوٹھے کا نشان کرائے تو مہینوں ہو گئے۔ اب کہتے ہو پھر لے جانا۔ اس بھکت نہ دو گے تو کیا میرے مرنے پر دو گے؟ چاہئے تو یہ تھا کہ اپنی طرف سے کچھ مدد کرتے۔ اُلٹے میرے ہی روپے باقی رکھتے ہو۔

طاہر علی کچھ روپے اور لائے۔ چمار نے سب روپے زمین پر پٹک دئے۔ اور بولا۔ آپ ٹھوک سے چوہیا چلاتے ہیں! میں آپ سے اُدھار نہیں مانگتا۔ خیرات نہیں مانگتا۔ اپنے روپے مانگتا ہوں اور آپ یہ کٹوسی کر رہے ہیں مانو گھر سے دے رہے ہوں۔

طاہر علی نے کہا۔ اس وقت اس سے زیادہ ممکن نہیں۔

چمار تھا تو سیدھا مگر اُسے کچھ شبہ ہو گیا۔ وہ گرم ہو پڑا۔ اتفاقاً اُسی وقت مسٹر جان سیوک بھی آپہنچے۔ وہ آج بہت جھلائے ہوئے تھے۔ پربھو سیوک کی کجروی نے اُنہیں بے قابو سا کر دیا تھا۔ اُنہوں نے یہ جھگڑا دیکھا تو تیز ہو بولے اس کے روپے کیوں نہیں دے دیتے؟ میں نے آپ سے تاکید کر دی تھی کہ سب آدمیوں کا حساب روز مرہ صاف کرا دیا کیجئے۔ آپ کیوں باقی رکھتے ہیں؟ کیا آپ کی تحویل میں روپے نہیں ہیں؟

طاہر علی روپے لانے چلے تو کچھ ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ صاحب کو فوراً شک ہو گیا۔ اُنہوں نے رجسٹر اٹھا لیا اور حساب دیکھنے لگے۔ حساب صاف تھا۔ اس چمار کے روپے ادا ہو چکے تھے۔ اس کے انگوٹھے کا نشان موجود تھا۔ پھر یہ بقایا کیسا؟ اتنے میں اور کئی چمار آ گئے۔ اس چمار کو روپے لے جاتے

دیکھا تو سمجھے آج حساب صاف کیا جا رہا ہے۔ بولے ۔ سرکار ہمارا بھی بل جائے
صاحب نے رجسٹر کو زمین پر پٹک دیا اور جھڑک کر بولے ۔ یہ کیا معاملہ ہے؟
جب ان سے رسید لی گئی تو ان کے روپے کیوں نہیں دئے گئے؟
طاہر علی سے اور کچھ تو نہ بن پڑا۔ صاحب کے قدموں پر گر پڑے اور رونے
لگے۔ نقب میں بیٹھ کر آنکھیں دکھانے کے لئے بڑے مشاق آدمی کی ضرورت ہے۔
چماروں نے موقع کو تاڑ کر کہا ۔ سرکار ہمارا پچھلا کچھ نہیں ہے۔ ہم تو آج کے
روپوں کے لئے کہتے ہیں۔ حرا دیر ہوئی مال رکھ گئے تھے۔ کہاں صاحب اس بھگت
(وقت) نماز پڑھتے تھے۔

صاحب نے پھر رجسٹر اٹھا کر دیکھا تو انہیں کسی نام کے سامنے ایک
ہلکا سا × کا نشان دکھائی دیا۔ سمجھ گئے حضرت نے یہی روپے اڑائے ہیں۔ ایک
چمار سے جو بازار سے سگریٹ پیتا ہوا آ رہا تھا۔ پوچھا ۔ تیرا نام کیا ہے؟
چمار ۔ چنکو۔
صاحب ۔ تیرے کتنے روپے باقی ہیں؟
کئی چماروں نے اسے ہاتھ کے اشارہ سے سمجھایا کہ کہہ دے کچھ نہیں۔
چنکو نہ سمجھا اور بولا ۔ سترہ روپے پہلے کے تھے تو آج کے۔
صاحب نے اپنی نوٹ بک پر اس کا نام درج کر لیا۔ طاہر علی کو کچھ بھی نہ کہا۔
ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالا۔ جہاں قانون کی رُو سے اُسے سزا مل سکتی تھی۔
وہاں سخت سُست کہنے کی کیا ضرورت؟ سب رجسٹروں کو اٹھوا کر گاڑی میں
رکھا۔ دفتر میں قفل بند کیا۔ آہنی سیف میں ڈبل لاک لگائے۔ کنجیاں جیب
میں رکھیں اور فٹن پر سوار ہو گئے۔ طاہر علی کو اتنی جرأت بھی نہ ہوئی کہ کچھ
منت سماجت کریں۔ زبان ہی بند ہو گئی ساکت کھڑے رہ گئے۔ چماروں
کے چودھری نے تشفی دی۔ آپ کیوں ڈرتے ہو کھاں صاحب۔ آپ کا بال تو
بانکا ہونے نہ پائے گا۔ ہم کہہ دیں گے اپنے روپے بھر پائے ہیں۔ کیوں رے

چنگو۔ بڑا گنوار ہی ہے۔ اشارہ بھی نہیں سمجھتا؟

چنگو نے نادم ہو کر کہا۔ چودھری۔ بھگوان جانیں جو میں ذرا بھی اشارہ پا جاتا تو روپے کا نام ہی نہ لیتا۔

چودھری۔ اپنا بیان بدل دینا۔ کہہ دینا۔ مجھے جبانی حساب یاد نہیں تھا چنگو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ بیان بدلنا سانپ کے منہ میں انگلی دینا تھا۔ طاہر علی کی ان باتوں سے ذرا بھی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ پچھتا رہے تھے۔ اس لئے نہیں کہ میں نے روپے کیوں خرچ کئے بلکہ اس لئے کہ ناموں کے سامنے کے نشانات کیوں قائم کئے۔ الگ کسی کاغذ پر نوٹ کر لیتا تو آج لبوں پہ نوبت آتی۔ اب خدا ہی خیر کرے۔ صاحب معاف کرنے والے آدمی نہیں ہیں۔ کچھ سوجھ ہی نہ پڑتا تھا کہ کیا کریں۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

چودھری بولا۔ کہاں صاحب۔ اب ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے سے کام نہ چلے گا۔ یہ صاحب بڑا جلاد آدمی ہے۔ عبلدی روپے جمع کیجئے۔ آپ کو یاد ہے کل کتنے روپے نکلتے ہوں گے؟

طاہر علی۔ روپوں کی فکر نہیں ہے جی۔ یہاں تو داغ لگ جانے کا افسوس ہے۔ کیا جانتا تھا کہ آج یہ آفت آنے والی ہے ورنہ پہلے ہی سے تیار نہ ہو جاتا۔ جانتے ہو کہ یہاں کارخانہ کا ایک نہ ایک آدمی قرض مانگنے کو سر پر سوار رہتا ہے۔ کس کس سے حیلہ کروں؟ اور پھر مروّت میں حیلہ کرنے سے بھی تو کام نہیں چلتا۔ روپے نکال کر دیتا ہوں۔ یہ اسی شرافت کی سزا ہے۔ ڈیڑھ سو سے کم نہ نکلیں گے بلکہ چاہے دو سو ہو گئے ہوں۔

چودھری۔ بھلا سرکاری رقم اس طرح خرچ کی جاتی ہے۔ آپ نے خرچ کی پاسکی کو اودھار دے دی۔ بات ایک ہی ہے۔ وہ لوگ روپے دے دیں گے؟

طاہر علی۔ ایسا کھرا تو ایک بھی نہیں۔ کوئی کہے گا۔ تنخواہ ملنے پہ دوں گا۔

کوئی کچھ بہانہ کرے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔

چودھری۔ گھر میں تو روپے ہوں گے؟

طاہر علی۔ ہوں گے کوئی دو چار سو روپے نہ ہوں گے۔ مگر جانتے ہو کہ عورتوں کا روپیہ جان کے ساتھ رہتا ہے۔ خدا کو جو منظور ہے وہ ہوگا۔

یہ کہہ کر طاہر علی اپنے دو چار دوستوں کی طرف چلے کہ شاید یہ حال سُن کر لوگ میری کچھ مدد کریں۔ مگر کہیں نہ جا کر ایک درخت کے نیچے نماز پڑھنے لگے۔ کسی سے مدد کی اُمید نہ تھی۔

اِدھر چودھری نے چماروں سے کہا۔ بھائیو چلو سے ملنی جی اس وقت تنگ ہیں۔ سب لوگ تھوڑی تھوڑی مدد کرو تو اُن کی جان بچ جائے۔ اپنے روپے ہی تو لیں گے کہ کسی کی جان لیں گے بس سمجھ لو کہ ایک دن نہ کمایا۔

چودھری تو چماروں سے روپے وصول کر کے جمع کرنے لگا۔ طاہر علی کے دوستوں نے یہ حال سُنا تو ہکا بکا ہی رہ گئے کہ کہیں طاہر علی کچھ مانگ نہ بیٹھیں۔ ہاں جب تیسرے پہر کو وہ دفتر سے آ کر تحقیقات کرنی شروع کی۔ اور طاہر علی کو اس حال میں دیکھا تو بار بار لوگ بھی تماشہ دیکھنے آ پہنچے۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ کلثوم نے جا کر زینب سے کہا۔ لیجئے اب تو آپ کا ارمان نکلا۔

زینب نے کہا۔ تم سمجھتی ہو کہ بگڑتی ہے بگڑے۔ ارمان نکلے ہوں گے تو تمہارے نہ نکلے ہوں گے تو تمہارے۔ میں نے یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ جا کر کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالو۔ گلچھرے تم نے اڑائے ہوں گے۔ یہاں تو روٹی دال کے سوا اور کسی کا کچھ نہیں جانتے۔

کلثوم کے پاس تو کفن کو کوڑی بھی نہ تھی۔ زینب کے پاس روپے تھے۔ مگر اُس نے دل جلانا ہی کافی سمجھا۔ کلثوم کو اس وقت طاہر علی سے ہمدردی نہ تھی۔ اُسے اُن پر غصہ آ رہا تھا جس طرح کسی کو اپنے بچے کو چاند سے اُنگلی کاٹتے ہوئے دیکھ کر غصہ آئے۔

ستام ہو رہی تھی۔ طاہر علی کے لئے داروغہ نے ایک یکہ منگوایا۔ اُس پر چار کانسٹیبل انہیں لے کر سوار ہوئے۔ داروغہ جانتا تھا کہ یہ طاہر علی کے بھائی ہیں۔ کچھ نرم کرتا تھا۔ چلتے وقت بولا کہ اگر آپ کو گھر میں کسی سے کچھ کہنا ہو تو آپ جا سکتے ہیں عورتیں گھبرا رہی ہوں گی۔ انہیں ذرا تسکین دیتے آئیے۔ مگر طاہر علی نے کہا مجھے کسی سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ وہ کلثوم کو اپنی صورت نہ دکھانا چاہتے تھے۔ جسے انہوں نے دیدہ و دانستہ تباہ کر دیا تھا۔ اور اب بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے تھے۔ کلثوم دروازہ پر کھڑی تھی۔ اُس کا غصہ ہر لحظہ رنج کی شکل میں تبدیل ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب یکہ چلا تو وہ غش کھا کر گر پڑی۔ بچے ابا ابا کہتے یکہ کے پیچھے دوڑے۔ داروغہ نے انہیں ایک ایک چونی مٹھائی کھانے کو دے کر بہلا دیا۔ طاہر علی تو اِدھر راستہ میں گئے۔ اِدھر گھڑی رات جاتے جاتے چمارون کا چودھری روپے لے کر مسٹر سیوک کے پاس پہنچا۔ صاحب بہادر۔ یہ روپے تم اُن کے گھر والوں کو دے دو تو اُن کا گزر ہو جائے۔ معاملہ اب پولیس کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتا۔

چودھری۔ حجور۔ آدمی سے کھتا ہو ہی جاتی ہے۔ اتنے دنوں تک آپ کی چاکری کی۔ سرکار کو اُس پر کچھ دیا کرنی چاہئے۔ بڑا بھاری کرمہ (کنبہ) ہے۔ مالک۔ بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔

جان سیوک۔ میں یہ سب جانتا ہوں۔ بیشک اُن کا خرچ بہت تھا۔ اسی لئے میں نے مال پر کمیشن مقرر کر دیا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ انہوں نے جو کچھ کیا ہے مجبور ہو کر کیا ہے۔ لیکن زہر کسی نیت سے کھایا جائے وہ زہر ہی کا کام کرے گا۔ کبھی اثر نہیں ہو سکتا۔ دغابازی زہر سے کم مہلک نہیں ہوتی۔ تم یہ روپے لے جا کر اُن کے گھر والوں کو دے دو۔ مجھے خانصاحب سے کوئی کینہ نہیں ہے۔ مگر اپنے اصول کو نہیں توڑ سکتا۔ گناہ کو معاف کرنا گناہ ہے۔

چودھری یہاں سے مایوس ہو کر چلا گیا۔ دوسرے دن مقدمہ پیش ہوا۔

طاہر علی مجرم ثابت ہوئے۔ وہ اپنی صفائی نہ دے سکے۔ انہیں چھ ماہ کی سزا ہوگئی۔

جب طاہر علی کانسٹیبلوں کے ساتھ جیل کی طرف جا رہے تھے تو انہیں ماہر علی تانگہ پر سوار آتا ہوا نظر پڑا۔ اُن کا دل بے اختیار اُمڈ آیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سمجھے کہ ماہر مجھ سے ملنے کو دوڑا ہوا چلا آ رہا ہے۔ شاید آج ہی آیا ہے۔ اور آتے ہی آتے یہ خبر سُن کر بیقرار ہو گیا ہے۔ جب تانگہ قریب آیا تو چیخ مار کر رہ پڑے۔ ماہر علی نے ایک بار انہیں دیکھا لیکن نہ سلام کیا نہ تانگہ روکا۔ نہ پھر اُس طرف دیکھا۔ اپنا منہ پھیر لیا گویا دیکھا ہی نہیں۔ تانگہ طاہر علی کی نظر سے نکل گیا۔ طاہر علی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ایک بار پھر چیخ کر رو دئے۔ وہ خوشی کا نعرہ تھا اور یہ غم کی فریاد۔ وہ آنسو نے نظر سے تھے اور یہ خون کے!

لیکن ایک ہی لمحہ میں اُن کے دل کو تسکین ہو گئی۔ ماہر نے مجھے دیکھا ہی نہ ہوگا۔ اس کی نگاہ میری طرف اُٹھی ضرور تھی مگر شاید وہ کسی خیال میں مستغرق تھا۔ ایسا ہوتا بھی تو ہے۔ کہ جب ہم کسی خیال میں محو ہوتے ہیں تو سامنے کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں اور نہ قریب کی باتیں سُنائی دیتی ہیں۔ یہی سبب ہے۔ اچھا ہی ہُوا کہ اُس نے مجھے نہ دیکھا ورنہ اِدھر مجھے ندامت ہوتی اُدھر اُسے رنج ہوتا۔

اُدھر ماہر علی مکان پر پہنچے تو چھوٹے بھائی آکر لپٹ گئے۔ طاہر علی کے دونوں بچے بھی دوڑے آئے اور "ماہر چچا آئے" کہہ کر اُچھلنے کودنے لگے۔ کلثوم بھی روتی ہوئی نکل آئی۔ سلام بندگی کے بعد ماہر اپنی ماں کے پاس گئے۔ اُس نے انہیں سینہ سے لگا لیا۔

ماہر۔ تمہارا خط نہ گیا ہوتا تو ابھی میں تھوڑا ہی آتا۔ امتحان کے بعد ہی تو وہاں لطف آتا ہے۔ کبھی میچ۔ کبھی دعوت۔ کبھی سیر۔ کبھی مشاعرہ۔ بھائی صاحب کو یہ کیا حماقت سوجھی۔

زینب۔ بیگم صاحبہ کی فرمائشیں کیسے پوری ہوتیں۔ زیور چاہئے

زردہ چاہئے۔ زری چاہئے۔ کہاں سے آتا؟ اُس پر کہتی ہیں کہ تمہیں لوگوں نے نہیں غارت کر دیا۔ پوچھو۔ روٹی دال میں ایسا کون چھپتی ٹکے کا خرچ تھا۔ مہینوں سر میں تیل ڈالنا نصیب نہ ہوتا تھا۔ اپنے پاس سے پیسے نکالو تو پان کھاؤ۔ اُس پر اتنے طعنے!

ماہر۔ میں نے تو اسٹیشن سے آتے ہوئے انہیں جلی جلتے دیکھا۔ میں تو شرم کے مارے ان سے کچھ نہ بولا۔ سلام تک نہ کیا۔ آخر لوگ یہی نہ کہتے کہ اُن کا بھائی قید خانہ جا رہا ہے۔ منہ پھیر کر چلا آیا۔ بھیا رو پڑے۔ میرا دل بھی مسوس کر اٹھا۔ جی چاہتا تھا۔ اُن کے گلے سے لپٹ جاؤں۔ لیکن شرم دامنگیر ہوئی۔ تھانیدار کوئی معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ اُس کا شمار حکام میں ہوتا ہے۔ اس بات کا خیال نہ کرونگا تو بدنام ہو جاؤں گا۔

زینب۔ چھ ماہ کی سزا ہوئی ہے۔

ماہر۔ جرم تو سنگین تھا مگر شاید حاکم نے رحم کیا۔

زینب۔ تمہارے ابا کا لحاظ کیا ہوگا۔ ورنہ تین سال سے کم کے لئے نہ جاتے۔

ماہر۔ خاندان میں داغ لگا دیا۔ بزرگوں کی آبرو خاک میں ملا دی۔

زینب۔ خدا نہ کرے کہ کوئی مرد عورت کا کلمہ پڑھے۔

اتنے میں ماما ناشتہ کے لئے مٹھائیاں لائی۔ ماہر علی نے ایک مٹھائی طاہر کو دی اور ایک جابر کو۔ ان دونوں نے جا کر صابرہ اور نسیمہ کو دکھائی۔ وہ دونوں بھی دوڑے۔ زینب نے کہا۔ "جاؤ کھیلتے کیوں نہیں؟ کیا سر پر ڈٹ گئے۔ نہ جانے کہاں کے مرھوں کے چھوکرے ہیں۔ ان سبوں کے مارے کوئی چیز منہ میں ڈالنی مشکل ہے۔ بلا کی طرح سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ رات دن کھاتے ہی رہتے ہیں پھر بھی اُن کا جی نہیں بھرتا۔

رقیہ۔ چھچھوری ماں کے بچے اور ہوں گے کیسے؟

ماہر نے ایک ایک مٹھائی ان دونوں کو بھی دی۔ پھر بولے ــــ اب گزر بسر کی کیا صورت ہوگی؟ بھائی کے پاس تو روپے ہوں گے نا؟

زینب۔ ہوں گے کیوں نہیں۔ انہیں روپوں کے لئے تو شوہر کو جیل بھیجا۔ دیکھتی ہوں۔ کیا انتظام کرتی ہیں۔ یہاں کسی کو کیا غرض پڑی ہے کہ پوچھنے جائے۔

ماہر۔ مجھے ابھی نہ جانے کتنے دنوں میں جگہ ملے۔ مہینہ بھر لگ جائے۔ دو مہینے لگ جائیں۔ جب تک مجھے تنگ مت کرنا۔

زینب۔ تم اس کا غم نہ کرو بیٹا۔ وہ اپنا سنبھالے۔ ہمارا بھی خدا حافظ ہے۔ وہ زیادہ کھا کر سوئیں گی تو ہمیں بھی روکھی روٹیاں میسر ہو جائیں گی۔

جب شام ہو گئی تو زینب نے ماما سے کہا۔ جا کر بیگم صاحب سے پوچھو کچھ سودا سلف آئے گا یا آج ماتم منایا جائے گا؟ ماما نے واپس ہو کر کہا۔ وہ تو لیٹی ہوئی رو رہی ہیں۔ کہتی ہیں کہ جسے بھوک ہو وہ کھائے مجھے نہیں کھانا ہے۔

زینب۔ دیکھا یہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی کہ عاف۔ بوا ہے گا۔ جانتی ہے کہ لڑکا پردیس سے آیا ہے مگر پیسے نہ نکلیں گے۔ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے بازار سے کھانا منگوائے گی۔ دوسرے کھائیں یا مریں اس کی بلا سے۔ خیر انہیں تو کل کے بیٹھے تو اسے مبارک ہوں۔ ہمارا بھی اللہ مالک ہے۔

کلثوم نے جب سے سنا تھا کہ طاہر علی کو چھ ماہ کی سزا ہو گئی تھی سے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھایا ہوا تھا۔ ماما پیغام لائی۔ تو وہ سن کر جل اٹھی بولی۔ ان سے کہہ دو کہ پکائیں کھائیں۔ یہاں بھوک نہیں ہے۔ بچوں پر ترس آئے تو دو لقمے انہیں بھی دے دیں۔

ماما نے اپنی ہی فہمائش کا خلاصہ کہا تھا جس سے یہ گڑبڑ ہوئی۔

رات کو نو بج گئے۔ کلثوم دیکھ رہی تھی کہ چولھا گرم ہے۔ مصالحہ جات کی خوشبو آ رہی تھی۔ بگھار کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ لیکن جب بڑی دیر تک کوئی اس کے بچوں کو بلانے نہ آیا تو وہ دھیں مار کر رونے لگی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ گھر والوں نے ساتھ چھوڑ دیا اور اب میں بیکس ہوں۔ دنیا میں کوئی میرا نہیں ہے۔ دونوں بچے روتے روتے سو گئے تھے۔ انہیں کے پاس لیٹے وہ بھی

پڑھی۔ یا اللہ! ابھی دو دن پہلے اور پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ گھر کے آدمیوں کا پیٹ
خالی ہے تو کیسے پار لگے گی۔

باہر علی دسترخوان پر بیٹھے تو ماں سے پوچھا۔ بھابھی نے بھی کچھ بازار سے منگایا
ہے یا نہیں؟

زینب۔ ماما سے منگوائیں گی تو پردہ فاش ہو جائے گا۔ خدا کے فضل سے
صدیقہ سیانی ہو چلی ہے۔ گھر چھپے سے وہ بلاتا ہے۔ اور ایسا کھا آگھر ہے کہ لاکھ
پھسلانے پر بھی منہ نہیں کھولتی۔

باہر علی۔ پوچھ لینا۔ اگر نہ ہو کر ہم لوگ کھا پی کر سو گئے اور وہ بیچاری رہ نہ
جائیں۔

زینب۔ ایسی ان کی نہیں ہیں، وہ ہم جلیبوں کو تو پوچھ لیں۔ ہاں پوچھا میرا فرض
ہے پوچھ لوں گی۔

رقیہ۔ سالن اور روٹی کہیں چلتے کھاتے ہیں گی۔ انہیں تو دودھ اور شیرمال چاہیئے۔
دوسرے روز دوپہر کو جب سب سے ہی یا اور بچی خانہ میں گئے تو زینب نے دیکھا
کہ ہانڈی میں سے دیکھ کر ہی رقیہ نے نکالے۔ اب کلثوم سے ضبط نہ ہو سکا۔
وہ جھٹ اٹھ کر اٹھی اور باورچی خانہ میں جا کر ماما سے بولی۔ تو نے بچوں کو کھانا کیوں نہیں
دیا رہی ہو کیا آج جلدی کی پابندی ہو گئی ہے؟ اسی گھر کے پیچھے ہم بھی جیل گئے تھے
آج میرے بچے بھوکے رہے تو پھر کسی کو نہ چھوڑوں گی۔

ماما نے کہا۔ تو آپ مجھ سے کیا لڑتی ہیں؟ میں کون ہوتی ہوں، جیسا حکم پاتی
ہوں ویسا کرتی ہوں۔

زینب اپنے کمرے سے بولی۔ تم چپ ہو گئیں تو یہاں کس نے گھر بھر دیا کہ کچھ کہا
جاتا وہ بھی تم نے تو دیا۔ بچے کے یہاں سے اور عادتیں نہیں آئی ہیں کہیں
منہ میں دانہ نہ گیا۔ سو کر سے لڑنا آیا۔ تم نے بات تک نہ پوچھی۔ تمہارا جی چاہے
کوئی کہاں تک برداشت کرے۔

آج سے کلثوم کو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ ماہر علی کبھی دونوں بھائیوں کو لے کر نانبائی کی دوکان سے کھانا کھا آتے۔ کبھی کسی دوست آشنا کے مہمان ہو جاتے۔ زینب اور رقیہ کے لئے ماما چپکے چپکے اپنے گھر سے کھانا بنا لاتی۔ گھر میں چولھا نہ جلتا۔ تسیمہ اور صابر علی الصباح گھر سے نکل جاتے اور کوئی کچھ دے دیتا۔ تو کھا لیتے۔ زینب اور رقیہ کی صورت سے ایسا ڈرتے تھے جیسے چوہا بلی سے۔ ماہر کے پاس بھی نہ جاتے۔ بچے دوست اور دشمن کو خوب پہچانتے ہیں۔ اب وہ پیار کے بھوکے نہیں رحم کے بھوکے تھے۔ رہی کلثوم سو اس کے لئے تو غم ہی کافی تھا۔ وہ سینہ پر دنا جانتی تھی۔ چاہتی تو سلائی کر کے اپنا گزارہ کر لیتی پر حلیمن کے ارمان کچھ نہ کرتی تھی۔ وہ ماہر کے منہ میں کالک لگانا چاہتی تھی کہ دنیا میری حالت دیکھے اور ان پر تھو کے۔ ایسے اب طاہر علی پر بھی غصہ آتا تھا۔ تم ایسے قابل تھے کہ جیل میں پڑے پڑے چکی پیسو۔ اب آنکھیں کھلیں گی۔ تم کو دنیا کے ہنسنے کی فکر تھی۔ اب دنیا کسی پہ نہیں ہنستی۔ لوگ مزے سے میٹھے لقمے اڑاتے اور میٹھی نیند سوتے ہیں۔ کسی کو بھی تو نہیں دیکھتی کہ جھوٹوں ہی ذرا ان تو دغرضوں کا فضیحت کرے۔ کسی کو غرض ہی کیا پڑی ہے کہ کسی پہ ہنسے لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ایسے کوتاہ اندیش حیادار دں کی یہی سزا ہے۔

اس طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک روز بھاگی کلثوم کے یہاں ساگ بھاجی لے کر آئی۔ وہ اب سبزی فروشی کا کام کرتی تھی۔ کلثوم کی صورت دیکھی تو بولی۔ بہو جی۔ تم تو پہچانی ہی نہیں جاتیں۔ کیا کڑھ کڑھ کر جان دے دو گی؟ پیٹ تو نکل آئی ہے۔ کڑھنے سے کیا ہوگا؟ مسل کے آندھی آئے بیٹھ گئو۔ اتم نہ رہو گی تو بچوں کو کون پالے گا؟ دنیا کتنی جلد اندھی ہو جاتی ہے۔ بچارے کھاں صاحب انہیں لوگوں کے لئے مرتے تھے۔ اب کوئی بات بھی نہیں پوچھتا۔ گھر گھر یہی چرچا ہو رہی ہے کہ ان لوگوں کو ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ بھگوان کو کیا منہ دکھائیں گے۔

کلثوم۔ اب تو بھاڑ لیپ کر اٹھ کالا ہو گیا۔

سبھاگی۔ بہو کوئی منہ پر بھلے نہ کہے پر سب تھوڑی تھوڑی کرتے ہیں۔ بچارے ننھے ننھے لڑکے مارے مارے پھرتے ہیں۔ دیکھ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔ کل تو چودھری نے ماہر میاں کو خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

کلثوم کو ان باتوں سے بڑی تسکین ہوئی۔ دنیا ان لوگوں کو تھوکتی تو ہے۔ اُن کی بُرائی تو کرتی ہے۔ ان بیحیاؤں کو لاج ہی نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔ بولی۔ کس بات پر؟

سبھاگی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ باہر سے چودھری نے پکارا۔ سبھاگی نے جاکر پوچھا۔ کیا کہتے ہو؟

چودھری۔ بہو جی سے کچھ کہنا ہے۔ جرا پردے کی اوٹ میں کھڑی ہو جائیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ زینب اور رقیہ کسی ولی کے مزار پر شیرینی چڑھانے گئی ہوئی تھیں۔ کلثوم پردہ کی آڑ میں آکر کھڑی ہو گئی۔

چودھری۔ بہو جی۔ کئی دن سے آنا چاہتا تھا۔ مگر موکا ہی نہ ملتا تھا۔ جب آتا تو ماہر میاں کو بیٹھے دیکھ کر لوٹ جاتا تھا۔ کل ماہر میاں مجھ سے کہنے لگے کہ تم نے بھتیا کی مدد کے لئے چوروپے جمع کئے تھے وہ مجھے دے دو۔ بھابھی نے مانگے ہیں۔ میں نے کہا کہ جب تک بہو جی سے خود نہ پوچھ لوں گا آپ کو نہ دوں گا۔ اس پر بہت بگڑے۔ گالی بکی منہ سے نکالنے لگے۔ "سمجھ لوں گا۔ بُرے گھر بھجوا دوں گا"۔ میں نے کہا۔ "جائیے۔ سمجھ لیجئے گا"۔ تو اب آپ کا کیا حکم ہے؟ دے سب روپے ابھی تک میرے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ آپ کو دے دوں نا؟ مجھے تو آج معلوم ہوا کہ وہ سب آپ کے ساتھ دغا کر گئے۔

کلثوم نے کہا۔ خدا تمہیں اس نیکی کا ثواب دے گا۔ مگر یہ روپے جس کے ہوں انہیں واپس کر دو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

چودھری۔ کوئی نہ لوٹائے گا۔

کلثوم۔ تو تمہیں اپنے پاس رکھو۔

چودھری۔ آپ لیتی کیوں نہیں؟ ہم کوئی احسان تھوڑے جتاتے

کھاں صاحب کی بدولت بہت کچھ کمایا کھایا ہے۔ دوسرا منشی ہوتا تو ہزاروں روپے بخرے لیتا۔ یہ انہیں کی بخر سمجھی جائے۔

چودھری نے بہت اصرار کیا مگر کلثوم نے روپے نہ لئے۔ وہ ماہر علی کو دکھانا چاہتی تھی کہ جن روپوں پر تم کتوں کی طرح لپکے تھے انہیں روپوں کو میں نے پیر سے ٹھکرا دیا۔ میں لاکھ گئی گزری ہوں پھر بھی مجھ میں کچھ غیرت باقی ہے۔ تم مرد ہو کر بھیا بنی پر کمر سے باندھے ہوئے ہو۔

چودھری یہاں سے چلا تو شیخانی سے بولا۔ یہی بڑے آدمیوں کی باتیں ہیں۔ چاہے ٹکڑے ٹکڑے اڑ جائیں مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پسارینگی۔ نہ یہ ہوتا تو چھوٹے بڑے میں پھر فرق ہی کیا رہتا۔ دھن سے بڑائی نہیں ہوتی۔ دھرم سے ہوتی ہے۔

ان روپوں کو ٹھکرا کر کلثوم کا سر غرور سے اونچا ہو گیا۔ آج اسے پہلی مرتبہ طاہر علی پر ناز ہوا۔ یہ عزت سے کہ بیٹھے پیچھے دنیا برائی کرتی ہے۔ اس بے عزتی سے کہ مر جانا ہی اچھا۔ کہ چھوٹے آدمی منہ پر فضیحت کریں۔ کوئی لاکھ ان کے احسان کو مٹانے پر دیا تو انصاف کرتی ہے۔ روز ہی تو عیب سراہا تے رہتے ہیں۔ کوئی ان کے بال بچوں کی بات نہیں پوچھتا بلکہ الٹے اور لوگ طعنے دیتے ہیں۔ آج ان کی نیک نامی نے میرا سر اونچا کر دیا۔

شیخانی نے کہا۔ بہو بی۔ بہت عورتیں دیکھیں پر تم جیسی دھیرج والی ہرگز نہیں کوئی ہوگی۔ بھگوان تمہارا سنکٹ ہریں۔

جانے لگی تو اس نے کئی امرود بچوں کے لئے رکھ دئے۔ کلثوم نے کہا۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔

شیخانی مسکرا کر چلی گئی۔

## (۳۷)

بدھو سیوک نہایت مستعد آدمی تھے۔ ان کی حوصلہ مندیوں کی بدولت سیوا سمتی

میں جان سی پڑ گئی۔ ممبروں کی تعداد میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ جو لوگ کاہل اور بے پرواہ سے ہو رہے تھے۔ وہ پھر نئے جوش سے کام کرنے لگے۔ پر بھو سیوک کی شرافت اور نیک دلی سب کو خریفتہ کر لیتی تھی۔ اُس کے ساتھ ہی اب اُن میں وہ مستعدی نظر آتی تھی جس کی اُنہیں خود اُمید نہ تھی۔ سیوا سمتی کے عموماً سبھی لوگ قابل اور تعلیم یافتہ تھے۔ وہ سمتی کو ترقی دینے کے لئے کسی نئی تجویز سے کام لینا چاہتے تھے۔ وہ جاہل سپاہیوں کی فوج نہ تھی جو افسر کے حکم کو حکم خداوندی سمجھے۔ یہ تعلیم یافتہ فوج تھی۔ جو افسر کے حکم پر غور کرتی ہے۔ اُسے ہر پہلو سے جانچتی ہے اور جب تک اُس کے جواز کی قائل نہ ہو جائے اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ پر بھو سیوک بڑی ہوشیاری سے اس مشکل کام کو آگے بڑھانا شروع کیا۔

اب تک اس جماعت کا کام صرف سوشل خدمتیوں تماشاؤں میں جانے والوں کی رد و کرنا۔ بازھ کے مارے ہوؤں کو چندا دینا وغیرہ تھا۔ وہ عوام کی تکلیفوں کو رفع کرنا بھی اُن کے خاص کام تھے۔ پر بھو سیوک نے سمتی کے دائرہ عملی کو وسیع کر دیا۔ اب سیاسی شکل دے دی۔ اگرچہ انہوں نے کوئی نئی تجویز نہیں پیش کی کسی تبدیلی کا مطالبہ تک نہ کیا۔ مگر رفتہ رفتہ ان کی شخصیت کے اثر سے نئی باتوں کا آغاز ہونے لگا۔

پر بھو سیوک نہایت خلیق آدمی تھے مگر کسی کو غریبوں پر ظلم کرتے دیکھ کر اُن کا اخلاقی نشتر دامیز ہو جاتا تھا کسی سپاہی کو گھسیاروں کی گھاس چھینتے دیکھ کر وہ فوراً گھسیاروں کی طرف سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ آفات ارضی و سماوی سے عوام کی حفاظت کرنا انہیں بے سود سا معلوم ہوتا تھا۔ زبردستوں کے ظلم پر اُن کی خاص نگاہ رہتی تھی۔ رشوت خور اہلکاروں پر ظالم زمینداروں پر خود غرض حکام پر وہ ہمیشہ تاک لگائے رہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ہی روز میں اس جماعت کی دھاک بیٹھ گئی۔ اُن کا دفتر کمزوروں اور مصیبت زدوں کی جائے پناہ بن گیا۔ پر بھو سیوک کمزوروں کو مقابلہ کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ اُن کا قول تھا۔ کہ جب تک عوام خود اپنی حفاظت کرنا نہ سیکھیں گے۔ انیشور بھی انہیں ظلم سے

نجات نہیں دے سکتا۔

ہمیں سب سے پہلے اپنی خودداری کی حفاظت کرنی چاہیئے۔ ہم بزدل اور ڈرپوک ہو گئے ہیں۔ ذلت اور نقصان چپکے سے برداشت کر لیتے ہیں۔ ایسے آدمیوں کو تو بہشت میں بھی آرام نہیں مل سکتا۔ ضرورت ہے کہ ہم بے خوف اور جری بنیں۔ مصائب کا مقابلہ کریں۔ مرنا سیکھیں۔ جب تک ہمیں مرنا نہ آئیگا۔ جینا بھی نہ آئے گا۔ پربھو سیوک کے لئے مظلوموں کی حفاظت کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن جانا اس سے کہیں زیادہ آسان تھا کہ وہ کسی مریض کے سرہانے بیٹھا پنکھا جھلے یا قحط زدوں کو غلہ اور روپیہ تقسیم کرتا پھرے۔ اُس کے رفیقوں کو بھی اِس قسم کی مردانہ خدمت کرنے کا زیادہ شوق تھا۔ کچھ لوگ تو اس سے بھی زیادہ کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ عوام میں بدامنی پیدا کرنا بھی والنٹیروں کا خاص فرض ہے۔ اندرداد اِس غول کا سرغنہ تھا اور اُسے نرم رکھنے کے لئے پربھو سیوک کو نہایت ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا تھا۔

لیکن جیوں جیوں یہ جماعت مشہور اور ہر دلعزیز ہوتی گئی۔ اس پر حکام کا شُبہ بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اب کنور صاحب کو اندیشہ ہوا کہ کہیں سرکار اس جماعت کا تشدد سے خاتمہ نہ کر دے۔ کچھ دنوں میں یہ افواہ بھی گرم ہوئی کہ حکام میں کنور صاحب کی ریاست کو ضبط کرنے کا چرچا ہو رہا ہے۔ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے مگر یہ افواہ سُن کر اُن کی طبیعت بھی ڈانواڈول ہو گئی۔ وہ ثروت سے خط نہ اٹھانا چاہتے تھے۔ مگر ثروت کی خواہش کو ترک نہ کر سکتے تھے۔ اُن کو دوسروں کی بھلائی کرنے میں اُس سے کہیں زیادہ خوشی ملتی تھی جتنی کہ نفس پرستی میں۔ بھلائی کرنے میں عزت تھی۔ وہ عزت ہی نہ رہی تو جینے میں کیا مزہ رہا۔ وہ پربھو سیوک کو بار بار سمجھاتے ــــ بھئی ذرا سوچ سمجھ کر کام کرو۔ حکام سے بچ کر چلو۔ ایسے کام ہی کیوں کرو۔ جن سے حکام کو تم پر شُبہ ہو؟ تمہارے لئے رفاہِ عام کا میدان کیا کم ہے کہ سیاسی جھگڑوں میں پڑو؟ ــ لیکن پربھو سیوک

اُن کے مشورہ کی ذرا بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دھمکاتے تھے کہ استعفےٰ دے دوں گا۔ ہمیں حکّام کی کیا پرواہ؟ وہ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ہم سے کچھ نہیں پوچھتے۔ پھر ہمیں کیوں اُن کا رُخ دیکھ کر کام کریں؟ ہم اپنے مجوزہ راستہ سے منحرف نہ ہوں گے۔ حکّام کا جی چاہے کریں۔ خودداری کے احساس کو مٹا کر سمتی کو زندہ بھی رکھا تو کیا۔ ان کا رُخ دیکھ کر کام کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ ہم کھائیں پئیں۔ مقدمہ بازی کریں۔ ایک دوسرے کا بُرا چاہیں اور پڑے پڑے سوئیں۔ ہمارے اور اُن کے اغراض میں اختلاف ہے جس سے ہمارا فائدہ ہے اُس سے اُن کا نقصان ہے۔ اور ایسی حالت میں ان کا بدگمان ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ اگر ہم لوگ اس طرح ڈرتے رہیں گے تو پھر ہمارا عدم وجود برابر ہے۔

ایک روز دونوں آدمیوں میں بحث کی نوبت آگئی۔ بندوبست کے حکّام نے کسی صوبہ میں اراضی کا محصول اپنے حسبِ دلخواہ بڑھا دیا تھا۔ کاؤنسلوں اخباروں اور سیاسی جلسوں میں اس اضافہ کی مخالفت کی جا رہی تھی۔ مگر حکّام متعلقہ پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ پربھوسیوک کی رائے تھی کہ ہمیں جا کر اسامیوں سے کہنا چاہئے کہ سال بھر تک زمین کو پرتی پڑی رہنے دیں۔ کنور صاحب کہتے تھے کہ یہ تو کھلم کھلا حاکموں سے بَیر مول لینا ہے۔

پربھوسیوک۔ اگر آپ اتنا ڈر رہے ہیں تو بہتر ہے کہ آپ اس جماعت کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔ آپ دو کشتیوں پر بیٹھ کر دریا کو عبور کرنا چاہتے ہیں یہ ناممکن ہے۔ مجھے رئیسوں پر پہلے بھی اعتبار نہ تھا اور اب تو بالکل ہی مایوس ہو گیا ہوں۔

کنور۔ تم میرا شمار رئیسوں میں کیوں کرتے ہو۔ جب تمہیں خوب معلوم ہے کہ مجھے ریاست کی پرواہ نہیں ہے؟ لیکن کوئی کام روپیہ کے بغیر تو نہیں چل سکتا میں نہیں چاہتا کہ دیگر قومی انجمنوں کی طرح اس انجمن کو بھی روپیہ کی کمی کے سبب ہم ٹوٹتا ہوا دیکھیں۔

پرکھو سیوک۔ میں بڑی سے بڑی جائداد کو بھی اصول پر قربان کر دینے سے دریغ نہ کروں گا۔

کنور۔ میں بھی نہ کرتا اگر جائداد میری ہوتی۔ لیکن جائداد میرے ورثاء کی ہے اور مجھے کوئی مجاز نہیں ہے کہ میں بلا اُن کی مرضی جائداد کا تلف کر دوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے اعمال کا خمیازہ میرے ورثاء کو اٹھانا پڑے۔

پرکھو سیوک۔ یہ روسا کی پرانی دلیل ہے۔ وہ اپنی ثروت پسندی کو اسی پردہ کی آڑ میں چھپایا کرتے ہیں۔ اگر آپ کو خوف ہے کہ ہمارے کاموں سے آپ کی جائداد کو نقصان پہنچے گا تو بہتر ہے کہ آپ اس انجمن سے قطع تعلق کر لیں۔

کنور صاحب نے تشکرانہ لہجہ میں کہا۔ پرکھو تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس تحریک کی بنیاد ابھی کتنی کمزور ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ حکام کی تیز نگاہی کو ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا اور تمہارا مقصد ایک ہی ہے۔ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔ لیکن میں سن رسیدہ ہوں۔ آہستہ چلنا چاہتا ہوں۔ اور تم جوان ہو۔ دوڑنا چاہتے ہو۔ میں بھی حکام کا مہربانیوں کا منتظر نہیں ہوں۔ میں بہت پہلے تجربہ کر چکا ہوں۔ کہ ہماری قسمت ہمارے ہاتھ ہے۔ اپنے بھروسے کے لئے جو کچھ کریں گے ہمیں کرنا ہے۔ دوسروں سے ہمدردی یا مدد کی امید رکھنا فضول ہے۔ لیکن کم از کم ہماری قومی تحریکات کو زندہ تو رہنا ہی چاہئے۔ میں اس تحریک کو حکام کی بدگمانیوں کا شکار بنا کر اس کا ناطقہ بڑھانا نہیں چاہتا۔

پرکھو سیوک نے کچھ جواب نہ دیا۔ بات بڑھ جانے کا خوف تھا۔ البتہ دل میں طے کر لیا کہ اگر کنور صاحب نے زیادہ مداخلت کی تو ان کو اس جماعت سے علیحدہ کر دوں گا۔ روپیہ کا سوال اتنا مشکل نہیں ہے کہ اس کے لئے تحریک کی بیخکنی کر دی جائے۔ اندرمنی نے بھی یہی صلاح دی۔ کنور صاحب کو الگ کر دینا چاہئے۔ ہم دوائیں تقسیم کرنے اور قحط زدہ علاقوں میں مریضوں کا پتہ لگانے کے لئے ڈھونڈنے کے نہیں ہیں۔ یہ وہ بھی ہمارا کام۔ اس سے ہمیں انکار نہیں۔ لیکن میں اسے اتنا وزنی کام نہیں سمجھتا۔ یہ

ابھی انہدام کا زمانہ ہے۔ تعمیر کا زمانہ بعد کو آئے گا۔ طاعون قحط اور سیلاب سے دنیا کبھی ویران نہیں ہوئی اور نہ ہوگی۔

شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ اب کتنے ہی اہم معاملات میں یہ دونوں آدمی کنور صاحب سے رائے تک نہ لیتے۔ بیٹھ کر آپس ہی میں طے کر لیتے۔ ہر طرف سے مظالم کی خبریں ہر وقت دفتر سے آتی رہتی تھیں۔ کہیں کہیں تو لوگ اس جماعت کی مدد حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینے کو تیار ہو جاتے۔ اس سے اس امر کا یقین ہوتا جاتا تھا کہ سمتی اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ اُسے کسی مستقل سرمایہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کام کرنے والوں میں کافی حوصلہ اور جوش ہو تو کبھی روپیوں کا کال نہیں پڑ سکتا۔ رجبوں جیوں یہ بات ظاہر ہوتی جاتی تھی۔ کنور صاحب کی ماتحتی ممبروں کو کھلتی تھی۔

پربھو سیوک کا کلام ان دنوں انقلابی جذبات سے مملو ہوتا تھا۔ قومیت، جد و جہد، کشمکش کا جذبہ ہر شعر سے مترشح ہوتا تھا۔ اُس نے کشتی کے عنوان سے ایک نظم لکھی جسے کہر شاعری کا ایک گوہر نایاب کہنا بیجا نہ ہوگا۔ لوگ پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے۔ پہلے ہی بند میں مسافر نے پوچھا تھا کیوں مانجھی کشتی ڈوبے گی یا پار لگے گی۔ مانجھی نے جواب دیا ہے مسافر کشتی ڈوبے گی۔ کیونکہ تمہارے دل کو یہ اندیشہ وسوسہ سے ہوا ہے۔ کوئی ایسا جلسہ یا مجمع نہ تھا جہاں پر یہ نظم نہ پڑھی گئی ہو۔ ادبی دنیا میں ہل چل سی مچ گئی۔

خدمتی جماعت پر پربھو سیوک کا اقتدار دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ عموماً سبھی ممبروں کو اب اُن سے عقیدت ہو گئی تھی۔ سبھی دل و جان سے اُن کے اشاروں پر چلنے کو تیار تھے۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ قومیت کے نشہ میں چور۔ نہ دولت کی پرواہ۔ نہ گھر بار کی فکر۔ روکھا سوکھا کھانے والے۔ موٹا جھوٹا پہننے والے۔ زمین پر سو کر رات کاٹ دیتے تھے۔ گھر کی ضرورت نہ تھی۔ کبھی کسی درخت کے نیچے پڑ رہتے۔ کبھی کسی جھونپڑے میں۔ جہاں اُن کے

دِل میں اعلیٰ اور پاک حب الوطنی کے جذبات اُمڈ رہے تھے۔

تمام ملک میں اس انجمن کے حُسنِ انتظام کی دھوم تھی۔ پربھو سیوک ملک کے معزز اور ہر دلعزیز لیڈروں میں سے تھے۔ اتنی کم عمری یہ نامروری! لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ جگہ جگہ سے قومی مجلسوں نے انہیں بُلانا شروع کیا۔ جہاں جاتے لوگ اُن کی تقریر سُن کر از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔

پُونا میں قومی سبھا کا جلسہ تھا۔ پربھو سیوک کو نوید ملا۔ اُنہوں نے فوراً اندرون کو اپنا کام سپرد کیا اور جنوبی علاقہ جات میں سفر کرنے کا ارادہ کر کے روانہ ہو گئے۔ پُونا میں ان کے استقبال کی خوب خوب تیاریاں کی گئی تھیں۔ یہ شہر قومی کارکنوں کا ایک مرکزی مقام بھی تھا۔ اُن کا افسر بڑے جیوٹ کا آدمی تھا جس نے برلن میں انجینیری کی ڈگری حاصل کی تھی اور تین سال کے لئے اس جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کا تمام شہر میں بڑا رسوخ تھا۔ وہ اپنی جماعت کے ممبروں کو لئے ہوئے اسٹیشن پر کھڑا ہُوا تھا۔ پربھو سیوک کا دل اس دھوم دھام کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اُن کے دِل نے کہا — یہ میری سرکردگی کا اثر ہے۔ یہ لگن۔ یہ بے خوفی۔ یہ بیداری ان میں کہاں تھی؟ میں نے ہی انہیں پیدا کیا تھا۔ اب اُمید ہوتی ہے۔ کہ زندہ رہا تو کچھ نہ کچھ کر دکھاؤں گا۔ — آہ غرور!

شام کے وقت بڑے پنڈال میں جب وہ پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تو کئی ہزار سامعین کو اپنی طرف عقیدتمندانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے دیکھ کر اُن کا دل بھر آیا۔ گیلری میں یورپین لیڈیاں بھی موجود تھیں۔ صوبہ کے گورنر بھی تشریف لائے تھے۔ جس کی تحریر میں یہ معجزہ ہے اس کی تقریر میں کیا کچھ جادو ہو گا سب ہی دیکھنا چاہتے تھے۔

پربھو سیوک کا لکچر شروع ہُوا۔ کسی سے ان کا تعارف کرانے کی ضرورت نہ تھی۔ قانونِ سیاست کی فلسفیانہ تشریح کرنے لگے۔ وہ قانون کیا ہے۔ اُس کی ضرورت کیوں ہے۔ اُس کی پابندی کا کیا طریقہ ہے۔ کن حالتوں میں اُس کی

خلاف ورزی کرنا رعایا کا فرض ہوجاتا ہے۔ اُس میں کیا بھلائی ہوتی ہے؟ انہوں نے نہایت قابلیت اور بے خوفی سے ان سوالوں کی توضیح کی۔ ایسے پیچیدہ اور مشکل مسئلہ کو اگر کوئی شخص سلیس اور دلکش بنا سکتا تھا تو وہ پربھوسیوک تھے۔ گو سیاست بھی دنیا کی ان مخصوص چیزوں میں ہے جو توضیح و تشریح کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اُس کی تشریح اُس کے حق میں سم قاتل ہے۔ اس پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہتا ہی بہتر ہے۔ پربھوسیوک نے پردہ اُٹھا دیا۔ فوجوں کے پہرے نظروں سے غائب ہوگئے۔ عالیشانوں کے شاندار محل زمین دوز ہوگئے۔ شوکت و اقتدار کے نشانات مٹنے لگے۔ سامنے روشن اور جلی حروف میں لکھا ہُوا تھا۔ "قانون کا نہ ہونا ہی بہتر ہے قانون ہے۔" لیکن جُوں ہی اُن کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ "ہمارا ملک بلا قانون کا ہے۔ جمہوری اور پابندی میں بعد المشرقین ہے۔" اُسی وقت سامنے سے پستول دغنے کی آواز آئی۔ اور گولی پربھوسیوک کے کان کے پاس سے نکل کر پیچھے دیوار میں جا لگی۔ رات کا وقت تھا۔ کچھ پتہ نہ چلا کہ کس نے یہ وار کیا۔ شک ہُوا کہ کسی یوروپین کی شرارت ہے۔ لوگ گیلریوں کی طرف دوڑے۔ معاً پربھوسیوک نے بلند آواز میں کہا ــــ میں اس شخص کو معاف کرتا ہوں جس نے مجھ پر وار کیا ہے۔ اُس کا جی چاہے تو وہ پھر مجھے نشانہ بنا سکتا ہے۔ میری جانب سے کسی کو بدلہ لینے کا اختیار نہیں ہے۔ میں اپنے خیالات کی اشاعت کرنے کے لئے آیا ہوں۔ زیادتیوں کے انتقام کے لئے نہیں۔

ایک سمت سے آواز آئی ــ یہ قانون کی ضرورت کا روشن ثبوت ہے۔

جلسہ برخاست ہوگیا۔ یوروپین اصحاب عقب کے دروازہ سے نکل گئے۔ باہر مسلح پولیس آپہنچی تھی۔

دوسرے روز شام کو پربھوسیوک کے نام ایک تار آیا کہ خدمتی انجمن کی انتظامیہ کمیٹی آپ کے لیکچر کو ناپسند کرتی ہے اور مطالبہ کرتی ہے کہ آپ اُسے واپس لیں ورنہ یہ کمیٹی آپ کے لکچروں کی ذمہ وار نہ ہوگی۔

پربھوسیوک نے تار کے کاغذ کو پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور اُسے پیروں

سے گھٹتے ہوئے آپ آپ بولے ۔ مکار، بزدل۔ رنگا سیار۔ قومیت کا دم بھرتا ہے قوم کی خدمت کرے گا۔ ایک تقریر سے کایا پلٹ کردی۔ خود لگا کر شہیدوں میں شامل ہونا چاہتا ہے؟ قومی خدمت کو بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ سانپ سے کھیلنا ہے۔ شیر سے پنجہ لینا ہے۔ اگر اپنی جان اور دولت اتنی پیاری ہے تو یہ سوانگ کیوں بھرتے ہو؟ جاؤ تم جیسے قوم پرستوں کے بغیر ملک کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

اُنہوں نے اُسی وقت تار کا جواب دیا ۔ میں انتظامیہ کمیٹی کے ماتحت ہونا اپنے لئے ذلت آمیز سمجھتا ہوں۔ میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آدھ گھنٹہ کے بعد دوسرا خط آیا۔ اُس پر سرکاری مہر تھی۔ لکھا تھا:۔

مائی ڈیر سیوک ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کل آپ کی تقریر سُن کر مجھے کتنا خلا اور نفع حاصل ہوا۔ اسے مبالغہ نہ سمجھئے کہ سیاست کی ایسی عالمانہ اور باریک تنظیر میں نے آج تک نہیں سُنی تھی۔ قواعد نے میری زبان بند کر رکھی ہے مگر میں آپ کے جذبات و خیالات کی عزت کرتا ہوں اور خدا سے دست بدعا ہوں کہ وہ دن جلد آئے جب ہم سیاست کا راز سمجھیں اور اُس کے اعلےٰ ترین اصولوں پر کاربند ہو سکیں۔ صرف ایک ہی ایسا شخص ہے جسے آپ کی صاف گوئی شاق ہے اور مجھے افسوس و شرم کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ شخص یورپین ہے۔ یہ یورپین جماعت کی طرف سے اس وحشیانہ اور بزدلانہ حملہ پر اپنے رنج و نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کل یورپین جماعت کو آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اگر میں اس شیطان کا پتہ لگانے میں کامیاب ہوا تو اُس کا کل سے پتہ نہیں ہے، تو آپ کو اس کی اطلاع دینے میں مجھ سے زیادہ خوش اور کوئی نہ ہوگا۔ آپ کا ایف ولسن۔

پرھوسیوک نے اس خط کو دوبارہ پڑھا۔ اُس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ بڑی احتیاط سے اُسے اپنے صندوق میں رکھ دیا۔ کوئی اور وہاں ہوتا۔

تو ضرور ہی اُسے پڑھ کر سُناتے۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگے۔ یہ ہے زندہ قوموں کی فیاضی۔ فراخدلی اور قدردانی! انہوں نے آزادی کا تحفہ اٹھایا ہے آزادی کے لئے قربانیاں دی ہیں اور آزادی کی اہمیت سے واقف ہیں۔ جس کی ساری زندگی دوسروں کی خوشامد کرنے اور دوسروں کا منہ تکنے میں گزری ہو وہ آزادی کی اہمیت کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ مرنے کے دن سر پر آجاتے ہیں تو ہم کتنے خدا پرست بن جاتے ہیں۔ بھرت سنگھ بھی اُسی طرف گئے ہوتے۔ اب تک رام نام کی مالا پھیرتے ہوتے۔ وہ تو دنے سنگھ نے اس طرف گھما دیا۔ یہ انہیں کا اثر تھا۔ دنے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ بڑی ضرورت ہے! تم کہاں ہو؟ آکر دیکھو تمہاری اس کشت کا کیا حال ہے۔ اس کے محافظ ہی اسے اُجاڑ رہے ہیں۔

## (۳۸)

صوفیا اور دنے ساری رات تو اسٹیشن پر پڑے رہے۔ سویرے قریب کے گاؤں میں گئے جو بھیلوں کی ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ صوفیا کو یہ مقام بہت پسند آیا۔ گاؤں کے سر پر پہاڑ کا سایہ تھا اور پیروں کے نیچے ایک پہاڑی چشمہ بیٹھا راگ گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔ بھیلوں کے چھوٹے چھوٹے جھونپڑے جن پر بیل ہوئی تھی پریوں کے کھلونوں کی طرح خوشنما معلوم ہوتے تھے۔ جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ کیا کرنا ہے کہاں جانا ہے کہاں رہنا ہے اُس وقت تک انہوں نے اُسی گاؤں میں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ ایک جھونپڑے میں جگہ بھی آسانی سے مل گئی۔ بھیلوں کی مہمان نوازی مشہور ہے اور یہ دونوں بھوک پیاس گرمی سردی برداشت کرنے کے عادی تھے۔ جو کچھ موٹا جھوٹا میسر ہوا کھا لیا۔ چاء اور مکھن مربّے اور میووں کا چسکا نہ تھا۔ صاف اور سادہ غذا ان کی خوراک تھی۔ وہاں ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔ اس جھونپڑے میں صرف ایک بھیلنی رہتی تھی۔ اس کا لڑکا کہیں فوج میں ملازم تھا۔ بڑھیا ان لوگوں کی خدمت خوشی سے کرتی۔ یہاں انہوں نے مشہور کیا کہ

ہم دِلّی کے رہنے والے ہیں۔ تبدیلی آب وہوا کی غرض سے آئے ہیں۔ گاؤں کے باشندے اُن کا بڑا ادب اور لحاظ کرتے تھے۔

مگر اتنی خلوت اور آزادی کے باوجود بھی دونوں ایک دوسرے سے بہت کم ملتے۔ دونوں ہی نہ جانے کیوں خائف رہتے تھے۔ ان میں ناچاقی نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت کا دم بھرتے تھے۔ دونوں مضطرب تھے۔ دونوں بیقرار۔ دونوں بیتاب۔ مگر اخلاقی پابندیوں کا خیال انہیں باہم ملنے نہ دیتا تھا۔ عمیق مذہبی مطالعہ نے صوفیا کو فرقہ بندیوں کی تنگی سے آزاد کر دیا تھا۔ اُس کے دل میں اب کسی سے نفرت یا مخالفت نہ تھی۔ جس بے اطمینانی نے مہینوں تک اُس کے مذہبی اصولوں کا دبا رکھا تھا۔ وہ مفقود ہو گئی تھی۔ اب کل جائداد اس کے لئے اپنے ہی تھے۔ اگرچہ ونے کے خیالات اتنے وسیع نہ تھے۔ دنیا کی محبت اُن کی نگاہ میں ایک فلسفیانہ بحث سے زیادہ قیمتی تھی مگر صوفیا کی وسیع الخیالی کے سامنے اُس کے موروثی احساسات منہ چھپاتے پھرتے تھے۔ واقعی دونوں کا روحانی ارتباط ہو چکا تھا اور مادی ارتباط میں بھی کوئی کھوس رُکاوٹ نہ تھی۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ دونوں جُدا رہتے تھے۔ تنہائی میں ساتھ ساتھ کبھی نہ بیٹھتے تھے۔ انہیں اب اپنے آپ سے ڈر لگتا تھا۔ تقریر کا دَور ختم ہو چکا تھا۔ تحریر کا دَور آ گیا تھا۔ تقریر سے زبان نہیں کٹتی۔ تحریر سے ہاتھ کٹ جاتے ہیں۔

لیکن تحریر سے ہاتھ چاہے کٹ جائیں پھر بھی اُس کے بغیر کوئی بات پختہ نہیں ہوتی۔ ذرا سا اختلاف۔ ذرا سی بے احتیاطی سے سمجھوتہ مسترد ہو سکتا ہے۔ اس لئے دونوں ہی اس غیر یقینی حالت کا خاتمہ کر دینا چاہتے تھے۔ کیسے کریں۔ یہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کون اس تذکرے کو چھیڑے؟ شاید باتوں میں کوئی اعتراض پیدا ہو جائے۔ صوفیا کے لئے تو ونے کی قربت کافی تھی۔ وہ انہیں ہر وقت آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ اُن کے رنج اور خوشی میں شریک ہوتی تھی۔ انہیں اپنا سمجھتی تھی۔ اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتی تھی۔ ونے ہر روز اس پاس کے دیہاتوں میں گھومنے

چلے جاتے تھے۔ کوئی عورت ان سے اپنے پردیسی لڑکے یا شوہر کے نام خط لکھاتی کہیں وہ مریضوں کو دوا دیتے۔ کہیں انہیں آپس کے جھگڑوں میں پنچ بننا پڑتا۔ صبح کے گئے کبھی رات گزرے لوٹتے۔ یہ ان کا روزمرہ کا دستور تھا۔ صوفیا چراغ جلائے ان کی راہ دیکھا کرتی۔ جب وہ آجاتے تو ان کے ہاتھ پیر دھلوا کر کھانا کھلواتی۔ دن بھر کی باتیں اشتیاق سے سنتی اور پھر دونوں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں سونے چلے جاتے۔ وہاں دونے کو ایک گھاس کا بچھونا بچھا ہوا ملتا۔ سرہانے پانی کی ہانڈی رکھی ہوتی۔ صوفیا اتنے ہی سے مطمئن تھی۔ اگر اسے یقین ہو جاتا کہ میری ساری زندگی اسی طرح کٹ جائے گی۔ تو اسے وہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی۔ یہی اس کی زندگی کا خواب شیریں تھا۔ لیکن دونے اتنے صابر اور بے نیاز نہ تھے۔ ان کو محض روحانی ارتباط سے تسکین نہ ملتی تھی۔ صوفیا کا بے مثال حسن۔ اس کی شیریں کلامی، اس کے جسم کا سڈول پن ان کے عشقیہ تخیل کو پریشان کرتا رہتا تھا۔ انہوں نے نامناسب حالات میں پڑ کر ایک بار اسے کھو دیا تھا۔ وہ اب دوبارہ اس امتحان میں نہ پڑنا چاہتے تھے۔ جب اس کا مکان تھا ان کے دل کو کبھی سکون نہ مل سکتا تھا۔

یہ لوگ ریلوے اسٹیشن کے پتہ پر اپنے نام کے خطوط۔ اخبارات رسالے اور کتابیں وغیرہ منگا لیا کرتے تھے۔ ان سے دنیا کے حالات معلوم ہوتے رہتے تھے۔ بیلوں سے انہیں کچھ محبت سی بھی ہو گئی تھی۔ یہاں سے کسی اور جگہ چلے جانے کی انہیں خواہش نہ ہوتی تھی۔ دونوں کو خوف تھا کہ اس محفوظ مقام سے نکل کر ہمارا نہ جانے کیا حال ہو۔ نہ جانے ہم کس بھنور میں جا پھنسیں۔ اس گوشۂ عافیت کو دونوں ہی غنیمت سمجھتے تھے۔ صوفیا کو دنے پر یقین تھا۔ وہ اپنی کشش کی طاقت سے واقف تھی۔ دونے کو صوفیا پر یقین نہ تھا۔ وہ اپنی مقناطیسی قوت سے بے خبر تھے۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ صوفیا دونے کو ناشتہ کرا کے انگیٹھی کے سامنے بیٹھی ہوئی ایک کتاب دیکھ رہی تھی۔ کبھی اہم مقامات پر پنسل سے × کا نشان لگاتی۔ کبھی حاشیہ نشان لگاتی اور کہیں کہیں خط بھی کھینچ دیتی۔ دونے کو

اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں یہ محویت سرد مہری کی علامت تو نہیں ہے۔ مطالعہ میں ایسی محو ہے کہ دوسری طرف دیکھتی بھی نہیں۔ انہوں نے کپڑے پہنے۔ وہ باہر جانا چاہتے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ سرمائی پارچے موجود تھے۔ کمبل کافی نہ تھا۔ آلسی میں ہو کر انگیٹھی کے پاس آئے اور ماچس بیٹھ گئے۔ صوفیا کی نگاہیں کتاب کی طرف لگی ہوئی تھیں وہ کتاب کی اٹھائی ہوئی نظر موقع پاکر آزادی سے اُس کے حُسنِ خداداد کا جلوہ دیکھنے لگے۔ دفعتاً صوفیا نے سر اٹھایا تو وہ کو اپنی طرف مخمور نگاہوں سے تاکتے دیکھا۔ اُس نے شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا۔ "آج تو بڑی سردی ہے۔ کہاں جاؤ گے، بیٹھو تمہیں اس کتاب کے چند ابواب سناؤں۔ نہایت عمدہ کتاب ہے۔" یہ کہہ کر اس نے صحن کی طرف دیکھا۔ بھیلنی غائب تھی۔ شاید لکڑیاں چننے چلی گئی تھی۔ اب دس بجے کے پہلے نہ آئے گی۔ صوفیا کچھ پریشان سی ہو گئی۔

وہ نے اشتیاق آمیز لہجہ میں کہا۔ "نہیں صوفی آج کہیں نہ جاؤں گا۔ تم سے کچھ باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کتاب بند کر کے رکھ دو۔ تمہارے ساتھ رہ کر بھی تم سے باتیں کرنے کو ترستا رہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے صوفیا کے ہاتھوں سے کتاب چھین لینے کی کوشش کی صوفیا کتاب کو مضبوط پکڑ کر بولی۔ "ٹھہرو ٹھہرو۔ کیا کرتے ہو؟ اب یہی شرارت مجھے بھلی نہیں لگتی۔ بیٹھو۔ اس فرانسیسی فلاسفر کے خیالات سناؤں۔ دیکھو اس نے مذہبی تفسیر میں کتنی وسیع النظری سے کام لیا ہے۔"

وہ نے۔ نہیں آج دس منٹ کے لئے تم اس فلاسفر سے چھٹی مانگ لو اور میری وہ باتیں سنو جو کسی پنجرے میں پڑی ہوئی چڑیا کی طرح باہر نکلنے کے لئے تڑپ رہی ہیں۔ آخر میرے اس بن باس کی کوئی مدت ہے یا ہمیشہ مسرت کے خواب ہی دیکھتا رہوں گا؟

صوفیا۔ اس فلاسفر کے خیالات اُس جواب سے کہیں دلچسپ ہیں جو میں تمہیں دے سکتی ہوں۔ مجھے ان پر کئی شکوک ہیں۔ ممکن ہے۔ تمہارا یہ خیالات

سے وہ دفع ہو جائیں۔

وہ نے۔ نہیں۔ یہ کتاب بند کر کے رکھ دو۔ آج میں تنگ آمد بجنگ آمد کا مصداق بن کر حاضر ہوا ہوں۔ آج تم سے وعدہ لئے بغیر تمہارا دامن نہ چھوڑوں گا۔ کیا اب بھی میرا امتحان لے رہی ہو؟

صوفیا نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور متانت سے کہا "میں نے تو اپنے کو تمہارے قدموں پہ ڈال دیا۔ اب اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

وہ نے۔ اگر میں دیوتا ہوتا تو تمہاری محبت آمیز پرستش سے فارغ ہو جاتا لیکن میں بھی تو خواہشات کا تابع کمزور انسان ہوں۔ میں نے جو کچھ پایا ہے اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں اور چاہتا ہوں۔ سب چاہتا ہوں۔ کیا اب بھی تم میرا مطلب نہیں سمجھیں؟ میں تمہارا کوہانی منڈیر پر بیٹھی دیکھ کر آسودہ نہیں۔ میں اُسے اپنے پنجرے میں بلاتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں۔ کیا اور بھی زیادہ صاف الفاظ میں کہوں؟ میں پھل کا رس چاہتا ہوں۔ صرف پھول کی خوشبو سے میرا جی نہیں بھرتا۔

صوفیا۔ وہ نے ابھی بھی مجھ سے بگڑو۔ میں بالکل تمہاری ہی ہوں۔ میں اس وقت یہ بات مبنی صداقت اور خلوص سے کہہ رہی ہوں۔ اس سے زیادہ کسی مرد کا کیا میں یا کسی ہوں کنڈ کے سامنے نہیں کہہ سکتی۔ جس وقت میں نے تمہاری توہین کی تھی اُس وقت بھی تمہاری تھی۔ لیکن معاف کرنا۔ میں کبھی کوئی ایسا کام نہ کروں گی جس سے تمہاری سبکی۔ تمہاری ذلت یا تمہاری بُرائی ہو۔ میری یہ احتیاط اپنے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے ہے۔ روحانی اتصال کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مگر جسمانی اتصال کے لئے عزیز و اقارب کی منظوری اور سوسائٹی کے قواعد کی پابندی لازمی ہے۔ ورنہ یہ اتصال شرمناک ہو جاتا ہے۔ میرا ضمیر مجھے کبھی معاف نہ کرے گا۔ اگر میرے باعث تم پر تمہارے ماں باپ بالخصوص تمہاری ماں کی ناخوشی ہو اور میرے ساتھ تمہیں بھی ننگ خاندان سمجھے لگیں۔ میں قیاس بھی نہیں کر سکتی کہ اس کمزوری کے لئے رائی جی تمہیں اور خصوصاً مجھے کبھی معاف

دیں گی۔ وہ جانتی ہیں۔ دیوی ہیں۔ اُن کا غصہ نہ جانے کیا غضب ڈھائے۔ میں اُن کی نگاہ میں کتنی ذلیل ہوں۔ اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے اور تمہیں بھی انہوں نے انتہائی سزا دے دی جو اُن کے امکان میں تھی۔ ایسی حالت میں جب اُنہیں معلوم ہوگا۔ کہ میرے اور تمہارے درمیان صرف محبت کا رشتہ نہیں۔ عقد کا رشتہ قائم ہو گیا ہے تو عجب نہیں کہ وہ غصہ سے مغلوب ہو کر خودکشی کر لیں۔ ممکن ہے کہ اُس وقت تم ان ساری پیشانیوں کے لئے تیار ہو جاؤ مگر میں مادی تعلق اتنا اہم نہیں سمجھتی۔

دلے نے اُداس ہو کر کہا ــــ "اس کا مطلب کچھ اس کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ میری ساری عمر خوشی کا خواب دیکھتے ہی تمام ہو جائے"۔

صوفیا۔ نہیں دلے میں اتنی ناامید نہیں ہوں۔ مجھے اب بھی اُمید ہے کہ کبھی نہ کبھی رانی جی سے تمہارا اور اپنا قصور معاف کرا لوں گی اور پھر اُن کی دعاؤں کے ساتھ ہم دونوں کی متحد زندگی کا آغاز ہوگا۔ رانی جی کی خوشی اور ناخوشی دونوں انتہا پسند ہوتی ہیں۔ ایک انتہا کا اندازہ ہم کر چکے۔ خدا نے چاہا تو دوسری انتہا کا بھی جلد ہی اندازہ ہو جائے گا۔ میں تم سے منت کرتی ہوں کہ اب اس معاملہ کا ذکر پھر نہ کرنا ورنہ مجھے کوئی دوسرا مکان تلاش کرنا پڑے گا۔

دلے نے آہستہ سے کہا ــــ "وہ دن کبھی آئے گا جب یا تو ماں جی نہ ہوں گی۔ یا میں نہ ہوں گا"۔

پھر انہوں نے کمبل اوڑھا۔ ہاتھ میں لکڑی لی اور باہر چلے گئے جیسے کوئی کسان مویشیوں کی دانت سُن کر اُس کے گھر سے باہر نکلے۔

پھر یہ معمول کئی دن گذرنے لگے۔ دلے بہت دن گرفتہ اور مغموم رہتے۔ جب مکان گھر سے باہر ہی گھوما کرتے۔ آتے بھی تو کھانا کھا کر چلے جاتے۔ کہیں جانا ہوتا تو ندی کے کنارہ پر جا بیٹھتے اور گھنٹوں نظارۂ آب سے دل بہلاتے رہتے۔ کبھی کاغذ کی ناؤیں بنا کر اس میں چھوڑتے اور ان کے پیچھے پیچھے وہاں تک جاتے جہاں کہ وہ غرقاب ہو جاتیں۔ اُنہیں یہ گمان ہونے لگا تھا کہ صوفیا کو اب بھی

مجھ پر یقین نہیں ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے مگر میری اخلاقی طاقت پر اُسے شک ہے۔

ایک روز وہ ندی کے کنارہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ بڑھیا بھیلنی پانی بھرنے کو آئی۔ انہیں وہاں بیٹھے دیکھ کر اُس نے گھڑا رکھ دیا اور بولی۔ کیوں مالک تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟ گھر میں مالکن گھبراتی نہ ہوں گی؟ میں انہیں بہت روتے دیکھا کرتی ہوں کیا تم نے انہیں کچھ کہا ہے کیا؟ کیا بات ہے کہ کبھی تم دونوں کو بیٹھ کر ہنستے بولتے ہوئے نہیں دیکھتی؟

دلے نے کہا۔ کیا کروں مانا۔ انہیں یہی تو بیماری ہے کہ مجھ سے رُوٹھی رہتی ہیں۔ یہ بیماری اُنہیں برسوں سے ہوگئی ہے۔

بھیلنی۔ تو بیٹا۔ اس کا دوا دارو میں کردوں گی۔ ایسی جڑی دے دوں کہ تمہارے بِنا اُنہیں چھن بھر بھی چین نہ آئے۔

دلے نے کہا۔ کیا ایسی جڑی بھی ہوتی ہے؟

بُڑھیا نے واقفیت کے لہجہ میں کہا۔ "بیٹا جڑیاں تو ایسی ایسی ہوتی ہیں۔ کہ چاہے آگ باندھ لو۔ پانی باندھ لو۔ مُردے کو جلا دو۔ مدعی کو گھر بیٹھے مار ڈالو۔ ہاں جاننا چاہیئے۔ تمہارا بھیل بڑا گُنی تھا۔ راجوں کے دربار میں آیا جایا کرتا تھا۔ اُسی نے مجھے دو چار بوٹیاں بتا گئی تھیں۔ بیٹا۔ ایک ایک بوٹی ایک ایک لاکھ کو سستی ہے۔"

دلے۔ تو میرے پاس اتنے روپے کہاں ہیں؟

بھیلنی۔ نہیں بیٹا۔ تم سے میں کیا لوں گی۔ تم تو پُتنا تھ پوری کے نواسی ہو۔ تمہارے درسن ہو گئے۔ یہی میرے لئے بہت ہے۔ وہاں جا کر میرے لئے تھوڑا سا گنگا جل بھیج دینا۔ بُڑھیا تر جائے گی۔ تم نے مجھ سے پہلے نہ کہا نہیں تو میں نے وہی جڑی بوٹی تمہیں دے دی ہوتی۔ تم دونوں کی آن بن دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔

شام کے وقت جب صوفیا بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ بھیلنی نے ایک جڑی لا کر دنے سنگھ کو دی اور بولی "بیٹا۔ بڑے جتن سے رکھنا۔ لاکھ روپے دو گے تب بھی نہ ملے گی۔ اب تو بدّیا ہی اُٹھ گئی۔ اس کو اپنے لہو میں پندرہ دن روج بھگو کر سکھاؤ۔ تب اس میں سے ایک ایک رتی کاٹ کر بالکن کو دُھونی دو۔ پندرہ دن کے پیچھے جو بچ رہے وہ اُن کے جوڑے میں باندھ دو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ بھگوان چاہیں گے تو تم آپ اُن سے اوبنے لگو گے۔ وہ پرچھائیں کی طرح تمہارے پیچھے لگی رہیں گی"۔ یہ کہہ کر اُس نے دنے کے کان میں ایک منتر بتایا جو کئی مہمل الفاظ کا مجموعہ تھا اور کہا کہ جڑی کو لہو میں ڈوباتے وقت یہ منتر پانچ بار پڑھ کر جڑی پر پھونک دینا۔

دنے سنگھ توہم پرست نہ تھے۔ منتر جنتر پر اُن کا ذرا بھی اعتقاد نہ تھا۔ لیکن سُنی سنائی باتوں سے انہیں یہ معلوم تھا کہ بھیلنی ڈائنوں میں اس قسم کے جادو ٹونکے کا بڑا رواج ہے اور کبھی کبھی اُس سے حیرت انگیز نتائج بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ خود عمل میں کوئی طاقت نہیں۔ اگر کچھ نتیجہ ہوتا ہے تو وہ جہلا کی دماغی کمزوری کے سبب۔ تعلیم یافتہ لوگوں پر جو عموماً شکی ہوتے ہیں۔ جڑی بوٹی کی ہستی کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان باتوں کا بھلا کیا اثر ہو سکتا ہے؟ تو بھی انہوں نے عمل کا تہیہ کر لیا۔ انہیں کسی نتیجہ کی امید نہ تھی۔ وہ صرف امتحاناً ایسا کرنا چاہتے تھے۔

لیکن اگر کہیں واقعی اس جڑی میں کوئی معجزہ ہو تو پھر کیا پوچھنا۔ اس کے خیال ہی سے اُن کا دل بے حد مسرور ہو گیا۔ صوفیا میری ہو جائے گی۔ اُس وقت اُس کی محبت میں کچھ اور ہی بات ہو گی۔

جوں ہی منگل کا دن آیا۔ وہ ندی پر گئے۔ اور چاقو سے اپنی ایک انگلی میں زخم کر کے جڑی کو خون سے تر کیا۔ پھر اُسے ایک بلند چٹان پر نتھنوں سے ڈھک کر رکھ آئے۔ پندرہ دن تک متواتر یہی عمل کرتے رہے۔ سردی ایسی تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھٹھرے جاتے تھے۔ برتنوں میں پانی جم جاتا تھا لیکن وہ روزمرہ

نہانے جاتے۔ صوفیا نے اُن میں اتنی پابندی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ کہتی تھی کہ اتنے سویرے نہ نہاؤ۔ کہیں سردی نہ لگ جائے۔ جنگلی لوگ بھی دن بھر آگ جلائے بیٹھے رہتے ہیں۔ باہر منہ نہیں نکالا جاتا۔ ذرا دھوپ پھیلنے پر غسل کیا کرو۔ اس پر وہ مسکرا کر کہہ دیتے کہ بیمار پڑوں گا تو کم از کم میرے پاس بیٹھو گی تو۔ ان کی کئی انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں مگر وہ زخموں کو چھپائے رہتے تھے۔

ان دنوں وہ نے کی نگاہ صوفیا کی ایک ایک بات، ایک ایک چال پر لگی رہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میرے عمل کا کچھ اثر ہو رہا ہے یا نہیں۔ مگر کوئی ظاہر نتیجہ نہ دکھائی دیتا تھا۔ آخر ہفتہ بھر میں روز انہیں صوفیا کے برتاؤ میں کچھ خفیف سا فرق نظر آیا۔ شاید کسی اور وقت اُن کا خیال بھی اُس طرف نہ جاتا۔ مگر آج کل تو اُن کی نگاہ بہت باریک بین ہو گئی تھی۔ جب وہ گھر سے باہر جانے لگے تو صوفیا نادانستہ طرفہ پر نکل آئی اور کئی فرلانگ تک اُن سے باتیں کرتی ہوئی چلی گئی۔ جب وہ نے بہت اصرار کیا تو لوٹی۔ وہ نے سمجھا کہ یہ اُسی عمل کا اثر ہے۔

آج سے دُھونی دینے کا کام شروع ہوتا تھا۔ وہ نے بہت متفکر تھے ــــ یہ عمل کیونکر پورا ہوگا۔ تنہا صوفیا کے کمرہ میں جانا تہذیب۔ شرافت اور انسانیت کے خلاف ہے۔ کہیں صوفیا جاگ پڑے اور مجھے دیکھ لے تو مجھ کو کتنا کمینہ سمجھے گی۔ شاید ہمیشہ کے لئے مجھ سے متنفر ہو جائے۔ وہ نہ بھی جاگے تو بھی یہ کون سا اخلاق ہے کہ کوئی مرد کسی نوجوان عورت کے کمرہ میں جائے۔ نہ جانے وہ کس حالت میں لیٹی ہوگی۔ ممکن ہے کہ بال کھلے ہوں۔ کپڑا ہٹ گیا ہو۔ اُس وقت میرے دل میں کیا کیا پُر خیالات پیدا ہوں گے۔ میں اخلاقی نقطۂ خیال سے کس درجہ گر جاؤں گا۔

تمام دن وہ انہیں پریشان کُن خیالات میں محو رہے لیکن شام ہوتے ہی وہ کُمہار کے یہاں سے ایک کچا پیالہ لائے اور اُسے حفاظت سے رکھ دیا۔ انسانی فطرت میں یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکثر ہم ایسے کام کر ڈالتے ہیں جن کے کرنے کی ہمیں خواہش نہیں ہوتی۔ کوئی پوشیدہ ترغیب ہم کو اپنی مرضی کے خلاف چلنے پر

مجبور کرتی ہے۔

آدھی رات ہوئی تو ونے پیالے میں آگ اور ہاتھ میں وہی فون بھگو کر سُکھائی ہوئی جڑی لے کر صوفیا کی کوٹھڑی کے دروازہ پر پہنچے۔ کمبل کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جھونپڑے میں کواڑ کہاں؟ کمبل کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے کان لگا کر سُنا۔ صوفیا بیٹھی نیند سو رہی تھی۔ وہ تھر تھر کانپتے پسینہ سے تر اندر داخل ہوئے۔ چراغ کی دھیمی روشنی میں صوفیا خواب میں مدہوش لیٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے دماغ میں نازک خیالی بس رہی ہو۔ ونے کے دل پر رعب سا چھا گیا۔ کئی منٹ تک مسحور سے کھڑے رہے مگر اپنے کو سنبھالے ہوئے۔ گویا کسی دیوی کے مندر میں ہوں۔ ہر حسین دلوں میں حسنِ خداداد کا نظارہ پرستش کے جذبات کو متحرک کر دیتا ہے اور خواہشات نفسانی کو مسکن۔ ونے کچھ دیر تک صوفیا کو عقیدتمندانہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ پھر وہ آہستہ سے بیٹھ گئے۔ پیالہ میں جڑی کا ایک چھوٹا ٹکڑا توڑ کر رکھ دیا اور اُسے صوفیا کے سرہانے کی طرف کھسکا دیا۔ ایک لمحہ میں جڑی کی خوشبو سے سارا کمرہ مہک گیا۔ عود اور عنبر میں یہ خوشبو کہاں؟ دھوئیں میں کچھ ایسا جوش افزا اثر تھا کہ ونے کا دل بیقرار ہو گیا۔ جونہی دھواں بند ہوا۔ ونے نے پیالے سے جڑی کی راکھ نکال لی۔ بھیلنی کی ہدایت کے مطابق اُسے صوفیا پر چھڑک دیا اور باہر نکل گئے۔ لیکن اپنی کوٹھڑی میں جا کر وہ گھنٹوں بیٹھے پچھتاتے رہے۔ انہوں نے بار بار اپنے اخلاقی حسیات کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ اپنے اس فعل کو دغابازی اور عصمت دری کہہ کر دل میں نفرت پیدا کرنی چاہئے۔ سوتے وقت قصد کر لیا کہ بس آج ہی سے اس عمل کا خاتمہ ہے۔ دوسرے روز وہ دن بھر غمگین اُداس اور پریشان رہے۔ جوں جوں رات نزدیک آتی تھی۔ انہیں اندیشہ ہوتا جاتا تھا کہ کہیں میں پھر اُسی عمل کو نہ کروں۔ وہ دو تین بھیلوں کو بلا لائے اور انہیں اپنے پاس سُلایا۔ انہوں نے کھانا بھی دیر سے کھایا کہ بستر پر جاتے ہی نیند آ جائے۔ جب کھانا کھا کر اُٹھے تو صوفیا آ کر اُن کے پاس بیٹھ گئی۔ یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ وہ رات کو اُن کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ بہت دیر تک اُن کے پاس

بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ آج کے اخبارات میں پربھو سیوک کی پونا والی تقریر شائع ہوئی تھی۔ صوفیا نے اُسے بلند لہجہ میں پڑھا۔ اُس کا سر غرور سے اُونچا ہو گیا۔ بولی ۔ دیکھو کتنا عشرت پسند شخص تھا جسے ہمیشہ عمدہ کپڑوں اور عمدہ سامانوں کی دُھن لگی رہتی تھی۔ اُس کی کتنی کایا پلٹ ہوئی ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس سے کبھی کچھ نہ ہوگا۔ تن پرستی ہی میں اُس کی زندگی بسر ہوگی۔ انسانی دل کے بھید سمجھ میں نہیں آتے۔ اُس کے اس پریم اور تیاگ پر تعجب ہوتا ہے۔

ونے۔ جب پربھو سیوک اس جماعت کے مہتمم ہو گئے۔ تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر گنگولی تو اُسے تقسیم کرنے والوں کی جماعت بنا کر چھوڑتے۔ تیاگ پر میرا یقین نہیں ہے اور اندرونت تو بالکل اُجڈ ہے۔ پربھو سیوک سے زیادہ قابل شخص نہ مل سکتا تھا۔ وہ یہاں ہوتے تو بلائیں لیتا۔ یہ خدائی مدد ہے اور اب مجھے اُمید ہوتی ہے کہ ہماری کوشش بیکار نہ جائے گی۔

بھیلوں کے خراٹوں کی آوازیں آنے لگیں۔ صوفیا چلنے کو اُٹھی تو اُس نے ونے کو ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ جس میں محبت کے سوا اور بھی کچھ تھا۔ ایک تو خواہش جھلک رہی تھی۔ ایک کشش تھی جس نے ونے کو سر سے پیر تک ہلا دیا۔ جب وہ چلی گئی تو اُنہوں نے ایک کتاب اُٹھالی اور پڑھنے لگے۔ لیکن جوں جوں عمل کا وقت قریب آتا تھا اُس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جبراً اُنہیں دھکیل رہا ہے۔ جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ صوفیا سو گئی ہوگی تو وہ آہستہ سے اُٹھے۔ پیالہ میں آگ لی اور چلے۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ خائف تھے۔ ایک بار جی میں آیا کہ پیالہ کو پٹک دوں۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد ہی اُنہوں نے صوفیا کی کوٹھڑی میں قدم رکھا۔ آج اُنہوں نے اپنی نگاہیں اوپر نہیں اُٹھائیں۔ سر نیچا کئے ہوئے دُھونی سُلگائی اور راکھ چھڑک کر چلے آئے۔ چلتی بار اُنہوں نے صوفیا کی چاند سی صورت دیکھی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایشور اب لاج تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اِس نے دیکھ نہ لیا ہو۔ بڑی تیزی

سے اپنی کوٹھڑی میں آئے۔ چراغ بجھا دیا اور چارپائی پر گر پڑے۔ گھنٹوں دل دھڑکتا رہا!

اس طرح پانچ روز تک ونے نے بڑی دقت سے اس کام کو کیا اور اتنے ہی دنوں میں انہیں صوفیا پر اس کا اثر صاف نظر آنے لگا۔ حتیٰ کہ پانچویں دن وہ دوپہر تک اُن کے ساتھ بھیلوں کے جھونپڑوں کی سیر کرتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں متانت کی جگہ اب اشتیاق انگیز شوخی نمودار تھی۔ اور لبوں پر شیریں تبسم تھا۔ آج رات کو کھانے کے بعد وہ اُن کے پاس بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگی۔ پڑھتے پڑھتے اُس نے اپنا سر ونے کی گود میں رکھ دیا اور اُن کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی —

"سچ بتاؤ ونے۔ ایک بات تم سے پوچھوں۔ بتاؤ گے نا؟ سچ بتانا۔ تم یہ تو نہیں چاہتے کہ یہ بلا سر سے ٹل جائے؟ میں کہے دیتی ہوں کہ جیتے جی نہ ٹلوں گی۔ نہ تمہیں چھوڑوں گی۔ تم بھی مجھ سے بھاگ کر نہیں جا سکتے۔ کسی طرح نہ جانے دوں گی۔ جہاں جاؤ گے میں بھی چلوں گی۔ تمہارے گلے کا ہار بنی رہوں گی۔ یہ کہتے کہتے اس نے ونے کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اُن کے گلے میں باہیں ڈال دیں"

ونے کو ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیر اکھڑ گئے ہیں اور میں لہروں میں بہا جا رہا ہوں۔ ایک عجیب خوف سے اُن کا دل کانپ اٹھا گویا انہوں نے کھیل میں شیرنی کو جگا دیا ہو۔ انہوں نے نامعلوم طریقہ پر خود کو صوفیا کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور بولے — صوفیا!

صوفیا چونک پڑی گویا خواب میں تھی۔ پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی — مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں اگلے جنم سے اُس کے قبل سے ابتدا ہی سے تمہاری ہوں۔ کچھ خواب سا یاد آتا ہے کہ ہم اور تم کسی ندی کے کنارے ایک جھونپڑے میں رہتے تھے۔ سچ!

ونے نے خائف ہو کر کہا۔ "تمہارا جی کیسا ہے؟"

صوفیا۔ مجھے کچھ ہڑا تھڑا ہی ہے۔ میں تو اپنے اگلے جنم کی بات یاد کر رہی ہوں۔ مجھے ایسا یاد آتا ہے کہ تم مجھے جھونپڑے میں تنہا چھوڑ کر اپنی کشتی پر کہیں پردیس چلے

گئے تھے اور میں روز ندی کے کنارے بیٹھ کر تمہاری راہ دیکھتی رہتی تھی پر تم آتے نہ تھے۔

وِنے۔ صوفیا مجھے خوف ہو رہا ہے کہ تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ رات بہت گئی ہے۔ اب سو جاؤ۔

صوفیا۔ "میرا تو آج یہاں سے چلنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ کیا تمہیں نیند آ رہی ہے۔ تو سو جاؤ۔ میں بیٹھی ہوں۔ جب تم سو جاؤ گے میں چلی جاؤں گی۔" ایک لمحہ بعد پھر بولی — "مجھے نہ جانے کیوں خوف ہو رہا ہے کہ تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ سچ بتاؤ کیا تم مجھے چھوڑ جاؤ گے؟"

وِنے۔ صوفی اب ہم روز ابد تک جُدا نہ ہوں گے۔

صوفیا۔ تم اتنے بیدرد نہیں ہو۔ میں جانتی ہوں۔ میں رانی مجا سے نہ ڈروں گی۔ صاف صاف کہہ دوں گی کہ وِنے میرے ہیں۔

وِنے کی حالت اس بھوکے پیاسے آدمی کی سی تھی جس کے آگے پروسی ہوئی تھالی رکھی ہو۔ بھوک سے طبیعت بے چین ہو۔ آنتیں قُل ہو اللہ پڑھ رہی ہوں۔ بھوک سے آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا ہو مگر تھالی میں ہاتھ نہ ڈال سکتا ہو۔ اس لئے پہلے کسی دیوتا کا بھوگ لگانا ہے۔ انہیں اب اس میں کوئی شک نہ رہا تھا کہ صوفیا کی بیقراری اُن کے عمل کا نتیجہ ہے۔ اُنہیں تعجب ہوتا تھا کہ اُس جڑی میں ایسی کون سی تاثیر ہے۔ وہ اپنے فعل پر نادم تھے۔ دُکھی تھے اور سب سے زیادہ خوفزدہ تھے۔ آتما سے نہیں پرماتما سے نہیں۔ صوفی سے! جب صوفیا کو معلوم ہو جائے گا۔ کبھی نہ کبھی تو یہ نشہ اُترے ہی گا۔ اُس وقت وہ مجھ سے اُس کا سبب پوچھے گی اور میں چھپا نہ سکوں گا۔ اُس وقت وہ مجھے کیا کہے گی۔

آخر جب انگیٹھی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی اور صوفیا کو سردی معلوم ہونے لگی تو وہ اُٹھ کر چلی گئی۔ عمل کا وقت بھی آ پہنچا۔ لیکن آج وِنے کو عمل کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اُنہیں جڑی کا امتحان ہی لینا تھا وہ ہو گیا اور اُنہیں ایسے عمل پر

ہمیشہ کے لئے اعتقاد ہو گیا۔

صوفیا کو چارپائی پر لیٹتے ہی الہام ہوا کہ رانی صاحبہ ساتھ کھڑی ہوئی تاک رہی ہیں۔ اُس نے کمبل سے سر کو باہر کر کے دیکھا اور اپنی دماغی کمزوریوں پر جھنجھلا کر وہ سوچنے لگی ۔ آج کل مجھے کیا ہو گیا ہے ؟ مجھے کیوں طرح طرح کے اندیشے ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں روز ناگوار واقعات کا خوف دل پر طاری رہتا ہے؟ جیسے مجھ میں تمیز ہی نہیں باقی رہی۔ ونے آج کل کیوں کھینچے ہوئے ہیں ؟ شاید وہ ڈر رہے ہیں کہ رانی جی کہیں انہیں بد دعا نہ دے دیں یا خودکشی نہ کر لیں۔ ان کی باتوں میں پہلا سا جوش ہے اور نہ پہلی سی محبت۔ رانی میری زندگی کو تباہ و برباد کئے دیتی ہیں۔

انہیں خیالات پریشان کے ہوتے ہوئے وہ سو گئی۔ تو دیکھتی کیا ہیں۔ کہ واقعی رانی جی میرے سامنے کھڑی قہر آلود نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں ۔ ونے میرا ہے۔ وہ میرا بچہ ہے۔ اُسے میں نے پیدا کیا ہے۔ پالا پوسا ہے۔ تو کیوں اُسے میرے ہاتھوں چھینے لیتی ہے ؟ اگر تو نے اُس کو مجھ سے چھینا میرے خاندان کو داغ لگایا تو میں تم دونوں کو اس تلوار سے قتل کر دوں گی۔

صوفیا تلوار کی چمک سے گھبرا گئی۔ چلّا اُٹھی۔ نیند ٹوٹ گئی۔ اُس کا سارا بدن تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ وہ دل مضبوط کر کے اُٹھی اور ونے کی کوٹھڑی میں جا کر اُن کے سینے سے لپٹ گئی۔ ونے کی آنکھیں لگ ہی رہی تھیں۔ انہوں نے چونک کر سر اُٹھایا۔

صوفیا۔ ونے ونے جاگو! میں ڈر رہی ہوں

ونے ۔ فوراً چارپائی سے اُتر کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے پوچھا ۔ کیا ہے صوفیا ؟

صوفیا۔ رانی جی کو ابھی ابھی میں نے اپنے کمرہ میں دیکھا۔ ابھی وہیں کھڑی ہیں۔

دونے۔ صوفیا۔ اطمینان رکھو۔ تم نے کوئی خواب دیکھا ہے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔

صوفیا۔ خواب نہیں تھا دونے! میں نے رانی جی کو مجسم دیکھا۔

دونے۔ وہ یہاں کیسے آجائیں گی؟ ہُوا تو نہیں ہیں۔

صوفیا۔ تم ان باتوں کو نہیں جانتے۔ دونے! ہر شخص کے دو قالب ہوتے ہیں۔ ایک کثیف دوسرا لطیف۔ دونوں مشابہ ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے۔ کہ دوسرا پہلے سے کہیں زیادہ لطیف ہوتا ہے۔ وہ معمولی حالتوں میں نظر نہیں آتا۔ مگر اِغفہ یا خواب کی حالت میں کثیف جسم کا عوض بن جاتا ہے۔ رانی جی کا لطیف جسم یہاں ضرور ہے۔

دونوں نے بیٹھ کر ساری رات آنکھوں میں کاٹی۔ صوفیا کو اب دونے کے بغیر ایک لمحہ بھی چین نہ آتا۔ اُسے صرف دماغی بے چینی تھی۔ نفسانی خواہشات پُورا کرنے کے لئے بھی بے چین رہتی۔ جن باتوں کے محض خیال سے اُسے نفرت ہوتی تھی۔ جن باتوں کی فقط یاد سے اُس کے چہرہ پر شرم کی سُرخی دوڑ جاتی تھی۔ وہی باتیں اب ہر وقت اُس کے دل میں موجود رہتیں۔ اُسے اپنی اس دلی کثافت پر تعجب ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ عشق و عشرت کے تصور میں محو ہو کر اُس دائرہ میں قدم رکھتی جو تباہی ہی کے لئے مخصوص ہے۔ تو رانی جی کی وہی غضب ناک مورت اُس کے رُوبرو آکر کھڑی ہو جاتی اور وہ چونک کر کمرہ سے نکل بھاگتی اس طرح اُس نے دس بارہ یوم گزارے۔ شمشیر برہنہ کے نیچے کھڑے ہوئے مجرم کی حالت بھی اتنی بُری نہ ہوتی ہوگی۔

ایک روز وہ گھبرائی ہوئی دونے کے پاس آئی اور بولی۔ دونے میں بنارس جاؤں گی میں بڑی پریشانی میں ہوں۔ رانی جی یہاں مجھے چین نہ لینے دیں گی۔ اگر یہاں رہی۔ تو شاید مجھے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے۔ مجھ پر ضرور کوئی نہ کوئی عمل کیا گیا ہے۔ میں اتنی پریشان حال کبھی نہ تھی۔ مجھے خود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں وہ نہیں رہی۔ کوئی اور ہی ہوگئی ہوں۔ میں جاکر رانی جی کے پیروں پڑوں گی۔ اُن سے اپنی خطا معاف

کراؤں گی اور انہیں کی اجازت سے تمہیں حاصل کر سکوں گی۔ اُن کی مرضی کے بغیر میں تمہیں نہیں پا سکتی۔ اور جبراً لے لوں تو غیریت سے نہ گزرے گی۔ مجھے خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ میں تمہارے لئے اتنی اکتانے والی چیز ہو جاؤں گی۔ میرا دل اتنا کمزور۔ اتنا گریدہ کبھی نہ تھا۔

وہ نے متردد ہو کر کہا ــــ صوفیا۔ مجھے اُمید ہے کہ چند روز میں تمہارے دل کو قرار ہو جائے گا۔

صوفیا۔ نہیں وہ نے ہرگز نہیں۔ رانی جی نے تمہیں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ موقوفہ شے سے مستفید ہونا مضرت رساں ہوا کرتا ہے۔ میں اُن سے بھیک مانگوں گی ــــ

وہ نے۔ تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیا۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ میں تمہیں رانی جی کے سامنے نہ لے جاؤں گی۔ مجھے تنہا چلنے دو۔

وہ نے۔ اس حالت میں میں تمہیں تنہا کبھی نہ جانے دوں گا۔ اگر ایسا ہی ہے تو میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آجاؤں گا۔

صوفیا۔ وعدہ کرو کہ بلا میری اجازت رانی جی کے پاس نہ جاؤ گے۔

وہ نے۔ ہاں صوفیا یہ منظور ہے۔ وعدہ کرتا ہوں۔

صوفیا۔ پھر بھی دل نہیں مانتا۔ ڈر لگتا ہے۔ کہ وہاں تم جوش میں آکر کہیں رانی جی کے پاس نہ چلے جاؤ۔ تم یہیں کیوں نہیں رہتے؟ میں تمہیں روزمرہ خط لکھا کروں گی۔ اور جلد سے جلد واپس آجاؤں گی۔

وہ نے اُسے تسکین دینے کے لئے تنہا جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اُن کا محبت میں ڈوبا ہوا دل یہ کب گوارا کر سکتا تھا کہ صوفیا اس اضطراب کی حالت میں اتنا طویل سفر تنہا کرے۔ سوچا اُس کی نگاہ بچا کر گاڑی کے کسی دوسرے کمرہ میں بیٹھ جاؤں گا۔ انہیں واپسی کی بہت کم اُمید تھی۔ بھیلوں نے سُنا۔ تو

انواع و اقسام کے تحفے دے کر انہیں رخصت کرنے کو آموجود ہوئے۔ ہرنوں کی کھالیں شیروں کے ناخون اور نہ جانے کن کن جڑی بوٹیوں کا انبار لگ گیا۔ ایک بھیل نے اپنی بھاری کمان تذر کی۔ صوفیا اور ونے دونوں ہی کو اس مقام سے رخصت ہو گئی تھی وہاں کے باشندوں کی سیدھی سادی اور سچی زندگی انہیں ایسی پسند آگئی تھی۔ کہ چھوڑ کر جاتے ہوئے دل رنج ہوتا تھا۔ بھیل لوگ کھڑے رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ کہ جلد آنا۔ ہمیں بھول نہ جانا۔ بڑھیا بھیلنی تو انہیں کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔ سب کے سب اسٹیشن تک انہیں پہنچانے آئے۔ لیکن جب گاڑی کے آجانے پر ونے سے جدا ہونے کا وقت آیا تو صوفیا اُن کے گلے سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔ ونے چاہتے تھے کہ نکل جائیں اور کسی دوسری گاڑی میں بیٹھیں مگر اُن کو چھوڑتی ہی نہ تھی گویا کہ وہ آخری ملاقات تھی۔ جب انجن نے سیٹی دی تو وہ دلی صدمہ سے بیقرار ہو کر بولی — ونے مجھ سے اتنے دنوں تک کیسے رہا جائے گا؟ رو رو کر مر جاؤں گی۔ ایشور میں کیا کروں؟

ونے۔ صوفیا۔ گھبراؤ نہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔

صوفیا۔ نہیں نہیں۔ خدا کے لئے۔ میں اکیلی ہی جاؤں گی۔

ونے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور گاڑی چل دی۔ ذرا دیر بعد صوفیا نے کہا — تم نہ آتے تو میں شاید گھر تک نہ پہنچتی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جان نکلی جا رہی ہے۔ سچ بتانا تم نے مجھ پر جادو تو نہیں کر دیا۔ میں اتنی بے صبر کیوں ہوں۔

ونے نے شرمندہ ہو کر کہا۔ کیا جانے صوفی۔ میں نے ایک عمل کیا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ جادو تھا یا کچھ اور۔

صوفیا۔ سچ؟

ونے۔ ہاں بالکل سچ؟ میں تمہاری سرد مہری سے خائف ہو گیا تھا کہ مبادا تم پھر میرا امتحان لو۔

صوفیا نے ونے کی گردن میں ہاتھ ڈال دئے اور بولی — تم بڑے چھلیا ہو۔ اپنا جادو اُتار لو۔ مجھے کیوں مار رہے ہو؟

**وِنے** ۔ کیا کہوں اُتارنا نہیں سیکھا۔ یہی تو غلطی ہوئی۔

**صوفیا** ۔ تو مجھے بھی وہی منتر کیوں نہیں سکھا دیتے؟ نہ میں اُتار سکوں گی۔ نہ تم اتار سکو گے ۔۔۔ ایک کو بعد لیکن نہیں ہیں ۔۔۔ نہ بچا رہے گی۔ دونوں سے ایک کو تو ہوشیار رہنا ہی چاہئے۔ دونوں بے ہوش ہو جائیں گے تو بُرا ہوگا۔ اچھا بتاؤ۔ کون سا عمل کیا ہے؟

**وِنے** نے اپنی جیب سے اس جڑی کو نکال کر دکھاتے ہوئے کہا ۔۔۔ بس اس کی دُھونی دیتا تھا۔

**صوفیا** ۔ جب میں سو جاتی تھی؟

**وِنے** ۔ (زیادہ شرمندہ ہوکر) ہاں صوفیا۔ جبھی۔

**صوفیا** ۔ تم بڑے گستاخ ہو۔ اچھا وہ بڑی مجھے دے دو۔ تم ۔۔۔ کی محبت کم ہوتے دیکھوں گی تو میں بھی وہی عمل کروں گی۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے جڑی لے کر رکھ لی۔ ذرا دیر بعد اُس نے پُوچھا۔ یہ تو بتاؤ کہ وہاں تم رہو گے کہاں؟ میں تمہیں رانی کے پاس نہ جانے دوں گی۔

**وِنے** ۔ اب میرا کوئی دوست نہیں رہا۔ سبھی مجھ سے بدظن ہو رہے ہونگے نائیک رام کے گھر چلا جاؤں گا۔ تم وہیں آکر مجھ سے مل لیا کرنا۔ وہ تو اپنے گھر پہنچ ہی گیا ہوگا۔

**صوفیا** ۔ کہیں جا کر نہ کہہ دے۔

**وِنے** ۔ نہیں۔ وہ احمق ہو مگر دغاباز نہیں ہے۔

**صوفیا** ۔ اچھی بات ہے۔ دیکھیں رانی صاحبہ سے مراد ملتی ہے یا موت!

## (۳۹)

تیسرے روز سفر ختم ہوگیا۔ شام ہو چکی تھی۔ صوفیا اور وِنے دونوں ڈرتے ہوئے گاڑی سے اُترے کہ کہیں کسی شناسا سے ملاقات نہ ہو جائے۔ سونیلے بیوپاری جھوٹ

دینے کا گھر، جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ رانی صاحبہ نہ جانے
کون طرح پیش آئیں۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ تا حق یہاں آئی۔ نہ جانے کیسی پڑے۔ کیسی
نہ پڑے۔ اب اسے اپنے دیہاتی زندگی کی یاد آنے لگی۔ کتنا سکون تھا کتنی سادی زندگی
تھی۔ نہ کوئی خیال نہ کاوٹ تھی۔ نہ کسی سے حسد تھا نہ کینہ۔ وہ اپنے سنگھ کو
تسکین دیتے ہوئے ہے ۔۔۔ دل مضبوط رکھنا۔ ذرا بھی نہ ڈرنا۔ سچی باتیں کہہ
دینا۔ مگر سچی ذرا بھی سب لغزش نہ ہو۔ ذرا بھی خوشامد نہ ہو۔ التجا اور سوال کا ایک
کلمہ بھی زبان سے نہ نکالنا۔ میں باتوں کو گھٹا بڑھا کر اپنی جان کی حفاظت نہیں کرنا
چاہتا۔ میں انصاف اور خالص التجا چاہتا ہوں۔ اگر وہ تم سے ناشائستہ سلوک کریں
سخت الفاظ کا استعمال کریں تو جو تم ذرا بھی نہ ٹھہرنا۔ علے الصباح آکر مجھ سے ایک
ایک بات کہہ دینا۔ یا کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔

صوفیا نہیں ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوئی۔ وہ تو پانڈے پور کی طرف
چلے اور وہ سیوا بھون کی طرف چلی۔ تانگہ والے نے کہا ۔۔۔ مس صاحب۔ آپ کہیں
چلو گئی تھیں کیا؟ بہت دنوں بعد دکھلائی دیں۔

صوفیا کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ بولی ۔۔۔ تم نے مجھے کب دیکھا؟ میں
تو اس شہر میں پہلی ہی بار آئی ہوں۔

تانگہ والے نے کہا۔ آپ ہی جیسی ایک مس صاحب یہاں سیوک صاحب کی
بی بی تھیں۔ میں نے سمجھا۔ آپ ہی ہوں گی۔

صوفیا۔ میں عیسائی نہیں ہوں۔

جب وہ سیوا بھون کے سامنے پہنچی تو تانگہ سے اتر پڑی۔ وہ رانی صاحبہ کے ملنے
سے پہلے اپنے آنے کی کانوں کان خبر نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنا بیگ نکالا
ڈیوڑھی پر گئی اور دربان سے بولی ۔۔۔ جاکر رانی سے کہو کہ مس صوفیا آپ سے
ملنا چاہتی ہیں۔

دربان اسے پہچانتا ہی تھا۔ اس نے اٹھ کر سلام کیا اور بولا ۔۔۔ ہجور اندر

چلیں۔ اطلاع کیا کرنی ہے۔ بہت دنوں کے بعد آپ کے درشن ہوئے۔

صوفیا۔ میں بہت اچھی طرح کھڑی ہوں۔ تم جا کر اطلاع تو کر دو۔

دربان۔ سرکار۔ اُن کا مجاج آپ جانتی ہی ہیں۔ بگڑ اُٹھیں گی کہ ساتھ کیوں نہ لایا۔ اطلاع کیوں دینے آیا؟

صوفیا۔ میری خاطر سے دو چار باتیں سُن لینا۔

دربان اندر گیا۔ صوفیا کا دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پتا ہل رہا ہو۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں رانی صاحبہ غصہ میں بھری رہیں سے بگڑتی ہوئی نہ آئیں یا کہلا دیں۔ کہ چلی جا۔ میں نہیں ملنا چاہتی۔ ایک مرتبہ اُن سے ملے بغیر تو میں جانے کی نہیں۔ چاہے وہ ہزار بار دُھتکاریں

ایک منٹ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ رانی جی شال اوڑھے ہوئے دروازہ پر آگئیں اور اس سے لپٹ کر گلے ملیں جیسے کوئی ماں سسرال سے آئی ہوئی بیٹی کو گلے لگاتی ہے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ روندھے ہوئے گلے سے بولیں ——— تم یہیں کیوں کھڑی رہ گئیں۔ بیٹی اندر کیوں نہ چلی آئیں میں تو روز ہی تمہاری راہ دیکھتی رہتی تھی۔ تم سے ملنے کو جی تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ مجھے اُمید بھی نہ تھی کہ تم آ رہی ہو پر تم آتی نہ تھیں۔ کئی بار یونہی اسٹیشن تک گئی کہ شاید تمہیں دیکھ سکوں۔ اسٹیشر سے روزنہ دعائیں کرتی تھی کہ ایک بار تم سے ملاقات ہو۔ چلو اندر چلو۔ میرے تمہارے ساتھ جو سخت کلامی کی تھی اُسے بھول جاؤ۔ (دربان سے) یہ بیگ اُٹھا لے میری سے کہہ دے کہ مس صوفیا کا پرانا کمرہ صاف کر دے۔ بیٹی تمہارے کمرہ کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ دل بھر آتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے وہ صوفیا کا ہاتھ پکڑے اپنے کمرہ میں آئیں اور اُسے اپنی بغل میں مسند پر بٹھا کر بولیں۔ آج میری مراد پوری ہو گئی۔ تم سے ملنے کو دل بہت بے چین تھا۔

صوفیا کا متفکر دل اس بے نوث محبت کے اظہار سے بیقرار ہو گیا۔ وہ صرف اتنا کہہ سکی ـــــ مجھے بھی آپ کے درشن کی بڑی خواہش تھی۔ آپ سے اپنی غلطیوں معاف کرانے آئی ہوں۔

رانی ۔ بیٹی تم دیوی ہو۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ میں نے تمہیں پہچانا نہ تھا۔ مجھے سب معلوم ہے بیٹی۔ سب سن چکی ہوں۔ تمہارا دل اتنا پاک و صاف ہے۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ آہ اگر میں پہلے سے جانتی!

یہ کہتے کہتے رانی صاحبہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ جب طبیعت ٹھہری۔ تو پھر بولیں ـــ اگر پہلے سے جان گئی ہوتی تو آج اس گھر کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا۔ آہ میں نے ونے کے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ تمہیں ۔ معلوم ہوگا۔ بیٹی جب تم نے ۔ ۔ ۔ ۔ سورج کمار بیرباری سنگھ ہی نام تھا؟ ہاں جب تم نے اس کے کفر پرات کے وقت دینے کو ملامت کی تو وہ نادم ہو کر ریاست کے حکام کے پاس فریادیں پہ رحم کرنے کے لئے دوڑتا رہا۔ وہ دن دن بھر بھوکا پیاسا پڑا رہتا۔ رات رات بھر روتا کرتا۔ کبھی دیوان کے پاس جاتا۔ کبھی ایجنٹ کے پاس کبھی پولیس افسر اعلیٰ کے پاس۔ کبھی تمہارا جا صاحب کے پاس۔ سب سے دھتکار کر نکالا گیا۔ کسی نے نہ سنی۔ غریبوں کی فریاد کون سنتا ہے۔ آخر تنگ آ کر وہ بیرنگ لوٹ گیا۔ کسی نے نہ سنی۔ غریبوں کی فریاد کون سنتا ہے۔ آخر تنگ آ کر وہ بیرنگ لوٹ گیا۔ وہاں سے مایوس ہو کر اپنے گھر پہنچا۔ وہاں سے پھر آیا۔ وہ تمہارے نام کا پیارا خط تھا۔ جسے تم نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اس نے اور کر دیا۔ وہ خط نہیں تھا زہر کا پیالہ تھا۔ جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے پلایا۔ تم نے لکھا تھا کہ اس کی گردن پر چھری رکھ دو۔ تم نے لکھا تھا کہ اس کی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دو۔ تم نے لکھا تھا کہ اس کی آنکھیں نکال لو۔ تم نے لکھا تھا کہ اس کی صورت نہ دکھانا۔ اور بھی نہ جانے کتنی سخت باتیں لکھی تھیں۔ یاد کرتی ہوں تو چھاتی پھٹنے لگتی ہے۔ یہ خط پاتے ہی بالکو نے گھر جانے کا ایک رام کے ساتھ یہاں آنے کو تیار ہو گیا۔ کئی ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے ساتھ آئے۔ پھر بیٹا جی کو ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی آنکھیں کھلیں۔

رونے کا کہیں گاڑی میں پتہ نہ تھا۔ انہوں نے ساری گاڑی میں ڈھونڈ مارا۔ پھر اودے پور تک لیے۔ راستہ میں ایک ایک اسٹیشن پر اُتر کر دریافت کیا مگر سب بے سُود۔ بیٹی یہ اس دُکھیا کی رام کہانی ہے میں ہتیارنی ہوں مجھ سے زیادہ ابھاگنی دُنیا میں کون ہوگی نہ جانے رونے کا کیا حال ہُوا کچھ پتہ نہیں۔ وہ بڑا غیرت مند ہے بیٹی۔ بات کا بڑا دھنی میری باتیں اُس کے دل میں بُھالے کی طرح لگیں۔ میرے پیارے حل نے کبھی آرام نہ پایا۔ اُس کی ساری زندگی تپسیا ہی میں گزری۔

یہ کہہ کر رانی پھر رونے لگیں۔ صوفیا بھی رو رہی تھی۔ مگر دونوں کے خیالات میں کتنا فرق تھا۔ رانی کے آنسو فکر و غم کے تھے اور صوفیا کے آنسو مسرت و جوش کے۔

ایک لمحہ بعد رانی جی نے پُوچھا ـــ کیوں بیٹی تم نے اُسے جیل میں دیکھا تھا بہت دُبلا ہو گیا تھا؟

صوفیا ـ جی ہاں۔ پہچانے نہ جاتے تھے۔

رانی۔ اس نے سمجھا کہ باغیوں نے نہ جانے تمہارے ساتھ کیسا سلوک کیا ہو۔ بس اسی بات پر اُسے ضد ہو گئی۔ آرام سے بیٹھو بیٹی۔ اب یہی تمہارا گھر ہے اب میرے لیے تمہیں رونے کی جگہ پیدا ہو۔ اب یہ بتاؤ تم اتنے دنوں تک کہاں تھیں؟ مندر دت تو کہتا تھا کہ تم رونے کو لعنت و ملامت کرنے کے تین ہی چار روز بعد وہاں سے چلی آئی تھیں۔ اتنے دن کہاں رہیں؟ سال بھر سے زیادہ تو ہو گیا ہوگا۔

صوفیا کا دل فرطِ مسرت سے اُچھل رہا تھا۔ جی میں تو آیا کہ اُسی وقت سارا ماجرا بیان کر دوں اور مالتی کی آتشِ غم کو بُجھا دوں۔ مگر اندیشہ ہُوا کہ کہیں ان کا ذہنی توازن پھر نہ متحرک ہو جائے۔ رونے کی طرف سے تو اب وہ بیفکر ہو گئی تھی۔ اب اُسے صرف اپنی ہی فکر تھی۔ دیوتا کو نہ پا کر ہم پتھر پُوجتے ہیں۔ دیوتا مل جائے۔ تو پتھر کو کون پُوجے؟ بولی ـــ کہاں تھی؟ اِدھر اُدھر بھٹکتی پھرتی تھی۔ مایوس ہو کر یہاں چلی آئی ہوں۔

رانی۔ تم ناحق اتنے دنوں تک تکلیف اُٹھاتی رہیں۔ تمہارا کیا یہ گھر نہ تھا؟

بُرا نہ ماننا بیٹی۔ تم نے دنے کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ اُتنی ہی جتنی میرے نے۔ تمہاری بات اُسے اور بھی زیادہ لگی کیونکہ اُس نے جو کچھ کیا تھا ہمارے (فائدہ کے لئے کیا تھا میں تو اپنے چہیتے کے ساتھ اتنی سیر بھی کبھی نہ کر سکتی۔ اب تم خود اپنی بھول پچھتا رہی ہوگی۔ ہم دونوں ہی ابھاگنی ہیں۔ آہ بیچارے دنے کو کہیں سکھ نہ ملا۔ تمہارا دل بہت سخت ہے۔ سوچو۔ اگر تمہیں خبر ملتی کہ دنے کو ڈاکوؤں نے پکڑ کر قتل کر ڈالا ہے۔ تو تمہاری کیا حالت ہو جاتی۔ شاید تم بھی اتنی ہی سیر ہو جاتیں۔ یہ انسانی خاصہ ہے مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ میں آپ ہی ہر وقت پچھتایا کرتی ہوں۔ اب تو اُسے کام کو سنبھالنا ہے جو اُسے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ تم نے اُس کے لئے بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ ذلت بدنامی۔ سختی بھی اٹھائیں۔ اب اُس کا کام سنبھالو۔ اسی کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھو۔ تمہیں کیا خبر ہوگی۔ کچھ دنوں تک پربھو سیوک اس سیلما ممتی کے نایک رہے۔ کام کرنے والا ہونہار ایسا ہو۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے سارا ملک چھان ڈالا اور پورے پانچ سو وائلن جمع کر لئے۔ بڑے بڑے شہروں میں شاخیں قائم کر دیں۔ بہت سا روپیہ بھی جمع کر لیا۔ مجھے اس سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ دنے نے جس تحریک پر اپنی زندگی قربان کر دی وہ پھل پھول رہی ہے۔ مگر ایشور کو نہ جانے کیا منظور تھا۔ پربھو سیوک اور کنور صاحب میں ان بن ہو گئی۔ پربھو سیوک اُسے ٹھیک اُسی راستہ پر لے جا رہا تھا جس پر دنے لے جانا چاہتا تھا۔ کنور صاحب اور اُن کے خاص دوست ڈاکٹر گنگولی اُسے دوسرے ہی راستہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ آخر پربھو سیوک نے استعفا دے دیا۔ جبھی سے سمتی ڈانوا ڈول ہو رہی ہے۔ نہ جانے بچتی ہے یا جاتی ہے۔ کنور صاحب میں ایک عجیب تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہ اب حکام سے خائف رہنے لگے ہیں۔ افواہ تھی کہ سرکار ان کی کل جائداد ضبط کرنے والی ہے۔ حکام کی بدگمانیاں رفع کرنے کے لئے انہوں نے پربھو کے بجوزہ پروگرام سے اپنا اختلاف شائع کرا دیا۔ یہی باہمی ناچاقی کا خاص سبب تھا۔ ابھی دو ماہ بھی نہیں گزرے۔

لیکن شیرازہ بکھر گیا۔ سنیکروں رضاکار مایوس ہو کر اپنے کام دھندوں میں لگ گئے مشکل سے دو سو والنٹیر اور رہوں گے۔ چلو بیٹی۔ تمہارا کمرہ اب صاف ہو گیا ہوگا۔ تمہارے کھانے کا بندوبست کر کے پھر اطمینان سے باتیں کروں۔ (مہراجن سے) انہیں پہچانتی ہے نہ؟ پہلے یہ میری مہمان تھیں۔ اب یہ میری بہو ہیں۔ جا ان کے لئے دو چار نئی چیزیں تیار کر لا۔ آہ۔ آج رنے ہوتا تو میں اپنے ہاتھوں سے اسے اُس کے گلے لگا دیتی۔ بیاہ رچاتی۔ شادی میں اس کی اجازت ہے۔

صوفیا کی زبردست خواہش ہوئی کہ راز کو افشا کر دوں۔ بات ہونٹوں تک آئی۔ اور رُک گئی۔ اسی وقت دفعتاً شور اٹھا کہ لال صاحب آ گئے۔ لال صاحب آ گئے بھیا دنے سنا آ گئے۔ نوکر چاکر ہر طرف سے دوڑ پڑے۔ لونڈیاں باندیاں کام چھوڑ چھوڑ کر بھاگیں۔ ایک لمحہ میں دنے نے کمرہ میں قدم رکھا۔ رانی نے انہیں سر سے پیر تک دیکھا گویا یقین کر رہی تھیں کہ میرا ہی دنے ہے یا کہ اور۔ پھر رانی صاحبہ اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔ بہت دنوں میں آئے بیٹا۔ آؤ چھاتی سے لگا لوں۔ لیکن دنے نے فوراً اُن کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ رانی صاحبہ کو آنسوؤں کی کثرت سے نہ کچھ سوجھتا تھا اور نہ محبت کے بے انتہا جوش کے سبب کوئی بات منہ سے نکلتی تھی۔ وہ جھکی ہوئیں دنے کا سر پکڑ کر اُسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ بھگتی اور ماتا کا کیسا قابل دید نظارہ تھا!

لیکن دنے کو رانی کی باتیں بھولی نہ تھیں۔ ماں کو دیکھ کر اُس کے دل میں جوش پیدا ہوا کہ اُن کے قدموں پر جان دے دوں۔ ایک مجنونانہ خیال تھا۔ جان دے دینے کے لئے وہیں ماں کے قدموں پر زندگی کا خاتمہ کر دینے کے لئے یہ دھلا دینے کے لئے کہ اگرچہ میں نے قصور کیا ہے مگر بالکل بے غیرت نہیں ہوں۔ جینا نہیں جانتا لیکن مرنا جانتا ہوں۔ اُس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سامنے دیوار پر تلوار لٹک رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر تلوار کو اتار لایا اور اُسے یکدم کھینچ کر بولا۔ ماں اس قابل تو نہیں ہوں کہ آپ کا بیٹا کہلاؤں لیکن آپ کے آخری حکم کی تعمیل میں [illegible]

ساری غلطیوں کا پراسچیت (کفارہ) کئے دیتا ہوں۔ مجھے آسیرواد دیجئے۔

صوفیا چیخ مار کر دنے سے لپٹ گئی۔ رانی نے لپک کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی — دنے ایشور گواہ ہے۔ کہ میں تمہیں کب کا معاف کر چکی۔ تلوار چھوڑ دو صوفیا۔ تو ان کے ہاتھوں سے تلوار چھین لے۔ میری مدد کر!

دنے کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔ آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ گردن پر تلوار پھیر لینا کتنا آسان ہے۔ صوفیا نے دونوں ہاتھوں سے اُس کی کلائی پکڑ لی۔ اور آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ دنے مجھ پر رحم کرو۔

اُس کی نگاہ میں اتنا درد اتنا انکسار تھا کہ دنے کا دل پسیج گیا۔ اُن کی مٹھی ڈھیلی پڑ گئی۔ صوفیا نے تلوار لے کر کھونٹی پر لٹکا دی۔

اتنے میں کنور بھرت سنگھ آ کر کھڑے ہو گئے اور دنے کو سینہ سے لگاتے ہوئے بولے۔ تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ مُوچھیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ اتنے دُبلے کیوں ہو؟ بیمار تھے کیا؟

دنے۔ جی نہیں۔ بیمار تو نہیں تھا۔ ایسا دُبلا بھی نہیں ہوں۔ اب ماں کے ہاتھوں کا پکوان کھا کر موٹا ہو جاؤں گا۔

کنور۔ تم دُور کیوں کھڑی ہو صوفیا۔ آؤ تمہیں بھی پیار کر لوں۔ رہ رہ کر تمہاری یاد آتی تھی۔ دنے بڑا خوش نصیب ہے کہ اُس نے تم جیسی استری پائی۔ دُنیا میں تو ملتی نہیں۔ بہشت کی میں نہیں جانتا۔ یہ بھی حُسن اتفاق ہے کہ تم دونوں ایک ہی روز آئے۔ بیٹی میں تم سے دنے کی سفارش کرتا ہوں۔ تم نے انہیں جو ملامت کی تھی اُسے سُن کر بیچارہ نایک رام عورتوں سے اتنا ڈر گیا ہے کہ مے کی کرائی شادی سے انکار کر گیا۔ عمر بھر عورت کے لئے ترستا رہا۔ پر اب تو نام بھی نہیں لیتا۔ کہتا ہے کہ یہ ذات بے وفا ہوتی ہے۔ بھیا دنے سنگھ نے حسن کے لئے بدنامی سہی۔ جان پر کھیلے۔ دہی اُن سے آنکھیں پھیرے! کان پکڑے۔ اب تو مر جاؤں گا پر بیاہ نہ کروں گا۔ اپنا ہاتھ بڑھاؤ دنے! صوفیا۔ یہ ہاتھ لو تو مجھے اطمینان ہو جائے کہ تمہارے دل صاف ہو گئے۔

جانہوی۔ چلو۔ ہم لوگ باہر چلیں۔ انہیں ایک دوسرے کو منانے دو۔ انہیں کتنی شکائتیں کرنی ہوں گی۔ دونوں باتیں کرنے کے لیے بیقرار ہو رہے ہوں گے۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔

جب تخلیہ ہو گیا تو صوفیا نے پوچھا ۔ تم اتنی جلد کیسے آ گئے؟

ونے نے شرماتے ہوئے کہا۔ صوفیا مجھے وہاں منہ چھپا کر بیٹھتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جان کے خوف سے چھپ رہنا بزدلوں کا کام ہے۔ ماتا جی کی جو مرضی ہو وہی سہی۔ نایک رام کہتا رہا کہ پہلے مس صاحب کو آ جانے دو پر مجھ سے نہ رہا گیا۔

صوفیا۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ خوب ہو گئے۔ ماتا جی تمہاری چرچا کے آٹھ آٹھ آنسو رو رہی تھیں۔ ان کا دل تمہاری طرف سے صاف ہو گیا ہے۔

ونے۔ تمہیں تو کچھ نہیں کہا؟

صوفیا۔ مجھ سے تو ایسا لپٹ کر گلے ملیں کہ میں متحیر ہو گئی۔ یہ انہیں سخت الفاظ کا اثر ہے جو میں نے تم سے کہے تھے۔ ماں خود چاہے بیٹے کو جتنا ڈانٹے۔ مگر اسے یہ گوارا نہیں ہوتا کہ کوئی دوسرا شخص اسے کڑی نگاہوں سے بھی دیکھے۔ میری بے انصافی نے ان کے منصفانہ جذبہ کو بیدار کر دیا۔

ونے۔ ہم لوگ بڑی اچھی ساعت میں چلے تھے۔

صوفیا۔ ہاں ونے۔ ابھی تک تو خیریت سے گزری۔ آگے کی ایشور جانے۔

ونے۔ ہم اپنا دکھ بھگت چکے۔

صوفیا نے شک کے لہجہ میں کہا۔ ایشور کرے ایسا ہی ہو۔

لیکن صوفیا کو اپنے دل کے آئینہ میں کسی آنے والی ناگہانی مصیبت کا عکس نظر آ رہا تھا۔ وہ اسے ظاہر نہ کر سکتی تھی مگر وہ بادل تھی۔ ممکن ہے کہ آبائی مذہب کو ترک کر دینے کا غم اس کا سبب ہو یا وہ اسے ایسی بارش خیال کر رہی ہو جو اپنی کثرت سے آئندہ ہونے والی بارش کی فتنت کی خبر دیتی ہے۔ معلوم نہیں جو بات ہو۔ مگر صوفیا رات کو کھانا کھا کر سوئی۔ تو اس کا دل کسی بوجھ سے دبا ہوا تھا۔

## (۴۰)

پل کے تیار ہونے میں اب بہت تھوڑی کسر رہ گئی تھی۔ باہر سے تمباکو کی گاڑیاں لدی چلی آتی تھیں۔ کسانوں کو تمباکو کی کاشت کے لئے نقادی تقسیم کی جا رہی تھی۔ گورنر سے پل کے افتتاحی رسم ادا کرنے کی استدعا کی گئی تھی اور انہوں نے منظور بھی کر لیا تھا۔ تاریخ مقرر ہو چکی تھی۔ اس لئے تعمیری کام کو اُس دن تک ختم کر دینے کے لئے بڑی مستعدی سے کام کیا جا رہا تھا۔ اس وقت کوئی کام باقی نہ رہنا چاہئے۔ مزہ تو جب آئے کہ دعوت میں اسی پل کا بنا ہوا سگار بھی رکھا جاوے۔ مسٹر جان سیوک صبح سے شام تک انہیں تیاریوں میں مصروف رہتے تھے یہاں تک کہ رات کو بھی دُونی اُجرت دے کر کام کرایا جا رہا تھا۔ پل کے قریب پختہ مکانات تیار ہو چکے تھے۔ سڑک کے دونوں کناروں پر اور پاس کے کھیتوں میں مزدوروں نے جھونپڑیاں ڈال لی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف ایک میل تک جھونپڑیوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ یہاں بڑی چہل پہل رہتی تھی۔ دوکان داروں نے بھی اپنے اپنے چھپر ڈال لئے تھے۔ پان مٹھائی۔ اناج۔ گڑ۔ گھی۔ ساگ۔ ترکاری اور منشی اشیاء کی دوکانیں کھل گئی تھیں معلوم ہوتا تھا کوئی بازار ہے۔ پل کے پردیسی مزدور جنہیں نہ برادری کا خوف تھا نہ رشتہ داروں کا لحاظ۔ دن بھر تو پل میں کام کرتے تھے اور رات کو تاڑی شراب وغیرہ پیتے تھے۔ جُوا روز ہوتا تھا۔ ایسے مقامات پر بدچلن عورتیں بھی آ ہی پہنچتی ہیں۔ یہاں بھی ایک چھوٹا موٹا چکلا آباد ہو گیا تھا۔ پانڈے پور کا پُرانا بازار سرد ہوتا جاتا تھا۔ مٹھو۔ گھیسو۔ وَدیا دھر تینوں، اکثر اِس طرف سَیر کو آتے اور جُوا کھیلتے۔ گھیسو تو دُودھ بیچنے کے بہانے آتا۔ وِدیا دھر نوکری تلاش کرنے کے بہانے آتا اور مٹھو صرف ان دونوں کا ساتھ دینے کے لئے آتا۔ کوئی چاٹ کھا رہا ہے۔ کوئی تمبولی کی دوکان کے سامنے کھڑا ہے۔ کوئی پیشہ ور عورتوں سے مذاق کر رہا ہے۔ فحش مذاق حیا سوز نظر بازیاں۔ شہوانی طور طریق۔ ان سب کا ایک نہ رُکنے والا بہاؤ سا جاری رہتا تھا۔ پانڈے پور

میں یہ دلچسپیاں کہاں؟ لڑکوں کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ تاڑی کی دوکان کے سامنے کھڑے ہوں۔ کہیں گھر کا کوئی آدمی نہ دیکھ لے۔ نوجوانوں کی مجال نہ تھی کہ کسی عورت کو چھیڑیں۔ کہیں میرے گھر جاکر کہہ نہ دے۔ سبھی ایک دوسرے سے رشتہ رکھتے تھے یہاں وہ رُکاوٹیں کہاں؟ ہر شخص آزاد تھا۔ اُسے نہ کسی کا خوف تھا نہ لحاظ۔ کوئی کسی پر ہنسنے والا نہ تھا۔ نینوں کو منع کیا جاتا تھا کہ وہاں نہ جایا کرو۔ اور جاؤ بھی تو اپنا کام کرکے چلے آیا کرو۔ مگر جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ کون کسی کی سُنتا تھا؟ سب سے بُری حالت بجرنگی کی تھی۔ گھیسو روز ہی روپیہ بارہ آنے اُڑا لیا کرتا اور پوچھنے پر بگڑ کر کہتا۔ کیا میں چور ہوں؟

ایک روز بجرنگی نے سُور داس سے کہا ـــــ سُور داس لڑکے برباد ہوئے جاتے ہیں۔ جب دیکھو چلکے ہی میں ڈٹے رہتے ہیں۔ گھیسوا میں چوری کی بان کبھی نہ تھی۔ اب ایسا ہتھ لپا ہو گیا ہے کہ سوجتن سے پیسے رکھ دو۔ کھوج کر نکال لیتا ہے۔

جگدھر سُور داس کے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ یہ باتیں سُن کر بولا ـــ میری بھی وہی دَسا ہے بھائی۔ وِدیا دھر کو کتنا پڑھایا لکھایا۔ مُڈل تک کھینچ کھانچ کرے گیا آپ بھوکا رہتا تھا۔ گھر کے لوگ کپڑوں کو ترستے تھے پر اُس کے لئے تو کسی بات کی کمی نہ تھی۔ آس تھی کہ چار پیسے کمائے گا۔ میرا بڑھاپا کاٹ جائے گا۔ گھر بار سنبھالے گا۔ برادری میں مرجاد بڑھائے گا۔ سو وہ اب رو ج وہاں جاکر جُوا کھیلتا ہے۔ مجھ سے بہانہ کرتا ہے کہ وہاں ایک بابو کے پاس کام سیکھنے جاتا ہوں۔ سُنتا ہوں کسی عورت سے اُس کی آشنائی ہو گئی ہے ابھی پتلی گھر کے کئی مجُور اُسے گھیرے ہوئے میرے پاس آئے تھے۔ اُسے پاجائیں تو مار پیٹ کریں۔ وہ بھی اُسی عورت کے آشنا ہیں۔ میں نے ہاتھ پیر جوڑ کر ان کو بدا کیا۔ یہ کارکھانا کیا کھلا ہماری بتا ہی آگئی۔ پھاندہ جُو در ہے۔ چار پیسے کی آمدنی ہے۔ پہلے ایک ہی کھوکھ نہ پکتا تھا۔ اب تین تین بک جاتے ہیں۔ لیکن ایسا سونا کس کام کا جس سے کان پھٹیں؟

بجرنگی بولا جی جُوا ہی کھیلنا تب تک غنیمت تھی۔ ہمارا گھیسو تو آوارہ ہو گیا

ہے۔ دیکھتے نہیں ہو صحت کیسی بگڑ گئی ہے۔ کیسا دبلہ نکل آئی تھی! مجھے پوری آسا تھی کہ اب کی دنگل مارے گا۔ اکھاڑے کا کوئی پٹھا اُس کے جوڑ کا نہیں ہے۔ مگر جب سے چلکے کی چاٹ پڑ گئی ہے دن بدن گھلا جاتا ہے۔ واہ! کو تم نے دیکھا تھا؟ دس پانچ کوس کے گرد میں کوئی کوئی اُن سے ہاتھ ملا سکتا تھا۔ چٹکی سے سپاری توڑ دیتے تھے۔ میں نے بھی جوانی میں کتنے ہی دنگل مارے۔ تم نے تو دیکھا ہی تھا اُس پنجابی کو کیسا مارا کہ پانچ سو روپے انام پائے اور اکھاڑوں میں دُور دُور تک نام ہو گیا۔ کبھی کسی مائی کے لال نے میری پیٹھ میں دُھول نہیں لگائی۔ تو بات کیا تھی؟ لنگوٹ کے سچے تھے۔ موہنچیں نکل آئی تھیں۔ تب تک کسی استری کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ یاد بھی ہو گیا۔ تب بھی محنت کی دُھن میں استری کا دھیان ہی نہ کرتے تھے۔ امی کے بل پہ اب بھی دعوے ہے کہ دس پانچ کا سامنا ہو جائے تو چھکے چھڑا دوں۔ پر اس لونڈے نے ڈونگا ڈبا دیا۔ گھوڑے اُستاد کہتے تھے کہ اس کا تو دم ہی نہیں ہے۔ جہاں دو پکڑیں ہوئیں نہ بھینسے کی طرح ہانپنے لگتا ہے۔

سورداس۔ میں اندھا آدمی۔ لونڈوں کے یہ چرتر کیا جانوں۔ پر سُجھا گی کہتی تھی کہ مٹھوا کے ڈھنگ بھی اچھے نہیں ہیں۔ جب سے ٹیسن پر کلی ہو گیا ہے روپیہ آٹھ آنے روج کماتا ہے مُدا کسم لے لو پر گھر میں ایک پیسہ بھی دیتا ہو۔ بھوجن میرے ماتھے ہے۔ جو کچھ پاتا ہے نسہ پانی میں اُڑا دیتا ہے۔

جگدھر۔ تم بھی جھوٹ موٹ لاج دھو رہے ہو۔ نکال کیوں نہیں دیتے گھر سے؟ اپنے سر پڑے گی تو آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اپنا لڑکا ہو تو ایک بات ہے۔ بھائی بھتیجے کس کے ہوتے ہیں؟

سُورداس۔ پالا تو لڑکے ہی کی طرح ہے۔ دل نہیں مانتا۔

جگدھر۔ اپنا بنانے سے تھوڑے ہی اپنا ہو جائے گا۔

ٹھاکر دین بھی آ گیا تھا۔ جگدھر کی بات سُن کر بولا۔ بھگوان نے کیا تمہارے کرم میں کانٹے ہی بونا لکھا ہے؟ کسی کا بھی بھلا نہیں دیکھ سکتے۔

شور و اس ۔ اس کے من میں جو آئے کرے پر میرے کئے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کھا کر سوؤں اور اُس کی بات نہ پوچھوں ۔

ٹھاکر دین ۔ کوئی بات کہنے کے پہلے سوچ لینا چاہئے کہ سُننے والے کو اچھی لگے گی یا بُری ۔ جس لڑکے کو بچپنے سے پالا اور اس طرح کہ کوئی اپنے بیٹے کو بھی نہ پالتا اُسے اب کیسے چھوڑ دے ۔

جمن ۔ اب کے کل کی لگی لڑکے جو کچھ نہ کریں تھوڑا ہے ۔ ابھی دُودھ کے دانت نہیں اُکھڑے ۔ بھائی نے گھیسو کو دیں کھلایا ہے ۔ سو آج وہ اُسی سے دل لگی کرتا ہے ۔ چھوٹے بڑے کا لحاظ اُٹھ گیا ۔ یہ تو کہو بھائی کی کاٹھی اچھی ہے نہیں بال بچے ہوتے تو گھیسو سے جیتے ہوتے ۔

اِدھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں اُدھر تینوں لونڈے نایک رام کے دالان میں بیٹھے ہوئے منصوبے باندھ رہے تھے ۔ گھیسو نے کہا ۔ بھائی مارے ڈالتی ہو ۔ دیکھ کر بھی جی چاہتا ہے کہ گلے لگا لوں ۔ سر پر ساگ کی ٹوکری رکھ کر بل کھاتی ہوئی چلتی ہے ۔ سو جان سے لیتی ہے ۔ بڑی کا پھیر ہے ۔

وِدیا دھر ۔ تم تو ہو گھامڑ ۔ پڑھے لکھے تو ہو نہیں ۔ بات کیا سمجھو ۔ معسوک کبھی اپنے منہ سے تھوڑا ہی کہتا ہے کہ میں راجی ہوں ۔ اُس کی آنکھوں سے تاڑ جانا چاہئے ۔ جتنی ہی بگڑے اتنی ہی دل سے راجی سمجھو ۔ کچھ پڑھے ہوتے تو جانتے ۔ عورتیں کیسے نکھرے کرتی ہیں ۔

منگھو ۔ پہلے بھائی مجھ سے بھی اسی طرح بگڑتی تھی ۔ کسی طرح ہتھے ہی نہ چڑھے ۔ بات ہی نہ سُنے ۔ پر میں نے ایک دن ہمت کر کے کلائی پکڑ لی اور کہا ۔ اب نہ چھوڑونگا چاہے مار ہی ڈالو ۔ مرنا تو ایک دن ہے ہی ۔ تیرے ہی ہاتھوں مروں گا تو سیدھے سرگ جاؤں گا ۔ وہ تو بگڑ کر گالیاں دینے لگی ۔ پھر کہنے لگی ـــ چھوڑ دو ۔ کہیں کوئی دیکھ لے تو گجب ہو جائے ۔ میں تیری بُوا لگتی ہوں ۔ پر میں نے ایک نہ سُنی ۔ بس پھر کیا تھا اُسی دن سے آگئی چنگل میں ۔

مسعود اپنی عشقیہ فتوحات کی فرضی داستانیں گھڑنے میں بڑا ہوشیار تھا۔ جاہل ہونے پر بھی غپ مارنے میں اُس نے وِدّیادھر کو مات کر دیا تھا۔ اپنی گزشتہ عمر کی کچھ ایسا رنگ بھرتا تھا کہ دوستوں کو ان گپوڑوں پر یقین آجاتا تھا۔

گھیسو بولا۔ کیا کروں۔ میری تو ہمت ہی نہیں پڑتی۔ ڈرتا ہوں کہیں شور نہ مچا دے تو آفت آجائے۔ تمہاری ہمت کیسے پڑتی ہے۔

وِدّیادھر۔ تمہارا سر۔ جاہل چیت تو ہو۔ معشوق اپنے عاشق کو آجاتا ہے۔ اس میں کچھ چیوٹ بھی ہے یا بڑنی چھپڑا بنا پھرتا ہے۔ عورت اُسی کو پیار کرتی ہے جو دلاور ہو نڈر ہو۔ آگ میں کود پڑے۔

گھیسو۔ تم تیار ہو۔

وِدّیادھر۔ ہاں آج ہی۔

مٹھوا۔ گرد یکھ لینا دادا دوار پر نیم کے نیچے سوتے ہیں۔

گھیسو۔ اس کا کیا ڈر ہے ایک ڈھکا لگا دوں گا۔ زور جا کر گرے گا۔

تینوں مشہد کرتے ہوئے اس سازش کے داؤں پیچ سوچتے قلی بازار کی طرف چلے گئے۔ وہاں تینوں نے شراب پی۔ دس گیارہ بجے رات تک بیٹھے گانا بجانا سنتے رہے۔ شراب خانوں میں نغمہ ہے ناآشنا کانوں کے لئے گانے کی کمی کبھی نہیں رہتی۔ تینوں بدمست ہو کر لوٹے تو گھیسو بولا۔ صلاح پکی ہے نا؟ آج دارا نیارا ہو جائے۔ چت پڑے یا پٹ۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چوکیدار پہرہ دے کر جا چکا تھا۔ گھیسو اور وِدّیادھر سورداس کے دروازہ پر گئے۔

گھیسو۔ تم آگے چلو۔ میں یہیں کھڑا ہوں۔

وِدّیادھر۔ نہیں تم جاؤ۔ تم گنوار آدمی ہو۔ یہاں کوئی دیکھ لے گا تو بات بھی نہ بنا سکو گے۔

نشہ نے گھیسو کو آپے سے باہر کر رکھا تھا۔ کچھ بے دکھانا بھی منظور تھا کہ

تم لوگ مجھے احمق سمجھتے ہو اتنا نہیں ہوں۔ وہ جھونپڑی میں گھس ہی پڑا اور جا کر بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

بھائی چونک کر اٹھ بیٹھی اور زور سے بولی ۔۔۔ کون ہے؟ چل ہٹ!

گھسیو۔ چپ چپ میں ہوں۔

بھائی ۔ چور چور! چور چور!

سورداس جاگا۔ وہ اٹھ کر جھونپڑی میں جانا چاہتا تھا کہ کسی نے اسے پکڑ لیا۔ اس نے ڈانٹ کر پوچھا۔ کون ہے؟ جب کچھ جواب نہ ملا۔ تو اس نے بھی اس آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا اور چلایا "چور چور!" محلہ والے یہ آواز سنتے ہی لاٹھیاں لے کر نکل پڑے۔ ہر شخص نے پوچھا۔ کیا کیا کہاں ہے؟ بھائی کی بولی میں پکڑے ہوئے ہوں۔ لوگوں نے جا کر دیکھا تو واقعی بھائی گھسیو کو پکڑے ہوئے ہے اور باہر سورداس وڈیا دھر کو۔ مٹھو نائیک رام کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ یہ شور وغل سنتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک گھنٹہ میں سارا محلہ جمع ہو گیا۔ چور کے پکڑنے کو شاید ہی کوئی نکلے مگر پکڑے ہوئے چور پر ہر شخص اپنی بہادری دکھانے کے لئے ہاتھ پاؤں چلاتے ہیں۔ لیکن یہاں آکر دیکھتے ہیں تو نہ چور نہ چور کا بھائی بلکہ اپنے ہی محلہ کے لونڈے ہیں۔

ایک عورت۔ یہ زمانے کی کھوٹی ہے کہ کاؤں گھر کا بچا رہی اٹھ گیا۔ کسی کی آبرو بچے تو!

ٹھاکر دین۔ ایسے لونڈوں کا سر کاٹ لینا چاہیے۔

نائیک رام۔ چپ رہو۔ ٹھاکر دین۔ یہ گستاخی کرنے کی بات نہیں۔ رونے کی بات ہے۔

جگدھر۔ بجرنگی۔ جمبی سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ بجرنگی کو تو ایسا غصہ آرہا تھا کہ گھسیو کا گلا دبا دے۔ یہ بھیڑ اور ہل چل دیکھ کر کئی کانسٹیبل بھی آپہنچے۔ اچھا شکار پھنسا۔ مٹھیاں گرم ہوں گی۔ فوراً دونوں لونڈوں کی کان بتیاں پکڑ لیں۔ جمبی نے روکر کہا۔ یہ لونڈے منہ میں کالکھ لگانے

والے ہیں۔ اچھا ہوگا۔ چھ چھ مہینے کی سجا کاٹ آئیں گے تب اُن کی آنکھیں کھلیں گی۔ سمجھاتے سمجھاتے ہار گئی کہ بابیا۔ بدراہ مت چلو۔ پر کون سنتا ہے۔ اب جاکر جلی پیسو۔ اس سے اچھا تھا کہ بانجھ ہی رہتی۔

نایک رام۔ اچھا۔ اب اپنے اپنے گھر جاتے جاؤ۔ جمعدار لونڈے ہیں چھوڑ دو۔ آؤ جائیں۔

جمعدار۔ ایسا نہ کہو پنڈاجی۔ کوتوال صاحب کو معلوم ہو جائے گا تو سمجھیں گے کہ ان سبوں نے کچھ لے کر چھوڑ دیا ہوگا۔

نایک رام۔ کیا کہتے ہو سورداس۔ اب یہ لوگ جائیں نا؟

ٹھاکر دین۔ ہاں اور کیا۔ لڑکوں سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے۔ کام تو بگڑا کیا پر اب جانے دو۔ جو ہونا تھا سو ہوا۔

سورداس۔ میں کون ہوتا ہوں کہ جانے دوں؟ جانے دیں کوتوال چوپٹ حاکم لوگ۔

بچیر نگی۔ سورداس۔ بھگوان جانتا ہے جان کا ڈر نہ ہوتا تو اس دشت کو کچا ہی چبا جاتا۔

سورداس۔ اب تو حاکم لوگوں کے ہاتھ میں ہے۔ چھوڑیں چاہے ڈنڈ دیں۔

بچیر نگی۔ تم کچھ نہ کروگے تو کچھ نہ ہوگا۔ جمعداروں کو ہم منا لیں گے۔

سورداس۔ تو بھیا۔ صاف صاف بات یہ ہے کہ میں بنا سرکار میں رپٹ کئے نہ مانوں گا۔ چاہے سارا محلہ میرا دشمن ہو جائے۔

بچیر نگی۔ کیا یہی ہوگا۔ سورداس؟ گاؤں گھر ٹولے محلے کا کچھ لحاظ نہ کروگے؟ لڑکوں سے بھول تو ہو ہی گئی۔ اب اُن کی جندگانی کھراب کرکے کیا ملے گا؟

جگدھر۔ سبھاگی ہی کہاں کی دیبی ہے۔ جب سے بھیرو نے چھوڑ دیا۔ سارا محلہ اس کا رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہے۔ بنا پہلے کسی سانڈھ گانڈھ کے کوئی کسی کے گھر میں نہیں گھستا۔

سُور داس۔ تو یہ سب مجھ سے کیا کہتے ہو بھائی؟ سبھاؤ ہی ایسا ہو جاتا ہے ہر جائی۔ وہ جانے اس کا کام جانے۔ میں نے اپنے گھر میں چوروں کو پکڑا ہے۔ اس کی تھانے میں رپٹ جرور کروں گا۔ تھانہ والے نہ سُنیں گے تو حاکم سے کہوں گا لڑکے لڑکوں کی راہ نہیں لڑتے ہیں۔ سُہیدوں کی راہ چلیں تو سُہیدے ہیں۔ بدماسوں کے اور کیا سینگ پونچھ ہوتی ہے؟

بکھری۔ سور کے دیا ہوں کھون ہو جائے گا۔

سُور داس۔ تو کیا ہو جائے گا؟ کون میرے نام کو کوئی رونے والا بیٹھا ہُوا ہے؟

نایک رام نے وہاں ٹھہرنا بیفائدہ سمجھا۔ کیوں نیند خراب کریں۔ چلنے لگے تو جگدھر نے کہا۔ پنڈا جی تم بھی جاتے ہو۔ یہاں کیا ہوگا؟

نایک رام نے جواب دیا۔ بھائی سُور داس مانے گا نہیں۔ چاہے لاکھ کہو۔ میں بھی تو کہہ چکا۔ کہو اور ہاتھ پیر پڑوں پر ہونا ہوانا کچھ نہیں۔ گھیسو اور دیا کی تو بات ہی کیا۔ مٹھو بھی ہوتا تو سُور داس اُس کو بھی نہ چھوڑتا۔ ہٹھی آدمی ہے۔

جگدھر۔ ایسا کہاں کا دھنا سیٹھ ہے کہ اپنے من ہی کی کرے گا۔ تم چلو جرا ڈانٹ کر کہو تو۔

نایک رام لوٹ کر سُور داس سے بولے۔ سُور کبھی کبھی گاؤں گھر کے ساتھ ملاہجا بھی کرنا پڑتا ہے۔ لڑکوں کی چند گائی برباد کر کے تم کیا پاؤ گے؟

سُور داس۔ پنڈا جی۔ تم بھی اوروں کی سی کہنے لگے۔ دُنیا میں کہیں پاؤ ہے کہ نہیں؟ کیا عورت کی آبرو کچھ ہوتی ہی نہیں؟ سُبھاؤ کی گریب ہے۔ ابلا ہے۔ مجبوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہے۔ اس منے جو کوئی چاہے اُس کی آبرو بگاڑ دے؟ جو چاہے اُسے ہرجائی سمجھ لے؟

سارا محلہ ایک ہو گیا۔ یہاں تک کہ دونوں کانسٹیبل بھی محلہ والوں کی سی کہنے لگے۔ ایک بولا۔ عورت کھلہ (خود) ہرجائی ہے۔

دوسرا۔ محلّہ کے آدمی چاہیں تو کھون بچالیں۔ یہ کون سا بڑا جُرم ہے۔
پہلا۔ سہادت ہی نہ ملے گی تو جُرم کیا ثابت ہوگا۔
سُورداس۔ سہادت تو جیب نہ ملے گی جیب میں مرجاؤں گا۔ کیا کہا وہ ہرجائی ہے؟
کانسٹیبل۔ ہرجائی تو ہے ہی۔ ایک بار نہیں سَو بار اُسے بجار میں تڑکاری بیچتے اور ہنستے دیکھا ہے۔
سُورداس۔ تو بجار میں تڑکاری بیچنا اور ہنسنا ہرجائیوں کا کام ہے؟
کانسٹیبل۔ ارے تو جاؤ گے تو تھانہ ہی تک نا؟ وہاں بھی تو ہمیں سے رپٹ کرو گے۔
نائیک رام۔ اچھی بات ہے۔ اِسے رپٹ کرنے دو۔ میں دیکھ لوں گا۔ درد کا بھی کوئی گیر آدمی نہیں ہیں۔
سُورداس۔ ہاں۔ دردگاجی کے بھتیجے آئے ہیں۔ وہ اس پاپ میں اُن کے ساتھ ہے۔
نائیک رام۔ کہتا ہوں، محلّہ میں رہنے پاؤ گے۔
سُورداس۔ جب تک جیتا ہوں، تب تک رہوں گا۔ مرنے کے بعد دیکھی جائے گی۔
کوئی سُورداس کو سمجھاتا تھا کوئی دھمکاتا تھا۔ وہاں جتنے لوگ رہ گئے تھے۔ اس معاملہ کو دبا دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ اسے بڑھانا چاہتے تھے وہ جبر تکی اور نائیک رام کے خوف سے کچھ کہہ نہ سکنے کے سبب اپنے گھر کو چل دیئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں سے بیر مول لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ پر سُورداس اپنی بات پر اڑا تھا کہ کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔ آخر یہی طے ہوا کہ اسے تھانہ میں جا کر رپٹ لکھوآنے دو۔ ہم لوگ تھانہ دار ہی کو راضی کر لیں گے۔ دس بیس روپے سے غم کھائیں گے۔
نائیک رام۔ ارے وہی لالہ تھانہ دار ہیں نا؟ انہیں تو میں چٹکی بجاتے

بھلا تیرا کیا لگا۔ میری پرانی جان پہچان ہے۔

جگدھر۔ پنڈا! مجھ میرے پاس تو روپے بھی نہیں ہیں۔ میری جان کیسے بچیگی؟

نائیک رام۔ میں بھی پردیس سے لوٹا ہوں۔ ہاتھ کھالی ہے۔ جا کر کہیں روپے کی چوکی کر۔

جگدھر۔ میں سوردداس کو اپنا ہتوا سمجھتا تھا۔ جب کبھی کام پڑا ہے۔ اُس کی مدد کی ہے۔ اپنا کے پیچھے کلیجہ سے میری دشمنی ہوگئی۔ اور اب بھی بیرانہ ہوا!

نائیک رام۔ کسی کا نہیں پر اور سب کا ہے۔ جا کر دیکھو۔ جہاں سے ہو سکے کچھ روپے تو لے ہی آؤ۔

جگدھر۔ میں روپے کس سے مانگنے جاؤں؟ کون پتیائے گا۔

نائیک رام۔ دوریائی اتما سے کوئی گہنا ہی مانگ لو۔ اس بکست تو بدان بچیں۔ پھر چھڑا دینا۔

جگدھر بہانے کرنے لگا۔ وہ چھدا نگ نہ دے گی۔ یہ بھی جاؤں تو کھیتن کے لئے روپے نہ نکالے گی۔ یہ کہتے کہتے وہ رونے لگا۔

نائیک رام کو اس پر ترس آگیا۔ روپے دینے کا وعدہ کر لیا۔

سوردداس بڑے سویرے تھانہ کی طرف چلا تو بجر نگی نے کہا۔ سوردداس تمہارے سر پہ موت کھیل رہی ہے۔ جاؤ۔

جھٹی سوردداس کے پیروں سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی۔ سوردداس تم ہمارے پیری ہو جاؤ۔ یہ کبھی آسانہ تھی۔

بجر نگی نے کہا۔ سچ ہے لعل کیا۔ ہم اس کو پالتے ہی چلے آتے ہیں۔ بھوکوں کبھی نہیں سونے دیا۔ بیماری آرامی میں کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب کبھی دودھ مانگنے آیا کھالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ اس پہ یہ بدلہ! سچ کہا ہے کہ اندھوں میں سیل رمروت نہیں ہوتی۔ ایک پاسن کے پیچھے۔

نائیک رام بھلے ہی لپک کر تھانہ جا پہنچے اور تھانہ دار کو سارا ماجرا سنا کر

کہا۔ پچاس کا ڈول ہے۔ کم نہ حیادہ۔ رپٹ ہی نہ لکھئے۔

داروغہ نے کہا۔ پنڈت جی۔ جب تم درمیان میں ہو تو سو پچاس کی کوئی بات نہیں لیکن اندھے کو معلوم ہو جائے گا کہ رپٹ نہیں لکھی گئی تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے پاس جا پہنچے گا۔ پھر میری جان آفت میں پڑ جائے گی۔ نہایت روکھا افسر ہے۔ پولیس کا تو جانی دشمن ہی سمجھو۔ اندھا بوں ملنے والا آدمی نہیں ہے۔ جب اس نے چنار کی کے راجہ صاحب کے ناکوں چنے چبوا دئے تو دوسروں کی کیا گنتی ہے۔ بس یہی ہو سکتا ہے کہ جب ہم تحقیقات کے لئے آؤں تو آپ لوگ کسی کو شہادت نہ دیجئے دیں۔ عدم ثبوت میں معاملہ خارج ہو جائے گا۔ میں اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ شہادت کے لئے کسی کو مجبور نہ کروں گا اور گواہوں کے بیانات میں بھی کچھ کانٹ چھانٹ کر دوں گا۔

دوسرے روز شام کے وقت داروغہ جی تحقیقات کرنے گئے۔ محلہ کے سب لوگ جمع ہوئے مگر جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتا۔ میں نے رات کو کسی کی "چور چور" کی آواز ہیں سنی۔ میں نے تو سورداس کے دروازہ پر نہیں دیکھا۔ میں تو گھر میں دروازہ بند کئے پڑا سوتا تھا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر دین نے بھی صاف کہا۔ صاحب میں کچھ نہیں جانتا۔

داروغہ نے سورداس پر بگڑ کر کہا۔ جھوٹی رپٹ کرتا ہے۔ بدمعاش!

سورداس۔ رپٹ جھوٹی نہیں ہے۔ سچی ہے۔

داروغہ۔ تیرے کہنے سے سچی مان لوں۔ کوئی گواہ بھی ہے؟

سورداس نے محلہ والوں کو مخاطب کر کے کہا۔ یارو سچی بات کہنے سے مت ڈرو۔ میرے دوست اسے نہیں کہتے کہ کسی عورت کی آبرو بگاڑ دی جائے اور لوگ اس پر پردہ ڈال دیں۔ کسی کے گھر میں چوری ہو جائے اور لوگ چھپا لیں۔ اگر یہی حال رہا تو سمجھ لو کہ کسی کی آبرو نہ بچے گی۔ بھگوان نے سبھی کو بہو بیٹیاں دی ہیں۔ کچھ ان کا بھی خیال کرو۔ عورت کی آبرو کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے سر کٹ جاتے ہیں۔ لہو کی ندیاں بہہ جاتی ہیں۔ میں اور کسی سے نہیں پوچھتا۔ ٹھاکر دین

تمہیں بھگوان کا ڈر ہے۔ پہلے تمہیں آئے تھے۔ تم نے یہاں کیا دیکھا؟ کیا میں اور سبھاگی دونوں گھیسو اور بدیا دھر کا ہاتھ نہیں پکڑے ہوئے تھے؟ دیکھو منہ دیکھی نہیں۔ ساتھ کوئی نہ جائے گا۔ جو کچھ دیکھا ہے سچ سچ کہہ دو۔

ٹھاکر دین دھرم سے ڈرتا تھا۔ یہ باتیں سُن کر خوفزدہ ہو گیا۔ بولا۔ چوری ڈاکے کی بات تو میں کچھ نہیں جانتا۔ یہی پہلے بھی کہہ چکا۔ بات بدلنی نہیں آتی۔ ہاں جب میں آیا تو تم اور سبھاگی دونوں لڑکوں کو پکڑے چلا رہے تھے۔

سُور داس۔ میں ان دونوں کو اُن کے گھر سے تو نہیں پکڑ لایا تھا؟

ٹھاکر دین۔ یہ بھگوان جانیں۔ ہاں چور چور کی آواز میرے کان میں پڑی تھی۔

سُور داس۔ اچھا اب میں تم سے پوچھتا ہوں جمعدار۔ تم آئے تھے نا؟ بولو یہاں جماؤ تھا کہ نہیں۔

کانسٹیبل نے ٹھاکر دین کو بدلتے دیکھا تو ڈرا کہ اندھا دو چار آدمیوں کو اور لائے گا تو ہم جھوٹے بنیں گے۔ بولا۔ ہاں جماؤ کیوں نہیں تھا۔

سُور داس۔ گھیسو کو سبھاگی پکڑے ہوئے تھی کہ نہیں؟ بدیا دھر کو میں پکڑے ہوئے تھا کہ نہیں؟

کانسٹیبل۔ چوری ہوتے ہم نے نہیں دیکھی۔

سور داس۔ ہم ان دونوں لڑکوں کو پکڑے ہوئے تھے کہ نہیں؟

کانسٹیبل۔ ہاں پکڑے ہوئے تھے پر چوری ہوتے نہیں دیکھی۔

سُور داس۔ داروگا جی۔ ابھی تو آپ ہی نے کہا کہ اور دوں؟ یہاں ننگے لچے نہیں بستے۔ بھلے مانسوں ہی کی بستی ہے کہئے۔ بجرنگی سے کہلا دوں۔ کہئے گھد گھیسو سے کہلا دوں۔ کوئی جھوٹی بات نہیں کہے گا۔ مروّت مروّت کی جگہ ہے۔ محبت محبت کی جگہ ہے۔ مُروّت اور محبت کے پیچھے کوئی اپنا پرلوک بگاڑے گا۔

بجرنگی نے دیکھا۔ اب لڑکے کی جان نہیں بچتی تو اپنا ایمان کیوں بگاڑے۔ داروغہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اور بولا ــــ داروگا جی۔ سور داس جو بات

کہتے ہیں وہ ٹھیک ہے جیسے نے جیسی کرنی کی ہے ویسی بھوگے۔ ہم کیوں اپنا پرلوک بگاڑیں؟ لڑکا ایسا نالائق نہ ہوتا تو آج کیوں منہ میں کالکھ لگتی؟ جب اُس کا چلن ہی بگڑ گیا تو میں کہاں تک بچاؤں گا؟ ڈنڈ بھوگے گا تو آپ آنکھیں کھلیں گی۔

ہوا بدل گئی۔ ایک لمحہ میں شہادتوں کا تانتا بندھ گیا۔ دونوں ملزم حراست میں لے لئے گئے۔ مقدمہ چلا اور تین تین مہینے کی سزا ہو گئی۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں سورداس کے معتقد تھے۔ نائیک رام کا یہ کام تھا کہ سب سے سورداس کے گن گا بکھان لیا کرے۔ اب یہ تینوں اُس کے دشمن ہو گئے۔ دوبار پہلے بھی وہ اپنے محلہ سے بیر لے چکا تھا۔ مگر اُن دونوں موقعوں پر کسی کو اُس کی ذات سے اتنا عدم نہ پہنچا تھا۔ اب کے تو اُس نے بڑا زبردست قصور کیا تھا۔ جمنی جب سورداس کو دیکھنی تو سر کا کام چھوڑ کر اُسے کوستی۔ سُبھاگی کو گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ یہاں تک ہوا کہ مٹھوا نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ رات کو بھی ہٹیا میں ہی پڑ رہ جاتا۔ اپنے ساتھیوں کی حالت دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھُل گئیں۔ نائیک رام نہ جانتے تھے کہ سورداس کے دروازہ کا راستہ ہی چھوڑ دیا۔ چکر کھا کر آتے جاتے۔ بس اُس کے سائنیوں بیرے دے کے ایک بھیرو رہ گیا۔ ہاں کبھی کبھی دوسروں کی نظر بچا کر دین بھی خیریت کا حال پوچھ جاتا۔ اور تو اور دیا گر بھی اُس سے کنارہ کرنے لگے کہ کہیں لوگ اُس کا دوست سمجھ کر مجھے دان دچھنا دینا بند کر دیں۔ سچائی کے دوست کم ہوتے ہیں۔ دشمنوں کی تعداد سے کہیں کم۔

## (۴۱)

پربھو سیوک نے تین سال تک امریکہ میں رہ کر اور ہزاروں روپے خرچ کر کے جو تجربہ اور ہنر حاصل کیا تھا وہ مسٹر جان سیوک نے اُن کی صحبت سے اتنے ہی مہینوں میں حاصل کر لیا تھا۔ اتنا ہی نہیں پربھو سیوک کی طرح وہ صرف نبلائے ہوئے راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلنے پر قانع نہ تھے۔ اُن کی نگاہ آگے پیچھے دائیں بائیں

بھی رہتی تھی۔ ماہرین میں ایک تنگ دلی ہوتی ہے جو اُن کی نگاہوں کو محدود رکھتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر آزاد ہو کر وسیع نگاہ نہیں ڈال سکتے۔ ضابطہ اصول اور روایات اُن کی نگاہوں کو پھیلنے نہیں دیتیں۔ طبیب ہر مرض کی دوا کتابوں میں تلاش کرتا ہے۔ وہ صرف تشخیص کا غلام ہے اور علامات کا غلام۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کتنے ہی مرضوں کی دوا انسان کے پاس بھی نہیں تھی۔ عقل سلیم اگر تفصیلات پر قادر نہیں۔ تو تعصبات سے بھی آزاد ہوتی ہے۔ وہ کسی مسئلہ پر مجموعی حیثیت سے غور کر سکتی ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں اُلجھ کر نہیں رہ جاتی۔ یہی باعث ہے کہ دفتر وزارت میں بیٹھا ہوا فوجی وزیر سپہ سالار پر حکومت کرتا ہے۔ پرجوسیوک کی علیحدگی سے مسٹر جان سیوک ذرا بھی برداشتہ خاطر نہیں ہوئے۔ وہ دوگنے حوصلے سے کام کرنے لگے۔ کاروباری شخص تھے۔ جتنی آسانی سے دفتر میں بیٹھ کر بھی کھانا کھا سکتے تھے۔ اُتنی ہی آسانی سے موقع پڑنے پر وہ انجن کے پہیوں کو بھی چلا سکتے تھے۔ پہلے کبھی کبھی سرسری نگاہوں سے مل کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اب باقاعدگی کے ساتھ اوقات معینہ پر جاتے۔ اکثر دن کا کھانا وہیں کھاتے اور شام کو گھر جاتے کبھی کبھی رات کے نو دس بج جاتے۔ وہ پرجوسیوک کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ میں نے تمہارے ہی بھروسہ پر یہ کام نہیں شروع کیا۔ کوّے کے نہ بولنے پر بھی سویرا ہو ہی جایا کرتا ہے۔ اُن کی زر پرستی اولاد کی محبت پر مبنی نہ تھی۔ وہ ان کی زندگی کا خاص جزو اور اُن کے چشمۂ حیات کا اصلی منبع تھی۔ دنیا کی اور سبھی باتیں ضمنی تھیں۔

مزدوروں اور کاریگروں کے لئے مکانات تعمیر کرانے کا مسئلہ ابھی حل نہ ہوا تھا۔ اگرچہ مجسٹریٹ صلح سے اُنہوں نے ربط ضبط پیدا کر لیا تھا مگر چتاری کے راجہ صاحب کی طرف سے اُنہیں بڑا اندیشہ تھا۔ راجہ صاحب ایک بار عوام کی مرضی کے خلاف چل کر اس قدر بدنام ہو چکے تھے کہ اُس سے کہیں زیادہ اہم فتح کی اُمید بھی اُنہیں ایسی فضیحت کے لئے تیار نہ کر سکتی تھی۔

مل بڑے زوروں پر چل رہی تھی مگر مزدوروں کے مکانات کا نہ ہونا اُس کی ترقی میں رُکاوٹ ڈال رہا تھا۔ جان سیوک اسی اُدھیڑ بن میں پڑے رہتے تھے۔

اتفاقاً وقتی حالات میں کچھ ایسا تغیر ہُوا کہ یہ مشکل مسئلہ بھی کسی خاص کوشش کے بغیر ہی حل ہو گیا۔ پربھو سیوک کی علیحدگی نے وہ کام کر دکھایا جو شاید اُن کی رفاقت سے نہ ہو سکتا۔

جب سے صوفیا اور رونے آگئے تھے سمتی خوب ترقی کر رہی تھی۔ اُس کی سیاسی آگاہی روز بروز تیز ہو جاتی تھی۔ کنور صاحب نے جتنی آسانی سے پہلی مرتبہ حکام کے شکوک رفع کر دئے تھے اتنی آسانی سے اب کے نہ کر سکے۔ اب مسئلہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہو گیا تھا۔ پربھو سیوک کو استعفا دینے کے لئے مجبور کرنا مشکل نہ تھا۔ مگر دنے کو گھر سے بدر کر کے اُسے حکام کے رحم پر چھوڑ دینا کہیں زیادہ مشکل تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ کنور صاحب بے خوف آدمی تھے۔ حب الوطنی کے رنگ میں رنگے ہوئے آزاد۔ بے لوث اور دُور اندیش۔ اُن کی زندگی اتنی سادہ اور صاف تھی کہ لوگ اُنہیں تارک الدنیا کہا کرتے تھے۔ اُنہیں عیش و عشرت کے لئے کسی بڑی جائداد کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔ مگر فطرتاً ہر طریقہ پر وہ حکام کے عتاب بننے کے لئے تیار نہ تھے۔ وہ قومی کام کے لئے اپنا سب کچھ دے سکتے تھے۔ مگر اس طرح کہ امانت کی باگ دُور اُن کے ہاتھوں میں رہے۔ اُن میں اُس قربانی کی ہمت نہ تھی۔ جو بالکل بے غرضی اور بے لوثی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ انہیں یقین تھا کہ ہم آزمیں رہ کر اس سے کہیں زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں جتنا کہ سامنے آکر۔ رونے کی اور ہی رائے تھی۔ وہ کہتا تھا کہ ہم جائداد کے لئے اپنے ضمیر کی آزادی کا خون کیوں کریں۔ ہم جائداد کے مالک بن کر رہیں گے۔ اُس کے غلام بن کر نہیں۔ اگر دولت پرستی سے نجات پا سکے تو اس ریاضت کا نتیجہ کیا ہُوا۔ یہ تو گناہ بے لذت ہے۔ بے نیازی کے لئے ہی تو یہ ریاضت اختیار کی گئی ہے۔ کنور صاحب اس کا یہ جواب دیتے کہ ہم جائداد کے مالک نہیں بلکہ محافظ ہیں۔ یہ جائداد آئندہ نسلوں کی امانت

ہے۔ ہمیں کیا اختیار ہے کہ ہم اُن نسلوں سے وہ آرام چھین لیں جو اُنہیں وراثتاً ملنا چاہیئے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ اتنے معیار پسند نہ ہوں یا اُنہیں وقتی حالات کے تبدیل ہو جانے سے نفس کشی کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اُن میں وہ فطرتی اوصاف نہ ہوں جن کے سامنے جائداد کوئی چیز نہیں۔ ایسے ہی دلائل سے وہ دنے کی تشفی کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اپنی زندگی بھر دولت و ثروت سے آرام و عزت حاصل کرنے کے بعد وہ ترک اور استغناء کا واقعی مطلب ہی نہ سمجھ سکتے تھے۔ وہ اولاد کے لیے جائداد نہ چاہتے تھے۔ جائداد کے لیے اولاد چاہتے تھے۔ جائداد کے مقابلہ میں اولاد کی حیثیت ثانوی تھی۔ اُنہیں حکام کی خوشامد سے نفرت تھی۔ وہ حکام کے ہاں بیں ہاں، لانا معیوب سمجھتے تھے۔ مگر حکام کی نظروں میں مشتبہ ہو جانا اس حد تک کہ وہ دشمنی پر آمادہ ہو جائیں انہیں محض حماقت معلوم ہوتی تھی۔ کنور صاحب کے ہاتھوں میں دنے کو راہ راست پر لانے کی ایک ہی تدبیر تھی۔ وہ یہ کہ صوفیا سے اُس کی شادی ہو جائے۔ اس طرح زنجیروں میں جکڑ کر وہ اُس کے اُٹھتے ہوئے جوش کو ٹھنڈا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب جو تاخیر تھی وہ صوفیا کی طرف سے۔ صوفیا کو اب بھی اندیشہ تھا کہ اگرچہ رانی صاحبہ اس وقت مجھ پر خصوصاً مہربان ہیں مگر انہیں دل سے یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔ اُس کا یہ اندیشہ بالکل بے بُنیاد بھی نہ تھا۔ رانی بھی صوفیا سے محبت کر سکتی تھیں اور کرتی تھیں۔ وہ اس کی عزت کر سکتی تھیں۔ اور کرتی تھیں۔ مگر وہ اپنی بہو میں ترک تعلق و استغناء غور و خوض کی بہ نسبت حیا۔ سادگی اور خاندانی شرافت کا ہونا زیادہ ضروری خیال کرتی تھیں۔ وہ چھوڑنے والی بہو نہیں بلکہ لپٹنے والی بہو چاہتی تھیں۔ مگر وہ اپنے دل خیالات کو بھول کر بھی زبان پر نہ لاتی تھیں۔ نہیں۔ بلکہ وہ ایسے خیالات کو اپنے دل میں آنے ہی نہ دینا چاہتی تھیں۔ وہ ایسے احسان فراموشی سمجھتی تھیں۔

کنور صاحب کئی روز تک اسی فکر میں مُبتلا رہے۔ مسٹر جان سیوک سے

گفتگو کئے بغیر شادی کس طرح طے ہوتی؟ آخر ایک دن اپنی مرضی کے خلاف ہونے پر بھی وہ مجبوراً اُن کے پاس گئے۔ شام ہو گئی تھی۔ مسٹر سیدوک ابھی ابھی مل سے واپس آئے تھے۔ اور مزدوروں کے مکانات کی تجویز و سامنے رکھے ہوئے کچھ سوچ رہے تھے۔ کنور صاحب کو دیکھتے ہی اُٹھے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔

کنور صاحب کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ آپ دنے اور صوفیا کی شادی کے متعلق کیا تجویز کرتے ہیں؟ آپ میرے دوست اور صوفیا کے والد ہیں اور دونوں ہی رشتوں کے سبب مجھے آپ سے یہ کہنے کا حق ہے کہ اب اس کام میں دیر نہ کیجئے۔

جان سیدوک۔ دوستی کے تعلق سے آپ مجھ سے چاہے جو خدمت لے سکتے ہیں۔ لیکن (متانت سے) صوفیا کا والد ہونے کے تعلق سے مجھے کچھ تجویز کرنے کا حق نہیں ہے۔ اُس نے مجھے اس حق سے محروم کر دیا ہے۔ ورنہ اُسے یہاں آئے اتنے دن ہو گئے۔ کیا ایک مرتبہ بھی یہاں تک نہ آتی؟ اس نے ہم سے یہ حق چھین لیا ہے۔ اتنے ہی میں مسز سیدوک بھی آگئیں اور شوہر کی باتیں سُن کر بولیں۔ میں تو مر جاؤں گی پر اُس کی صورت نہ دیکھوں گی۔ ہمارا اُس سے اب کوئی تعلق نہیں رہا۔

کنور۔ آپ لوگ صوفیا کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں۔ جب سے وہ یہاں آئی ہے ایک روز بھی گھر سے باہر نہیں نکلی۔ اس کا سبب فقط شرم ہے اور کچھ نہیں۔ شاید ڈرتی ہے کہ باہر نکلوں اور کسی شناسا سے ملاقات ہو جائے تو اُس سے کیا باتیں کروں گی۔ ذرا دیر کے لئے فرض کر لیجئے کہ ہم میں سے کوئی بھی اُس کی جگہ ہوتا تو اُس وقت دل میں کیسے خیالات ہوتے۔ اس بارہ میں وہ قابل معافی ہے۔ میں تو اسے اپنی بد قسمتی سمجھوں گا۔ اگر آپ لوگ اُس سے اس طرح بے تعلق ہو جائیں گے۔ تو شادی میں تاخیر نہ ہونی چاہئے۔

مسز سیدوک۔ خدا وہ دن نہ لائے۔ میرے لئے تو وہ مر گئی۔ میں اُس کا فاتحہ پڑھ چکی اور اُس کے نام کو جتنا رونا تھا رو چکی۔

کنور۔ یہ زیادتی آپ لوگ میری ریاست کے ساتھ کر رہے ہیں۔ شادی

ہی ایک ایسی تدبیر ہے جو رونے کی خودسری کو زائل کر دے گی۔

جان سیلوک۔ میری تو رائے ہے کہ آپ ریاست کو کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دیجئے۔ گورنمنٹ عالیہ آپ کی تجویز کو بخوشی منظور کرے گی اور آپ کے متعلق اس کا سارا شبہ دور ہو جائے گا۔ اُس وقت کنور رونے سنگھ کی سیاسی بدعنوانیوں کا ریاست پر ذرا بھی اثر نہ پڑے گا۔ اور اگرچہ اُس وقت اُن کو آپ کی یہ تجویز بُری معلوم ہو گی۔ مگر کچھ روز بعد جب اُن کے خیالات میں پختگی آجائے گی۔ تو وہ آپ کے ممنون ہوں گے اور آپ کو اپنا سچا بہی خواہ خیال کریں گے۔ ہاں اتنی عرض اور ہے کہ اس کام میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ اپنے کو خوب مضبوط بنا لیں۔ اُس وقت اگر آپ کی طرف سے ذرا بھی پس و پیش ہُوا تو آپ کی ساری کوشش بیکار جائے گی۔ آپ گورنمنٹ کی بدگمانیوں کو رفع کرنے کی بجائے اور بھی بڑھا دیں گے۔

کنور۔ میں جائداد کی حفاظت کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ رونے کو کسی قسم کی مالی تکلیف نہ ہونے پاوے۔ بس اپنے لئے میں اور کچھ نہیں چاہتا۔

جان سیلوک۔ آپ ظاہر اگر کنور رونے سنگھ کے لئے کوئی انتظام نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ کہ آپ اپنے وثیقہ میں سے جو مناسب سمجھیں انہیں بھی دے دیا کریں۔

کنور۔ اچھا۔ مان لیجئے کہ رونے اسی راستہ پر بڑھتے ہی گئے تو؟

جان سیلوک۔ تو اُنہیں ریاست پر کوئی اختیار نہ ہو گا۔

کنور۔ لیکن اُن کی اولاد کو تو یہ اختیار رہے گا؟

جان سیلوک۔ ضرور۔

کنور۔ گورنمنٹ صاف لفظوں میں اس شرط کو منظور کرے گی؟

جان سیلوک۔ نہ منظور کرنے کا تو کوئی سبب نہیں معلوم ہوتا۔

کنور۔ ایسا تو نہ ہو گا کہ رونے کے اعمال کا نتیجہ اُن کی اولاد کو بھگتنا پڑے؟

سرکار ریاست کو ہمیشہ کے لئے ضبط کرلے؟ دو ایک مقامات پر ایسا ہوا ہے۔ برار ہی کو لیجئے۔

جان سیوک۔ کوئی خاص بات پیدا ہو جائے تو نہیں کہہ سکتا۔ لیکن سرکار کا یہ وطیرہ کبھی نہیں رہا۔ برار کی بات جانے دیجئے۔ وہ اتنا بڑا صوبہ ہے کہ کسی ریاست میں اُس کا شامل ہو جانا ملکی انتظامات میں مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔

کنور۔ تو میں کل ڈاکٹر گنگولی کو شملہ سے تار بھیج کر بلائے لیتا ہوں۔

جان سیوک۔ آپ چاہیں تو بُلا لیں۔ میری رائے میں تو یہیں سے مسودہ بنا کر اُن کے پاس بھیج دیا جائے یا کہئے تو میں خود چلا جاؤں اور ساری باتیں آپ کی مرضی کے موافق طے کر آؤں۔

کنور صاحب نے شکریہ ادا کیا اور گھر چلے آئے۔ تمام رات وہ اسی حیص بیص میں پڑے رہے کہ دونے اور جانہوی سے اس تجویز کا تذکرہ کروں یا نہیں۔ اُن کا جواب اُنہیں معلوم تھا۔ اُن سے ناپسندیدگی اور انکار کے سوا ہمدردی کی ذرا بھی اُمید نہیں کہنے سے فائدہ کیا؟ ابھی تو دنے کو کچھ خوف بھی ہے۔ یہ حال سُنے گا تو اور بھی دلیر ہو جائے گا۔ آخر کار انہوں نے یہی طے کیا کہ ابھی راز فاش کر دینے سے کوئی نفع نہیں بلکہ خلل پڑ جائے گا۔ کام پورا ہو جائے پر کہنے سُننے کے لئے کافی وقت ملے گا۔

مسٹر جان سیوک پیروں تلے گھاس نہ اُگنے دینا چاہتے تھے۔ دوسرے ہی روز اُنہوں نے ایک بیرسٹر سے درخواست کا مسودہ تیار کرایا اور اُسے کنور صاحب کو بھی دکھلایا۔ اُسی روز وہ کاغذ ڈاکٹر گنگولی کے پاس روانہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس تجویز کو بہت پسند کیا اور خود شملہ سے آئے۔ یہاں کنور صاحب سے مشورہ کیا۔ اور دونوں اصحاب صوبہ کے گورنر کے پاس جا پہنچے۔ گورنر کو اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ ریاست پر ایک کوڑی کا بھی قرض نہ تھا۔ سرکاری عمّال نے ریاست کے حساب وغیرہ کی جانچ شروع کی اور ایک ماہ کے اندر ریاست پر سرکار کا قبضہ ہو گیا۔ کنور صاحب ندامت و پشیمانی کے سبب ان دنوں دنے سے

بہت کم بولتے۔ گھر میں بہت کم جاتے۔ آنکھیں چُراتے رہتے تھے۔ کہ کہیں یہ گفتگو نہ چھڑ جائے۔ جس روز تمام شرائط طے ہو گئیں۔ کنور صاحب سے ضبط نہ ہو سکا۔ وہ تنگ سے بولے۔ ریاست پر سرکاری قبضہ ہو گیا۔

وہ نے چونک کر دریافت کیا۔ کیا ضبط ہو گئی؟

کنور۔ نہیں میں نے کورٹ آف وارڈ کے سپرد کر دیا۔

یہ کہہ کر انہوں نے شرائط کا ذکر کیا اور انکسار کے ساتھ کہا۔ معاف کرنا۔ میں نے تم سے اس بارہ میں صلاح نہیں کی۔

وہ نے۔ مجھے اس کا ذرا بھی غم نہیں ہے۔ لیکن آپ نے فضول ہی اپنے کو گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ڈال دیا۔ اب آپ کی حیثیت محض ایک وثیقہ دار کی ہے۔ جس کا وثیقہ کسی وقت بھی بند کیا جا سکتا ہے۔ کنور۔ اس کا انتظام تمہارے سپرد ہے۔

وہ نے۔ آپ نے یہ تجویز کرنے کے پیشتر ہی مجھ سے پوچھا ہوتا تو یہ نوبت نہ آنے پاتی۔ میں تمام عمر ریاست سے دست بردار رہنے کا اقرار نامہ تحریر کر دیتا۔ اور آپ اُسے شائع کر کے حکام کو خوش رکھ سکتے تھے۔

کنور۔ (سوچ کر) اُس حالت میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ میں پوشیدہ طور پر تمہاری مدد کر رہا ہوں۔ اس شبہ کو مٹانے کا میرے پاس اور کون ذریعہ تھا؟

وہ نے۔ تو میں اس گھر سے نکل جاتا اور آپ سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیتا۔ اب بھی اگر آپ اس انتظام کو مسترد کرا سکیں تو بہتر۔ ورنہ میں اپنے خیال سے نہیں۔ آپ ہی کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔ میں اپنے گورنمنٹ کی کوئی صورت پیدا کر لوں گا۔

کنور صاحب آبدیدہ ہو کر بولے۔ وہ نے مجھ سے ایسی سخت باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری ملامت کا نہیں۔ تمہاری ہمدردی اور رحم کا مستحق ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ صرف سوشل خدمات سے ہماری نجات نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہم آئندہ سے ان خدمات کو بھی انجام نہیں دے سکتے۔ کوئی تحریک

جس ملک میں اپنی حالت کے احساس کی قابلیت پیدا ہو تو انسانیت اور قومیت کے جذبات کو پیدا کرے۔ اشتہار سے نہیں سکتی۔ یہ سب جانتے ہوئے میں نے اس بھی دائرہ میں قدم رکھا تھا مگر یہ نہ جانتا تھا کہ یہ تحریک جلد ہی موجودہ صورت اختیار کر لے گی اور اُس کا یہ انجام ہوگا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں ظاہر نہ ہو کر بھی اس کا انتظام کرتا رہوں گا۔ یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے لئے مجھے اپنا سب کچھ اپنا نام تک آنے والی نسلوں کا بھی سب کچھ سُوا کر دینا پڑے گا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں اس قدر ایثار کی ہمت نہیں ہے۔

دنے نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ انہیں اپنی یا صوفیا کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ اُسے فکر تھی تحریک کو جاری رکھنے کی۔ اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔ انہیں کبھی دان مانگنے کی ضرورت نہ پڑی تھی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ عوام سے روپیہ کس طرح ملتے ہیں۔ کم از کم پانچ ہزار ماہوار کا اندازہ تھا۔ اتنا روپیہ فراہم کرنے کے لئے ایک علیحدہ جماعت کی ضرورت تھی۔ اب انہیں معلوم ہوا کہ دولت اتنی حقیر شے نہیں ہے۔ پانچ ہزار روپے ماہوار یا ساٹھ ہزار روپے سالانہ کے لئے بڑا کام کے مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے۔ کچھ عقل کام نہ کر سکتی تھی۔ جانہوی کے پاس کچھ ان کی بچت کی پونجی تھی جسے وہ دینا نہ چاہتی تھیں۔ اب تو اُسے محفوظ رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت تھی کیونکہ وہ دنے کو مفلس نہیں بنانا چاہتی تھیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ دنے اور اندر دت دونوں روپے کے لئے فکر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً صوفیا نے آکر کہا۔ میں ایک تدبیر بتلاؤں۔

اندر دت۔ چندہ مانگنے چلیں؟

صوفیا۔ کیوں نہ ایک ڈراما کھیلا جائے۔ ایکٹر موجود ہی ہیں۔ کچھ پردے تیار کرا لئے جائیں۔ میں بھی تماشا میں مدد دوں گی۔

دنے۔ رائے تو صائب ہے۔ مگر ڈراما کی ہیروئن تمہیں کو بننا پڑے گا۔

صوفیا۔ ہیروئن کا پارٹ اندر رانی لیں گی اور میں اُن کی سکھی کا۔

اندردت۔ اچھا کون سا ناٹک کھیلا جائے؟ بھوجی کا دکھی ناٹک۔؟

دنے۔ مجھے تو پرساد کا "اجات شاستر" بہت پسند ہے۔

صوفیا۔ مجھے کرشنا بہت پسند آیا۔ اس میں رزم کا بھی شائبہ ہے اور سوگ کا بھی۔ دونوں کی نفیس آمیزش ہے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ ایک چپڑاسی رسالہ لے آیا اور ایک مہر بند رجسٹرڈ لفافہ دنے کے ہاتھ میں دے کر چلا گیا۔ لفافہ لندن سے آیا تھا۔ اور اس پر پبلیسٹی کے نام کی مہر تھی۔

دنے۔ اچھا بتاؤ اس میں کیا ہوگا؟

صوفیا۔ روپے تو ہوں گے نہیں اور چاہے جو ہو۔ وہ غریب روپے کہاں پائے گا۔ وہاں ہوٹل کا خرچ ہی بمشکل ادا کرتا ہوگا۔

دنے۔ اور میں کہتا ہوں کہ اس میں روپیوں کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

اندردت۔ کبھی نہیں۔ کوئی نئی تصنیف ہوگی۔

دنے۔ تو جبھی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

اندردت۔ روپے ہوتے تو بیمہ نہ کرایا ہوتا۔

دنے۔ میں کہتا ہوں روپے ہیں۔ جا۔ مے شرط بد لو۔

اندردت۔ میرے پاس کل پانچ روپے ہیں۔ پانچ پانچ کی بازی ہے۔

دنے۔ یہ نہیں۔ اگر اس میں روپے ہوں تو میں تمہاری گردن پر سوار ہو کر کے اس سرے تک جاؤں گا۔ نہ ہوئے تو تم میری گردن پر سوار ہونا۔ بولو

اندردت۔ اچھا منظور ہے۔ کھولو لفافہ۔

لفافہ کھولا گیا۔ تو ایک چیک نکلا۔ پورے دس ہزار کا۔ لندن بینک کے نام۔ دنے خوشی سے اچھل پڑے۔ بولے ــــ میں کہتا نہ تھا۔ یہاں علم الغیب پڑھے ہوئے ہیں۔ آئیے لائیے گردن۔

اندردت۔ ٹھہرو ٹھہرو۔ گردن توڑ دوگے کیا؟ ذرا خط تو پڑھو۔ لیا لفافہ

ہے؟ کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟ لگے سواری کا منتظر ہے۔

ونے۔ جی نہیں۔ یہ نہیں ہونے کا۔ آپ کو سواری دینا ہوگی۔ گردن ٹوٹے یا رہے۔ اس کا میں ذمہ دار نہیں۔ کچھ ڈبلے پتلے تو ہو نہیں۔ خاصے دیو بنے ہوئے ہو۔

اندرودت۔ بھئی آج منگل کے دن نظر نہ لگاؤ۔ کل دو من ۳۵ سیر تو رہ گیا ہوں۔ برا جیو تانہ جانے کے قبل تین من سے زیادہ تھا۔

ونے۔ خیر دیر نہ کیجئے۔ آئیے گردن جھکا کر کھڑے ہو جائیے۔

اندرودت۔ صوفیا میری حفاظت کرو۔ تمہیں نے پہلے کہا تھا کہ اس میں دھبے نہ ہوں گے۔ وہی سن کر میں نے بھی کہہ دیا تھا۔

صوفیا۔ میں تمہارے جھگڑوں میں نہیں پڑتی۔ تم جانو وہ جانیں۔ یہ کہہ کر اس نے خط پڑھنا شروع کیا۔

پیارے بھائی۔ میں نہیں جانتا کہ یہ خط کس کو لکھ رہا ہوں۔ کچھ خبر نہیں کہ آج کل میجر کون ہے۔ مگر سبوا سمتی سے مجھے اب بھی وہی محبت ہے جو پہلے تھی۔ اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ آپ میری حیرت کا حال جاننے کے لئے مشتاق ہوں گے۔ میں پونا ہی میں تھا کہ وہاں کے گورنر نے مجھے ملنے کے لئے بلایا۔ اُن سے دیر تک علم ادب کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ وہ ایک ہی ہر فن ہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے لوگ کم نکلیں گے۔ ونے (اس کا کچھ حال نہیں معلوم ہوا) کے سوا میں نے اور کسی کو بھی اتنا سخن فہم نہیں پایا۔ کتنا جاندار اخلاق تھا۔ گورنر صاحب کے اصرار سے میں یہاں آیا اور جب سے آیا ہوں میری تواضع تکریم برابر ہو رہی ہے۔ واقعی زندہ اقوام ہی ماہرین فن کی قدر کرنا جانتے ہیں۔ ملنسار آدمی ہیں۔ مجھے اس قوم سے اب عقیدت ہو گئی ہے اور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس قوم کے ہاتھوں ہمارا نقصان کبھی نہیں ہو سکتا۔ کل یونیورسٹی کی جانب سے مجھے ایک سپاس نامہ دیا گیا تھا خادمانِ ادب ایسا ہجوم میں نے کاہے کو کبھی دیکھا تھا۔ عورتوں کا اخلاق اور احترام آمیز

سلوک دیکھ کر میں دنگ ہو گیا۔ دو دن پہلے ایڈلر پانڈس نے دعوت دی تھی۔ آج ادبی انجمن نے مدعو کیا ہے۔ کل لبرل ایسوسی ایشن دعوت دے گا۔ پرسوں پارسی سماج کا نمبر ہے۔ اسی روز یونین کلب کی جانب سے پارٹی دی جاوے گی۔ مجھے خواب میں بھی امید نہ تھی کہ میں اتنا جلد بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔ میں شہرت اور عزت کی بُرائی کرنے والوں میں نہیں ہوں۔ اس کے سوا اہل کمال کو اور کیا صلہ مل سکتا ہے؟ مجھے اب معلوم ہوا کہ میں کیا کرنے کے لیے دُنیا میں آیا ہوں۔ میری زندگی کا کیا مقصد ہے۔ اب تک وہم میں پڑا ہوا تھا۔ اب میری زندگی کا مشن ہوگا مغرب و مشرق میں رشتہ اتحاد قائم کرنا اور اُسے پائدار بنانا۔ باہمی اختلافات کو مٹانا اور دونوں میں یکسانیت کے جذبہ کو پیدا کرنا۔ میں اسی بات کا عہد کروں گا۔ کسی زمانہ میں مشرق نے مغرب کو مذہب و ایمان کا راستہ دکھلایا تھا۔ اب وہ اسے اتحاد کا نغمہ سُنائے گا۔ اتحاد کا راستہ دکھلائے گا۔ میرے کلام کے پہلے حصہ کو میکملن کمپنی جلد ہی شائع کرے گی۔ خود گورنر صاحب اُس کا دیباچہ لکھیں گے۔ اس مجموعۂ کلام کے لیے کمپنی نے مجھے چالیس ہزار روپے دیے ہیں۔ نشتا تو یہی تھی کہ یہ ساری رقم اپنی پیاری سمتی کے نذر کرتا مگر ارادہ ہے کہ ہر یکہ کی سیر کراؤں۔ اس لیے بس وقت جو کچھ بھیجتا ہوں اُسے قبول کیجیے۔ میں نے محض اپنا فرض ادا کیا ہے اس لئے شکریہ کا مستحق نہیں رکھتا۔ البتہ اتنا عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آپ کو خدمت کے معیار کو اعلیٰ اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔ اور سیاسی معاملات سے الگ ہو کر انسانی خدمت کی اشاعت کو اپنا معیار بنانا چاہیے۔ میری تقریروں کی رپورٹ آپ کو یہاں کے اخبارات میں ملے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ میرے سیاسی خیالات میں کتنا فرق آ گیا ہے۔ میں اب ایک مُلک کا نہیں بلکہ سب مُلکوں کا ہوں۔ اب ساری دنیا میرا مُلک ہے۔ کل انسان میرے بھائی ہیں اور جغرافیائی نیز قومی حدود کو مٹا دینا میری زندگی کا خاص مقصد ہے۔ خدا سے دعا کیجیے کہ امریکہ سے بخیریت واپس آ جاؤں۔

آپ کا سچا بھائی۔ پر بھو سیوک۔

صوفیا نے خط میز پر رکھ دیا۔ متانت سے بولی ـــ اس کے دونوں ہی مطلب ہو سکتے ہیں۔ روحانی کمال یا زوال۔ میں تو زوال ہی سمجھتی ہوں۔

وِنے۔ کیوں کمال کیوں نہیں؟

صوفیا۔ اس لئے کہ پربھو سیوک آرائش و زیبائش کا دلدادہ ہے۔ وہ ایک بات پر کبھی قائم نہیں رہتا۔ جو شخص اپنی عزت ہونے پر اتنا پُر اُمید ہو سکتا ہے وہ اپنی ذلت سے اُتنا ہی نا اُمید بھی ہو جائے گا۔

وِنے۔ یہ کوئی بات نہیں۔ شاید اسی طرح میں بھی مسرور ہو جاتا۔ یہ تو بالکل قدرتی بات ہے۔ یہاں اُن کی کیا قدر ہوئی۔ عزتے وہ بنارس گمنام بنے رہتے۔

اندرو۔ جب ہمارے کام کے نہیں رہے تو مشہور ہُوا کریں۔ ایسے دُنیا سے محبت کرنے والوں سے ہمیں کسی بھلائی کی توقع ہے اور نہ ہوگی۔ جس میں اپنا پن نہیں اُس میں پرایا پن کیا ہوگا؟

صوفیا۔ یہی محبت ہمارے کئی تو ڑ کرنے والی اور وہ انہیں نہیں چھوڑنے کی ان کا عدم وجود ہمارے لئے ایسا ہی ہے بلکہ مجھے تو اب ان سے نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ میں ابھی جا کر اس خط کا جواب لکھتی ہوں۔

یہ کہتے ہوئے صوفیا اُس خط کو ہاتھ میں لئے اپنے کمرہ میں چلی گئی

وِنے نے کہا۔ کیا کروں؟ روپے واپس کر دوں؟

اندرو۔ روپے کیوں واپس کر دو گے۔ اُنہوں نے کوئی شرط تو نہیں لکھی ہے محض دوستانہ صلاح دی ہے اور بہت عمدہ صلاح دی ہے۔ ہمارا بھی تو وہی مقصد ہے فرق ـــ فرق اتنا ہے کہ وہ مساوات کے بغیر ہی اخوت کی اشاعت کرنی چاہتے ہیں اور ہم اخوت کے لئے مساوات کا ہونا لازمی خیال کرتے ہیں۔

وِنے۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ اخوت کا مساوات ہی پر دار و مدار ہے۔

اندرو۔ [illegible]

دنے۔ اچھا روپے رکھ لیتا ہوں۔ پھر دیکھا جائے گا۔

اندردت۔ دو چار ایسے ہی دوست اور مل جائیں تو ہمارا کام چل نکلے۔

دنے۔ صوفیا کے ڈرامے کیسے ہیں؟ (صوفیا کی طرف دیکھتے ہوئے)

اندردت۔ کیا پوچھنا ان کا پارٹ دیکھ کر لوگ دنگ رہ جائیں گے۔

دنے۔ تم میری جگہ ہوتے تو اُسے سٹیج پر لانا پسند کرتے؟

اندردت۔ پیشہ سمجھ کر تو نہیں لیکن رفاہ عام کے لئے سٹیج پر لانے میں شاید مجھے اعتراض نہ ہوتا۔

دنے۔ تو تم مجھ سے کہیں زیادہ فراخدل ہو۔ میں تو یہ بات کسی حالت میں بھی پسند نہ کروں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمہیں صوفیا آج کل کچھ اداس سی معلوم ہوتی ہے؟ کل اُس نے مجھ سے جو باتیں کیں وہ بہت مایوس کن تھیں۔ اُس کو اندیشہ ہے کہ اُسی کے سبب ریاست کا یہ حشر ہوا ہے۔ اتا جی تو اُس پر جان دیتی ہیں مگر وہ اُن سے دُور بھاگتی ہے۔ پھر وہی روحانی باتیں کرتی ہے جس کا مطلب آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔ "میں تمہارے پیروں کی زنجیر نہیں بننا چاہتی۔ میرے لئے صرف تمہاری محبت کی نظر کافی ہے"۔ اور خدا جانے کیا کیا بک جاتی ہے۔ اِدھر میرا یہ حال ہے کہ گھنٹہ بھر بھی اُسے نہ دیکھوں تو دل بیقرار ہو جاتا ہے۔

اتنے ہی میں موٹر کی آواز سُنائی دی اور ایک لمحہ بعد اندو وہاں آ پہنچی۔

اندردت۔ آیئے۔ اندر رانی آیئے۔ آپ ہی کا انتظار تھا۔

اندو۔ جھوٹے ہو۔ میری اس وقت ذرا بھی چرچا نہ تھی۔ روپے کے تردّد میں مبتلا ہو۔

اندردت۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کچھ لائی ہیں۔ لائیے۔ واقعی ہم لوگ بہت متردّد ہیں۔

اندو۔ مجھ سے مانگتے ہو؟ میرا حال جان کر بھی ایک بار چندہ دے کر ہمیشہ کے لئے سیکھ کیوں نہ لیا۔ صوفیا کہاں ہے؟ اتا جی تو اب رہتی ہیں نا؟

ولے۔ کسی کے دل کی بات کوئی کیا جانے؟

اندو۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ماتا جی بھی راضی ہو جائیں تو بھی تم صوفیا کو نہ پا سکو گے تمہیں ہی باتوں سے رنج تو ضرور ہوگا مگر کسی صدمہ کے لئے پیشتر سے تیار رہنا اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ اُسے ناگہانی طریقہ پر برداشت کرنا پڑے۔

ولے نے آنسو پی کر کہا۔ مجھے بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

اندو۔ صوفیا کل مجھ سے ملنے گئی تھی۔ اُس کی باتوں نے اسے بھی رولایا۔ اور مجھے بھی۔ وہ بڑی کشمکش میں پڑی ہوئی ہے۔ نہ تمہیں بیوس کرنا چاہتی ہے اور نہ ماتا جی کو ناخوش کرنا چاہتی ہے۔ نہ جانے کیوں اُسے اب بھی شک ہے کہ ماتا جی اُسے اپنی بہو نہیں بنانا چاہتیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ صرف اُس کا خیال ہے۔ وہ خود اپنے دل کی راز کو نہیں سمجھتی۔ وہ عورت نہیں ہے ایک خیالی وجود ہے۔ جذبات اور حسیات سے معمور۔ تم اُس کے لطف اندوز ہو سکتے ہو مگر اُسے عملاً محسوس نہیں کر سکتے۔ اُسے مجسم نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر اپنے عمیق ترین جذبات کو ادا نہیں کر سکتا۔ اُن میں اتنی سکت ہی نہیں ہے۔ صوفیا بھی وہی عمیق ترین جذبہ ہے۔

ارے ہاں۔ اور آپ کی یہ ساری باتیں بھی شاعرانہ ہیں۔ صوفیا شاعرانہ خیال ہے نہ کوئی مخفی راز۔ وہ نہ دیوی ہے نہ دیوتا۔ نہ حور نہ پری۔ جیسی اور عورتیں ہوتی ہیں ویسی ہی ایک عورت وہ بھی ہے۔ وہی اُس کے جذبات ہیں اور وہی اُس کے خیالات۔ آپ لوگوں نے کبھی شادی کی کوئی تیاری کی۔ کوئی بھی ایسی بات کی جس سے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ یہ شادی کر دینا چاہتے ہیں؟ تو جب آپ لوگ خود ہی ہچکچا رہے ہیں تو اُسے کیا غرض ہے کہ خواہ مخواہ شادی کا تذکرہ کرتی پھرے۔ میں تو اکھڑ آدمی ہوں۔ اُسے دیکھتے سے لاکھ محبت ہو مگر وہ اپنے منہ سے تو شادی کی بات نہ کہے گی۔ آپ لوگ وہی چاہتے ہیں جو کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس نے بھی جدائی کی راہ سے یہ تدبیر نکالی ہے۔ آپ لوگ تیاریاں کیجئے۔ پھر اُس کی طرف سے اگر کوئی ہو تو البتہ اُس سے شکایت ہو سکتی ہے۔ جب دیکھتی ہے کہ آپ لوگ خود ہی

پس و پیش کر رہے ہیں تو وہ بھی اُن دلیلوں سے اپنی عزت قائم رکھنا چاہتی ہے۔

اندو۔ ایسا کہیں بھول کر بھی نہ کرنا ورنہ وہ اس مکان میں بھی نہ رہنے دے گی۔

اتنے میں صوفیا اس خط کو لیے ہوئے آتی نظر پڑی جو اس نے پرھو سیوک کو لکھا تھا۔ اندو نے بات پلٹ دی اور کہا۔ تم لوگوں کو تو بھی خبر نہ ہوگی۔ اور مسٹر سیوک کو پانڈے پور بھیج گیا۔

صوفیا نے اندو سے گلے ملتے ہوئے پوچھا۔ پاپا اس گاؤں کو لے کر کیا کریں گے؟

اندو۔ ابھی تمہیں معلوم ہی نہیں؟ وہ خلہ کھدوا کر پھینک دیا جائے گا۔ اور وہاں مل کے مزدوروں کے لیے مکانات بنائے جائیں گے۔

اندرودت۔ راجہ صاحب نے منظور کر لیا؟ اتنی جلدی بھول گئے۔ اب کے شہر میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔

اندو۔ سرکار کا حکم تھا۔ کیسے نہ منظور کرتے؟

اندرودت۔ صاحب نے بڑی دوڑ لگائی۔ سرکار پر بھی منتر چلا دیا۔

اندو۔ کیوں اتنی بڑی ریاست پر سرکار کا قبضہ نہیں کرا دیا؟ ایک باغی راجہ کو مجہول نہیں بنا دیا؟ ایک انقلابی تحریک کی جڑ نہیں کر دی؟ سرکار پر اتنے احسانات کر کے اُسے یونہی جانے دیتے۔ کاروباری شخص نہ ہوئے کوئی راجہ نواب ہوئے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کمپنی نے پچیس فی صدی نفع دے کر اور کثیر التعداد حصہ داروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا۔

دیے۔ تو راجہ صاحب کو استعفیٰ دے دینا چاہیے تھا۔ اتنی بڑی ذمہ داری سر پر لینے سے تو یہی بہتر ہوتا۔

اندو۔ کچھ سوچ سمجھ کر تو منظور کیا ہوگا۔ سُنا کہ پانڈے پور کے لوگ اپنے مکانات چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتے۔

اندرودت۔ نہ ہونا چاہیے۔

صوفیا۔ ذرا چل کر دیکھنا چاہیے۔ کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ لیکن کہیں مجھے پاپا نظر آ گئے تو؟ نہیں میں نہ جاؤں گی۔ تمہیں لوگ جاؤ۔

تینوں آدمی پانڈے پور کو روانہ ہوئے۔

## (۴۲)

عدالت نے اگر دونوں لڑکوں کو سخت سزا دی تو عوام نے بھی سُور داس کو اُس سے کم سخت سزا نہیں دی۔ اُس پر ہر طرف سے پھبتیاں پڑنے لگیں۔ محلہ والوں کا تو کہنا ہی کیا۔ آس پاس کے گاؤں والے بھی دو چار کھری کھوٹی سُنا جاتے تھے ۔ مانگتا تو ہے بھیک۔ پر اپنے کو کتنا لگتا ہے۔ ذرا چار بھلے مانسوں نے منہ لگا لیا تو گھمنڈ کے مارے دھرتی پر پاؤں ہی نہیں دھرتا۔ سُور داس کو شرم کے مارے گھر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اُس کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہُوا کہ بجرنگی اور جگدھر کا غصّہ فرو ہو گیا۔ بجرنگی نے سوچا کہ اب کیا ماروں بیٹوں۔ اُس کے منہ میں تو یوں ہی کالکھ لگ گئی۔ جگدھر کی تنہا اتنی ہمت کہاں۔ دوسرا نتیجہ یہ ہُوا کہ سبھاگی بھیرو کے گھر جانے پر رضامند ہو گئی۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ بلا کسی آڑ کے میں ان جھونکوں سے بچ نہیں سکتی۔ سُور داس کی آڑ صرف ٹٹی کی آڑ تھی۔

ایک روز سُور داس بیٹھا ہُوا دُنیا کی ہٹ دھرمی اور بے انصافی کا دُکھڑا رو رہا تھا کہ سبھاگی بولی ۔ بھیا تمہارے اوپر میرے کارن چاروں طرف سے یہ بوچھار پڑ رہی ہے۔ بجرنگی اور جگدھر دونوں مارنے پر اُتارو ہیں۔ نہ ہو تو مجھے بھی اب میرے گھر پہنچا دو۔ یہی نہ ہو گا۔ مار سے پیٹے گا۔ کیا کروں گی۔ سہہ لوں گی۔ اس بے آبروئی سے تو بچوں گی۔

بھیرو تو پہلے ہی سے منہ پھیلائے ہوئے تھا بہت خوش ہُوا۔ آکر سبھاگی کو بڑے آدر سے لے گیا۔ سبھاگی جا کر بڑھیا کے پیروں پر گر پڑی اور خوب روئی۔ بڑھیا نے اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ بیچاری اب آنکھوں سے بھی معذور ہو گئی تھی۔ بھیرو جب کہیں چلا جاتا تو دوکان پر کوئی بیٹھنے والا نہ رہتا۔ لوگ اندھیرے

لکڑیاں اُٹھائے جاتے تھے۔ کھانا تو خیر کسی طرح پکا لیتی تھی۔ مگر اس لُوٹ گھسوٹ کا نقصان نہ سہا جاتا تھا۔ سبھاگی گھر کی دیکھ بھال تو کرے گی۔ رہا بھیرو۔ سو اُس کے دل میں اب دغا و فریب کا نام بھی نہ تھا۔ اُسے سُور داس سے اتنی عقیدت ہو گئی تھی کہ شاید کسی دیوتا سے بھی نہ ہو گی۔ اب وہ اپنی چھوٹی باتوں پر پچھتاتا اور کھلے دل سے سور داس کی سراہنا کرتا تھا۔

اتنے دنوں تک سور داس کو گھر بار کی فکر سے نجات تھی۔ پکی پکائی روٹیاں مل جاتی تھیں۔ برتن دھل جاتے تھے۔ گھر میں جھاڑو لگ جاتی تھی۔ اب پھر وہی پرانی مصیبت سر پر سوار ہوئی۔ مٹھو اب اسٹیشن پر ہی رہتا تھا۔ گھیسو اور وِدیا دھر کی سزا سے اُس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ اُس نے کان پکڑے کہ اب کبھی جُوا اور چرس کے قریب نہ جاؤں گا۔ بازار سے چرتن لے کر چیاتا اور اسٹیشن کے برآمدے میں پڑا رہتا تھا۔ کون روز تین چار میل چلے؟ ذرا بھی فکر نہ تھی۔ کہ سور داس کی کیسی کٹتی ہے۔ اب میرے ہاتھ پیر ہوئے کچھ میرا فرض بھی اُس کے متعلق ہے یا نہیں۔ آخر کس دن کے لیے اُس نے مجھے اپنے لڑکے کی طرح پالا پوسا تھا؟ سور داس کئی مرتبہ خود اسٹیشن پر گیا اور اس سے کہا کہ شام کو گھر چلا آیا کر۔ کیا اب بھی بھیک مانگوں؟ مگر اس کی بلا سنے۔ ایک مرتبہ اُس نے صاف کہہ دیا کہ یہاں میرا گزر تو ہوتا ہی نہیں۔ تمہارے لئے کہاں سے لاؤں؟ میرے لیے تم نے کون سی بڑی پنسیا کی تھی؟ ایک ٹکڑا روٹی دے دیتے تھے۔ سے تو کر دیا مجھی کو دیا۔ تم سے میں کہنے گیا تھا کہ مجھے کھلاؤ پلاؤ؟ مجھ کو کیوں نہ دیا؟ کیا جن لڑکوں کے ماں باپ نہیں ہوتے وہ سب مر ہی جاتے ہیں؟ جیسے تم ٹکڑا دے دیتے تھے۔ ویسے بہت ٹکڑے مل جاتے۔ ان باتوں سے سور داس اس قدر دل شکستہ ہو گیا کہ پھر اُس نے گھر آنے کو نہ کہا۔

اِدھر صوفیا کئی بار سُور داس سے مل چکی تھی۔ وہ اور تو کہیں نہ جاتی مگر وقت نکال کر سُور داس سے ملنے ضرور جاتی۔ ایسے موقع سے پہنچتی کہ سبلوک صاحب

سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آنے پائے۔ وہ جب آتی تو سورداس کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات ضرور لاتی۔ اُس نے اندوت سے اس کا سارا حال سُنا تھا۔ اس کا عدالت میں عوام سے اپیل کرنا۔ چندہ کے روپے خود نہ لے کر دوسرے کو دے دینا۔ زمین کا معاوضہ جو سرکار سے ملا تھا اُسے خیرات کر دینا۔ اُس وقت سے اُس کو سورداس سے اور بھی زیادہ عقیدت ہو گئی تھی۔ جہلا کا مذہبی شوق اینٹ پتھر کی پرستش سے پورا ہو جاتا ہے۔ اور شرفا کا اولیائے کرام کی خدمت سے۔ انہیں ہر فقیر و اللے جنم کا کوئی نہ کوئی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُن کی گالیاں سُنتے ہیں۔ اُس کے جھوٹے برتن دھوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے گرد آلود پیروں کو دھو کر پی جاتے ہیں۔ انہیں اُس کے قالب میں کوئی مقدس ترین روح بیٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ صوفیا کو سورداس سے کچھ ایسی ہی عقیدت ہو گئی تھی۔ ایک بار وہ اُس کے لئے سنترے اور سیب لے گئی۔ سورداس گھر لایا۔ مگر اس نے خود نہ کھایا۔ مٹھو کی یاد آئی۔ وہ اُس کی بدکلامی کو بھول گیا۔ سویرے پھلوں کو دے کر اسٹیشن گیا اور اُسے دے آیا۔ ایک بار صوفیا کے ساتھ اندو بھی آئی تھی۔ سردی کے دن تھے۔ سورداس کھڑا کانپ رہا تھا۔ اندو نے وہ کمبل جسے وہ اپنے پیروں پر ڈالے ہوئے تھی سورداس کو دے دیا۔ سورداس کو وہ کمبل ایسا اچھا معلوم ہوا کہ اُسے خود نہ اوڑھ سکا۔ میں بوڑھا بھکاری۔ یہ کمبل اوڑھ کر کہاں جاؤں گا۔ کون بھیک دے گا۔ رات کو زمین پر پڑوں۔ دن بھر سڑک کے کنارے کھڑا رہوں۔ مجھے یہ کمبل لے کر کیا کرنا ہے۔ جا کر مٹھو کو دے آیا۔ ادھر تو اب بھی اتنی محبت تھی اُدھر مٹھو اتنا خود غرض تھا کہ کھانے کو بھی نہ پوچھتا۔ سورداس سمجھتا کہ لڑکا ہے یہی اس کے کھانے پہننے کے دن ہیں۔ میری خبر نہیں لیتا نہ سہی۔ خود تو آرام سے کھاتا پہنتا ہے۔ اپنا ہے تو کام آئے گا۔

پھاگن کا مہینہ تھا اور شام کا وقت۔ ایک عورت گھاس بیچ کر جا رہی تھی۔ مزدوروں نے ابھی ابھی کام سے فرصت پائی تھی۔ دن بھر چپ چاپ

چرخیوں کے سامنے کھڑے کھڑے اکتا گئے تھے۔ تفریح کے لئے بیقرار تھے۔ گھسیاری کو دیکھتے ہی اس پر گندی گالیوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ سورداس کو یہ بات بُری لگی۔ بولا — یار و کیوں اپنی زبان خراب کرتے ہو؟ وہ بچاری تو اپنی راہ چلی جاتی ہے اور تم لوگ اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ وہ بھی تو کسی کی بہو بیٹی ہوگی۔

ایک مزدور نے کہا۔ بھیک مانگو بھیک۔ جو تمہارے کرم میں بدا ہے۔ ہم گاتے ہیں تو تمہاری نانی کیوں مرتی ہے؟

سورداس۔ گانے کو تھوڑے ہی کوئی منع کرتا ہے۔

مزدور۔ تو ہم کیا لاٹھی چلاتے ہیں؟

سورداس۔ اُس عورت کو چھیڑتے کیوں ہو؟

مزدور۔ تو تمہیں کیوں بُرا لگتا ہے؟ تمہاری بہن ہے کہ بیٹی؟

سورداس۔ بیٹی بھی ہے۔ بہن بھی ہے۔ ہماری ہوئی تو کسی دوسرے بھائی کی ہوئی تو۔

اُس کے مُنہ سے مُہلہ کا آخری لفظ نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک مزدور نے چپکے سے جاکر اُس کی ایک ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔ بیچارہ بے خبر کھڑا تھا۔ اتنی زور سے مُنہ کے بل گرا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ منہ میں بڑی چوٹ آئی۔ ہونٹ کٹ گئے۔ غشی سی آگئی۔ پندرہ بیس منٹ تک وہیں بیہوش پڑا رہا۔ کوئی مزدور پاس بھی نہ آیا۔ سب اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ اتفاقاً نایک رام اُسی وقت شہر سے آرہے تھے۔ سورداس کو سڑک پر پڑا دیکھا تو چکرائے کہ ماجرا کیا ہے۔ کسی نے مارا پیٹا تو نہیں؟ بجرنگی کے سوا اور کس میں اتنا دم ہے۔ بُرا کیا۔ کتنا ہی ہو اپنے ایمان کا سچا ہے۔ انہیں رحم آگیا۔ قریب جاکر بلایا تو سورداس کو [illegible] اُس نے اُٹھ کر نایک رام کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا۔

نایک رام نے پوچھا۔ کسی نے مارا ہے کیا۔ سُور! منہ سے لہو بہہ رہا ہے۔

سُور داس۔ نہیں بھیّا۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔

نائک رام۔ چھپاؤ مت۔ اگر بجرنگی یا جگ دھر نے مارا ہو تو بتا دو۔ دونوں کو سال سال بھر کے لئے بھجوا نہ دوں تو برہمن نہیں۔

سُور داس۔ نہیں بھیّا کسی نے نہیں مارا؟ جھوٹ کیسے لگاؤں؟

نائک رام۔ بل والوں میں سے تو کسی نے نہیں مارا؟ یہ سب بہت راہ چلتے آدمیوں کو چھیڑا کرتے ہیں۔ کہتا ہوں۔ لٹوا دوں گا۔ ان جھونپڑوں میں آگ نہ لگا دوں تو کہنا۔ بتاؤ کس نے یہ کام کیا۔ تم تو آج تک کبھی ٹھوکر کھا کر نہیں گرے۔ ساری دیہہ لہو میں لت پت ہو گئی ہے۔

سُور داس نے کسی کا نام نہ بتلایا۔ جانتا تھا کہ نائک رام غصّہ میں آجائے گا۔ تو مرنے مارنے کو نہ ڈو دے گا۔ گھر پہنچا تو سارا محلّہ دوڑ پڑا۔ ہائے ہائے کس مدعی نے بیچارے اندھے کو مارا؟ دیکھو تو مُنہ کتنا سُوج گیا ہے۔ لوگوں نے سُور داس کو بستر پر لٹا دیا۔ بھیرو دردا۔ بجرنگی نے آگ جلائی۔ افیون اور تیل کی مالش ہونے لگی۔ سبھی کے دل اُس کی طرف سے نرم پڑ گئے۔ تنہا جگدھر خوش تھا۔ جیسی سے بولا۔ بھگوان نے ہمارا بدلا لیا ہے۔ ہم صبر کر گئے۔ پر بھگوان تو نیائے کرنے والے ہیں۔

جیسی چڑھ کر بولی۔ چُپ بھی رہو۔ آئے ہو بڑے نیائی کی پونچھ بن کے۔ جیت میں بیری پر بھی نہ ہنسنا چاہئے۔ وہ ہمارا بیری نہیں ہے۔ کچھ بات کے پیچھے جان دے دے گا۔ چاہے کسی کو اچھا لگے یا بُرا۔ آج ہم میں سے کوئی بیمار پڑ جائے تو دیکھو کہ رات کی رات بیٹھا رہتا ہے کہ نہیں۔ ایسے آدمی سے کیا بیر۔

جگدھر شرمندہ ہو گیا۔

پندرہ روز تک سُور داس گھر سے نکلنے کے قابل نہ ہوا۔ کئی دن تک مُنہ سے خون آتا رہا۔ سبھاگی دن بھر اُس کے پاس بیٹھی رہتی اور بھیرو رات کو اس کے پاس سوتا۔ جیسی بڑے سویرے گرم دودھ لے کر آتی اور اُسے اپنے ہاتھوں سے پلا جاتی۔ بجرنگی بازار سے دوائیں لاتا۔ ہاں اگر کوئی اُسے دیکھنے

نہ آیا تو وہ مٹھوا تھا۔ اُس کے پاس تین مرتبہ آدمی گیا مگر اُس کی اتنی بھی ہمت نہ ہوئی کہ تیمارداری کے لئے نہیں تو کم از کم اُس کی تجہیز و تکفین کا حال ہی دریافت کرنے کے لئے آتا۔ ڈرتا تھا کہ جاؤں گا تو لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑے گا۔ اسے اب روپے کا چسکا لگ گیا تھا۔ سورداس کے منہ سے بھی اتنا نکل ہی گیا۔ دنیا اپنے مطلب کی ہے۔ باپ ننھا سا چھوڑ کر مر گیا۔ تو اپنے لڑکے کی طرح پرورش کی۔ آپ لڑکوری کی طرح بن گیا۔ اُس کی نیند سوتا تھا۔ اُس کی نیند جاگتا تھا۔ آج چار پیسے کمانے لگا تو بات بھی نہیں پوچھتا۔ کھیر ہمارے بھی بھگوان ہیں۔ جہاں رہے سکھی رہے۔ اُس کی قسمت اس کے ساتھ۔ میری نیت میرے ساتھ۔ اسے میری کلک نہ ہو۔ مجھے تو اُس کی ٹکٹکی ہے۔ میں کیسے بھول جاؤں؟ میں نے لڑکے کی طرح اُسے پالا ہے۔

اِدھر تو سورداس بستر علالت پر پڑا ہوا تھا اُدھر پانڈے پور کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا۔ ایک روز علے الصباح راجہ مہیندر کمار۔ مسٹر جان سیوک۔ افسر تخمینہ۔ پولیس کے چند سپاہی اور ایک داروغہ پانڈے پور آ پہنچے۔ راجہ صاحب نے محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے کہا۔ سرکار کو ایک خاص سرکاری کام کے لئے اس محلہ کی ضرورت ہے۔ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو معقول معاوضہ دے کر یہ زمین حاصل کر لی جائے۔ لاٹ صاحب کا حکم آ گیا ہے۔ افسر تخمینہ صاحب اسی کام کے لئے تعینات کئے گئے ہیں۔ کل سے اُن کا اجلاس یہیں ہوا کرے گا۔ وہی سب مکانوں کی قیمت کا تخمینہ کریں گے اور اُسی کے مطابق تم لوگوں کو معاوضہ مل جائے گا۔ تمہیں جو کچھ عرض معروض کرنا ہو انہیں سے کرنا۔ آج سے تین ماہ کے اندر تمہیں اپنے اپنے مکان خالی کر دینے پڑیں گے۔ معاوضہ بعد کو ملتا رہے گا۔ جو شخص اتنے دنوں کے اندر مکان خالی نہ کرے گا اُس کے معاوضہ کے روپے ضبط کر لئے جاویں گے۔ اور وہ جبراً گھر سے نکال دیا جاوے گا۔ اگر کوئی روک ٹوک کرے گا۔ تو پولیس اُس کا چالان کرے گی۔ اسے سزا ہوگی۔ سرکار تم لوگوں کو

وجہ تکلیف نہیں دے رہی ہے۔ اُس کو اِس زمین کی سخت ضرورت ہے ۔ میں صرف سرکاری حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔

گاؤں والوں کو پہلے ہی سے اُس کی کچھ خبر مل چکی تھی۔ لیکن اس خیال سے دل کو تسکین دے رہے تھے کہ کون جانے خبر ٹھیک ہے یا نہیں۔ جیوں جیوں دیر ہوتی تھی ان کا دل الجھن اور طبیعتیں بے فکر ہو جاتی تھیں۔ کسی کو اُمید نہ تھی کہ حکام سے کہہ سُن کر اپنا گھر بچا لوں گا۔ کوئی کچھ دے دلا کر اپنے بچاؤ کی فکر کر رہا تھا۔ کوئی عذر داری کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا۔ کوئی یہ سوچ کر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ نہ جانے کیا ہوگا۔ پہلے سے کیوں اپنی جان ہلکان کریں۔ جب سر پر پڑے گی۔ دیکھی جائے گی۔ اس پر بھی آج جب لوگوں نے یکایک یہ حکم سنا تو گویا ان پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سب کے سب دست بستہ راجہ صاحب کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے ۔۔۔ سرکار ہاں رہتے ہمارن پیڑھیاں بیت گئیں۔ اب سرکار ہم کو نکال دے گی تو کہاں جائیں گے ؟ دو چار آدمی ہوں تو کہیں گھس پڑیں۔ محلہ کا محلہ اُجڑ کر کہاں جائے گا ؟ سرکار جیسے ہمیں نکالتی ہے ویسے کہیں کوئی ٹھکانا بھی بتا دے۔

راجہ صاحب بولے۔ مجھے خود اس بات کا سخت افسوس ہے اور میں نے تمہاری طرف سے سرکار کی خدمت میں عذر بھی کیا تھا۔ مگر سرکار کہتی ہے کہ اِس زمین کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا۔ مجھے تمہارے ساتھ سچی ہمدردی ہے مگر مجبور ہوں۔ کچھ کر نہیں سکتا۔ سرکار کا حکم ہے۔ ماننا ہی پڑے گا۔

اس کا جواب دینے کی کسی کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے کو کہنیوں سے ڈھکے دیتے تھے کہ آگے بڑھ کر پوچھو۔ معاوضہ کس حساب سے ملے گا مگر کسی کے قدم آگے نہ بڑھتے تھے۔ نایک رام یوں تو بہت ہی چلتے ہوئے آدمی تھے مگر اس موقع پر وہ بھی خاموش اختیار کئے ہوئے تھے۔ وہ راجہ صاحب سے کچھ کہنا سننا فضول سمجھ کر افسر تخمینہ سے تخمینہ کی شرح میں کچھ بیشی کرا لینے کی تدبیر سوچ رہے تھے۔ کچھ دے دلا کر اُن سے کام نکالنا زیادہ

آسان معلوم ہوتا تھا۔ اس مصیبت میں سبھوں کو سُور داس کی یاد آتی تھی وہ ہوتا تو ضرور ہی ہماری طرف سے کچھ کہتا سُنتا۔ اتنا گروہ اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ کئی آدمی دوڑے ہوئے سُور داس کے پاس گئے۔ اور اُس سے یہ سارا حال کہا۔

سُور داس نے کہا۔ اور سب لوگ تو موجود ہیں۔ میں چل کر کیا کروں گا۔ نائیکرام کیوں سامنے نہیں آتے؟ یوں تو بہت گرجتے ہیں۔ اب کیوں منہ نہیں کھلتا؟ محلہ ہی میں رعب دکھانے کو ہیں؟

ٹھاکر دین۔ سب کی دیکھ لی گئی۔ سب کے مُنہ میں دہی جما ہُوا ہے۔ حاکموں سے پالا کبھی پڑا ہے۔ اکل چاہیے۔

شیو سیوک بنیا نے کہا ــــ میرے تو اُن کے سامنے کھڑے ہوتے پیر تھر تھر کانپتے ہیں۔ نہ جانے کوئی کیسے حاکموں سے بات کرتا ہے؟ مجھے تو جرا ڈانٹ دیں تو دم ہی نکل جائے۔

بھیرنگر تیلی بولا۔ حاکموں کا بڑا رُعب ہوتا ہے۔ اُن کے سامنے تو اکل ہی خفت ہو جاتی ہے۔

سُور داس۔ مجھ سے تو اٹھا ہی نہیں جاتا۔ چلنا بھی چاہوں تو کیسے چلوں؟

سُور داس یوں لاٹھی کے سہارے گھر سے باہر آنے جانے لگا تھا۔ پر اِس وقت یکایک اُسے کچھ بیان کرنے کی خواہش ہوئی۔ کچھ سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا۔

ٹھاکر دین۔ یہ کون کٹھن کام ہے۔ ہم لوگ تمہیں اٹھائے چلیں گے۔

سُور داس۔ بھائی سب لوگ کرو گے اپنے اپنے من ہی کی۔ مجھے کیوں نکو بناتے ہو؟ جو سب کی گت ہوگی وہی میری بھی ہوگی۔ بھگوان کی جو مرضی ہے وہ ہوگی۔

ٹھاکر دین نے بہت منت کی۔ پر سُور داس جانے کو راضی نہ ہُوا۔ ٹھاکر دین کو بھی غصہ آگیا۔ بے لاگ بات کہتے تھے۔ بولے۔ اچھی بات ہے۔ مت جاؤ۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ جہاں مُرگا نہ ہوگا وہاں سویرا ہی نہ ہوگا؟ چار آدمی سر اپنے لگے تو تب مجاج ہی نہیں ملتے۔ سچ کہا ہے۔ کوا دھونے سے بگلا نہیں ہوتا۔

آٹھ بجتے بجتے حاکم لوگ رخصت ہو گئے۔ اب لوگ نایک رام کے گھر اکٹھا پنچایت کرنے لگے کہ کیا کیا جائے۔

جمنی۔ تم لوگ یونہی بکواس کرتے رہو گے اور کسی کا کیا کچھ نہ ہوگا۔ سُورداس کے پاس جا کر کیوں نہیں صلاح کرتے؟ دیکھو کیا کہتا ہے؟

بھیرو۔ بھگت۔ تو جاتی کیوں نہیں۔ تجھی کو ایسی کیا گرج پڑی ہوئی ہے؟

جمنی۔ تو پھر چل کر اپنے اپنے گھر بیٹھو۔ بکواس سے کیا ہوتا ہے؟

بھیرو۔ بھگت یہ بیکار کی دکھلانے کا اوسر نہیں ہے۔ سُورداس کے پاس سب مل کر چلو۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکالے گا۔

ٹھاکر دین۔ میں تو اب کبھی اُس کے دوار پہ نہ جاؤں گا۔ اتنا کہہ سُن کر ہار گیا پر نہ اُٹھا نہ اُٹھا۔ اپنے کو کچھ لگانے لگا ہے

جگدھر۔ سورداس کیا کوئی دیوتا ہے؟ حاکم کا حکم پلٹ دے گا؟

ٹھاکر دین۔ میں تو گود میں اٹھا لانے کو تیار تھا۔

بھگت۔ سیکھی ہے سیکھی اور کوئی کیوں نہیں آئے۔ گیا کیوں نہیں حاکموں کے سامنے؟ ایسا سر تھوڑے ہمارا ہے۔

جمنی۔ کیسے جاتا؟ وہ تو حاکموں سے بُرا بنے۔ یہاں تم لوگ اپنے اپنے من کی کرنے لگو تو اُس کی بھد ہو۔

بھیرو۔ ٹھیک تو کہتی ہو۔ مدعی سُست تو گواہ چُست ہوگا۔ پہلے چل کر پوچھو۔ اُس کی صلاح کیا ہے؟ اگر مانے لایک ہو تو مانو۔ نہ مانے لایک ہو تو نہ مانو۔ ہاں ایک بات جو طے ہو جائے اس پر ڈٹنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ کہا تو کچھ اور۔ اور پیچھے سے نکل بھاگے۔ سردار تو بھرم میں پڑا رہے کہ آدمی پیچھے ہیں اور آدمی اپنے اپنے گھر کی راہ لیں۔

بجرنگی۔ چلو پنڈا جی۔ پوچھ ہی دیکھیں۔
نایک رام۔ وہ کہے گا کہ بڑے صاحب کے پاس چلو۔ وہاں سُنائی نہ ہو تو پراگ راج۔ لاٹ صاحب کے پاس چلو۔ پہلے اِتنا بُوتہ؟
جگدھر۔ بھیا کی بات مہراج۔ یہاں تو کسی کا مُنہ نہیں کھلا۔ لاٹ صاحب کے پاس کون جاتا ہے؟
جمنی۔ ایک بار چلے کیوں نہیں جاتے؟ دیکھو تو کیا صلاح دیتا ہے۔
نایک رام۔ میرا پیار ہوں چلو۔
ٹھاکر دین۔ میں نہ جاؤں گا اور جسے جانا ہو جائے۔
جگدھر۔ تو کیا ہمیں کو بڑی گرج پڑی ہے؟
بجرنگی۔ جو سب کی گت ہوگی وہی ہماری بھی ہوگی۔
گھنٹہ بھر تک پنچایت ہوئی پر سُورداس کے پاس تک کوئی نہ گیا۔ سانجھ کی سُوئی ٹھیلے پر لدتی ہے۔ تو چل۔ میں آتا ہوں۔ بس یہی ہوتا رہا۔ لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ شام کے وقت بھیرو سورداس کے پاس گیا۔ سُورداس نے پوچھا۔ آج کیا ہُوا؟
بھیرو۔ ہُوا کیا۔ گھنٹہ بھر تک بکواس ہوئی۔ پھر سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔
سُورداس۔ کچھ طے نہ ہُوا کہ کیا کیا جائے؟
بھیرو۔ نکالے جائیں گے۔ اس کے سوا اور کیا ہوگا۔ کیوں سُورداس کوئی نہ سُنے گا؟
سُورداس۔ سُننے والا بھی تو وہی ہے جو نکالنے والا ہے۔ تیسرا ہوتا تب نہ سُنتا۔
بھیرو۔ میری مرن ہے۔ ہجاروں من لکڑی ہے۔ کہاں ڈھو کر لے جاؤں گا؟ کہاں اتنی دھرتی ملے گی کہ پھر ٹال لگاؤں؟
سُورداس۔ سبھی کی مرن ہے۔ بجرنگی ہی کو اتنی دھرتی کہاں مل جاتی ہے

کہ پندرہ بیس جانور نہیں اور آپ بھی رہے ہیں۔ ملے گی بھی تو اتنا کرایہ دینا پڑے گا۔ کہ دیوالہ نکل جائے گا۔ دیکھو بیٹھو آج بھی نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہ بیمار ہے تو چھن بھر بھی نہ رُکوں۔ کُتے کی طرح دَوڑوں چاہے وہ میری بات بھی نہ پوچھے جن کے لیے اپنی جند گانی کھراب کی کہ وہ بھی گاڑھے سیمے پر منہ پھیر لیتے ہیں۔

بھیرو۔ اچھا تم تو بتاؤ کہ تم کیا کرو گے؟ تم نے بھی کچھ سوچا ہے؟

سُور داس۔ میری کیا پوچھتے ہو؟ جمین بھی وہ نکل گئی۔ جھونپڑی کے بہت بلیں گے تو دو چار روپے مل جائیں گے۔ ملے تو کیا اور نہ ملے تو کیا۔ جب تک کوئی نہ بولے گا پڑا رہوں گا۔ کوئی ہاتھ پکڑ کر نکال دے گا تو باہر جا بیٹھوں گا۔ وہاں سے اُٹھا دے گا پھر آ بیٹھوں گا۔ جہاں جنم لیا ہے وہیں مروں گا۔ اپنا جھونپڑا جیتے جی نہ چھوڑا جائے گا۔ مرنے پر جو چاہے لے لے۔ باپ دادوں کی جمین کھو دی۔ اب اتنی نشانی رہ گئی ہے۔ اسے نہ چھوڑوں گا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی مر جاؤں گا۔

بھیرو۔ سُور اتنا دم تو یہاں کسی میں نہیں ہے۔

سُور داس۔ اسی سے تو میں نے کسی سے کچھ کہا ہی نہیں۔ بھلا سوچو کتنا اندھیر ہے کہ ہم جو ستر پشتوں سے یہاں آباد ہیں وہ تو نکال دیے جائیں۔ اور دوسرے یہاں آ کر بس جائیں۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ کسی کے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔ میرجنتی سے جو چاہے نکال دے۔ نیائے سے نہیں نکال سکتا۔ تمہارے ہاتھ میں بل ہے۔ تم ہمیں مار سکتے ہو۔ ہمارے ہاتھ میں بل ہوتا تو ہم بھی تمہیں مارتے۔ سرکار کے ہاتھ میں مارنے کا بل ہے۔ ہمارے ہاتھ میں اور کوئی بل نہیں ہے۔ تو مر جانے کا تو بل ہے۔

بھیرو نے جا کر اور لوگوں سے یہ باتیں کہیں۔ جگدھر نے کہا۔ دیکھو یہ صلاح ہے۔ گھر تو جائے گا ہی۔ جان بھی جائے گی۔

ٹھاکر دین بولے۔ یہ سُور ہی کا کیا ہوگا۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا۔ مر ہی جائے گا تو کیا۔ یہاں مر جائیں تو بال بچوں کو کس کے سر پہ چھوڑیں؟

بجرنگی۔ مرنے کے لئے کلیجہ چاہئے۔ جب ہم ہی مر گئے تو گھر لے کر کیا ہوگا۔
نایک رام۔ ایسے بہت مرنے والے دیکھے ہیں۔ گھر میں سے تو نکلا نہیں گیا۔ مرنے چلے ہیں۔
بھیرو۔ اُس کی نہ چلاؤ پنڈا جی۔ سن میں آنے کی بات ہے۔

دوسرے دن اشرفی تخمینہ نے مل کر ایک کمرہ میں اجلاس کرنا شروع کیا۔ ایک منشی محلہ کے لوگوں کے نام۔ مکانات کی حیثیت۔ پختہ ہیں یا خام۔ پرانے ہیں یا نئے۔ لمبائی چوڑائی وغیرہ کی ایک فہرست تیار کرنے لگا۔ پٹواری اور منشی گھر گھر گھومنے لگے۔ اُن کا ایک ساتھ رہنا ضروری تھا۔ اس وقت سبھی لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ اسی تثلیث کے ہاتھوں میں تھا۔ نایک رام کی بن آئی۔ دلالی کرنے لگے۔ لوگوں سے کہتے کہ نکالنا تو پڑے ہی گا۔ اگر کچھ غم کھانے سے معاوضہ بڑھ جائے تو ہرج ہی کیا۔ بیٹھے بٹھائے مٹھی گرم ہوتی تھی۔ تو کیوں چھوڑتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مکانوں کی حیثیت کا انحصار اس چڑھاوے پر تھا جو اس تثلیث پر چڑھایا جاتا تھا۔ نایک رام منشی کی آڑ سے شکار کھیلتے تھے۔ نام بھی کماتے تھے اور دولت بھی۔ بھیرو کا پڑا مکان اور سامنے کا ڈامیان دونوں سمٹ گئے۔ اُن کا رقبہ گھٹ گیا۔ تثلیث کی وہاں کچھ لُوجا نہ ہوئی۔ جگدھر کا چھوٹا سا مکان بڑا ہو گیا۔ تثلیث نے اُس کی پُوجا سے خوشنما ہو کر فضائیں دھیلی کر دیں۔ رقبہ بڑھ گیا۔ ٹھاکر دین نے ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کی بہ نسبت شیو جی کو خوش کرنا زیادہ آسان سمجھا۔ وہاں ایک مونا پانی کے سوا کوئی اور خرچ نہ تھا۔ دونوں وقت پانی دینے لگے۔ مگر اس وقت تثلیث کا دَور دورہ تھا۔ شیو جی کی ایک نہ چلی۔ تثلیث نے ان کے مختصر مگر پختہ مکان کو خام قرار دے دیا۔ بجرنگی دیوتاؤں کو خوش کرنا کیا جانے۔ انہیں ناراض ہی کر چکا تھا۔ مگر جمبی نے اپنی دانشمندی سے بگڑتا ہوا کام بنا لیا۔ منشی جی اُس کی ایک کچھیا پر ریجھ گئے۔ اس پر دانت لگائے۔ بجرنگی اپنے مویشیوں کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ تنک گیا۔ نایک رام نے کہا۔ بجرنگی چھپاؤ گے۔

بجرنگی نے کہا کہ چاہے ایک کوڑی بھی معاوضہ نہ ملے پر بچھیا نہ دوں گا۔ آخر جمنی نے جو سودا کرنے میں بڑی ہوشیار تھی اُسے تنہائی میں لے جا کر سمجھایا کہ اتنے جانوروں کے رہنے کا نہیں ٹھکانا بھی ہے؟ کہاں سے لے کے پھروگے؟ ایک بچھیا کے دینے سے سو روپے کا کام نکلتا ہے تو کیوں نہیں نکالتے؟ ایسی نہ جانے کتنی بچھیاں پیدا ہوں گی۔ دے کر سے بلا ٹالو۔ اُس کے سمجھانے سے آخر بجرنگی بھی راضی ہو گیا۔

پندرہ روز تک تثلیث کی حکومت رہی۔ افسر تخمینہ صاحب بارہ بجے گھر سے تشریف لاتے۔ اپنے کمرہ میں دو چار سگار پھونکتے۔ اخبارات ملاحظہ فرماتے اور ایک دو بجے تک مکان واپس آجاتے۔ جب نقشہ مرتب ہو گیا۔ تو افسر صاحب اُس کی جانچ کرنے لگے۔ باشندگان دیہہ کو پھر طلب کیا گیا۔ افسر نے سب کے تخمینے پڑھ پڑھ کر سُنائے۔ ایک سرے سے دھاندلی تھی۔ بھیرو نے کہا۔ حضور چل کر ہمارا کھیت دیکھ لیں۔ وہ بڑھے کہ جگدھر کا۔ ان کو تو بیس چار سو اور مجھے تین سو۔ اس حساب سے مجھے چھ سو ملنا چاہئے۔

ٹھاکر دین بگڑے۔ دل تھا ہی۔ اُن سے صاف صاف کہہ دیا۔ صاحب تخمینہ کسی حساب سے تھوڑے ہی بنایا گیا ہے۔ جس نے منہ میٹھا کر دیا اُس کی چاندی ہو گئی۔ جو بھگوان کے بھروسے بیٹھا رہا اُس کی بدھیا بیٹھ گئی۔ اب بھی آپ کے پرچل کر جانچ نہیں کرتے کہ ٹھیک ٹھیک تخمینہ ہو جائے۔ غریبوں کے گلے ریتے رہے ہیں۔

افسر نے بگڑ کر کہا۔ تمہارے گاؤں کا لکھیا تو تمہاری طرف سے رکھ لیا گیا تھا۔ اُس کی صلاح سے تخمینہ کیا گیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

ٹھاکر دین۔ اپنے کہلانے والے ہی تو اور لوٹتے ہیں۔

افسر۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

سُور داس کی جھونپڑی کا معاوضہ ایک روپیہ رکھا گیا تھا اور نائک رام کے گھر کے اور سے تین ہزار! لوگوں نے کہا۔ یہ ہے گاؤں گھر والوں کا حال! یہ ہمارے

سگے ہیں۔ بھائی کا گلا کاٹتے ہیں۔ اس پر گھمنڈ یہ کہ ہمیں دھن کا لالچ نہیں۔ آخر ہے تو جات کا پنڈا ہی نا۔ جاتریوں کو ٹھگنے والا جیسی تو یہ حال ہے۔ جرا سا کھٹکا پا کے آنکھیں پھر گئیں۔ کہیں تھانہ دار ہوتے تو کسی کے گھر میں ہی نہ رہنے دیتے۔ اسی سے کہا گیا ہے کہ پر میسر گنجے کو ناکھون نہ دے۔

مسٹر کلارک کے بعد مسٹر سینا پتی حاکم ضلع ہوئے تھے۔ سرکار کا روپیہ خرچ کرتے کانپتے تھے۔ پیسے کی جگہ دھیلے سے کام نکالتے تھے۔ ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں بدنام نہ ہو جاؤں۔ ان میں وہ خود اعتباری نہ تھی جو انگریز افسروں میں ہوا کرتی ہے۔ انگریزوں پر جانبداری کا شک نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بے خوف اور آزاد ہوتے ہیں۔ مسٹر سینا پتی کو شک ہوا کہ معاوضے بڑی رقمی سے لکھے گئے ہیں۔ انہوں نے ان کا نصف ہی دینا کافی خیال کیا۔ اب یہ مسل صوبہ کی سرکار کے پاس منظوری کے لئے بھیجی گئی۔ وہاں پھر اس کی جانچ پڑتال ہونے لگی۔ اس طرح تین مہینے کی مدت گزر گئی تو مسٹر جان سیلوک۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور داروغہ ماہر علی اور سو دوسروں کو ساتھ لے کر محلہ کو خالی کرانے کے لئے آ دھمکے۔ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو ہم کو روپیہ ہی نہیں ملے۔ جان سیلوک نے جواب دیا۔ ہمیں تمہارے روپوں سے کوئی مطلب نہیں۔ روپے جس نے لیں اس سے لو ہمیں تو سرکار نے یکم مئی کو محلہ گرا پانے کی منظوری دے دی ہے اور اگر کوئی کہہ دے۔ کہ آج مئی کی پہلی تاریخ نہیں ہے تو ہم لوٹ جائیں گے۔ اب لوگوں میں بڑی ہل چل مچی۔ سرکار کی کیا نیت ہے؟ کیا معاوضہ لئے بغیر ہی ہمیں نکال دیا جائے گا۔ گھر کا گھر جائے اور معاوضہ بھی نہ ملے۔ یہ تو بے موت مرے۔ روپے مل جاتے تو کہیں زمین لے کر مکان بنواتے۔ خالی ہاتھ کہاں جائیں؟ کیا گھر میں خزانہ رکھا ہوا ہے؟ ایک تو روپیہ کے چار آنے ملنے کا حکم ہوا۔ اس کا بھی یہ حال۔ نہ جانے سرکار کی نیت بدل گئی کہ درمیانی لوگ ہضم کئے جاتے ہیں۔

ماہر علی نے کہا۔ تم لوگوں کو جو کچھ کہنا سننا ہو وہ حاکم ضلع سے جا کر کہو سنو۔ مکان آج خالی کرا لئے جائیں گے۔

بجیر تگی۔ مکان کیسے کھالی ہوں گے۔ کوئی راہ جھتی ہے ہمیں حاکم کا یہ حکم ہوا ہے
اُسی حاکم کا تو وہ بھی حکم ہے۔

ماہر علی۔ کہتا ہوں۔ سیدھے سے اپنے بورئے بقچے لادو اور چلتے پھرتے نظر
آؤ۔ ناحق ہمیں غصہ کیوں دلاتے ہو؟ کہیں مسٹر منیجر کو جوش آگیا تو پھر تمہاری
خیریت نہیں۔

نائیک رام۔ داروغہ جی دو چار دن کی مہلت دے دیجئے۔ روپے تو ملیں گے
ہی۔ بیچارے کیا بُرا کہتے ہیں کہ بارو پے سے کہاں بھٹکتے پھریں۔

مسٹر جان سیوک تو سپرنٹنڈنٹ کو ساتھ لے کر مل گزیر کرنے چلے گئے تھے۔
وہاں چائے پانی کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ یہاں ماہر علی کی حکومت تھی۔ بولے۔ پنڈا ہی
ایسے چھٹے دوسروں کو دیتا ہے یہاں نہیں بہت دنوں سے دیکھ رہے ہیں اور تمہاری
رگ رگ پہچانتے ہیں۔ مکان آج اور آج ہی خالی ہوں گے۔

دفعتاً ایک طرف سے دو بچے کھیلتے ہوئے آگئے۔ دونوں ننگے پاؤں تھے۔ پھٹے
ہوئے کپڑے پہنے مگر خوش۔ ماہر علی کو دیکھتے ہی چچا چچا کہتے ہوئے اُن کی طرف
دوڑے۔ یہ دونوں حقیقی بھائی بہن تھے۔ کلثوم نے اسی محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان
ایک روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لیا تھا۔ گو دام کا مکان جان سیوک نے خالی کرا لیا
تھا۔ بیچاری اسی چھوٹے سے گھر میں پڑی ہوئی اپنی مصیبت کے دن کاٹ رہی
تھی۔ ماہر نے دونوں بچوں کو دیکھا تو کچھ جھینپتے ہوئے بولے۔ بھاگ جاؤ۔ بھاگ
جاؤ۔ یہاں کیا کرنے آئے؟ دل میں بہت شرمائے کہ اب لوگ کہتے ہوں گے
کہ یہ اُن کے بھتیجے ہیں اور اتنے بچھے حالوں۔ یہ اُن کی خبر بھی نہیں لیتے۔

نائیک رام نے دونوں بچوں کو دو دو پیسے دے کر کہا۔ جاؤ مٹھائی کھانا یہ
تمہارے چچا نہیں ہیں۔

نسیمہ۔ ہوں۔ چچا تو ہیں۔ کیا میں پہچانتی نہیں؟

نائیک رام۔ چچا ہوتے تو تجھے گود میں نہ اُٹھا لیتے۔ مٹھائیاں نہ منگا دیتے

تو بھول رہی ہے۔

ماہر علی نے بگڑ کر کہا۔ پنڈا جی۔ تمہیں ان فضول باتوں سے کیا مطلب؟ میرے بھتیجے ہوں یا نہ ہوں۔ تم سے واسطہ؟ تم کسی کی خانگی باتوں میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ بھاگو صابر۔ نسیمہ بھاگ جاؤ نہیں تو سپاہی پکڑ لے گا۔

دونوں لڑکوں نے مشکوک نگاہوں سے ماہر علی کو دیکھا اور بھاگ گئے۔ راستہ میں نسیمہ نے کہا ـــــ چچا ہی جیسے تو ہیں۔ کیوں صابر۔ چچا ہی ہیں نہ؟

صابر۔ نہیں تو اور کون ہیں؟

نسیمہ۔ تو پھر ہمیں بھگا کیوں دیا؟

صابر۔ جب ابا تھے تب ہم لوگوں کو پیار کرتے تھے۔ اب تو ابا نہیں ہیں نا۔ تب تو ابا ہی سب کو کھلاتے تھے۔

نسیمہ۔ اماں کو بھی تو اب ابا نہیں کھلاتے۔ وہ تو ہم لوگوں کو اب پہلے سے زیادہ پیار کرتی ہیں۔ پہلے کبھی پیسے نہ دیتی تھیں۔ اب تو پیسے بھی دیتی ہیں۔

صابر۔ وہ تو ہماری اماں ہیں نا۔

لڑکے تو چلے گئے۔ ادھر داروغہ جی نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ پھینک دو سب اور مکان فوراً خالی کرا لو۔ یہ لوگ ذات کے آدمی ہیں۔ بات سے نہ مانیں گے۔

وہ کانسٹیبل حکم پاتے ہی بجرنگی کے گھر میں گھس گئے۔ اور برتن نکال کر پھینکنے لگے۔ بجرنگی باہر سُرخ آنکھیں لئے کھڑا ہونٹ چبا رہا تھا۔ جمنی گھر میں اِدھر اُدھر دوڑتی پھرتی تھی۔ کبھی ہانڈیاں اٹھا کر باہر لاتی۔ کبھی پھینکے ہوئے برتنوں کو سمیٹتی۔ منہ ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہ ہوتا تھا۔ مونڈی کاٹے کا رکھا نہ بنانے چلے ہیں۔ دنیا کو اُجاڑ کر اپنا گھر بھریں گے۔ بھگوان بھی ایسے پاپیوں کا ناس نہیں کرتے۔ نہ جانے کہاں جا کر سو گئے ہیں۔ ہائے ہائے گھسوا کی جوڑی پٹک کر توڑ ڈالی۔

بجرنگی نے ٹوٹی ہوئی جوڑی اٹھالی اور ایک سپاہی کے پاس لے جا کر کہا۔ جمعدار۔ یہ جوڑی توڑ ڈالنے سے تمہیں کیا ملا؟ ثابت اٹھالے جاتے تو بھلا کسی کام تو آتی۔

غنیمت ہے کہ لال پگیا باندھے ہوئے ہو نہیں تو آج ۔۔۔۔۔

اُس کے مُنہ سے پوری بات بھی نہ نکلی تھی کہ دو سپاہیوں نے اُس پر ڈنڈے چلانے شروع کئے۔ بجرنگی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ لپک کر ایک سپاہی کی گردن ایک ہاتھ سے اور دوسرے سپاہی کی گردن دوسرے ہاتھ سے پکڑ لی اور اتنے زور سے دبائی کہ دونوں کی آنکھیں نکل آئیں۔ جمنی نے دیکھا کہ اب غضب ہوا چاہتا ہے۔ تو روتی ہوئی بجرنگی کے پاس گئی۔ اور بولی۔ تمہیں بھگوان کی قسم ہے جو کسی سے لڑائی کرو۔ چھوڑو چھوڑو۔ کیوں اپنی جان سے بیر کر رہے ہو؟

بجرنگی۔ تو جا بیٹھ۔ پھانسی پا جاؤں تو سیکے چلی جانا۔ میں تو ان دونوں کی جان ہی لے کر چھوڑوں گا۔

جمنی۔ تمہیں گھیسو کی قسم۔ تم میرا ہی مانس کھاؤ جو ان دونوں کو چھوڑ کر یہاں سے چلے نہ جاؤ۔

بجرنگی نے دونوں سپاہیوں کو چھوڑ دیا مگر اُس کے ہاتھ سے چھوٹنا تھا کہ وہ دوڑے ہوئے ماہر علی کے پاس پہنچے اور کہا اور سپاہیوں کو لئے ہوئے پھر آئے۔ مگر بجرنگی کو جمنی پہلے ہی سے خبر دے چکی تھی۔ سپاہیوں کو شیرنہ ملا تو شیر کی ماں کو پیٹنے لگے۔ گھر کی ساری چیزیں توڑ پھوڑ ڈالیں۔ جو اپنے کام کی چیز نظر آئی اُس پر ہاتھ بھی صاف کیا۔ یہی حال دوسرے گھروں کا بھی ہو رہا تھا۔ چاروں طرف لوٹ مچی ہوئی تھی۔ کسی نے اندر سے گھر کا دروازہ بند کر لیا۔ کوئی اپنے بال بچوں کو لے کر پچھواڑے سے نکل بھاگا سپاہیوں کو مکان خالی کرنے کا حکم کیا لوٹ مچانے کا حکم مل گیا۔ کسی کو اپنے برتن وغیرہ سمیٹنے کی مہلت بھی نہ دیتے تھے۔ نائک رام کے گھر پر بھی دھاوا ہوا۔ ماہر علی خود پانچ سپاہیوں کو لے کر گھسے۔ دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گھر میں جھاڑو پھری ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی ہانڈی بھی نہ ملی۔ سپاہیوں کے حوصلے دل میں رہ گئے۔ سوچے ہوئے تھے کہ اس مکان میں خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ ماریں گے مگر مایوس اور شرمندہ ہو کر نکلنا پڑا۔ بات یہ تھی کہ

نایک رام نے پہلے ہی اپنے گھر کی چیزیں نکال کر باہر کر دی تھیں۔

اُدھر سپاہیوں نے مکانوں کے مقفل توڑنے شروع کر دئے۔ کہیں کسی پر مار پڑتی تھی۔ کہیں کوئی اپنی چیزیں لے بھاگا جاتا تھا۔ کہرام مچا ہوا تھا۔ عجیب منظر تھا۔ گویا دن دہاڑے ڈاکہ پڑ رہا ہو۔ سب لوگ گھروں سے نکل کر یا نکالے جا کر سڑک پر جمع ہوتے جاتے۔ ایسے موقعوں پر عموماً بدمعاشوں کا مجمع ہو ہی جاتا ہے۔ لوٹنے کی ترغیب تھی ہی۔ کسی کو باشندوں سے عداوت تھی۔ اور کسی کو پولیس سے۔ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں بدامنی نہ پھیل جائے۔ کہیں کوئی ہنگامہ برپا ہو جائے۔ ماہر علی نے عوام کے تیور دیکھے تو فوراً ایک کانسٹیبل کو پولیس کی چھاؤنی کی طرف دوڑایا اور چار بجتے بجتے مسلح پولیس کی ایک جماعت اور وہاں آ پہنچی۔ کمک کے آتے ہی ماہر علی اور بھی دلیر ہو گئے۔ حکم دیا کہ مار مار کر سبوں کو بھگا دو۔ لوگ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ بھگا دو۔ جس کسی کو یہاں کھڑے دیکھو۔ مارو۔ اب تک لوگ اپنے مال اسباب سمیٹنے میں لگے ہوئے تھے۔ مار پڑی تو بگٹٹ بھاگے۔ ٹرچکے سے سر لیتے تھے۔ گھر میں تنہا کتنی کی سپاہیوں سے کیسے بھرتے؟ اب سب کے سب ایک مقام پر جمع ہو گئے۔ انہیں کچھ تو اپنی مجموعی طاقت کا احساس ہوا۔ تھا اس پر نایک رام انہیں اکساتے جاتے تھے۔ یہاں آئیں تو مارے غصہ نہ چھوڑنا۔ جہاں تک دو چار کے ہاتھ پاؤں نہ توڑیں گے یہ سب نہ مانیں گے۔ بارود بھرنے والی ہی تھی کہ اتنے میں وہاں اندر کا موٹر آ پہنچا۔ اور اس میں سے نند دت اور اندر دت اتر پڑے۔ دیکھا تو کئی ہزار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ کچھ محلہ کے باشندے تھے اور کچھ راہ گیر لوگ۔ کچھ قریب کا گاؤں کے رہنے والے اور کچھ بیل کے مزدور۔ کوئی صرف تماشہ دیکھنے آیا تھا۔ کوئی ہمدردی کا اظہار کرنے اور کوئی اس فساد سے حاسدانہ مسرت حاصل کرنے۔ ماہر علی اور اس کے کانسٹیبلان اس جوش کے ساتھ بدیہ کمینہ آدمیوں کے دلوں میں ظلم کرتے وقت پیدا ہوتا ہے۔ لوگ کو سڑک پر سے ہٹانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر انبوہ پیچھے ہٹنے کے بجائے اور آگے ہی بڑھتا آتا تھا۔

ونے نے ماہر علی کے پاس جاکر کہا ۔ داروغہ جی ۔ کیا ان آدمیوں کو ایک دن کی بھی مہلت نہیں مل سکتی ؟

ماہر علی ۔ مہلت تو تین مہینے کی تھی ۔ اگر تین سال کی بھی ہو جائے تو بھی مکان خالی کرتے وقت یہی حالت ہوگی ۔ یہ لوگ سیدھے سے کبھی نہ جائیں گے ۔

ونے ۔ کیا آپ اتنی عنایت کر سکتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لئے سپاہیوں کو روک دیں ۔ جب تک کہ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہاں کی حالت سے مطلع کر دوں ؟

ماہر علی ۔ صاحب تو یہیں ہیں ۔ مسٹر جان سیوک انہیں مل دکھانے لے گئے تھے ۔ معلوم نہیں کہ وہاں سے کہاں چلے گئے ۔ اب تک نہیں لوٹے ۔

دراصل صاحب کہیں گئے نہ تھے ۔ جان سیوک کے ساتھ دفتر میں بیٹھے ہوئے مزہ سے شراب نوش کر رہے تھے ۔ دونوں ہی آدمیوں نے واقعی حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی کی تھی ۔ انہیں یہ خیال تھا کہ ہم کو دیکھ کر ہی لوگ رعب میں آ گئے ہوں گے ۔ خوف کے مارے خود بخود بھاگ جائیں گے ۔

صاحب کو خبر دینے کے لئے ونے سنگھ دل کی طرف تیز قدمی سے چلے ۔ تو راجہ صاحب کو موٹر پر آتے ہوئے دیکھا ۔ ٹھٹھک گئے ۔ سوچا کہ جب یہ آ گئے ہیں تو صاحب کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے ؟ انہیں سے چل کر کہوں ۔ لیکن ان کے سامنے جاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کہیں عوام نے ان کی تحقیر کی تو میں کیا کروں گا ۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ میں نے ہی ان لوگوں کو ترغیب دی ہے ۔ وہ اسی حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے کہ راجہ صاحب کی نگاہ انہ ونے کے موٹر پر پڑی ۔ جل اٹھے ۔ اندر دت اور ونے کو دیکھا ۔ بخار سا چڑھ آیا ۔ یہ لوگ یہاں رونق افروز ہیں ۔ پھر کیوں نہ فساد ہو ؟ جہاں یہ چھلے ناشی ہوں گے ۔ وہاں جو کچھ نہ ہو جائے تھوڑا ہے ۔ یوں انہیں غصہ بہت کم آتا تھا مگر اس وقت ضبط نہ ہو سکا ۔ ونے سے بولے ۔ یہ سب آپ ہی کی کرامات معلوم ہوتی ہے ۔

ونے نے نرم لہجہ میں آکر کہا ۔ میں تو ابھی آیا ہوں ۔ سپرنٹنڈنٹ کے پاس

جاہی رہا تھا کہ آپ آتے ہوئے دکھائی دئے۔

راجہ۔ خیر۔ اب تو آپ اُن کے رہنما ہیں۔ انہیں اپنے کسی جادو منتر سے ہٹائیے گا ورنہ مجھے کوئی دوسری تدبیر کرنی پڑے گی؟

وِنے۔ ان لوگوں کو صرف اتنی شکایت ہے کہ ابھی ہمیں معاوضہ نہیں ملا۔ ہم کہاں جائیں کیسے نئی زمین خریدیں۔ کیسے نئے مکان کا سامان لیں؟ اگر آپ تکلیف فرما کر ان لوگوں کو تسلی دے دیں۔ تو خود بخود ہٹ جائیں گے۔

راجہ۔ یہ اُن لوگوں کا بہانہ ہے۔ دراصل یہ لوگ فساد کرنا چاہتے ہیں۔

وِنے۔ اگر انہیں معاوضہ دے دیا جائے تو شاید دوسری تدبیر نہ کرنی پڑے۔

راجہ۔ آپ چھ مہینے والا راستہ بتلاتے ہیں اور میں ایک ماہ والا چاہتا ہوں۔

وِنے۔ اس راہ میں کانٹے ہیں۔

راجہ۔ اُس کی کچھ پرواہ نہیں۔ یہیں کانٹے والی ہی راہ پسند ہے۔

وِنے۔ اس وقت اس مجمع کی حالت خشک پُوال کی سی ہے۔

راجہ۔ اگر پُوال ہمارا راستہ روکتا ہے تو ہم اُسے جلا دیں گے۔

سبھی لوگ خوفزدہ ہو رہے تھے کہ نہ جانے کس وقت کیا ہو جائے۔ پھر بھی انسانوں کا مجمع کسی غائبانہ طاقت سے متاثر ہو کر راجہ صاحب کی طرف بڑھتا ہُوا چلا آتا تھا۔ پولیس کے لوگ بھی اِدھر اُدھر سے آکر موٹر کے پاس کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ دیکھتے دیکھتے اُن کے چاروں طرف انسانوں کی ایک بھاری اور انتھاہ ندی لہریں مارنے لگی۔ گویا ایک ہی رو میں ان گنے گنائے آدمیوں کو نگل جائے گی۔ اس چھوٹے اور کمزور کنارہ کو بہالے جائے گی۔

راجہ مہیندر کمار یہاں آگ کو مشتعل کرنے نہیں بلکہ فرو کرنے آئے تھے۔ ان کے پاس لمحہ لمحہ کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ وہ اپنی ذمہ واریوں کو محسوس کر کے بہت متردد ہو رہے تھے۔ اخلاقی نقطۂ خیال سے تو اُن پر کوئی ذمہ واری نہ تھی۔

جب صوبہ کی سرکار نے دباؤ ڈالا تو وہ کر ہی کیا سکتے تھے؟ اگر مستعفی ہو جاتے تو دوسرا شخص آکر سرکاری حکم کی تعمیل کرتا۔ پانڈے پور والوں کے سر سے کسی حالت میں بھی یہ مصیبت نہ ٹل سکتی تھی۔ لیکن وہ شروع سے آخیر تک اس امر کی کوشش کرتے رہے تھے کہ مکانات کے تخلیہ کے بیشتر لوگوں کو معاوضہ دے دیا جائے۔ بار بار یاد دہانی کرتے تھے۔ جیوں جیوں آخری تاریخ قریب آتی جاتی تھی۔ اُن کے شکوک میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ وہ تو یہاں تک چاہتے تھے کہ باشندوں کو کچھ روپے پیشگی دے دئے جائیں کہ وہ پہلے ہی سے اپنا ٹھکانا کر لیں۔ مگر کسی نامعلوم سبب سے روپیوں کی منظوری میں دیر ہو رہی تھی۔ وہ مسٹر سینا پتی سے بار بار کہتے کہ آپ کی منظوری کی اُمید پر اپنے حکم سے روپے دلا دیں۔ مگر حاکم ضلع کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ کہ نہ جانے سرکار کا کیا ارادہ ہے۔ میں بلا اُس کے حکم کے کچھ نہیں کر سکتا۔ جب آج بھی منظوری نہ آئی تو راجہ صاحب نے تار دے کر دریافت کیا اور دوپہر تک جواب کا انتظار کرتے رہتے۔ آخر جب اس مجمع کی اطلاع ملی تو گھبرا گئے۔ اسی وقت دوڑے ہوئے حاکم ضلع کے پاس گئے۔ کہ اُن سے کچھ صلاح کریں۔ انہیں اُمید تھی کہ وہ خود ہی موقع واردات پر جانے کو تیار ہوں گے۔ مگر وہاں جا کر دیکھا۔ تو صاحب بہادر بیمار پڑے تھے۔ بیماری کیا تھی۔ بیماری کا بہانہ تھا۔ بدنامی سے بچنے کی یہی تدبیر تھی۔ راجہ صاحب سے بولے ـــــ مجھے افسوس ہے کہ میں نہیں جا سکتا۔ آپ جا کر فساد کے دفعیہ کے لئے جو مناسب سمجھیں کریں۔

نہیندر کمار اب بہت پریشان ہوئے۔ انہیں اپنی جان کسی طرح بچتی نہ نظر آتی تھی۔ اگر کہیں خونریزی کی نوبت آگئی تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔ ساری مصیبت میرے ہی سر پر آئے گی۔ پہلے ہی سے لوگ بدنام کر رہے ہیں۔ آج میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہے۔ بے قصور مارا جا رہا ہوں۔ میری تقدیر کی کچھ ایسی گردش ہے کہ جو کچھ میں کرنا چاہتا ہوں اُس کے برعکس ہی کرتا ہوں گویا میرا اپنے اوپر کچھ قابو ہی نہیں رہا۔ اس زمین کے جھمیلے میں پڑنا ہی میرے لئے زہر ہو گیا۔ جبھی سے

کچھ ایسے اتفاقات پیش آتے جاتے ہیں، جو میری تمناؤں کو برباد کئے دیتے ہیں۔ نیکنامی شہرت۔ نام عزت کو کون روئے۔ منہ دکھانے ہی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔

یہاں سے مایوس ہو کر وہ پھر گھر گئے کہ چل کر اندو سے رائے لوں۔ دیکھوں کہ کیا کہتی ہے۔ مگر یہاں اندو نہ تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کہیں گھومنے گئی ہیں۔

اُس وقت راجہ صاحب کی حالت اُس خسیس آدمی کی سی تھی جو اپنی آنکھوں سے اپنی دولت لٹتے ہوئے دیکھتا ہو۔ اور اس خوف سے کہ لوگوں پر میرے دولتمند ہونے کا بھید کھل جائے گا۔ کچھ بول نہ سکتا ہو۔ دفعتاً انہیں ایک بات سوجھی۔ کیوں نہ معاوضہ کے روپے اپنے ہی پاس سے دے دوں؟ روپے کہیں جاتے تو ہیں نہیں۔ جب منظوری آجائے گی واپس لے لوں گا۔ دو چار روز کا معاملہ ہے۔ میری بات رہ جائے گی اور عوام کے دلوں پر اس کا کتنا اچھا اثر پڑے گا۔ کُل ستر ہزار ہی تو ہیں۔ اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ کُل روپے آج ہی دے دئے جائیں؟ کچھ آج دے دوں۔ کچھ کل دے دوں۔ جب تک منظوری آ ہی جائے گی۔ جب لوگوں کو روپے ملنے لگیں گے۔ تو تسکین ہو جائے گی۔ یہ اندیشہ نہ رہے گا کہ کہیں سرکار روپیوں کو ضبط نہ کرلے۔ افسوس کہ مجھے پہلے یہ بات نہ سوجھی۔ ورنہ معاملہ اتنا طول ہی کیوں کھینچتا۔ انہوں نے اُسی وقت امپیریل بینک کے نام بیس ہزار روپیوں کا چیک لکھا۔ دیر بہت ہو گئی تھی۔ اس لئے بینک کے منیجر کے نام ایک خط بھی لکھ دیا کہ روپے دینے میں تاخیر نہ کیجئے گا ورنہ بدامنی واقع ہو جانے کا امکان ہے۔ بینک سے آدمی روپے لے کر واپس آیا تو پانچ بج چکے تھے۔ راجہ صاحب فوراً موٹر پر سوار ہو کر پانڈے پور آ پہنچے۔ آئے تو تھے ایسے نیک ارادے سے مگر وہاں دنے اور اندو کو دیکھ کر طبیعت آگئی۔ جی میں آیا۔ لوگوں سے کہہ دوں کہ جن کے بُوتہ پر اُچھل رہے ہو انہیں سے روپے لو۔ اور ادھر سرکار کو لکھ دوں کہ لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں۔ پس اُن کے روپے ضبط کرلئے جائیں۔ اُسی غصہ کی حالت

میں انہوں نے دیے سے مذکورہ بالا باتیں کہیں۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ مجمع بڑھا ہوا چلا آرہا ہے۔ لوگوں کے چہرے غصہ سے بگڑے ہوئے ہیں۔ مسلح پولیس سنگین چڑھائے ہوئے ہے اور ادھر اُدھر سے دو چار پتھر بھی پھینکے جا رہے ہیں تو اُن کی وہی حالت ہوئی جو خوف میں نشہ کی ہوتی ہے۔ وہ فوراً اپنے موٹر پر کھڑے ہو گئے اور مجمع کو مخاطب کر کے بلند لہجہ میں بولے ـــــ دوستو۔ ذرا صبر کرو۔ یوں فساد کرنے سے کچھ نہ ہوگا۔ میں روپے لایا ہوں۔ ابھی تم کو معاوضہ مل جائے گا۔ سرکار نے ابھی منظوری نہیں بھیجی ہے۔ مگر تمہاری خواہش ہو تو تم مجھ سے اپنے روپے لے سکتے ہو۔ اتنی سی بات کے لئے تمہاری یہ ہیٹ بالکل بیجا اور نامناسب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں تمہارا قصور نہیں ہے۔ تم کسی کے ورغلانے ہی سے مشتعل ہو کر بستہ ہوئے ہو۔ لیکن میں تمہیں اس بغاوت کی آگ میں نہ کودنے دوں گا جو تمہارے خیر خواہوں نے جلا رکھی ہے۔ یہ لو اپنے روپے۔ سب لوگ باری باری سے آکر اپنے نام لکھاؤ۔ انگوٹھے کا نشان بناؤ۔ روپے لو اور چپکے سے گھر چلے جاؤ۔

ایک آدمی نے کہا۔ گھر تو آپ نے چھین لیا۔

راجہ۔ روپیوں سے گھر ملنے میں دیر نہ لگے گی۔ ہم سے تمہاری جو کچھ مدد ہو سکے گی اُسے اُٹھا نہ رکھیں گے۔ اس مجمع کو فوراً منتشر ہو جانا چاہئے ورنہ روپے ملنے میں دیر ہوگی۔

جو مجمع اُمڈے ہوئے بادلوں کی طرح گھنا اور خوفناک ہو رہا تھا وہ اس اعلان کو سنتے ہی روئی کے گالوں کی طرح پھٹ گیا۔ نہ جانے لوگ کہاں سما گئے۔ صرف وہی لوگ رہ گئے جنہیں روپے پانے تھے۔ دقتی دانش مندی سر پر آئی ہوئی مصیبت کو کتنی آسانی سے رفع کر سکتی ہے۔ اس کا یہ بین ثبوت تھا۔ ایک نامناسب لفظ۔ ایک سخت فقرہ۔ حالت کو نازک اور ناقابلِ اصلاح بنا دیتا۔ پٹواری نے ناموں کی فہرست پڑھنی شروع کی۔ راجہ صاحب اپنے ہاتھوں

سے روپے تقسیم کرنے لگے۔ اسامی روپے لیتا تھا۔ انگوٹھے کا نشان بناتا تھا اور پھر دو سپاہی اس کے ساتھ کر دیئے جاتے تھے کہ جا کر مکان خالی کرا لیں۔

روپے پا کر لوٹتے ہوئے لوگ اس طرح باتیں کرتے جاتے تھے :۔

ایک مسلمان ۔ یہ راجہ بڑا موذی ہے۔ سرکار نے روپے بھیج دیئے تھے پر دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لوگ گرم نہ پڑتے تو صاف ہضم کر جاتا۔

دوسرا۔ سوچا ہوگا کہ مکان خالی کرا لوں اور روپے سرکار کو واپس کر کے سرخرو بن جاؤں۔

ایک برہمن نے اُس کی مخالفت کی۔ کیا پکتے ہو۔ بیچارے نے روپے اپنے پاس سے دیئے ہیں۔

تیسرا۔ تم کو کچھ ہو۔ یہ چالیں کیا جانو۔ جا کر پتھی پڑھوا دو۔ پیسے ٹھگو۔

چوتھا۔ سبھوں نے پہلے ہی صلاح کر لی ہوگی۔ آپس میں روپے بانٹ لیتے۔ اور ہم لوگ ٹھاٹھ ہی پر رہ جاتے۔

ایک منشی جی بولے۔ اتنا بھی نہ کریں تو سرکار کیسے خوش ہو؟ اُنہیں چاہئے تھا کہ رعایا کی طرف سے سرکار سے لڑتے مگر آپ خود ہی خوشامدی ٹٹو بنے ہوئے ہیں۔ سرکار کا دباؤ تو محض حیلہ ہے۔

پانچواں ۔ تو یہ سمجھ لو کہ اگر ہم لوگ نہ آجاتے تو بیچاروں کو کوڑی بھی نہ ملتی۔ گھر سے نکل جانے پر کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے؟ بیچارے مانگنے جاتے تو چپڑاسیوں سے مار کر نکلوا دیتے۔

عوام کی نظر میں ایک مرتبہ اعتبار کھو کر پھر اُس کا قائم کرنا مشکل ہے۔ راجہ صاحب کو عوام کے دربار سے یہ صلہ مل رہا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ چار پانچ ہی اسامیوں کو روپے ملنے پائے تھے کہ اندھیرا ہو گیا۔ راجہ صاحب نے لیمپ کی روشنی میں نو بجے رات تک روپے تقسیم کئے۔ اُس وقت نائک رام نے کہا۔ سرکار اب تو بہت دیر ہوئی۔ نہ ہو کل پر اُٹھا رکھئے۔

سے روپے تقسیم کرنے لگے۔ اسامی روپے لیتا تھا۔ انگوٹھے کا نشان بناتا تھا اور پھر دو سپاہی اس کے ساتھ کر دیئے جاتے تھے کہ جا کر مکان خالی کرا لیں۔

روپے پا کر لوٹتے ہوئے لوگ اس طرح باتیں کرتے جاتے تھے :۔

ایک مسلمان ۔ یہ راجہ بڑا موذی ہے۔ سرکار نے روپے بھیج دیئے تھے یہ دبائے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لوگ گرم نہ پڑتے تو صاف ہضم کر جاتا۔

دوسرا۔ سوچا ہوگا کہ مکان خالی کرالوں اور روپے سرکار کو واپس کر کے سرخرو بن جاؤں۔

ایک برہمن نے اُس کی مخالفت کی۔ کہا یکلخت ہو۔ بیچارے نے روپے اپنے پاس سے دیئے ہیں۔

تیسرا۔ تم گوکھے ہو۔ یہ چالیں کیا جانو۔ جا کر پوتھی پڑھواؤ، پیسے ٹھگو۔

چوتھا۔ سبوں نے پہلے ہی صلاح کر لی ہوگی۔ آپس میں روپے بانٹ لیتے۔ اور ہم لوگ ٹھاٹھ ہی پر رہ جاتے۔

ایک منشی جی بولے۔ اتنا بھی نہ کریں تو سرکار کیسے خوش ہو؟ اُنہیں چاہئے تھا کہ رعایا کی طرف سے سرکار سے لڑتے مگر آپ خود ہی خوشامدی ٹٹو بنے ہوئے ہیں۔ سرکار کا دباؤ تو محض حیلہ ہے۔

پانچواں۔ تو یہ سمجھ لو کہ اگر ہم لوگ نہ آجاتے تو بیچاروں کو کوڑی بھی نہ ملتی۔ گھر سے نکل جانے پر کون دیتا ہے اور کون لیتا ہے؟ بچارے مانگتے جاتے تو چپڑاسیوں سے مار کر نکلوا دیتے۔

عوام کی نظر میں ایک مرتبہ اعتبار کھو کر پھر اُس کا قائم کرنا مشکل ہے۔ راجہ صاحب کو عوام کے دربار سے یہ صلہ مل رہا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ چار پانچ ہی اسامیوں کو روپے بٹنے پائے تھے کہ اندھیرا ہو گیا۔ راجہ صاحب نے لیمپ کی روشنی میں نو بجے رات تک روپے تقسیم کئے۔ اُس وقت نائک رام نے کہا۔ سرکار اب تو بہت دیر ہوئی۔ نہ ہو کل پر اُٹھا رکھئے۔

کوئی تالاب کھُدے گا؟ کوئی دھرمسالہ بنے گی؟ بتائیے!

راجہ۔ یہ میں کچھ نہیں جانتا۔

سُور داس۔ جانتے کیوں نہیں؟ دُنیا جانتی ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ پتل گھر کے بجُوروں کے لئے گھر بنیں گے۔ بنیں گے تو اُس پر میرا کیا چھائدہ ہوگا۔ کہ گھر کو چھوڑ کر نکل جاؤں؟ جو کچھ چھائدہ ہوگا وہ صاحب کو ہوگا۔ پرجا کی برادی ہی ہے ایسے کام کے لئے میں اپنا جھونپڑا نہ چھوڑوں گا۔ ہاں کوئی دھرم کا کام ہوتا۔ تو سب سے پہلے میں اپنا جھونپڑا دے دیتا۔ اس طرح جبردستی کرنے کا آپ کو اکھتیار ہے۔ سپاہیوں کو حکم دے دیں۔ پھُوس میں آگ لگتے کتنی دیر لگتی ہے۔ پر یہ نیائے نہیں ہے۔ پُرانے جمانے میں ایک راجہ اپنا بگیچہ بنوانے لگا تو ایک بُڑھیا کی جھونپڑی بیچ میں پڑ گئی۔ راجہ نے اُسے بُلا کر کہا کہ تو یہ جھونپڑی مجھے دے دے۔ تجھے روپے تجھے دے دوں۔ جہاں کہہ۔ تیرے لئے گھر بنوا دوں۔ بڑھیا نے کہا۔ میرا جھونپڑا رہنے دیجئے۔ جب دنیا دیکھے گی کہ آپ کے بگیچہ کے لیے کونے میں بُڑھیا کی جھونپڑی ہے تو آپ کے دھرم اور نیائی کی بڑائی کرے گی۔ بگیچہ کی دیوار سے بانس بھی نیچی ہو جائے گی پر اس سے آپ کا نام سدا کے لئے امر ہو جائے گا۔ راجہ نے بڑھیا کی جھونپڑی چھوڑ دی۔ سرکار کا دھرم پرجا کو پالنا ہے۔ نہ اُس کا گھر اُجاڑنا۔ اُس کو تباہ کرنا؟

راجہ صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ میں تم سے دلیل کرنے نہیں آیا ہوں۔ سرکاری حکم کی تعمیل کرنے آیا ہوں۔

سُور داس۔ ہجور میری مجال ہے کہ آپ سے دلیل کر سکوں مگر مجھے اُجاڑیے مت۔ باپ دادوں کی نِسانی یہی جھونپڑی رہ گئی ہے۔ اسے بنی رہنے دیجئے۔

راجہ صاحب کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ ایک ایک اسامی سے گھنٹوں بحث مباحثہ کرتے۔ انہوں نے دوسرے آدمی کو بُلانے کا حکم دیا۔

انددت نے دیکھا کہ سور داس اب بھی وہیں کھڑا ہے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔

توڑے کہ راجہ صاحب کہیں اُسے سپاہیوں سے دھکے دے کر ہٹوا نہ دیں۔ آہستہ سے اُس کا ہاتھ پکڑ کر علیحدہ لے گئے اور بولے ــــ سُور داس ہے تو بے انصافی۔ مگر کیا کروگے؟ جھونپڑی تو چھوڑنی ہی پڑے گی۔ جو کچھ ملتا ہے لے لو۔ راجہ صاحب کی بدنامی کا خوف ہے ورنہ میں تم سے لینے کو نہ کہتا۔

کئی آدمیوں نے ان لوگوں کو گھیر لیا۔ ایسے موقع پر لوگوں کا شوق بڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ کیا ہُوا۔ کیا کہا۔ کیا جواب دیا؟ سبھی ان باتوں کے جاننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ سُور داس نے اشک آلود آنکھوں سے دیکھ کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھیا تم بھی کہتے ہو کہ روپیہ لے لو۔ مجھے تو اس پتلی گھر نے پیس ڈالا۔ باپ دادوں کی نشانی دس بیگھے جیت تھی وہ پہلے ہی نکل گئی۔ اب یہ جھونپڑی بھی چھینی جا رہی ہے۔ سنسار اسی مایا کا نام ہے۔ جب اس سے چھوٹ جاؤں گا تو جھونپڑی میں رہنے آؤں گا۔ لیکن جب تک جیتا ہوں اپنا گھر مجھ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ اپنا گھر ہے۔ نہیں دیتے۔ ہاں جبردستی جو چاہے لے لے۔

اندر دت۔ زبردستی کوئی نہیں کر رہا ہے۔ قانون کے مطابق ہی یہ مکانات خالی کرائے جا رہے ہیں۔ سرکار کو اختیار ہے کہ وہ کسی سرکاری کام کے لئے جو مکان چاہے لے لے۔

سُور داس۔ ہوگا کانون۔ میں تو ایک دھرم کانون جانتا ہوں۔ اس طرح زبردستی کرنے کے لئے جو کانون چاہو بنالو۔ یہاں کوئی سرکار کا ہاتھ پکڑنے والا تو ہے نہیں۔ اُس کے صلاح کار بھی تو سیٹھ مہاجن ہی ہیں۔

اندر دت نے راجہ صاحب کے پاس جاکر کہا۔ آپ اندھے کا معاملہ آج ملتوی کر دیں تو اچھا ہو۔ گنوار آدمی بات نہیں سمجھتا۔ بس، پتی ہی گائے جاتا ہے۔

راجہ نے سُور داس کو غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ گنوار نہیں ہے۔ چھٹا ہُوا بدمعاش ہے۔ وہ ہمیں اور تمہیں دونوں کو ہی قانون پڑھا سکتا ہے۔ بھکاری بڑا ہے۔ میں اس کا جھونپڑا گرائے دیتا ہوں۔

اس جملہ کے آخری الفاظ سُور داس کے کانوں میں پڑ گئے۔ بولا۔ جھونپڑا کیوں گروائے گا۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ بھنگی کو گولی مروا دیجئے۔

یہ کہہ کر سُور داس لاٹھی ٹیکتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ راجہ صاحب کو اس کی گستاخی پر غصہ آگیا۔ شرافت خود کو بڑی مشکل سے چھوتی ہے۔ خصوصاً جب دوسروں کے سامنے اُس کی تحقیر کی جائے۔ ماہر علی کو بلا کر کہا۔ اس کی جھونپڑی ابھی گرا دو۔

داروغہ ماہر علی چند مسلح اور غیر مسلح پولیس اور مزدوروں کی ایک جماعت ان کے ساتھ چلی گویا کسی قلعہ پر حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ۲۰۰ آدمیوں کا ایک مجمع بھی روانہ ہوا۔ راجہ نے ان آدمیوں کے تیور دیکھے تو ہوش اڑ گئے۔ فساد کا احتمال تھا۔ جھونپڑے کا مسمار کرنا اتنا آسان نہ معلوم ہوا جتنا انہوں نے سمجھ رکھا تھا۔ پچھتائے کہ میں نے ناحق ماہر علی کو حکم دیا۔ جب محلہ میدان ہو جاتا تو جھونپڑا خود بخود گر جاتا۔ سُور داس کوئی بھوت تو ہے نہیں کہ نہا اُس میں پڑا رہتا۔ میں نے چیونٹی کو تلوار سے مارنے کی کوشش کی۔ ماہر علی غصہ ور آدمی ہے اور ان آدمیوں کے رُخ بھی بدلے ہوئے ہیں۔ عوام غصہ میں اپنے کو بھول جاتے ہیں۔ مرنے پر اُتر آتے ہیں۔ کہیں ماہر علی جلد بازی کر بیٹھا تو ضرور فساد ہو جائے گا۔ اس کا سارا الزام میرے سر ہوگا۔ یہ اندھا خود تو ڈوبا ہی ہوا ہے۔ مجھے بھی ڈبوئے دیتا ہے۔ بُری طرح میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ مگر اس وقت وہ حاکم کی حیثیت میں تھے۔ حکم کو واپس نہ لے سکتے تھے۔ مدبرانہ آبرو میں بٹہ لگنے کی یہ نہایت کمیاب زیادہ خوف اپنی آبرو میں بٹہ لگنے کا تھا۔ یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ عوام کو جھونپڑے کی طرف نہ جانے دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ابھی ابھی مل سے لوٹا تھا اور گھوڑے پر چڑھا ہوا سگار پی رہا تھا۔ راجہ صاحب نے جا کر اُس سے کہا۔ ان لوگوں کو روکنا چاہئے۔

اُس نے کہا "جانے دیجئے۔ کوئی ہرج نہیں۔ شکار ہوگا۔"

"بڑی خونریزی ہوگی۔"

"ہم اس کے لئے تیار ہیں۔"

دستے کے چہرہ کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ نہ آگے جاتے بنتا تھا نہ پیچھے۔ نہایت مغموم ہو کر بولے۔ اندو۔ یں بڑی مصیبت میں ہوں۔

اندرودت نے کہا۔ اس میں کیا شک ہے۔

"عوام کو قابو میں رکھنا مشکل ہے"

"آپ جائیے۔ میں دیکھ لوں گا۔ آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں ہے۔"

"تم اکیلے ہی رہ جاؤ گے۔"

"کوئی اندیشہ نہیں ہے"

"تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں چلتے؟ اب ہم بھائی رہ کر کیا کریں گے؟ ہم اپنا فرض ادا کر چکے۔"

"آپ جائیے۔ میری ضرورت ہے۔ وہ بچے نہیں ہے جسے اپنے کی عزت کا خون ہو۔"

میں مصطفیٰ اندر کا کھڑے ہوئے تھے گویا کوئی عورت گھر سے نکال دی گئی ہو۔ اندرودت انہیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھے تو مجمع اسی گاؤں کے موڑ پر رکا ہوا تھا۔ جو شور اس کے جھونپڑے کی طرف جاتی تھی۔ گلی کے دروازہ پر بانکے کانسٹیبل سنگینیں چڑھائے کھڑے تھے۔ ایک قدم آگے بڑھنا سنگین کی نوک کو چھاتی پر لینا تھا۔ سنگینوں کی دیوار اس قدر کمزور تھی۔

اندرودت نے ایک گومٹی کی جگہ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ بھائیو سوچ لو۔ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟ کیا اس جھونپڑی کے لئے پولیس سے لڑو گے؟ اپنا اور اپنے بھائیوں کا خون بہاؤ گے؟ اس قیمت پر یہ جھونپڑی بہت مہنگی ہے۔ اگر اسے بچانا چاہتے ہو۔ تو اس آدمی کی سے منت کرو۔ جو اس وقت وردیاں پہنے سنگین چڑھائے۔ موت کے فرشتے بنے ہوئے تمہارے سامنے کھڑے ہوئے ہیں۔ اور اگرچہ ظاہرا وہ تمہارے دشمن ہیں مگر ان میں ایک بھی

ایسا نہ ہوگا جس کا دل تمہارے ساتھ نہ ہو۔ جو ایک بیکس اور کمزور اندھے کی جھونپڑی گرانے میں اپنی دلاوری سمجھتا ہو۔ ان میں سبھی بھلے آدمی ہیں۔ جن کے بال بچے ہیں جو قلیل تنخواہ پر تمہارے جان و مال کی حفاظت کرنے کے لئے گھر سے آئے ہیں۔

ایک آدمی۔ ہمارے جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں یا سرکار کے رعب و داب کی؟

اندر دت۔ ایک ہی بات ہے۔ تمہارے جان و مال کی حفاظت کے لیئے سرکار کے رُعب و داب کی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے۔ انہیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ ایک مزدور کی اُجرت سے بھی کم ہے۔ . . . . .

ایک سوال۔ یکہ بگھی والوں سے پیسے نہیں لیتے؟

دوسرا سوال۔ چوریاں نہیں کراتے؟ جُوا نہیں کھلاتے؟ گھُوس نہیں کھاتے؟

اندر دت۔ یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ تنخواہ جتنی ملنی چاہیئے اُتنی نہیں ملتی۔ یہ بھی ہماری اور تمہاری طرح انسان ہیں۔ اُن میں بھی رحم اور عقل ہے۔ یہ بھی کمزوروں پر ہاتھ اُٹھانا کمینہ پن سمجھتے ہیں۔ جو کچھ کرتے ہیں مجبور ہو کر۔ انہیں سے کہو کہ اندھے پر ترس کھائیں اور اس کی جھونپڑی کو بچائیں۔ (کانسٹیبلوں سے) کیوں دوستو تم سے اس رحم کی امید رکھیں؟ ان آدمیوں پر رحم کرو گے؟

اندر دت نے ایک طرف عوام کے دلوں میں سپاہیوں کے لئے ہمدردی پیدا کرنے کی کوشش کی اور دوسری طرف سپاہیوں کے دلی رحم کو متحرک کرنے کی۔ جو الدار سنگینوں کے غضب میں گھرا تھا۔ بولا۔ ہماری روزی بجا کر اور جو چاہے وہ کیجیئے۔ اِدھر سے نہ جایئے۔

اندر دت۔ تو روزی کے لئے اتنے لوگوں کی جانیں لے لوگے؟ یہ ہمارے بھی تو ایک بیکس کی مدد کرنے آئے ہیں۔ جو ایشور تمہیں یہاں رزق دیتا ہے۔ وہ کیا کسی دوسری جگہ تمہیں بھوکوں مارے گا؟ ارے یہ کون پتھر پھینکتا ہے

یاد رکھو کہ تم لوگ انصاف کی حفاظت کرنے آئے ہو۔ بلوہ کرنے نہیں۔ ایسے بزدلانہ حملوں سے اپنے کو قابلِ ملامت نہ بناؤ۔ مت ہاتھ اٹھاؤ۔ اگر تمہارے اوپر گولیوں کی بارش بھی چلے۔ . . . . . .

اندر دت کو زیادہ کہنے کا موقع نہ ملا۔ سپرنٹنڈنٹ نے گلی کے موڑ پر آدمیوں کا ہجوم دیکھا تو گھوڑا دوڑاتا ادھر چلا۔ اندر دت کی آواز کانوں میں پڑی تو ڈانٹ کر بولا۔ ہٹا دو اس کو۔ ان سب آدمیوں کو کہو سامنے سے ہٹا دے تم سب آدمی ابھی ہٹ جاؤ۔ ورنہ ہم گولی مار دے گا۔"

مجمع ذرا بھی نہ ہٹا۔

"ابھی ہٹ جاؤ نہیں تو ہم فائر کر دے گا۔"

کوئی آدمی اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

سپرنٹنڈنٹ نے تیسری دفعہ آدمیوں کو ہٹ جانے کا حکم دیا۔

مجمع ساکت اور بے حس کھڑا تھا۔

فائر کرنے کا حکم ہوا۔ سپاہیوں نے بندوقیں ہاتھ میں لیں۔ اتنے میں راجہ صاحب بدحواس ہو کر دوڑتے ہوئے آئے اور بولے "مسٹر براؤن۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔" لیکن حکم ہو چکا تھا۔ باڑھ سر کی گئی۔ بندوقوں کی نالوں سے دھواں نکلا۔ دھائیں دھائیں کی دل ہلا دینے والی آوازیں سنائی دیں اور کئی آدمی چکر کھا کر گر پڑے۔ مجمع کی طرف سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ دو چار شاخیں گر پڑیں مگر درخت ہنوز کھڑا ہوا تھا۔

پھر فائر کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے اب کے بہت منت کر کے کہا۔ "مسٹر براؤن۔ یہ گولیاں میرے دل کو چھیدے ڈالتی ہیں۔" لیکن حکم ہو چکا تھا۔ دوسری باڑھ چلی۔ پھر کئی آدمی گر پڑے۔ شاخیں گریں لیکن درخت بدستور کھڑا تھا۔

تیسری بار فائر کرنے کا حکم ہوا۔ راجہ صاحب نے آبدیدہ ہو کر بھری ہوئی آواز میں کہا۔ "مسٹر براؤن۔ اب میں بالکل تباہ ہو گیا۔" بندوقیں سر کی گئیں۔

گئی آدمی گرے اور ان کے ساتھ اندرونت بھی۔ گولی سینہ کے پار ہوگئی۔ درخت کا تنہ گر گیا۔

مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے ایک دوسرے کو کچلتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کوئی گھنی درخت کی آڑ میں چھپا کوئی کسی کھیر میں گھس گیا۔ کوئی سڑک کے کنارے کی کھائیوں میں جا بیٹھا۔ مگر زیادہ تر لوگ وہاں سے ہٹ کر سڑک پر جا کر کھڑے ہوگئے۔

نایک رام نے دنے سنگھ سے کہا — بھیا کیا کھڑے ہو؟ اندرونت کو گولی لگ گئی۔

دنے ابھی تک بے پروائی کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ خبر پاتے ہی گولی سی لگ گئی۔ بے تحاشا دوڑے اور سنگینوں کے سامنے گلی کے دروازہ پر آ کر کھڑے ہوگئے۔ انہیں دیکھتے ہی بھاگنے والے سنبھل گئے۔ جو چھپے بیٹھے تھے نکل پڑے۔ جب ایسے ایسے لوگ مرنے کو تیار ہیں جن کے لئے دنیا میں آرام ہی آرام ہے تو ہم پھر کس گنتی میں ہیں۔ یہ خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ گرتی ہوئی دیوار پھر کھڑی ہوگئی۔ سپرنٹنڈنٹ نے وانت پیس کر پھر بار فائر کرنے کا حکم دیا۔ لیکن یہ کہا؟ کوئی سپاہی بندوق نہیں چلاتا۔ حوالدار نے بندوقا نہیں پر تک۔ وی۔ سپاہیوں نے بھی اس کے ساتھ ہی اپنی اپنی بندوقیں رکھ دیں۔ حوالدار بولا — حضور کو اختیار ہے جو چاہیں کریں۔ مگر ہم لوگ گولی نہیں چلا سکتے۔ ہم بھی انسان ہیں۔ قصائی نہیں ہیں۔

براؤن — کورٹ مارشل ہوگا۔

حوالدار — ہو جائے۔

براؤن — نمک حرام لوگ!

حوالدار — اپنے بھائیوں کا گلا کاٹنے کے لئے نہیں ان کی حفاظت کے لئے نوکری کی تھی۔

یہ کہہ کر سب کے سب پیچھے کی طرف پھر گئے اور سوروداس کے جھونپڑے

کی طرف چلے۔ اُن کے ساتھ ہی کئی ہزار آدمی چرچے کے نعرے بلند کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ ونے اُن کے آگے آگے تھے۔ راجہ صاحب اور مسٹر براؤن حواس باختہ سے کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی بات وقوع پذیر ہو رہی تھی جو پولیس کی تاریخ میں ایک نئے زمانہ کی آمد کا پیش خیمہ تھی۔ جو روایات کے خلاف انسانی فطرت کے خلاف اور طرزِ حکومت کے خلاف تھی۔ سرکار کے وہ پرانے خادم جن میں سے کتنوں ہی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ رعایا کو دبانے ہی میں بسر کیا تھا۔ یوں اکڑے ہوئے چلے جائیں۔ اپنا سب کچھ یہاں تک کہ جان دینے کو بھی تیار ہو جائیں! راجہ صاحب اب تک جو ابدہی کے بوجھ سے کانپ رہے تھے۔ اب یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ لوگ مجھی پر نہ ٹوٹ پڑیں۔ براؤن تو گھوڑے پر سوار آدمیوں کو منتشر بار بار کر بھگانے کی کوشش کر رہا تھا اور راجہ صاحب اپنے لئے پچھنے کی کوئی جگہ تلاش کر رہے تھے۔ لیکن کسی نے اُن کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ سب کے سب فتح کے نعرے بلند کرتے ہوئے سیلابی روش سے سُور داس کی جھونپڑی کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے وہاں پہنچ کر دیکھا تو جھونپڑے کے چاروں طرف سینکڑوں آدمی کھڑے تھے۔ ماہر علی اپنے آدمیوں کے ساتھ نیم کے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے نئی مصیبت پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس بھیڑ کو پار کر کے جھونپڑے کے پاس جائیں۔ سب کے آگے نایک رام کندھے پر لٹھ رکھے ہوئے کھڑے ہوئے تھے۔ اس مجمع کے وسط میں جھونپڑے کے دروازہ پر سور داس سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا گویا صبر و دعائی طاقت اور پرسکون جلال کی زندہ تصویر تھی۔

ونے کو دیکھتے ہی نایک رام آگے بڑھا۔ بھیا تم اب کچھ پھکر مت کرو۔ میں یہاں سنبھال لوں گا۔ اِدھر مہینوں سے سُور داس سے میری آن بن تھی۔ پر اس چال تک بند تھا پر آج اُس کا جیوٹ جگرا دیکھ کر دنگ ہو گیا۔ ایک اندھے اپاہج میں اتنی ہمت! ہم لوگ دیکھنے ہی کو مٹی کا یہ بوجھ لادے ہوئے ہیں۔

ونے۔ اندر دت کا مرنا غضب ہو گیا۔

نایک رام ۔ بھیا دل نہ چھوڑا کرو۔ بھگوان کی یہی اچھا تھی۔

ونے ۔ کتنی بہادرانہ موت پائی ہے!

نایک رام ۔ میں تو کھڑا دیکھتا ہی تھا ۔ ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔

ونے ۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آج یہ نوبت آئے گی ورنہ پہلے خود ہی جاتا۔ وہ اکیلے سمتی کا کام سنبھال سکتے تھے۔ میں نہیں سنبھال سکتا۔ کتنے ہنس مکھ تھے۔ دقتوں کو تو دھیان ہی میں نہ لاتے تھے۔ آگ میں کودنے کو تیار رہتے تھے۔ خیریت یہی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔

نایک رام ۔ گھر والے کتنا زور دیتے رہے پر انہوں نے ایک بار نہیں کرکے پھر ہاں نہ کی۔

ونے ۔ ایک نوجوان عورت کی جان بچ گئی۔

نایک رام ۔ کہاں کی بات بھیا۔ بیاہ ہوگیا ہوتا تو وہ اس طرح بیدھڑک ہو کر گولیوں کے سامنے جاتے ہی نا۔ بیچارے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔

ونے ۔ رو رو کر مر جائیں گے اور کیا۔

نایک رام ۔ اتنا اچھا ہے کہ اور کئی بھائی ہیں اور گھر کے بوڑھے ہیں۔

ونے ۔ دیکھو ان سپاہیوں کی کیا گت ہوتی ہے۔ کل تک فوج آجائے گی۔ ان غریبوں کی بھی کچھ فکر کرنی چاہیئے۔

نایک رام ۔ کیا پھکر کروگے بھیا؟ ان کا کوٹ ماسل ہوگا۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟

ونے ۔ یہی تو اُن سے کہنا ہے کہ بھاگیں نہیں۔ جو کچھ کیا ہے اس کا پچھا ہو جانے سے نہ ڈریں۔ حولدار کو پھانسی ہو جائے گی۔

یہ کہتے ہوئے دونوں آدمی جھونپڑی کے پاس گئے تو حولدار بولا ۔ کنور صاحب میرا تو کوٹ ماسل ہوگا ہی۔ میرے بال بچوں کی کھبر لیجئے گا۔ یہ کہتے کہتے وہ وہ ڈھاریں مار مار کر رونے

بہت لوگ جمع ہو گئے اور کہنے لگے ۔۔۔ کنور صاحب چندہ کھول دیجئے۔ جوالدار تم سچے سورما ہو جو کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے۔

ونے ۔ جوالدار۔ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا وہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ آج تم نے ہماری لاج رکھ لی۔

جوالدار۔ کنور صاحب۔ مرنے جینے کی چنتا نہیں ہے۔ مرنا تو ایک دن ہو گا ہی۔ اپنے بھائیوں کی بیوا کرتے ہوئے مارے جانے سے بڑھ کر اور کون موت ہوگی؟ دھنیہ ہے آپ کو جو اپنا سکھ آنند چھوڑ کر ابھاگوں کی رکھشا کر رہے ہو۔

ونے ۔ تمہارے ساتھ کے جو لوگ نوکری چاہیں انہیں ہمارے یہاں جگہ مل سکتی ہے۔

جوالدار۔ دیکھئے کون کیتے ہے اور کون مرتا ہے؟

راجہ صاحب نے موقع پایا تو موٹر پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔ مسٹر ریڈن فوجی کمک کے بارہ میں حاکم ضلع سے مشورہ کرنے چلے گئے۔ باہر علی اور اُن کے ساتھی وہیں جمے رہے۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ لوگ بھی ایک ایک کر کے جانے لگے۔ دفعتاً سورداس آکر بولا ۔ کنور جی کہاں ہیں؟ دھرما تما رہا تھ بھر دھرتی کے لئے کیوں اتنا جھنجھٹ کرتے ہو؟ میرے کارن (سبب) آج اتنے آدمیوں کی جان گئی۔ میں کیا جانتا تھا کہ مانی کا پربت ہو جائے گا۔ نہیں تو اپنے ہاتھ سے اس جھونپڑی میں آگ لگا دیتا اور منہ میں کالکھ لگا کہیں نکل جاتا۔ مجھے کیا کرنا تھا۔ جہاں مانگتا وہیں پڑا رہتا۔ بھیا۔ مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ میری جھونپڑی کے پیچھے کتنے ہی گھر اُجڑ جائیں۔ جب مرجاؤں تو جی میں آئے کرنا۔

ونے ۔ تمہاری جھونپڑی نہیں۔ ہمارا قومی مندر ہے۔ ہم اس پر چھاؤنی چلتے دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھے رہ سکتے۔

سورداس۔ پہلے میری دیہہ پر چھاؤنی چل چکے گا تب گھر پر چھاؤنی چلے گا۔

ونے ۔ اور اگر آگ لگا دیں؟

سُورداس - تب تو میری چتا بنی ہوئی ہے - بھیا میں تم سے اور سب بھائیوں سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں کہ اگر میرے کارن کسی ماں کی گود سُونی ہوئی یا میری کوئی بہن بیوا ہوئی تو میں اس جھونپڑی میں آگ لگا کر جل مروں گا۔

ونے نے نائیک رام سے کہا۔ اب؟

نائیک رام۔ بات کا تو دھنی ہے۔ جو کہے گا جرور کرے گا۔

ونے۔ تو پھر بھی اسی طرح چلنے دو۔ دیکھو اُدھر سے کل کیا کل کھلتا ہے۔ ان کا ارادہ دیکھ کر ہم لوگ بھی سوچیں گے کہ کیا کرنا چاہئے۔ اب چلو۔ اپنے بہادروں کی مٹی ٹھکانے لگا دیں۔ یہ ہمارے قومی شہید ہیں۔ ان کا جنازہ دھوم سے نکلنا چاہئے۔

نو بجتے بجتے تو ارتھیاں نکلیں اور تین جنازے۔ آگے آگے اندر دت کی ارتھی تھی۔ پیچھے پیچھے دوسروں کی۔ جنازے قبرستان کی طرف گئے۔ ارتھیوں کے پیچھے کوئی دس ہزار آدمی تھے سر ننگے، سر جھکائے چلے جاتے تھے۔ ہر قدم پر مجمع بڑھتا چلا جاتا تھا۔ راستے بھر سے لوگ دوڑے پیچھے آتے تھے۔ لیکن کسی کے چہرہ پر سوگ یا غم کا نشان نہ تھا۔ نہ کسی کی آنکھ میں آنسو تھے۔ نہ کسی کے مُنہ سے فریاد و فغاں کی آواز نکلتی تھی۔ اس کے خلاف دلوں میں غرور تھا اور آنکھوں میں قومیت کا پُرجوش جھلک۔ اگر اس وقت راستہ میں توپیں لگا دی جاتیں تو بھی لوگوں کے قدم پیچھے نہ پڑتے۔ نہ کہیں ماتم کی آواز تھی۔ نہ فتح کا نعرہ۔ مجمع بالکل خاموش تھا۔ جذبۂ جوش اور سرداری سے معمور۔

راستہ میں راجہ مہیندر کمار کا محل تھا۔ راجہ صاحب چھت پر کھڑے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ دروازہ پر سپاہیوں کا ایک گروہ سنگینیں چڑھائے کھڑا تھا۔ جیسے ہی ارتھیاں ان کے دروازہ کے سامنے سے نکلیں کہ ایک عورت اندر سے نکل کر مجمع میں شامل ہو گئی۔ یہ رانی اندو تھی۔ اس پر کسی کی نگاہ نہ پڑی۔ اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھولوں کی ایک مالا تھی جسے اس نے خود ہی گوندھا تھا۔ وہ اس مالا کو لئے ہوئے آگے بڑھی اور اندر دت کی ارتھی کے پاس جا کر آنسوؤں کے ساتھ اسے ارتھی پر چڑھا دیا۔ ونے نے دیکھ لیا۔ بولے۔ "اندو نے اندو نے ان کی طرف اشک آلود

آنکھوں سے دیکھا اور کچھ نہ بولی۔ کچھ بول نہ سکی۔

اے گنگا! ایسا شاندار منظر شاید ہی تمہاری آنکھوں نے کبھی دیکھا ہوگا۔ تم نے بڑے بڑے سورماؤں کو حاکستر کا ڈھیر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو شیروں کا منہ پھیر سکتے تھے۔ بڑے بڑے زبردست راجے مہاراجے تمہاری آنکھوں کے سامنے خاک میں مل گئے جن کے نعروں سے دُنیا تھرّاتی تھی۔ بڑے بڑے جرّی لوگ یہاں چتا کی آگ میں جل گئے۔ کوئی نام ونمود کا بھوکا تھا کوئی راج پاٹ کا اور کوئی سیم وزر کا۔ کتنے گیانی۔ دھیانی۔ جوگی۔ پنڈت تمہارے دیکھتے دیکھتے آگ کے شعلوں میں سما گئے۔ سچ کہنا کبھی تمہارا دل اتنا مسرور ہوا تھا؟ کبھی تمہاری موجوں نے اس طرح سر اُٹھایا تھا؟ اپنے لئے سبھی مرتے ہیں۔ کوئی اس لوک کے لئے اور کوئی پرلوک کے لئے۔ آج تمہاری گود میں وہ لوگ آرہے ہیں جو بیغرض تھے جنہوں نے پاک اور خالص عدل کی حفاظت کے لئے اپنے کو قربان کر دیا ہے!

اور ایسا مسرت خیز ماتمی مجمع بھی کبھی تم نے دیکھا جس کا ایک ایک فرد اخوت۔ قومی محبّت اور بہادرانہ عقیدت سے مملو ہو؟

تمام رات شعلے بلند ہوتے رہے گویا شہیدوں کی روحیں آتشیں تخت پر بیٹھی ہوئیں بہشت کو جا رہی تھیں!

نکلتے ہوئے سورج کی شرخ کرنیں چتاؤں سے گلے لپٹ لپٹ کر رونے لگیں۔ یہ سورج دیوتا کا آشیرواد (دُعا) تھا۔

لوٹتے وقت صرف گنے گنائے لوگ رہ گئے تھے۔ عورتیں پرجوش گلنے گاتی ہوئیں چلی آتی تھیں۔ رانی جانھوی آگے آگے تھیں۔ اندرا اور کئی دیگر اپسرائیں پیچھے پیچھے۔ اُن کی بہادرانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی میٹھی تان صبح کی روشن شفق پر ناچ رہی تھی جس طرح دل کے تاروں پر محبّت رقص کرتی ہے۔

## (۴۳)

صوفیا کے مذہبی خیالات اُس کی معاشرت اُس کی نوروش اُس کی ابتدائی تعلیم۔

یہ سبھی باتیں ایسی تھیں جن سے ایک ہندو عورت کو نفرت ہو سکتی تھی۔ مگر اتنے دنوں کے تجربہ نے رانی صاحبہ کے سارے شکوک دور کر دیئے تھے۔ صوفیا ابھی تک ہندو مذہب کے دائرہ میں باقاعدہ طریقہ پر داخل نہ ہوئی تھی۔ مگر اُس کا اخلاق ہندو تہذیب اور ہندو سوسائٹی کے موافق تھا۔ اس بارہ میں اب رانی جانہوی کو ذرا بھی شک نہ تھا۔ انہیں اب اگر شک تھا تو صرف یہ کہ ازدواجی رشتہ کے قائم ہو جانے پر وہ کہیں اپنے مقصد کو بھول نہ جائے۔ اس تحریک میں رہنمائی کا بار اپنے اوپر لے کر رونے نے اس شک کو بھی بے بنیاد ثابت کر دیا۔ رانی صاحبہ اب شادی کی تیاریوں میں مشغول ہوئیں۔ کنور صاحب تو پہلے ہی راضی تھے۔ البتہ صوفیا کے والدین کی رضامندی ضروری تھی۔ اندو کو کوئی اعتراض ہو ہی نہ سکتا تھا۔ باقی اندر شنہ دار دل کی رضامندی یا نارضامندی کی انہیں کوئی فکر ہی نہ تھی۔ پس رانی صاحبہ ایک روز مسٹر سیوک کے مکان پر گئیں کہ اس عقد کی بابت طے کر لیں۔ مسٹر سیوک تو خوش ہوئے مگر مسز سیوک کا منہ نہ سیدھا ہوا۔ اُن کی نگاہوں میں ایک یوروپین کی جتنی عزت تھی اتنی کسی ہندوستانی کی نہ ہو سکتی تھی۔ خواہ وہ کتنا ہی صاحب ثروت کیوں نہ ہو۔ وہ جانتی تھیں کہ یہاں معمولی سے معمولی یوروپین کی عزت یہاں کے بڑے سے بڑے راجہ سے زیادہ ہے۔ پر بھو سیوک نے یوروپ کی راہ لی۔ اب گھر کو خط تک نہ لکھتے تھے۔ صوفیا نے ادھر یہ راستہ اختیار کیا۔ زندگی کی ساری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ جانہوی کے اصرار پر ناخوش ہو کر بولیں۔ خوشی صوفیا کی چاہیئے جب وہ خوش ہے تو میری رائے ہو یا نہ ہو۔ ایک ہی بات ہے۔ ماں ہوں۔ اولاد کے لئے جب منہ سے نکلے گی تو دعا ہی نکلے گی۔ اُس کی بد خواہی نہیں کر سکتی۔ لیکن معاف کیجئے گا۔ میں شادی کی رسوم میں شامل نہ ہو سکوں گی۔ میں اپنے اوپر جبر کر رہی ہوں کہ صوفیا کو بد دعا نہیں دیتی ورنہ ایسی ننگِ خاندان لڑکی کا تو مر جانا ہی اچھا ہے جو اپنے آبائی مذہب سے منحرف ہو جائے۔

رانی صاحبہ تو اور کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی تو گھر آکر انہوں نے عالم پنڈت

کو بُلا کر صوفیا کی تبدیلیِ مذہب اور شادی کی ساعت مقرر کرلی۔

رانی جانہوی تو ان رسوم کو دھوم دھام سے ادا کرنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ اُدھر پانڈے پور والی تحریک روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی۔ معاوضہ کے روپے تو اب کسی کے باقی نہ تھے۔ اگرچہ ابھی تک منظوری نہ آئی تھی اور راجہ مہیندر کمار کو سبھی اسامیوں کو اپنے پاس سے روپے دینے پڑے تھے مگر ان خالی مکانات کو گرانے کے لئے مزدور نہ ملتے تھے۔ دوگنی سے تگنی اُجرت دینے پر بھی کوئی مزدور کام کرنے نہ آتا تھا۔ حکام نے ضلع کے دیگر مقامات سے مزدور بُلوائے مگر جب اُنہوں نے آکر یہاں کی حالت دیکھی تو راتوں رات بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعدہٗ حکام نے سرکاری برقندازوں کو تحصیل کے چپڑاسیوں کو بڑا بڑا لالچ دے کر کام کرنے کے لئے تیار کیا مگر جب اُن کے سامنے سینکڑوں نوجوان جن میں کتنے ہی اُونچے گھرانوں کے تھے۔ آکر دست بستہ کھڑے ہو گئے اور منتیں ہوئے کہ بھائیو ایشور کے لئے بھاوڑے نہ چلاؤ اور اگر چلانا ہی چاہتے ہو تو پہلے ہماری گردنوں پر چلاؤ۔ تو اُن سب کی کایا پلٹ ہو گئی۔ دوسرے روز سے وہ لوگ پھر کام پر نہ آئے۔ دنے اور اُن کے رفیق والنٹیر لوگ آج کل اس ستیاگرہ کو بڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔

سُوردا س صبح سے شام تک جھونپڑے کے دروازہ پر بُت بنا بیٹھا رہتا۔ حوالدار اور اُس کے سپاہیوں پر عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ موقع واردات کی حفاظت کے لئے دوسرے ضلع سے مسلح پولیس بُلائی گئی تھی۔ وہ سپاہی تینتیس چڑھائے۔ چوبیس گھنٹے جھونپڑی کے سامنے والے میدان میں ٹہلتے رہتے۔ شہر کے ہزار دو ہزار آدمی آنکھوں پہر موجود رہتے۔ ایک جاتا تو دوسرا آتا۔ آنے جانے والوں کا سلسلہ دن بھر جاری رہتا تھا۔ والنٹیروں کی جماعت بھی نایک رام کے خالی برآمدے میں موجود رہتی تھی کہ نہ جانے کب کیا فساد ہو جائے۔ راجہ صاحب اور سپرنٹنڈنٹ پولیس دن میں دو مرتبہ ضرور آتے تھے مگر کسی سبب

سے جھونپڑے کو منہدم کرنے کا حکم نہ دیتے تھے۔ عوام کی طرف سے فساد کا اتنا اندیشہ نہ تھا جتنا کہ پولیس کی جانب سے عدول حکمی کا۔ جولدار کے ردّعمل سے جملہ حکام کے دلوں میں خوف سما گیا تھا۔ صوبہ کی گورنمنٹ کو مقامی حالات کی رپورٹ ہر روز بھیجی جاتی تھی۔ گورنمنٹ نے بھی دھمکی دی تھی کہ جلد ہی گورکھوں کی ایک رجمنٹ بھیجنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ اب حکام کی امیدوں کا گورکھوں ہی پر انحصار تھا جن کی وفاداری کا انہیں پورا یقین تھا۔ وہ عموماً تمام دن یہیں رہا کرتے تھے اور راجہ صاحب کے درمیان میں اب شمشیر برہنہ کا وقفہ تھا۔ وہ دنے کو دیکھتے تو نفرت سے منہ پھیر لیتے۔ ان کی نگاہ میں دنے باغی تھا اور سورداس کے ہاتھوں کا کھلونا۔

رانی جنہوی جیوں جیوں شادی کی تیاریاں کرتی تھیں اور تاریخ قریب آتی جاتی تھی، سوفیا کے دل پر ایک نامعلوم خوف ایک موہوم اندیشہ ایک نخوست آمیز فکر سے ہراساں ہو رہا تھا۔ خوف یہ تھا کہ شاید شادی کے بعد ازدواجی زندگی راحت خیز نہ ہو۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی خامیاں معلوم ہو جائیں اور پس ہماری زندگی تلخ ہو جائے۔ دنے کی نگاہ میں صوفیا ایک عجیب۔ بے خطا پاک صاف۔ بہر صفت موصوف دیوی تھی۔ صوفیا کو دنے پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے وسیع مذہبی مطالعہ اُسے انسانوں کو جبلی خامیوں سے واقف کر دیا تھا۔ اُس نے بڑے بڑے مہاتماؤں رشیوں منیوں۔ پنڈتوں اور جوگیوں کو جو اپنی سخت ریاضت سے اپنی نفسانی خواہشات کو مغلوب کر چکے تھے۔ دُنیا کے چکتے گرگٹ سے دھکے ہوئے ہاتھ پھسلتے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ نفس پر قابو رکھنے والے لوگ بڑی مشکل سے پھسلتے ہیں۔ مگر جب ایک بار پھسل گئے تو پھر کسی طرح نہیں سنبھل سکتے۔ اُس کی دبی ہوئی خواہشات اُس کی مقید آرزوئیں دنے کی مغلوب تمنائیں بڑی تیزی سے مخالف سمت کو جھکتی ہیں۔ زمین پر چلنے والا انسان گر کر پھر اُٹھ سکتا ہے۔ مگر آسمان پر گھومنے والا آدمی گرے تو اُسے کون روکے گا۔ اُس کے لئے کوئی اُمید نہیں

اُس کے بگاڑ کی کوئی صورت نہیں۔ صوفیا کو خوف تھا کہ کہیں مجھے بھی یہ تلخ تجربہ نہ ہو۔ کہیں میری بھی یہی حالت نہ ہو۔ ممکن ہے مجھ میں کوئی ایسا عیب نکل آئے جو مجھے دنے کی نگاہوں میں گرا دے۔ وہ میری بے قدری کرنے لگیں۔ یہ اندیشہ سب سے زبردست سب سے زیادہ مایوس کن تھا۔ آہ اُس وقت میری کیا حالت ہوگی۔ دنیا میں بے کتنے مرد عورت کے جوڑے ہیں کہ اگر انھیں دوبارہ انتخاب کی آزادی دے دی جائے تو وہ اپنے پہلے انتخاب پر قانع رہیں؟

صوفیا برابر اسی قسم کے خیالات میں محو رہتی تھی۔ دنے بلا بلا اس کے پاس آتے۔ اُس سے باتیں کرنا چاہتے۔ باتوں سے پورا لے معاملے کے متعلق اُس سے رائے لینا چاہتے مگر اُس کی پریشانی دیکھ کر انہیں کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوتی۔

فکر مرض کی جڑ ہے۔ صوفیا ہر وقت متفکر رہتی کہ دن دن بھر کمرے سے باہر نہ نکلتی۔ کھانا بھی بہت کم کھاتی اور کبھی کبھی کچھ نہ کھاتی۔ دل میں ایک آگ سی جلا رہی تھی۔ مگر اپنے دل کی بات کس سے کہے۔ دوسرے سے اس بارے میں ایک لفظ زبان پر نہ لا سکتی تھی۔ جانتی تھی کہ اس کا انجام بُرا ہوگا۔ بدنامی کی حالت میں دنے نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ آخر اُس کا نازک جسم اس دل کی جلن کو برداشت نہ کر سکا۔ پھر سر میں درد رہنے لگا اور پھر رفتہ رفتہ بخار کی نوبت آگئی۔

بستر علالت پر پڑتے ہی صوفیا کو دنے سے ایک۔ لمحہ بھی جدا رہنا ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ کمزور آدمی کو اپنی لاٹھی سے بھی بڑا آسرا ہوتا ہے۔ بیماری کی حالت میں ہمارا دل محبت کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے۔ صوفیا جو کئی روز پہلے کمرہ میں دنے کے آنے پر گوشۂ تنہائی کی تلاش کرتی تھی اب انہیں پیشقدمی کرنے نہیں۔ اُن کی مشتاق نگاہوں سے اُن کے شیریں تبسم سے اُن کی دل بہلانے والی ہنسی سے تھرتھر کانپتی رہتی تھی۔ جس طرح کوئی بیمار لذیذ کھانوں کو سامنے دیکھ کر ڈرتا ہے کہ میں بدپرہیزی نہ کر بیٹھوں۔ اب منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی ہوئی دنے کا انتظار کرتی رہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دنے اب کہیں نہ جائیں

میرے ہی پاس بیٹھے رہیں۔ دنے بھی زیادہ تر اُس کے پاس ہی رہتے۔ پانڈے پور کا کام اپنے رفیقوں پر چھوڑ کر صوفیا کی تیمارداری میں مشغول ہو گئے۔ اُن کے بیٹھے رہنے سے صوفیا کے دل کو گونہ اطمینان رہتا۔ وہ اپنے کمزور ہاتھوں کو دنے کے زانو پر رکھ دیتی اور معصوم تمناؤں کے ساتھ اُن کے چہرہ کی طرف دیکھتی۔ دنے کو کہیں جاتے دیکھتی تو پریشان ہو جاتی اور التجا آمیز نگاہوں سے بیٹھنے کی استدعا کرتی۔

رانی جانہوئی کے برتاؤ میں بھی اب ایک خاص فرق دکھائی دیتا تھا۔ صاف تو نہ کہہ سکتیں۔ مگر اشاروں سے دنے کو پانڈے پور کے ستیاگرہ میں شامل ہونے سے روکتیں۔ اندرموت کی موت نے اُنہیں بہت خائف کر دیا تھا۔ اُنہیں اندیشہ تھا کہ اس خودپرستی کا آخری نظارہ اُس سے بھی زیادہ خوفناک ہوگا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ شادی کے طے ہوتے ہی دنے سنگھ کا جوش بھی کم ہو چلا تھا۔ صوفیا کے پاس بیٹھ کر اُس سے تشفی آمیز گفتگو کرنا اور اس کی محبت بھری باتیں سُننا انہیں اب بہت مرغوب تھا۔ صوفیا کی التجاؤں نے اُن کی محبت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ہم پہلے انسان ہیں اور پیچھے قومی خادم۔ حب الوطنی کے لئے ہم اپنے انسانی جذبات کو پامال نہیں کر سکتے۔ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ اپنے بیٹے کی موت کا غم قومی مصیبت کے غم سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اپنا تم جوان لڑکا ہوتا ہے اور قومی غم یاس انگیز۔ اپنے غم پر ہم روتے ہیں۔ قومی غم پر ترحم دو بہو جاتے ہیں۔

ایک روز صبح صبح دنے ڈاکٹر کے یہاں سے دوا لے کر لوٹے تھے۔ (اچھے دیدوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کا اعتقاد مغربی دواؤں پر زیادہ تھا) کہ کنور صاحب نے اُنہیں بلا بھیجا۔ دنے اِدھر مہینوں سے اُن سے ملنے نہ گئے تھے۔ ناہی ناچاقی سی ہو گئی تھی۔ دنے نے صوفیا کو دوا پلائی اور پھر کنور صاحب سے ملنے گئے۔ وہ اپنے کمرہ میں ٹہل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر بولے۔ تم تو اب کبھی آتے ہی نہیں۔

دنے نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ فرصت نہیں ملتی۔ آپ نے کبھی یاد بھی تو نہیں کیا۔ میرے آنے سے شاید آپ کا وقت خراب ہوتا ہے۔

کنور صاحب نے اس طنز کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا۔ آج مجھے تم سے ایک تشویش انگیز امر میں مشورہ لینا ہے۔ اچھی طرح بیٹھ جاؤ۔ اتنی جلد فراغت نہ ہوگی۔

ونے۔ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔

کنور صاحب نے بہت پس و پیش کے لہجہ میں کہا۔ گورنمنٹ کا حکم ہے کہ تمہارا نام ریاست سے ——

یہ کہتے کہتے کنور صاحب رو پڑے۔ ذرا دیر میں طبیعت سنبھلی تو بولے۔ میری تم سے عاجزانہ التجاء ہے کہ تم بالاعلان اس تحریک سے اپنا قطع تعلق کر لو اور اخباروں میں اس اعلان کو شائع کرا دو۔ تم سے ایسی التجا کرتے ہوئے مجھے کتنی ندامت اور پریشانی ہو رہی ہے اس کا اندازہ تمہارے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر حالاتِ وقت نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ میں تم سے یہ ہرگز نہیں کہتا کہ کسی کی خوشامد کرو۔ کسی کے سامنے سر جھکاؤ۔ نہیں مجھے خود اس سے نفرت تھی اور ہے۔ مگر اپنی جائداد بچانے کی غرض سے میری اس التجا کو منظور کرو۔ میں نے سمجھا تھا کہ ریاست کو سرکار کے ہاتھ میں دے دینا کافی ہوگا مگر حکام اسے کافی نہیں سمجھتے۔ ایسی حالت میں میرے لئے دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو تم خود اس تحریک سے علیحدہ ہو جاؤ۔ کم از کم اس میں نمایاں حصہ نہ لو یا میں ایک معاہدہ تحریر کر کے تمہیں ریاست سے محروم کر دوں۔ آگے آنے والی اولاد کے لئے اس جائداد کا محفوظ رہنا نہایت ضروری ہے۔ تمہارے لئے پہلی صورت جتنی مشکل ہے اتنی ہی مشکل میرے لئے دوسری صورت ہے۔ تم اس بارہ میں کیا فیصلہ کرتے ہو؟

ونے نے تمکنت سے جواب دیا۔ میں جائداد کو اپنے پیروں کی زنجیر نہیں بنانا چاہتا۔ اگر جائداد ہماری ہے تو اس کے لئے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔ اگر غیر کی ہے اور آپ کا قبضہ محض مشروط ہے تو اسے میں اپنی جائداد نہیں سمجھتا۔ حقیقی عزت و وقار کے لئے جائداد کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے ایثار نفسی اور خدمت کافی ہیں۔

بھرت سنگھ۔ بیٹا۔ میں اس وقت تمہارے سامنے جائداد پر اصولی بحث نہیں کر رہا ہوں۔ اسے صرف عملی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ مانتے تسلیم کرتا ہوں کہ کسی حد تک جائداد ہماری حقیقی آزادی میں رکاوٹ ڈالتی ہے مگر اس کا روشن پہلو بھی تو ہے۔ فکر معاش سے نجات ملتی ہے اور وہ عزت و وقار جس کے حصول کے لیے غیر معمولی ایثار و خدمت کی ضرورت ہے۔ یہاں بلا کسی مشقت کے خود بخود ہاتھ آجاتا ہے۔ میں تم سے صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم اس تحریک سے کوئی ظاہر تعلق نہ رکھو۔ یہاں پوشیدہ طور سے اس کی جتنی مدد کرنی چاہو کر سکتے ہو۔ بس اپنے کو قانونی گرفت سے بچائے رہو۔

دلے۔ بعض کوئی اخبار بھی چھوں تو چھپ کر۔ کوئی بند کرے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ جس کام کے لئے پردہ کی ضرورت ہے تو اس کا مقصد کتنا ہی پاک کیوں نہ ہو۔ پھر بھی وہ واقعی ہانتہ آمیز ہے۔ زیادہ صاف الفاظ میں میں اسے چوری کہنے میں بھی کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ یہ شبہ اور خوف کی زندگی انسان کے بہترین وصف کو زائل کر دیتی ہے۔ میں تو رعایا کی اتنی آزادی ضروری سمجھتا ہوں۔ جس سے ہماری خودداری قائم رہے۔ اس بارہ میں میں اپنے خیالات کو اس سے زیادہ واضح الفاظ ظاہر نہیں کر سکتا۔

کنور صاحب نے دلے کو اشک آلود نظروں سے دیکھا۔ ان میں کتنا التجا کتنا عاجزی کتنا انکسار تھا۔ پھر بولے۔ میری خاطر سے انکار مت جاؤ۔

دلے۔ آپ کے قدموں پر اپنے کو نثار کر سکتا ہوں مگر اپنے ضمیر کی آزادی کا خون نہیں کر سکتا۔

دلے یہ کہہ کر جانا ہی چاہتے تھے کہ کنور صاحب نے پوچھا۔ تمہارے پاس روپے تو بالکل نہ ہوں گے؟

دلے۔ مجھے روپوں کی فکر نہیں۔

کنور۔ میری خاطر سے یہ لیتے جاؤ۔

انہوں نے نوٹوں کا ایک پلندہ دینے کی طرف بڑھ دیا۔ دینے انکار نہ کر سکے۔ کنور صاحب پر انہیں ترس آ رہا تھا۔ جب وہ نوٹ لے کر کمرہ سے چلے گئے۔ تو کنور صاحب رنج و مایوسی سے مضطرب ہو کر کرسی پر گر پڑے۔ دینا ان کی نگاہوں میں تاریک تھی۔

دینے کی محبت نے انہیں ریاست چھوڑنے پر آمادہ تو کر دیا۔ مگر ان کے سامنے اب ایک نیا سوال پیدا ہو گیا۔ وہ کسب معاش کا سوال تھا۔ سمتی کے بارہ میں تو کوئی خاص فکر نہ تھی۔ اُس کا بار ملک پر تھا۔ اس کے علاوہ کسی قومی کام کے لئے بھیک مانگنے میں بھی کوئی شرم کی بات نہیں۔ انہیں اُس کا یقین ہو گیا تھا کہ کوشش کی جائے تو اس کام کے لئے مستقل سرمایہ مہیا ہو سکتا ہے۔ مگر معاش کے لئے کیا ہو؟ مشکل یہ تھی کہ کسب معاش سے مراد صرف اُن کی روزمرہ کی ضروریات کا پورا ہونا نہ تھا بلکہ خاندانی روایات کا قائم رکھنا بھی۔ اب تک اس مسئلہ کی اہمیت کا انہیں احساس نہ ہوا تھا۔ دل میں کسی بھی خواہش کے صرف پیدا ہونے کی دیر تھی کہ وہ پوری ہو جاتی تھی۔ اب نگاہوں کے سامنے یہ زبردست مسئلہ یک دم کھڑا ہو گیا تو اُن کے ہوش اڑ گئے۔ ممکن تھا کہ اب بھی کچھ دنوں تک والدین کی شفقت انہیں اس فکر سے آزاد رکھتی۔ مگر اس کمزور بنیاد پر زندگی کا محل نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ پھر ان کی محبت یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ اپنی اصول پروری اور معیار پسندی کا کفارہ اپنے والدین سے کرائیں۔ کچھ نہیں۔ یہ بیحیائی ہے اور بزدلی۔ مجھے کوئی حق نہیں کہ اپنی زندگی کا بار والدین پر ڈالوں۔ انہوں نے اس ملاقات کا تذکرہ اپنی ماں سے بھی نہ کیا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے رہے۔ علاوہ بریں ان کو اب اپنی ہی فکر نہ تھی۔ صوفیا بھی ان کی زندگی کا جزو بن چکی تھی۔ پس اُس کی فکر اور بھی زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ مانا کہ صوفیا میرے ساتھ زندگی کی بڑی بڑی مصیبت کو برداشت کرے گی۔ مگر کیا یہ مناسب ہے کہ اُسے محبت کے لئے یہ سخت سزا دی جائے؟ اُس کی محبت کو اس سخت آزمائش میں ڈالا جائے۔ وہ تمام دن انہیں تفکرات میں مبتلا رہے۔ یہ عقدہ انہیں ناقابل حل معلوم ہوتا تھا۔ ان کی تعلیم میں کسب معاش کے مسئلہ پر ذرا بھی

دھیان نہ دیا گیا تھا۔ ابھی چند روز پیشتر اُن کے لئے اس مسئلہ کا وجود ہی نہ تھا۔ وہ خود سختیاں اٹھانے کے عادی تھے۔ ارادہ تھا کہ تمام عمر قومی خدمت کا کام انجام دوں گا مگر صوفیا کے سبب اُن کے اس ارادہ میں فرق آگیا تھا۔ جن چیزوں کی پہلے اُن کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ اب نہایت ضروری معلوم ہوتی تھیں۔ محبت کو خصوصاً عیش و عشرت کا خیال پسند ہے۔ وہ تکلیف اور مفلسی کا جواب نہیں دیکھتی۔ ونے صوفیا کو ایک رانی کی طرح رکھنا چاہتا تھا۔ اُسے زندگی کی اُن تمام نعمتوں سے معمور کر دینا چاہتا تھا جو شوق و تکلف نے ایجاد کی ہیں۔ مگر حالات ایسی صورت اختیار کرتے جاتے تھے جس سے وہ ساری تمنائیں برباد ہوئی جاتی تھیں۔ چاروں طرف سے مفلسی اور مصیبت ہی کا دور دورہ نظر آتا تھا۔ اس پریشانی کی حالت میں وہ کبھی صوفیا کے پاس جاتے اور کبھی اپنے کمرہ میں جاتے۔ کچھ سُم گم۔ اُداس۔ پس ہمت۔ اُترا ہوا اور بے رونق چہرہ۔ گویا کوئی بڑی مسافت طے کر کے آئے ہوں۔ پانڈے پور سے بڑی خوفناک اطلاعیں موصول ہو رہی تھیں۔ آج کمشنر آیا۔ آج گورکھوں کی رجمنٹ آپہنچی۔ آج گورکھوں نے مکانوں کو مسمار کرنا شروع کیا اور لوگوں کے رونے پر انہیں مارا پیٹا۔ آج پولیس نے رضا کاروں کو گرفتار کرنا شروع کیا۔ دس رضا کار پکڑ لئے گئے۔ آج بیس پکڑے گئے۔ آج حکم دیا گیا ہے۔ کہ سڑک سے سور داس کی جھونپڑی تک کانٹے دار تار لگا دیا جائے۔ کوئی وہاں جا ہی نہیں سکتا۔ ونے یہ خبریں سُنتے تھے اور کسی پر شکستہ پرند کی طرح ایک بار تڑپ کر رہ جاتے۔

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور صوفیا کی صحت ٹھیک ہونے لگی۔ اس کے پیروں میں اتنی طاقت آگئی کہ پیدل باغیچہ میں ٹہلنے چلی جاتی۔ کھانا اچھا معلوم ہونے لگا۔ چہرہ پر صحت کی سُرخی نمودار ہو گئی۔ ونے کی عقیدتمندانہ تیمارداریوں نے اُس پر پوری فتح حاصل کر لی تھی۔ وہ اندیشے جو اُس کے دل میں پہلے پیدا ہوتے تھے۔ دور ہو گئے تھے۔ محبت کے رشتہ کو خدمت نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ وہ اپنے شکریہ کا اظہار لفظوں میں نہیں بلکہ اپنے آپ کو وقف کر کے کرنا چاہتی تھی۔ ونے سنگھ کو مغموم دیکھ کر کہتی تم میرے

لئے اتنے فکر کیوں ہوتے ہو؟ میں تمہارے ساتھ سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ میں تمہاری دولت و ثروت کی بھوکی نہیں ہوں جو مجھے تمہاری خدمت کرنے کا موقع نہ دے گی۔ جو تمہیں جائیداد سے محروم بنا دے گی۔ اس سے مجھے تمہارا مفلس ہونا کہیں زیادہ پسند ہے۔ البتہ جیوں جیوں اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اسے خیال ہونے لگا۔ کہ کہیں لوگ مجھے بدنام نہ کرتے ہوں کہ اسی کی وجہ سے دونے پانڈے پور نہیں جاتے۔ اس سنیاگرہ کی لڑائی میں وہ حصہ نہیں لیتے جو ان کا فرض ہے۔ خود آگ لگا کر دور سے کھڑے ہوئے تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اس خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کی خواہش نہ ہوتی تھی کہ دونے وہاں جائیں۔

ایک روز انندو اسے دیکھنے آئی۔ بہت مغموم اور پریشان تھی۔ اب اپنے شوہر سے اس قدر بدعقیدہ ہو گئی تھی کہ دفتر بھتوں سے اس نے ان سے بات تک نہ کی تھی۔ یہاں تک کہ اب وہ کھلے الفاظ میں ان کی ہجو کرنے سے بھی نہ چوکتی تھی۔ راجہ صاحب بھی اس سے نہ بولتے تھے۔ باتوں باتوں میں دونے سے بولی ــــ انہیں تو حاکموں کی خوشامد نے چوپٹ کیا۔ پتاجی کو جائداد کی محبت نے چوپٹ کیا۔ کیا محبت تمہیں بھی چوپٹ کر دے گی؟ کیوں صوفیا تم انہیں ایک لمحہ کے لئے بھی قید سے نہیں آزاد کرتیں؟ اگر ابھی سے ان کا یہ حال ہے تو شادی ہو جانے پر کیا ہوگا؟ جب تو یہ شاید دیوانہ دنیا کہیں کے بھی نہ رہ جائیں گے۔ بھوتے کی طرح محبت کا رس پی کر بدمست رہیں گے۔

صوفیا یہ سن کر خجل ہوئی۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کا یہ گمان درست نکلا کہ دونے کی بے پروائی کا سبب میں ہی سمجھی جا رہی ہوں۔ لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ دونے اپنی جائداد بچانے کے خیال سے میری بیماری کا حیلہ کر کے اس لڑائی سے الگ رہنا چاہتے ہوں؟ یہ بُرا خیال خواہ مخواہ اس کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ اسے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ جیسے ہم کسی قابل نفرت شے سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ مگر اس الزام کو اپنے سر سے دور کرنا ضروری تھا۔ لجاتی ہوئی بولی ــــ میں نے تو کبھی منع نہیں کیا۔ اندرو۔ منع کرنے کے بھی کئی ڈھنگ ہیں۔

صوفیا۔ اچھا تو میں آپ کے سامنے کہہ رہی ہوں کہ مجھے لُٹن کے وہاں جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہے بلکہ میں اسے اپنے اور اُن کے دونوں ہی کے لئے فخر کی بات سمجھتی ہوں۔ اب میں اشیور کے رحم اور اُن کی مہربانی سے اچھی ہو گئی ہوں۔ اور انہیں یقین دلاتی ہوں کہ اس کے وہاں جانے سے مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی میں خود بھی دو چار روز میں جاؤں گی۔

اندر دینے والے کی طرف دیکھ کر کہا۔ اب تو تمہارے لئے کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ تمہارے وہاں رہنے سے سب کام عمدہ طریقہ پر ہوگا۔ اور ممکن ہے کہ لوگوں کو علاج ہی سمجھنا نہ کرنا پڑے۔ میں نہیں چاہتی کہ اُس کی عزت کسی دوسرے آدمی کو ہے۔

جب اس تاکید کا بھی دینے پر کوئی اثر نہ ہوا تو صوفیا کو یقین ہو گیا کہ اس علیحدگی کا سبب بجز حد سے بڑھے ہوئے لالچ کے اور کچھ نہیں ہے۔ جب انہیں معلوم ہے کہ ان کی علیحدگی سے میری بدنامی ہو رہی ہے تو یہ دیدہ دانستہ کیوں مجھے شرمندہ ملامت بنا رہے ہیں۔ یہ تو اونگلے کو مجھے کا بہانہ ہو گیا۔ رونے کو تو تھے ہی آنکھوں میں کوئی چیز پڑ گئی۔ میاں کے پیر تھوڑے ہی پکڑے ہوئے ہوں۔ وہ تو اب پانڈے پور کا نام تک نہیں لینے گویا وہاں کچھ ہوتا ہی نہیں رہا ہے۔ اس نے صاف الفاظ میں تو نہیں لیکن کنایتاً دے کو وہاں جانے کی ترغیب بھی دی مگر وہ پھر ٹال گئے۔ دراصل بات یہ تھی کہ اتنے دنوں تک علیحدہ رہنے کے بعد وہ اب وہاں جاتے ہوئے شرماتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ وہاں جانے پر کہیں مجھ پر لوگ تالیاں نہ بجائیں کہ تو خود سے پیچھے ہٹے رہے۔ وہ اب خود پشیمان ہو رہے تھے کہ میں کیوں اتنے دنوں تک منہ چھپائے رہا۔ میں نے کیوں اپنی ذاتی پریشانیوں کو اپنے فرض کے راستہ کا کانٹا بننے دیا۔ صوفیا کی رضامندی سے میں جا سکتا تھا۔ وہ کبھی مجھے منع نہ کرتی۔ صوفیا میں ایک بڑا عجیب یہ ہے کہ میں اُس کے نفع کے لئے بھی جو کام کرتا ہوں اُسے بھی وہ ایک برہم نقاد کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ خود چاہے محبت سے مغلوب ہو کر اپنے فرض کی ذرا بھی

پروا نہ کرے مگر میں معیار سے ذرا بھی نہیں ہٹ سکتا۔ اب اُنہیں معلوم ہوا کہ یہ میری کمزوری۔ میری بزدلی۔ میری کاہلی تھی جس نے صوفیا کی علالت کو میرے منہ چھپانے کا حیلہ بنا دیا ورنہ میری جگہ تو سپاہیوں کی آدھی صف میں تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے کہ میں اپنی خفت کو مٹا سکوں۔ اس کا کچھ گو دھو سکوں۔ کہیں دوسرے صوبہ سے کسی خوفناک حادثہ کی خبر آجائے اور میں وہاں اپنی لاج رکھوں۔

صوفیا کو اب اُن کا ہر وقت ساتھ رہنا گوارا نہ تھا۔ ہم بیمار کا میں جس لاٹھی کے سہارے چلتے پھرتے ہیں۔ آرام ہو جانے پر اُسے چھوتے تک نہیں۔ ملاحظہ کو چاہتی ہے۔ کہ بچہ کچھ دیر جاکر کھیل آئے۔ صوفیا کا دل اب بھی وہ اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے دینا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی اُس کا چہرہ پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا۔ آنکھوں میں محبت کا سرور چھا جاتا تھا۔ مگر قوت امتیازی اُسے فوراً اپنے فرض کی یاد دلا دیتی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ جب وہ میرے پاس آئے۔ تو میں بے مروت بن جاؤں۔ بے اعتنائی سے پیش آؤں۔ بولوں نہیں۔ آپ چلے جائیں گے مگر یہ صرف اُس کی پاک خواہش تھی۔ وہ اتنی بیدرد۔ اتنی بے مروت نہ ہو سکتی تھی۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں بُرا نہ مان جائیں۔ کہیں یہ نہ سمجھنے لگیں کہ اس کا دل ڈانوا ڈول ہے یا یہ اتنی خود غرض ہے کہ بیماری میں تو سراپا محبت بنی ہوئی تھی۔ اور اب مجھ سے بولتے ہوئے بھی زبان رُکتی ہے۔ صوفیا نیز اول محبت چاہتا ہے۔ تیری عقل۔ نیک نامی اور شہرت اور ان دونوں میں برابر کشمکش جاری ہے۔

معرکہ کا شروع ہوئے دو ماہ گزر گئے۔ معاملہ روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ والنٹیروں کی گرفتاری پر قانع نہ ہو کر گورکھوں نے اب انہیں جسمانی اذیت پہنچانی شروع کر دی تھی۔ بیجز تی بھی کرتے تھے اور اپنے وحشیانہ سلوک سے انہیں خائف بھی کر دینا چاہتے تھے۔ مگر سورداس پر فاتر کرنے کی

یا اُس کے جھونپڑے میں آگ لگانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ انقلاب کا خوف تھا بغاوت کا خوف نہ تھا۔ بڑی سے بڑی بغاوت بھی انہیں خائف نہ کر سکتی تھی۔ خوف تھا خونریزی کا۔ نہ جانے کتنے غریب مر جائیں۔ نہ جانے کتنا کہرام مچے۔ ایک بار پتھر کا دل بھی خونریزی سے کانپ اُٹھتا ہے۔

سارے شہر میں کوچہ کوچہ گھر گھر یہی چرچا تھی۔ شہر کے ہزاروں آدمی روز وہاں پہنچ جاتے صرف تماشا دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ ایک بار اُس بھوس کی جھونپڑی کا اور اُس کے اندھے رہنے والے کا درشن کرنے کے لئے نیز موقع پڑنے پر اپنے سے جو کچھ ہو سکے وہ کر دکھانے کے لئے۔ والنٹیروں کی گرفتاری سے اُن کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ قربانی کی ہوا سی بہہ گئی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ ایک شخص ڈونڈی پیٹتا ہوا نکلا۔ ونے نے نوکر کو بھیجا کہ کیا بات ہے۔ اُس نے لوٹ کر کہا۔ سرکار کا حکم ہوا ہے کہ آج سے شہر کا کوئی آدمی بانڈے پور نہ جائے۔ سرکار اُس کی جان کی حفاظت کی ذمہ وار نہ ہوگی۔

ونے نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ آج کوئی نیا حملہ ہونے والا ہے۔

صوفیا۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔

ونے۔ شاید سرکار نے اس جنگ کو ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

صوفیا۔ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

ونے۔ سخت خونریزی ہوگی۔

صوفیا۔ ضرور ہوگی۔

دفعتاً ایک والنٹیر نے آکر ونے کو تعظیم کی۔ اور بولا۔ آج تو اُدھر کا راستہ بند کر دیا گیا ہے۔ مسٹر کلارک راجپوتانہ سے حاکم ضلع کی جگہ پر آگئے ہیں۔ مسٹر سینا پتی معطل کر دئے گئے ہیں۔

ونے۔ اچھا مسٹر کلارک آگئے۔ کب آئے؟

والنٹیر۔ آج ہی چارج لیا ہے۔ سُنا جاتا ہے۔ سرکار نے اُنہیں اسی کام کے

لئے خاص طور سے تعلیمات کیا ہے۔

ولنے۔ تمہارے کتنے آدمی وہاں ہوں گے؟

والنٹیر۔ کوئی پچاس آدمی۔

ولنے کچھ سوچنے لگے۔ والنٹیر نے کئی منٹ کے بعد پوچھا۔ آپ کوئی خاص حکم دینا چاہتے ہیں۔

ولنے نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا ـــــ خواہ مخواہ لوگ ہیں مت کودنا۔ اور حتی الامکان عوام کو وہاں جانے سے روکنا۔

والنٹیر۔ آپ بھی آئیں گے؟

ولنے نے کچھ اُداس ہوکر کہا۔ دیکھا جائے گا۔

والنٹیر کے چلے جانے پر ولنے کچھ دیر تک سوچتے رہے۔ سوال تھا کہ جاؤں یا نہ جاؤں؟ دونوں کے متعلق سوچ بچار ہونے لگا۔ میں جاکر کیا کروں گا۔ حکام کی جو مرضی ہوگی ویسا تو وہ ضرور ہی کریں گے۔ اب سمجھوتہ کی کوئی اُمید نہیں۔ لیکن یہ کتنی ذلت کی بات ہے کہ شہر کے باشندے تو وہاں جانے کے لئے تیار ہوں اور میں جس نے یہ معرکہ چھیڑا ہے منہ چھپاکر بیٹھا رہوں۔ اس موقع پر میرا الگ رہنا مجھے زندگی بھر کے لئے بدنام کردے گا۔ میری حالت نہبندر کمار سے بھی زیادہ گئی گزری ہوجائے گی۔ لوگ سمجھیں گے بزدل ہے۔ ایک طرح سے میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ لیکن بہت ممکن ہے کہ آج بھی گولیاں چلیں۔ ضرور چلیں گی۔ کون کہہ سکتا ہے کیا ہوگا؟ صوفیا کس کی ہوکر رہے گی۔ آہ۔ میں نے ناحق عوام میں یہ جوش پھیلایا۔ اندھے کا جھونپڑا گر گیا ہوتا اور ساری باتیں ختم ہوجاتیں میں نے ہی سفید کرہ کا جھنڈا کھڑا کیا۔ سوتے ہوئے شیر کو جگایا۔ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالی۔

انہوں نے اپنے دل کو ملامت کرتے ہوئے سوچا آج میں اتنا پست ہمت کیوں ہو رہا ہوں؟ کیا میں موت سے ڈرتا ہوں؟ موت سے کیا ڈر؟ مرنا تو ایک دن

ضرور ہی ہے! کیا میرے مرنے سے ملک سونا ہو جائے گا؟ کیا میں ہی مکھیا ہوں؟ کیا دوسرے بہادروں کی پیدا کرنے کی والی ماں ملک میں موجود ہی نہیں ہے۔

صوفیا کچھ دیر تک ٹکٹکی لگائے ان کے منہ کی طرف تاکتی رہی۔ دفعتاً وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ میں وہاں جاتی ہوں۔

ونے نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ آج جانا خطرناک ہے۔ سُنا نہیں سارے ناکے بند کر دئے گئے ہیں؟

صوفیا۔ عورتوں کو کوئی نہ روکے گا۔

ونے نے صوفیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت منت آمیز انداز سے کہا۔ جان من۔ میرا کہنا مانو۔ آج نہ جاؤ۔ آثار اچھے نہیں نظر آتے۔ کوئی بُرا واقعہ ہونے والا ہے۔

صوفیا۔ جیسی تو میں چاہتی ہوں۔ اوروں کے لئے خوف مانع ہو تو میرے لئے بھی کیوں ہو؟

ونے۔ کلارک کا آنا بُرا ہُوا۔

صوفیا۔ اسی لئے میں اور جانا چاہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میرے سامنے کوئی وحشیانہ حرکت نہ کر سکے گا۔ اتنی شرافت ابھی اُس میں ہے۔

یہ کہہ کر صوفیا اپنے کمرہ میں گئی۔ اُس نے اپنا پرانا پستول شلوکے کی جیب میں رکھا۔ گاڑی تیار کرنے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ باہر نکلی تو گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اُس نے جا کر ونے سنگھ کے کمرہ میں دیکھا وہ وہاں نہ تھے۔ پھر وہ دروازہ پر کچھ دیر تک کھڑی رہی۔ ایک نامعلوم خوف نے کسی آنے والی مُصیبت کے اندیشہ نے اُس کے دل کو ڈانوا ڈول کر دیا۔ وہ اپنے کمرہ میں واپس جانا چاہتی تھی۔ کہ کنور صاحب آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ صوفیا ڈری کہ یہ کچھ پُوچھ نہ بیٹھیں۔ وہ فوراً گاڑی میں جا بیٹھی اور کوچوان کو تیزی سے لے جانے کا حکم دیا۔ لیکن جب گاڑی کچھ دور نکل گئی تو وہ سوچنے لگی کہ ونے کہاں چلے گئے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہُوا کہ مجھے جانے پر آمادہ دیکھ کر

وہ مجھ سے پہلے ہی چلے گئے ہوں؛ اُسے پچھتاوا ہونے لگا کہ میں ناحق یہاں آنے کو تیار ہوئی۔ دنے کی خواہش نہ تھی۔ وہ میرے ہی اصرار سے آئے ہیں۔ ایشور۔ تم اُن کی حفاظت کرنا۔ کلامک اُن سے جلا ہی ہوا ہے۔ کہیں ہنگامہ نہ ہو جائے۔ میں نے دنے کو نکما سمجھا۔ میری کتنی زیادتی ہے! یہ دوسرا موقعہ ہے کہ میں نے اُن پر جھوٹا الزام لگایا۔ میں شاید اب تک اُنہیں نہیں سمجھی۔ وہ دل کے بڑی ہیں۔ یہ میری کم ظرفی ہے کہ اُن کے بارہ میں اکثر مجھے بدگمانی ہو جاتی ہے۔ اگر میں اُن کی راہ کا کانٹا نہ بنی ہوتی تو ان کی زندگی کتنی پاک و صاف کتنی روشن ہوتی۔ میں ہی اُن کی کمزوری کا سبب ہوں اور میں ہی اُن پر الزام عاید کرنے والی ہوں۔ یقین کرے وہ یہاں نہ آئے ہوں۔ اُن کا نہ آنا ہی اچھا ہے۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ یہاں آئے یا نہیں چل کر دیکھ لوں۔

اُس نے کوچوان کو اور تیز ہانکنے کا حکم دیا۔

اُدھر دنے سنگھ دفتر میں جا کر ممتی کے جمع خرچ کا حساب لگا رہے تھے۔ اُن کا دل بہت اُداس تھا۔ چہرہ پر مایوسی چھائی ہوئی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد اپنے چاروں طرف مغموم نگاہوں سے دیکھتے اور پھر حساب لکھنے لگتے۔ نہ جانے وہاں سے لوٹ کر آنا ہو یا نہ ہو۔ اس لئے حساب کتاب ٹھیک کر دینا ضروری سمجھتے تھے۔ کام ختم کر کے انہوں نے دعائیہ انداز سے اوپر کی طرف دیکھا۔ پھر باہر نکلے۔ باغیچہ کی اکٹھائی اور بیڑی سے چلے۔ پیچھے مڑ مڑ کر مکان۔ باغ اور درختوں کو اتنی مشتاق نگاہوں سے دیکھتے چلتے گویا وہ انہیں پھر نہ دیکھیں گے۔ گویا یہ اُن کا آخری نظارہ ہے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ صوفیا چلی جا رہی ہے۔ اگر وہ اس سے مل جاتے تو شاید صوفیا بھی اُن کے ساتھ لوٹ پڑتی مگر انہیں یہ دُھن سوار تھی کہ میں صوفیا کے پہلے وہاں جا پہنچوں۔ موڑ پر آتے ہی انہوں نے سائیکل کو پھیر دیا اور دوسرا راستہ پکڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ میدان جنگ میں پہنچے تو صوفیا ابھی وہاں نہ آئی تھی۔ دنے نے دیکھا کہ گرے ہوئے مکانوں کی جگہ سینکڑوں جھونپڑیاں کھڑی ہوئی ہیں اور اُن کے چاروں طرف گوروکھے کھڑے ہوئے گشت لگا رہے ہیں۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اندر جا سکے۔

ہزارہ آدمی ارد گرد جمع ہیں گویا کسی بڑے تماشہ کو دیکھنے کے لئے تماشائی لوگ ایک حلقہ بناکر کھڑے ہو گئے ہوں۔ درمیان میں سورداس کا مجسمہ پیڑ اسٹیج کی طرح موجود تھا۔ سورداس مجسمہ پیڑ کے سامنے لاٹھی لئے کھڑا تھا گویا ناٹک کو شروع کرنے کے لئے کھڑا ہو۔ سب لوگ سامنے کا نظارہ دیکھنے میں اس قدر محو تھے کہ ونے کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ سمتی کے جانباز والنٹیر راتوں رات مجسمہ پیڑ کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ ونے نے فیصلہ کیا کہ میں بھی وہیں جاکر کھڑا ہو جاؤں۔

یکایک کسی نے پیچھے سے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ اُنہوں نے چونک کر دیکھا تو صوفیا تھی۔ اُس کے چہرہ کا رنگ فق تھا۔ گھبرائی ہوئی آواز سے بولی — تم کیوں آئے؟

ونے۔ تمہیں تنہا کیسے چھوڑ دیتا؟

صوفیا۔ مجھے بڑا خوف معلوم ہو رہا ہے۔ یہ توپیں کیوں لگا دی گئی ہیں؟

ونے نے توپیں نہ دیکھی تھیں۔ واقعی تین توپیں مجسمہ پیڑ کی طرف منہ کرکے کھڑی کر دی گئی تھیں۔ گویا تماشا گاہ میں دیو آ گئے ہوں۔

ونے۔ شاید آج اس ستیاگرہ کو ختم کر دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔

صوفیا۔ میں یہاں ناحق آئی۔ مجھے گھر پہنچا دو۔

آج صوفیا کو پہلی بار محبت کی کمزوری کا احساس ہوا۔ ونے کی سلامتی کے خیال سے وہ کبھی اتنی بدحواس نہ ہوئی تھی۔ جانتی تھی کہ ونے کا فرض اُن کی عزت اُن کی نیک نامی یہاں رہنے ہی میں ہے۔ لیکن یہ جانتے ہوئے بھی اُن کو یہاں سے ہٹا لے جانا چاہتی تھی۔ اُسے اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ اپنے کو وہ بالکل بھول گئی تھی۔

ونے۔ ہاں تمہارا یہاں رہنا خطرناک ہے۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا۔ پر تم نے نہ مانا۔

صوفیا ونے کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں گاڑی میں بٹھا دینا چاہتی تھی کہ اتنے میں رانی کا موٹر آ پہنچا۔ موٹر سے اُتر کر وہ صوفیا کے پاس گئیں اور بولیں — کیوں صوفیا

جاتی ہو کیا؟

صوفیا نے بات بنا کر کہا۔ نہیں جاتی نہیں ہوں۔ ذرا پیچھے ہٹ جانا چاہتی ہوں۔

صوفیا کو اندو کا آنا کبھی اتنا ناگوار نہ ہوا تھا۔ ونے کو بھی برا معلوم ہوا۔ بولے تم کیوں آئیں؟

اندو۔ اس لئے کہ تمہارے بھائی صاحب نے آج خط کے ذریعے مجھے منع کر دیا تھا۔

ونے۔ آج کی حالت بہت نازک ہے۔ ان لوگوں کے صبر و تحمل، ہمت و جوانمردی کا آج سخت ترین امتحان ہوگا۔

اندو۔ تمہارے بھائی صاحب نے بھی تو اس خط میں یہی بات لکھی تھی۔

ونے۔ کلارک کو دیکھو۔ کتنی بیدردی سے لوگوں کو گولیوں سے مار رہا ہے۔ مگر کوئی پیٹھ نہیں دیتا۔ عوام کا ضبط و تحمل اب آخری حد کو پہنچ گیا ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب کیا ہو جائے۔

عوام اس قدر مستقل مزاج اور وفا شعار ہو سکتے ہیں۔ اس کا احساس ہونے کو آج ہی ہوا۔ ہر شخص سرفروشی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ اتنے میں نایک رام کسی طرف سے آ گئے۔ انہوں نے ونے کو دیکھ کر تعجب سے پوچھا۔ آج تم ادھر کیسے بھول پڑے بھیا؟

اس سوال میں کتنا طنز، کتنی حقارت، کتنی ملامت تھی۔ ونے تلملا گئے۔ بات ٹال کر بولے۔ کلارک بڑا بے رحم ہے۔

نایک رام نے انگوچھا ہٹا کر ونے کو اپنی پیٹھ دکھائی۔ گردن سے کمر تک ایک نیلا سُرخ خط کھنچا ہوا تھا۔ گویا کسی نوک دار کیل سے کھرچ دیا گیا ہو۔ ونے نے پوچھا — یہ زخم کیسے لگا؟

نایک رام۔ ابھی یہی ہنٹر کھائے ہوئے چلا آتا ہوں۔ آج جیتا بچا تو سمجھوں گا۔ غصہ تو ایسا آیا تھا کہ ٹانگ پکڑ کر نیچے گھسیٹ لوں مگر ڈرا کہ کہیں گولی نہ چل جائے تو نایک سب آدمی بھون جائیں۔ ختم تھے تو ادھر آنا ہی چھوڑ دیا۔ عورت کا مایا جال

بڑا کٹھن ہے۔

صوفیا نے اس جملہ کا آخری لفظ سن لیا بولی ـــــ تم پر بیشر کا شکر ادا کرو۔ کہ تم اس مایا جال میں نہیں پھنسے۔

صوفیا کی ہنسی نے نائیک رام کو گدگدا دیا۔ سارا غصہ فرد ہو گیا۔ بولے ۔ بھیا میں صاحب کو جواب دو۔ مجھے معلوم تو ہے پر کہتے نہیں بنتا۔ ہاں کیسے ؟

دینے۔ کیوں نہیں نے تو فیصلہ کیا تھا کہ اب عورتوں کے منہ نہ لگاؤں گا۔ بڑی بے وفا ہوتی ہیں۔ یہ اُسی روز کی بات ہے جب میں صوفیا کی بات سُن کر اوسان کھو بیٹھا تھا۔

نائیک رام ۔ (شرارت) واہ بھیا۔ تم نے تو میرے ہی اوپر ڈنک دیا۔

دینے ۔ اور کیا کہوں ؟ سچ کہنے میں کیا تامل ؟ خوش ہوں تو مصیبت۔ ناراض ہوں تو مصیبت۔

نائیک رام ۔ بس بھیا۔ میرے من کی بات کہی۔ ٹھیک یہی بات ہے۔ ہمیشہ عورتوں پر ہی مارا۔ راضی ہوں تو مصیبت۔ ناراض ہوں تو اس سے بڑی مصیبت۔

صوفیا۔ جب عورت اتنی بڑی مصیبت ہے تو مرد کیوں اُسے اپنے سر منڈھتے ہیں ؟ جسے دیکھو وہی اس کے پیچھے مرتا ہے۔ کیا دنیا کے سبھی مرد جاہل ہیں۔ کسی کو تمیز نہیں چھو گئی ؟

نائیک رام۔ بھیا۔ میں صاحب نے تو میرے سامنے تجھے لڑھکا دیا۔ بات تو پتے کی ہے کہ جب عورت اتنی بڑی مصیبت ہے تو مرد کیوں اس کے پیچھے چیراں رہتے ہیں ؟ ایک کی دُردسا دیکھ کر دوسرا کیوں نہیں سیکھتا ؟ بولو بھیا ہے کچھ جواب ؟

دینے۔ جواب کیوں نہیں ہے۔ ایک تو تمہیں نے میری دُردسا سے سیکھ لیا۔ تمہاری طرح اور بھی کتنے ہی پڑے ہوں گے۔

نائیک رام (ہنس کر) بھیا تم نے پھر میرے ہی سر ڈال دیا۔ یہ تو کپ

ٹھیک، جواب نہ بن پڑا۔

دنے۔ ٹھیک وہی ہے جو تم نے آتے ہی آتے کہا تھا کہ عورت کا مایا جال بڑا کٹھن ہے۔

انسان فطرتاً تفریح پسند ہے۔ ایسے رنج کے وقت بھی اُسے ہنسی سُوجھتی ہے۔ پھانسی پر چڑھنے والے لوگ بھی ہنستے دیکھے گئے ہیں۔ یہاں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ مسٹر کلارک کھوڑا اُچھالتے اور آدمیوں کو کُچلتے ہوئے وہاں آ پہنچے۔ صوفیا پر نگاہ پڑی بیتر سا لگا۔ ٹوپی اوپر اٹھا کر بولے۔ یہ وہی نائک ہے یا کوئی دوسرا شروع کر دیا؟

فتر سے بھی تیز اور پتھر سے بھی سخت۔ بیپردہ انسان تھا۔ مسٹر کلارک نے اپنی دلی پوری۔ اپنے رنج۔ اپنی بے اعتقادی۔ اپنے غصہ کو ان الفاظ میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔

صوفیا نے برجستہ جواب دیا۔ نہیں یہ وہ نہیں۔ اس وقت جو ہمارے دشمن تھے وہی اب دشمن ہیں۔

کلارک طنز کو سمجھ کر تلملا اُٹھے۔ بولے۔ یہ تمہاری بے انصافی ہے۔ میں اپنے اصول سے ذرا بھی منحرف نہیں ہوا۔

صوفیا۔ کسی کو ایک بار سیاہ دنیا اور دوسری بار اُسی پر تلوار اُٹھانا کیا ایک ہی بات ہے؟ جس اندھے کے لئے تم نے پہلے کروسنا مقابلہ کیا تھا جس کے لئے تم ہوئے تھے جس کا خمیازہ اٹھایا تھا۔ اُسی اندھے پر تلوار چلانے کو آج راجپوتانہ سے دوڑے آئے ہو۔ کیا دونوں ایک ہی بات ہے؟

کلارک۔ ہاں مس سیوک۔ دونوں ایک ہی ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں۔ اپنے ذاتی جذبات و خیالات پر عمل پیرا ہونے کے نہیں۔ جہاز سے اُترتے ہی ہم اپنی شخصیت کو مٹا دیتے ہیں۔ ہمارے انصاف ہماری ہمدردی۔ ہمارا اخلاق۔ سب ہی مقصد سے۔ ہمارا اوّل اور آخر مقصد ہے حکومت کرنا۔

مسٹر کلارک کا اشارہ صوفیا کی طرف اتنا نہیں جتنا دنے کی طرف تھا۔

وہ دینے کو کنایتاً دھمکا رہے تھے۔ صاف الفاظ میں اُن کا مطلب یہ تھا کہ ہم کسی کے دوست نہیں ہیں۔ ہم یہاں حکومت کرنے آئے ہیں اور جو ہمارے کام میں مداخلت کرے گا اُسے بیخ و بُن سے اُڑا دیں گے۔

صوفیا نے کہا۔ ناانصافانہ حکومت حکومت نہیں بلکہ جنگ ہے۔

کلارک۔ تم نے پھاوڑے کو پھاوڑا کہہ دیا۔ ہم میں اتنی شرافت نہیں۔ اچھا میں تم سے پھر ملوں گا۔

یہ کہہ کر انہوں نے گھوڑے کو مہمیز لگائی۔ صوفیا نے بلند لہجہ میں کہا۔ تمہیں ہرگز نہ آنا۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔

آسمان ابر آلود ہو رہا تھا۔ شام سے پہلے شام ہو گئی تھی۔ مسٹر کلارک ابھی گئے تھے کہ مسٹر جان سیوک کا موٹر آ پہنچا۔ وہ جیوں ہی موٹر سے اُترے کہ سینکڑوں آدمی اُن کی طرف لپکے۔ لوگ حکام سے دبتے ہیں۔ اُن کی طاقت کا اُنہیں علم ہوتا ہے اور احساس بھی۔ جہاں اُس طاقت کا خوف نہیں ہوتا وہاں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں مسٹر سیوک پر حکام کی مہربانی تھی مگر وہ خود حاکم نہ تھے۔ وہ اپنی جان بچا کر گورکھوں کے کیمپ کی طرف بھاگے۔ سر پر پیر رکھ کر دوڑے مگر ٹھوکر کھائی اور گر پڑے۔ مسٹر کلارک نے گھوڑے پر سے اُنہیں دوڑتے دیکھا تھا۔ اُنہیں گرتے دیکھا تو سمجھے کہ لوگوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔ اُنہوں نے فوراً گورکھوں کی ایک جماعت تو ان کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ مجمع نے بھی خطرناک صورت اختیار کی۔ چھ بجے لڑنے کو تیار ہو گئے۔ سُور داس ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔ یہ ہل چل سُنی تو خوفزدہ ہو کر بھیرو سے بولا۔ تم مجھے جرا اپنے کندھے پر بیٹھا لو۔ ایک بار اور لوگوں کو سمجھا دوں۔ کیوں لوگ یہاں سے ہٹتے نہیں جاتے؟ سینکڑوں بار کہہ چکا۔ کوئی سُنتا ہی نہیں۔ کہیں گولی چل گئی تو آج اُس دن سے بھی زیادہ کھون کھرابہ ہوگا۔

بھیرو نے سور داس کو کندھے پر بٹھا لیا۔ اس مجمع سے اُس کا سر بالشت بھر اُونچا ہو گیا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اُس کی باتیں سُننے دوڑے۔ بہادروں کی پرستش کرتا عوام

کا ذاتی خاصہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اندھا یونانی دیوتا اپنے عقیدتمندوں کے درمیان میں کھڑا ہے۔

سورداس نے اپنی بے نور آنکھوں سے مجمع کی طرف دیکھ کر کہا۔ بھائیو۔ آپ لوگ اپنے اپنے گھر جائیں۔ آپ سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ہوں۔ گھر چلے جائیں۔ یہاں جمع ہو کر حاکم لوگوں کو چڑھانے سے کیا فائدہ؟ میری موت آوے گی تو آپ لوگ کھڑے رہیں گے اور میں مر جاؤں گا۔ موت نہ آوے گی تو میں توپوں کے منہ سے بچ کر نکل جاؤں گا۔ آپ لوگ اصل میں میری مدد کرنے نہیں آئے۔ مجھ سے دشمنی کرنے آئے ہیں۔ حاکموں کے من میں پھوج کے من میں پولیس کے من میں جو دیا اور دھرم کا خیال آتا۔ آپ لوگوں نے جمع ہو کر اُس خیال کو گُم بنا دیا ہے۔ میں حاکموں کو دکھا دیتا کہ ایک غریب اندھا آدمی ایک پھوج کو کیسے پیچھے ہٹا دیتا ہے۔ توپ کا منہ کیسے بند کر دیتا ہے۔ تلوار کی دھار کیسے موڑ دیتا ہے۔ میں دھرم کے بل پر لڑنا چاہتا تھا۔ . . . . .

اس کے آگے وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ مسٹر کلارک نے اُسے کھڑے ہو کر کچھ بولتے ہوئے سُنا تو سمجھے کہ اندھا لوگوں کو فساد کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ اُنہوں نے سمجھ لیا تھا کہ جب تک روح یہاں موجود رہے گی اعضاء کی حرکت کبھی بند نہ ہوگی۔ اس لئے روح کو جُدا کر دینا ضروری ہے۔ منہ کو بند کر دینے سے چشمہ کی روانی خود بخود بند ہو جائے گی۔ وہ اسی تاک میں لگے ہوئے تھے کہ اس خیال کو کسی طرح عمل میں تبدیل کریں۔ مگر سورداس کے گرد روز ہی آدمیوں کا مجمع رہتا تھا۔ کلارک کو مناسب موقع نہ ملتا تھا۔ اب جو اُس کے سر کو اوپر اٹھا ہوا دیکھا تو انہیں وہ موقع مل گیا۔ وہ سنہرا موقع تھا جس کے لئے برہی اس جنگ کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوگا اُسے وہ جانتے تھے۔ مجمع میں جوش پیدا ہوگا۔ وہ پتھر برسائے گا۔ گھروں میں آگ لگائے گا۔ سرکاری دفتروں کو لوٹے گا۔ ان شرارتوں کو مٹا دینے کے لئے اُن کے پاس کافی طاقت تھی۔ اصل چیز تھی اندھے کو رزم گاہ سے ہٹا

دنیا یہی زندگی کا مرکز ہے یہی حرکت دینے والی طاقت ہے۔ انہوں نے جیب سے پستول نکالا۔ اور سوردا س پر فائر کر دیا۔ نشانہ بیٹھا تھا۔ گولی سوردا س کے کندھے میں لگی۔ سر شگ کیا اور خون بہنے لگا۔ بھیرو اُسے سنبھال نہ سکا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ روحانی طاقت مادی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکی۔

صوفیا نے مسٹر کلارک کو جیب سے پستول نکالتے اور سوردا س کو نشانہ بناتے دیکھا تھا۔ اُس کو زمین پر گرتے دیکھ کر سمجھ گئی کہ قاتل نے اپنا کام پورا کر دیا۔ فتح پر کھڑی تھی۔ نیچے کود پڑی اور مقتل کی طرف دوڑی جیسے کوئی ماں اپنے بچہ کو کسی آنے والی گاڑی کی زد میں دیکھ کر بے تحاشا دوڑ پڑے۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے اُسے روکنے کے لئے دوڑے۔ وہ کہتے جاتے تھے۔ "صوفیا۔ ایشور کے لئے وہاں نہ جاؤ۔ مجھ پر اتنا رحم کرو۔ دیکھو گورکھے بندوقیں سنبھال رہے ہیں۔ ہائے تم نہیں مانتیں یہ کہہ کر انہوں نے صوفیا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف کھینچا۔ لیکن صوفیا نے ایک جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور پھر دوڑی۔ اُسے اس وقت کچھ نہ سوجھتا تھا۔ نہ گولیوں کا خوف تھا۔ نہ سنگینوں کا۔ لوگ اُسے دوڑتے دیکھ کر خود بخود راستہ سے ہٹتے جاتے۔ گورکھے سپاہی سامنے کھڑے تھے۔ مگر صوفیا کو دیکھ کر وہ بھی ہٹ گئے۔ مسٹر کلارک نے پہلے ہی سختی تاکید کر دی تھی کہ کوئی سپاہی عورتوں سے چھیڑ چھاڑ نہ کرے۔ وہ اس فوجی دیوار کو پار نہ کر سکے۔ رقیق شے سوراخ کے راستہ نکل گئی مگر ٹھوس چیز نہ نکل سکی۔

صوفیا نے جا کر دیکھا تو سوردا س کے شانہ سے خون بہہ رہا تھا۔ اعضا سُست پڑ گئے تھے۔ چہرہ بگڑ گیا تھا مگر آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سکون۔ قناعت اور صبر کی چمک تھی۔ ان میں عفو تھا۔ غصہ اور خوف کا نام نہ تھا۔ صوفیا نے فوراً رومال نکال کر زخم پر باندھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ انہیں شفاخانہ بھیجنا چاہیئے۔ ابھی جان ہے۔ ممکن ہے بچ جائیں۔ بھیرو نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔ صوفیا اُسے اپنی گاڑی تک لائی۔ اُس پر سوردا س کو لٹا دیا۔ خود گاڑی پر

بیٹھ گئی۔ اور کوچوان کو شفاخانہ چلنے کا حکم دیا۔

مجمع بالوسی اور غصہ سے دیوانہ ہو گیا۔ ہم بھی یہیں مر مٹیں گے اگر کسی کو یہ ہوش ہوتا کہ یوں مر مٹنے سے اپنے ہوا خواہوں کا کیا نقصان ہوگا۔ بچہ جانتا ہے کہ ماں کھیل میں بھی ہر حال میں اپنے کھیلنے والوں کی حفاظت کرے۔ لیکن غصہ میں دور اندیشی سے کام لینا ہوش مندی ہے۔ لوگوں کا وہ سمندر امنڈتا ہوا گورکھپور کی طرف چلا۔ ہتھیار بند سپاہی گھبرائے ہوئے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے لیکن اُن کی تعداد اتنی کم تھی کہ ہجوم کو روکنے کا خیال نہ کرتے تھے۔ کچھ دور دوڑ کر پیچھے ہٹ کر جمع ہو رہے تھے۔ کچھ دیر میں ہجوم کا پتا نہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے جگہ جگہ پتھروں کے انبار لگ گئے۔

ولسن نے دیوانہ وار غضب ہوا چاہتا ہے۔ آن واحد میں سینکڑوں جانوں پر بن جائے گی۔ فوراً ایک ٹوٹی ہوئی دیوار پر چڑھ کر بولے ــــ دوستو! یہ غصہ کا موقع نہیں ہے۔ انتقام کا موقع نہیں ہے۔ بلکہ حق کی فتح پر خوشی اور جشن منانے کا موقع ہے۔

ایک آدمی ــ ہمارے دو کنور ولسن نے سنگھ ہیں۔

دوسرا ــ واقعی خوشی اور جشن منانے کا موقع ــ صنائیے شادی مبارک ہو۔

تیسرا ــ جب میدان صاف ہو گیا تو آپ مردوں کی لاش پر آنسو بہانے آئے ہیں۔ نئے خواب گاہ میں سوئے اور آپ ــ یہ تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں؟

ولسن ــ ہاں یہ خوشی منانے کا موقع ہے کہ اب بھی ہماری ٹوٹی پھوٹی پارلیمنٹ زندہ ہے۔ قوم اتنی عجیب روحانی طاقت ــ ایک سکیں بجھوا دیں۔ ہسپتال کے زخمیوں کی مدد کریں۔ اتنی مردانگی سے مقابلہ کر سکتی ہے۔

ایک آدمی نے طنز سے کہا ــ ایک سکہ اور دو ایک کچھ کر سکتا ہے وہ راجے مہاراجے ہیں کر سکتے۔

دوسرا ــ کہاں کے راجہ مہاراجہ ــ ڈاکو ہیں۔ دیر ہو رہی ہے ــ ہم بدنصیبوں کو مرنے دیجئے۔

تیسرا۔ سرکار سے کتنا انعام ملنے والا ہے۔

چوتھا آپ ہی نے تو راجپوتانہ میں دربار کی طرف ہو کر رعایا کو آگ میں جھونک دیا تھا

دوسرا میری ملامت کا موقع پھر آئے گا اگر یہ میں چند خاص وجوہ سے ادھر آپ کا ساتھ نہ دے سکا مگر ایشور جانتا ہے کہ میری ہمدردی آپ ہی کے ساتھ تھی۔ میں ایک لمحے کے لئے بھی آپ کی طرف سے غافل نہ تھا۔

ایک آدمی۔ یار یہاں کھڑے کھڑے کیا بکواس کر رہے ہو؟ کچھ دم ہو تو چلو ٹٹ مریں۔

دوسرا۔ یہ لکچر بازی کا موقع نہیں ہے۔ آج ہمیں دکھانا ہے کہ ہم حق کے لئے کتنی دلیری سے جان دے سکتے ہیں۔

تیسرا۔ چل کر گورکھوں کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ کوئی شخص پیچھے قدم نہ ہٹا دے۔ وہی اپنی لاشوں کا ڈھیر لگا دو۔ بال بچوں کو خدا پر چھوڑ دو۔

چوتھا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آگے بڑھ کر للکاریں کہ بزدلوں کا خون بھی جوش کھانے لگے۔ ہمیں سمجھانے چلے ہیں گویا ہم دیکھتے نہیں کہ سامنے فوج بندوقیں بھرے کھڑی ہے اور ایک ہی باڑھ میں ہمارا ستھراؤ کر دے گی۔

پانچواں۔ بھائی ہم غریبوں کی جان سستی ہوتی ہے۔ رئیس زیادہ ہوتے۔ تو ہم بھی دور ہی سے کھڑے تماشہ دیکھتے۔

چھٹواں۔ اس سے کہو کہ جا کر چلو بھر پانی میں ڈوب مرے۔ ہمیں اس کی نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ اگلی میں خون لگا شہید بننے چلے ہیں۔

یہ حقارت آمیز طنز بہ اور سخت الفاظ دنے کے دل میں تیر کی طرح اتر گئے۔ ہائے رے قسمت۔ میری زندگی بھر کی خدمت۔ قربانی اور نفس کشی کا یہی نتیجہ ہے! اپنا سب کچھ قومی خدمت کی قربان گاہ پر چڑھا کر روسیوں کو محتاج ہو جانے کا یہی صلہ ہے! کیا ریاست کی بدنامی میرے سر سے کبھی نہ دور ہو گی؟ یہ سوچتے ہوئے وہ

بھول گئے کہ "میں یہاں عوام کی حفاظت کرنے آیا ہوں۔" گورکھا فوج سامنے کھڑی ہے۔ میں یہاں سے ہٹا کہ ایک لمحہ میں انسانوں کا خون قتل ہونے لگے گا۔ میرا نشانہ فرض عوام کو اخیر تک روکے رہنا ہے۔ کوئی۔ معاملہ نہیں اگر انہوں نے طعنے دیئے۔ میری تحقیر کی۔ مجھے بدنام کیا۔ نامناسب الفاظ کہے۔ میں قصوروار ہوں۔ اگر نہیں ہوں۔ تو بھی مجھے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے ۔ سچ ہے جو بھول گئے موقع شناس آدمی وقت کے موافق کام کرتا ہے۔ جہاں دبنا چاہیئے وہاں دب جاتا ہے۔ جہاں تیز پڑنا چاہیئے وہاں تیز پڑتا ہے۔ اسے عزت یا ذلت سے خوشی یا رنج نہیں ہوتا۔ اس کی نگاہ برابر اپنے مقصد پر رہتی ہے۔ وہ پورے [illegible] کے ساتھ اسی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن سادہ مزاج غیر متمدن اور صاف دل لوگ بادلوں کی مانند ہوتے ہیں جو باد موافق کو پاکر زمین کو سیراب کر دیتے ہیں اور باد مخالف کے جھونکوں سے منتشر ہو جاتے ہیں۔ سیاست دان شخص کے لئے اپنا معیار ہی سب کچھ ہے۔ ضمیر کی اس کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں۔ باعزت آدمیوں کے لئے اپنی اخلاقی قوت ہی سب سے بڑھ کر ہے۔ وہ اپنے اخلاق پر کئے گئے حملوں کو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ اپنی بیگانہ ہی ثابت کرتا اپنی معیار پرستی سے کہیں زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ وہ کا خوبصورت چہرہ متما اٹھا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ دیوانہ وار مجمع کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے اور بولے۔ کیا آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ رئیسوں کے بیٹے کیونکر جان دیتے ہیں؟ دیکھئے۔

یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے بھرا ہوا پستول نکالا۔ اس کی نال سینہ میں لگائی۔ اور جب تک لوگ دوڑیں زمین پر گر پڑے۔ لاش تڑپنے لگی۔ دل کی ساری تمنائیں خون کا فوارہ بن کر نکل گئیں۔ اسی وقت بارش ہونے لگی گویا جنت کی رحمتیں پھول برسا رہی تھیں۔

زندگی کا رشتہ کتنا نازک ہے! کیا پھول سے بھی زیادہ نازک نہیں۔ جو ہوا کے جھونکے سہتا ہے اور مرجھاتا نہیں؟ کیا وہ بیلوں سے زیادہ نازک نہیں جو

درختوں کے جھنڈ سہمتی ہرن سے پیس رہتی ہے؟ کیا وہ سب اس سے زیادہ نازک نہیں؟ پھر موروں پر تیرتے ہیں اور لوٹتے نہیں؟ دنیا میں اور لوگ بھی پیدا کئے ہیں جن کے لئے ایک جنسِ ایک لفظ بھی قابلِ برداشت اور تہلکہ ہے! ہم ناز و نعمت میں پلتے زیرِ دشت اور عالیشان محلوں کا تیر کی جاتی ہے۔

مجمع منتشر اور دم بخود رہ گیا۔ سب آنکھوں سے اچھا جاتے۔ ان کا غصہ رحم کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ [illegible] کرنے لگے۔ وہ کو دیکھ کر اپنی آنکھوں کو [illegible] کے لئے جو دشمن [illegible] تھا [illegible] ایک محبت میں ڈوبا [illegible] مختصر لمحے [illegible] اور قوم کی آنکھوں [illegible] ہوا تھا۔ بوڑھوں کے گھٹنے [illegible] گئے تھے وہ بھی واپس آئے۔ [illegible] آنکھوں [illegible] آنسوؤں کی [illegible] ہو رہی تھی جو قدرتی بارش سے مل کر زمین کو تر کر رہی تھی۔ ہر دل فرطِ غم سے بیقرار تھا۔ ہر دل اپنے آپ کو ملامت کر رہا تھا۔ ہر دل پشیمان ہو رہا تھا۔ آہ یہ ہمارے ہی طعنوں ہماری سخت کلامی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اسی کے قاتل ہیں۔ اس کا خون ہماری ہی گردن پر ہے۔ ہائے کتنا بہادر کتنا شریف۔ کتنا فیاض۔ کتنا غیرت مند کتنا جوانمرد۔ ہمیں کتنا [illegible] اور انسان کا [illegible] تھا جس [illegible] ہم نے [illegible] سمجھا۔ اور ہم کمظرفوں نے اس کا خون کر ڈالا۔ اُسے نہ پہچانا۔

ایک [illegible] کر کہا۔ خدا کرے میری زبان کٹ جائے۔ میں نے ہی شادی پر مبارکباد کا لعنہ دیا۔

دوسرا بولا۔ [illegible] پر فدا ہو جاؤں [illegible] اس کے قدموں پر گر کر قربان ہو جاؤں۔ یہ کہہ کر اس نے کمر سے تلوار نکالی اپنی گردن پر پھیر لی اور وہیں تڑپنے لگا۔

تیسرا [illegible] بڑھا [illegible] ہے۔ ہائے میں کیا جانتا تھا کہ

میرا طعنہ بجلی کا کام کرے گا۔

چوٹ تھا۔ ہمارے دلوں کا یہ زخم ہمیشہ ہرا رہے گا۔ ہم (۳) فرشتہ خصلت انسان کو کبھی بھول نہ سکیں گے۔ کتنی بہادری سے جان دے دی۔ جیسے کوئی ایک پیسہ نکال کر بیمکاری کے سامنے پھینک دے۔ رئیس زادوں میں یہی اوصاف ہوتے ہیں۔ وہ اگر جینا جانتے ہیں تو مرنا بھی جانتے ہیں۔ رئیس کی یہی پہچان ہے کہ بات پر مرمٹے۔

اندھیرا ہوتا جاتا تھا۔ پانی موسلا دھار برس رہا تھا۔ کبھی ذرا دیر کے لئے بوندیں ہلکی پڑ جاتیں اور پھر زوروں سے گرنے لگتیں۔ جیسے کوئی رونے والا تھک کر ذرا دم لے لے اور پھر رونے لگے۔ زمین نے پانی کی چادر میں منہ چھپا لیا تھا۔ مانا منہ پر اپنی ڈالے رو رہی تھی سر رہ کر ٹوٹی ہوئی دیواروں سے گرنے کا دھماکا ہوتا تھا جیسے کوئی سینہ پیٹ پیٹ کر ماتم کر رہا ہو۔ لحہ لحہ پر بجلی گوندتی تھی جیسے آسمان پر روحیں ماتم کر رہی ہوں۔ دم دم کے بعد یہ خبر چاروں طرف پھیل گئی۔ اندو مسٹر جان سیبوک کے ساتھ تھی۔ یہ خبر سنتے ہی غش کھا کر گر پڑی۔

دنے کی لاش پر ایک چادر تان دی گئی۔ چراغوں کی روشنی میں اس کا چہرہ اب بھی پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ دیکھنے والے آتے تھے۔ روتے تھے اور عزاداروں کی صف میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ کوئی کوئی پھولوں کی مالا رکھ دیتا تھا۔ جانباز لوگ یونہی مرتے ہیں۔ ننھائیں اُن کے گلے کی زنجیر نہیں ہوتیں۔ نفسانی خواہشات اُن کے پیروں کی بیڑیاں نہیں بنتیں۔ انہیں اس کی فکر نہیں ہوتی کہ میرے بعد کون ہنسے گا اور کون روئے گا۔ انہیں اس کا خوف نہیں ہوتا کہ میرے بعد کون سنبھالے گا؟ یہ سب دنیا سے پیٹھ والوں کے بہانے ہیں۔ بہادر لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ جب تک جیتے ہیں بیفکری سے جیتے ہیں۔ جب مرتے ہیں بیفکری سے مرتے ہیں۔

ہم داستانِ غم کو کیوں طول دیں؟ جب بیگانوں کی آنکھوں سے آنسو اور دلوں سے آہ نکلا پڑتی تھی تو یگانوں کا کہنا ہی کیا۔ نائک رام سوروداس کے ساتھ شفاخانہ گئے تھے۔ روتے ہی تھے کہ یہ منظر دکھائی دیا۔ ایک ٹھنڈی سانس

کھینچ کر رونے کے ارادوں پر سر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگے۔ ذرا طبیعت ٹھکانے ہوئی تو صوفیا کو خبر دینے چلے جو ابھی شفاخانہ ہی میں تھی۔

نایک رام راستہ بھر روتے ہوئے گئے مگر صوفیا کے پاس پہنچے تو گلا اتنا بھر گیا کہ منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اُس کی طرف دیکھ کر سسک کر رونے لگے۔ صوفیا کے دل میں درد سا اُٹھا۔ ابھی نایک رام گئے اور اُلٹے پاؤں واپس آئے۔ ضرور کوئی بُری خبر ہے۔ پوچھا "کیا ہے پنڈا جی؟" یہ پوچھتے ہی اُس کا گلا بھی بھر آیا۔

نایک رام کی سسکیاں فریاد و فغاں میں تبدیل ہو گئیں۔ صوفیا نے دوڑ کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا اور کانپتی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "کیا ہوا ہے؟" یہ کہتے کہتے فرطِ غم کی حالت میں شفاخانہ سے نکل پڑی اور پانڈے پور کی طرف چلی۔ نایک رام آگے آگے لالٹین دکھاتے ہوئے چلے۔ پانی نے جل تھل ایک کر دیا تھا۔ سڑک کے کنارے کے درخت جو اب پانی میں کھڑے تھے۔ سڑک کا پتہ دے رہے تھے۔ صوفیا کا رنج ایک ہی لمحہ میں پشیمانی کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ ہائے میں سنتیاناس ہوں۔ کیوں آسمان سے بجلی گر کر مجھے جلا نہیں دیتی؟ کیوں کوئی سانپ زمین سے نکل کر مجھے ڈس نہیں لیتا؟ کیوں زمین پھٹ کر مجھے نگل نہیں جاتی؟ ہائے آج میں وہاں نہ گئی ہوتی تو وہ ہرگز نہ جاتے۔ میں کیا جانتی تھی کہ مقدر مجھے تباہی و بربادی کی طرف لئے جاتا ہے۔ میں دل میں اُن پر جھنجھلا رہی تھی۔ مجھے یہ شک بھی ہو رہا تھا کہ یہ ڈرتے ہیں۔ آہ یہ سب میرے کارن ہُوا۔ میں ہی اپنی بربادی کا سبب ہوں۔ میں اپنے ہی ہاتھوں لُٹ گئی۔ ہائے میں اُن کی محبت کے معیار کو نہ پہنچ سکی۔"

پھر اُس کے دل میں خیال آیا کہیں یہ خبر غلط نہ ہو۔ اُنہیں صرف چوٹ لگی ہو اور وہ بیہوش ہو گئے ہوں۔ آہ۔ کاش میں ایک بار اُن کی باتوں سے اپنے دل کو پاک بنا لیتی۔ نہیں نہیں وہ زندہ ہیں۔ ایشور مجھ پر اتنا ظلم نہیں کر سکتے۔ میں نے کبھی کسی مخلوق کو ایذا نہیں پہنچائی۔ میں کبھی بد اعتقاد نہیں ہوئی۔ پھر وہ مجھے اتنی سخت سزا کیوں دے گا؟

جب صوفیا موقع راردات کے قریب پہنچی تو اُس پر ایک زبردست خوف کا غلبہ ہُوا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک میل کے پتھر پر بیٹھ گئی۔ وہاں کیسے جاؤں؟ کیسے اُنہیں دیکھوں گی؟ ان کی موت کا نقشہ اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اُن کی لاش خاک و خون میں لپٹی ہوئی زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ اُسے اُس نے گویا جیتے جاگتے دیکھا تھا۔ اُسے اس بُری حالت میں وہ کیسے دیکھے گی؟ اُسے اِس وقت زبردست خواہش ہوئی کہ وہاں جاتے ہی میں بھی اُن کے قدموں پر گر کر جان دے دوں۔ اب دنیا میں میرے لئے کون سا آرام ہے۔ ہائے یہ صبر آزما جدائی کیسے برداشت ہوگی؟ میں نے اپنی زندگی کو تباہ کر دیا۔ ایسے اعلیٰ آدمی کو مذہب کی وحشیانہ نمونہ پر قربان کر دیا۔

اگرچہ وہ جانتی تھی کہ دنے کا انتقال ہو گیا۔ پھر بھی اُسے ایک چھوٹی اُمید ہو رہی تھی۔ کہ کون جانے اُنہیں صرف غش آ گیا ہو۔ دفعتاً اُسے اپنے عقب سے ایک موٹر کار پانی کو چیرتے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ اُس کی تیز روشنی میں پھٹا ہُوا پانی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دونوں طرف سے آبی جانور اُس پر حملہ کر رہے ہوں۔ وہ نزدیک آ کر رُکا۔ رانی جانھوی تھیں۔ صوفیا کو دیکھ کر بولیں۔ بیٹی۔ تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ آؤ میرے ساتھ چلو۔ کیا گاڑی نہ لی؟

صوفیا چیخ مار کر رانی سے لپٹ گئی مگر اُن کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے اور نہ چہرہ پر آثار غم۔ اُن کی آنکھوں میں غرور کا نشہ چھا رہا تھا اور چہرہ پر فاتحانہ مسرت کی نمود تھی۔ صوفیا کو گلے سے لگاتی ہوئی بولیں۔ کیوں روتی ہو بیٹی؟ رونے کے لئے؟ بہادروں کی موت پہ آنسو نہیں بہائے جاتے۔ خوشی کا راگ گایا جاتا ہے۔ میرے پاس میرے جوہر موت ہوتے تو اُس کی لاش پر لٹا دیتی۔ مجھے اُس کے مرنے کا غم نہیں ہے۔ غم ہوتا اگر وہ آج جان بچا کر بھاگتا۔ وہ تو میری دیرینہ خواہش تھی۔ نہایت دیرینہ۔ جب میں نوجوان تھی اور بہادر راجپوتوں اور راجپوتنیوں کی قربانی کی داستانیں پڑھا کرتی تھی۔ اُسی وقت میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ ایشور مجھے کوئی ایسا ہی سیوگ دیتا جو انہیں جانبازوں کی طرح موت سے کھیلتا۔ جو اپنی زندگی کو

ملک و قوم کی خدمت میں قربان کر دیتا۔ جو اپنے خاندان کا نام روشن کرتا۔ میری وہ خواہش پوری ہو گئی۔ آج میں ایک جانباز بیٹے کی ماں ہوں۔ کیوں روتی ہو؟ اس سے اُس کی روح کو تکلیف ہو گی۔ تم نے تو مذہبی کتابیں پڑھی ہیں۔ انسان کبھی مرتا ہے؟ روح تو غیر فانی ہے۔ اُسے تو لیفٹیننٹ بھی فنا نہیں کر سکتا۔ موت تو صرف نئی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ ایک بلند تر زندگی کا راستہ۔ وہ پھر دنیا میں آئے گا۔ وہ اور زیادہ نیک نام ہو گا۔ جس موت پر گھر والے روئیں۔ وہ بھی کوئی موت ہے۔ وہ تو ایڑیاں رگڑنا ہے۔ شاندار موت وہی ہے جس پر بیگانے روئیں اور یگانے خوشی منائیں شاندار موت شاندار زندگی سے کہیں بہتر ہے۔ شاندار زندگی میں بدنام ہو کر مرنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ شاندار موت میں یہ اندیشہ کہاں؟ کوئی زندگی شاندار نہیں ہے جب تک کہ اُس کا انجام بھی ویسا ہی نہ ہو۔ یہ تو وہ پہنچ گئے۔ کتنے زور کی بارش ہے۔ کیسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ پھر بھی ہزاروں آدمی اُس کی لاش پر آنسو بہا رہے ہیں۔ کیا یہ رونے کا مقام ہے؟

موتی کا صوفیا اور چاندنی کو دیکھ کر لوگ اِدھر اُدھر ہٹ گئے۔ اندو دوڑ کر ماں سے لپٹ گئی۔ ہزاروں آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ رانی نے دنے کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ اُسے سینہ سے لگایا۔ اُس کا بوسہ لیا اور ماتمی مجمع کی طرف فخر آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ یہ نوجوان جس نے دنے پر اپنی جان نچھاور کر دی۔ دنے سے بڑھ کر ہے۔ کیا کہا؟ مسلمان ہے! فرض کے دائرہ میں ہندو مسلمان کا فرق نہیں۔ دونوں ایک ہی کشتی پر سوار ہیں۔ ڈوبیں گے تو دونوں۔ بچیں گے تو دونوں۔ بیں اس بہادر شخص کا یہیں مزار بنواؤں گی۔ شہید کے مزار کو کون کھود کر پھینک دے گا؟ کون اتنا سفلہ اور کمینہ ہو گا؟ یہ سچا شہید تھا۔ تم لوگ کیوں روتے ہو؟ دنے کے لئے۔ تم لوگوں میں کتنے ہی نوجوان ہیں کتنے ہی بال بچوں والے ہیں۔ نوجوانوں سے بیں کہوں گی۔ جاؤ اور دنے کی طرح قربان ہونا سیکھو۔ دنیا صرف پیٹ پالنے کی جگہ نہیں ہے۔ ملک کی بہبودیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ تمہیں اس کا بیڑا پار لگانا ہے۔ گرہستی کے

جال میں نہ پھنسو۔ جب تک مُنک کا کچھ کام نہ کر لو۔ دیکھو رونے کیا ہنس رہا ہے۔ جب بچہ تھا اُس وقت کی یاد آتی ہے۔ اسی طرح ہنستا تھا۔ کبھی اُسے روتے نہیں دیکھا۔ کتنی عجیب ہنسی ہے۔ کیا اُس نے دولت کے لئے جان دی؟ دولت اس کے گھر میں بھری ہوئی تھی۔ اُس کی طرف کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ برسوں ہو گئے پلنگ پر نہیں سویا۔ جوتے نہیں پہنے۔ پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا۔ ذرا دیکھو اُس کے پیروں میں کیسے گھٹنے پڑ گئے ہیں۔ وہ سادھو تھا۔ تم لوگ بھی ایسے ہی سادھو بن جاؤ۔" ہاں بچے والوں سے میری التجا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کو چکی کا بیل نہ بناؤ۔ خانہ داری کا غلام نہ بناؤ۔ ایسی تعلیم دو کہ زندہ رہیں۔ زندگی کے غلام بن کر نہیں بلکہ زندگی کے مالک بن کر۔ یہی تعلیم ہے جو اس سرفروش نے تمہیں دی ہے۔ جانتے ہو۔ اس کی شادی ہونے والی تھی۔ یہی پیاری لڑکی میری بہو بننے والی تھی۔ کسی نے ایسا دلکش حُسن۔ ایسا روحانی جلوہ دیکھا ہے؟ رانیاں اُس کے آگے پانی بھریں۔ علم میں اُس کے سامنے کوئی پنڈت منہ نہیں کھول سکتا۔ زبان پر سرسوتی ہے۔ گھر کا اُجالا ہے۔ دے کو اس سے کتنی محبت تھی یہ اسی سے پوچھو۔ لیکن کیا ہوا؟ جب موقع آیا تو اُس نے محبت کے رشتہ کو کچے دھاگے کی طرح توڑ دیا۔ اُسے اپنی توہین کا ذریعہ نہیں بنایا۔ اُس پر اپنے مقصد کو قربان نہیں کیا۔ پیارو۔ پیٹ پر اپنی جوانی کو اپنی روح کو اپنی اُمنگوں کو نہ قربان کرو۔ اندو بیٹی کیوں رو رہی ہو؟ کس کو ایسا بھائی ملا ہے؟

اندو کے دل میں بڑی دیر سے آگ سی جل رہی تھی۔ وہ ان سارے دُکھوں کا اصلی سبب اپنے شوہر کو سمجھتی تھی۔ اب تک آگ دل میں تھی۔ اب باہر نکل پڑی۔ یہ خیال نہ رہا کہ میں اتنے آدمیوں کے سامنے کیا کہتی ہوں۔ جوالا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بولی۔ "ماتا جی۔ اس خون کا الزام میرے سر ہے۔ میں اب اُس شخص کا منہ نہ دیکھوں گی جس نے میرے دلاور بھائی کی جان لے کر چھوڑی اور یہ صرف اپنی خود غرضی کو پورا کرنے کے لئے۔

رانی جاہنوی نے تیز لہجہ میں کہا۔ کیا مہیندر کو کہتی ہے؟ اگر پھر میرے سامنے

منہ سے ایسی بات نکالی تو تیرا گلا گھونٹ دوں گی۔ کیا تو انہیں اپنا غلام بنا کر رکھے گی؟ تو عورت ہو کر چاہتی ہے کہ کوئی تیرا ہاتھ نہ پکڑے تو وہ مرد ہو کر کیوں نہ ایسا چاہیں؟ وہ دُنیا کو کیوں تیری ہی آنکھوں سے دیکھیں؟ کیا بھگوان نے انہیں آنکھیں نہیں دیں؟ اپنے نفع و نقصان کا حساب دار تجھے کیوں بنائیں؟ کیا بھگوان نے اُنہیں عقل نہیں دی؟ تیری سمجھ میں اور میری سمجھ میں اور یہاں جو لوگ ہیں اُن کی سمجھ میں وہی راستہ اچھا ہے۔ جس پر ہم چل رہے ہیں۔ مگر اُن کی سمجھ میں وہ راستہ خطرناک ہے۔ دریاؤں سے بھرا ہُوا ہے۔ اس کا بُرا مانتا کیا؟ اگر تجھے اُن کی باتیں پسند نہیں آتیں تو کوشش کر کہ پسند آئیں۔ وہ تیرے سوامی ہیں۔ تیرے لئے ان کی خدمت سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔

دس بج گئے تھے۔ لوگ کنور بھرت سنگھ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب دس کے گھنٹہ کی آواز کانوں میں آئی تو رانی جانھوی نے کہا۔ اُن کی راہ اب نہ دیکھو۔ وہ نہ آئیں گے اور نہ آسکتے ہیں۔ وہ اُن پاپیوں میں ہیں جو بیٹے کے لئے جیتے ہیں اور بیٹے کے لئے مرتے ہیں۔ اور بیٹے کے بیٹوں کے لئے منصوبے باندھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہوگا۔ تمام دنیا سُونی معلوم ہوتی ہوگی۔ بیہوش پڑے ہوں گے۔ ممکن ہے۔ مر بھی گئے ہوں۔ اُن کا مذہب اُن کا فرض اُن کی زندگی۔ اُن کی موت اُن کا دین۔ اُن کی دُنیا سبھی کا انحصار اسی اکلوتے بیٹے پر تھا۔ اب وہ بے سہارا ہیں۔ اُن کی زندگی کا کوئی مقصد کوئی معیار نہیں۔ وہ اب ہرگز نہ آئیں گے۔ آ ہی نہیں سکتے۔ چلو۔ دنے کے ساتھ اپنا آخری فرض پورا کر لوں۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے ہنڈولے میں جھلایا تھا۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے چتا پر رکھ دوں۔ انہیں ہاتھوں سے اُسے کھانا کھلاتی تھی۔ اُنہیں ہاتھوں سے اُسے گنگا جل پلا دوں۔

## (۴۴)

گنگا سے لوٹتے لوٹتے دن کے نو بج گئے۔ ہزاروں آدمیوں کا ہجوم۔ گلیاں تنگ اور کیچڑ سے بھری ہوئیں۔ قدم قدم پر پھولوں کی بارش۔ والنٹیروں کے

قومی گانے۔ گنگا تک پہنچتے ہی پہنچتے سویرا ہو گیا تھا۔ لوٹتے ہوئے جانھوی نے کہا۔ چلو ذرا سُور داس کو دیکھتے چلیں۔ نہ جانے مرا کہ بچا۔ سُنتی ہوں۔ زخم کاری تھا۔

صوفیا اور جانھوی دونوں شفاخانہ گئیں تو دیکھا کہ سُور داس برآمدہ میں چارپائی پر لیٹا ہُوا ہے۔ بھیرو اُس کے پائنتے کھڑا ہے۔ اور سُبھاگی سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔ جانھوی نے ڈاکٹر سے پوچھا اس کی حالت کیسی ہے؟ بچنے کی کوئی اُمید ہے

ڈاکٹر نے کہا۔ کسی دوسرے آدمی کو ایسا زخم لگا ہوتا تو اب تک مر چکا ہوتا۔ اُس کی قوتِ برداشت حیرت انگیز ہے۔ دوسروں کو انجکشن لگاتے وقت کلورو فارم دینا پڑتا ہے۔ اس کے کندھے میں دو انچ گہرا اور دو انچ چوڑا انجکشن دیا گیا پر اس نے کلورو فارم نہ لیا۔ گولی نکل آئی ہے۔ مگر بچ جائے۔ تو کہیں۔

صوفیا کو رات بھر کی سخت روحانی تکلیف نے اتنا گھلا دیا تھا کہ اُسے پہچاننا مشکل تھا۔ گویا کوئی پھول مُرجھا گیا ہو۔ چال سُست۔ چہرہ اُترا ہُوا۔ آنکھیں بھی پُتلیں گویا بادی دنیا میں نہیں بلکہ خیالی دنیا میں حرکت کر رہی ہے۔ آنکھوں کو جتنا رونا تھا رو چکی تھیں۔ اب اُس کا بال بال رو رہا تھا۔ اس نے سُور داس کے پاس جا کر کہا۔ سُور داس۔ کیسا جی ہے؟ رانی جانھوی آئی ہیں۔

سُور داس۔ دھینہ بھاگ۔ اچھا ہوں۔

جانھوی۔ درد بہت ہو رہا ہے؟ بہت تکلیف ہے؟

سُور داس۔ کچھ تکلیف نہیں ہے۔ کھیلتے کھیلتے گر پڑا ہوں۔ چوٹ آ گئی ہے۔ اچھا ہو جاؤں گا۔ اُدھر کیا ہُوا؟ جھونپڑی بچ گئی؟

صوفیا۔ ابھی تو نہیں گئی ہے۔ پر شاید اب نہ رہے۔ ہم لوگ تو دونے کو گنگا کی گود میں سونپے چلے آتے ہیں۔

سُور داس نے کمزور آواز میں کہا۔ بھگوان کی مرضی۔ بیروں کا یہی دھرم ہے۔ جو غریبوں کے لئے جان دیتا ہے وہی سچا بیر ہے۔

چانھوی۔ تم سادھو ہو۔ ایشور سے دُعا کرو کہ ونے کا پھر اسی دیش میں جنم ہو۔
سُورداس۔ ایسا ہی ہوگا ماتا جی ایسا ہی ہوگا۔ اب مہان پُرش (بڑے لوگ) ہمارے ہی دیس میں جنم لیں گے۔ جہاں انیائے اور ادھرم ہوتا ہے۔ وہیں دیوتا لوگ جاتے ہیں۔ اُن کے سنسکار انہیں کھینچ لے جاتے ہیں۔ میرا من کہہ رہا ہے۔ کہ کوئی مہاتما تھوڑے ہی دنوں میں اس دیس میں جنم لینے والے ہیں۔

ڈاکٹر نے آکر کہا۔ رانی جی میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ سے عرض کرتا ہوں کہ سُورداس سے باتیں نہ کریں۔ ورنہ زور پڑنے سے اُن کی حالت بگڑ جائے گی۔ ایسی حالت میں سب سے زیادہ خیال اس امر کا ہونا چاہئے کہ مریض کی طاقت زائل نہ ہو۔ اُسے ضعف نہ آنے پائے۔

شفا خانہ کے مریضوں کو جب یہ پتہ لگا کہ ونے سنگھ کی ماں آئی ہوئی ہیں تو سب ان کی زیارت کو جمع ہوگئے۔ کتنوں ہی نے اُن کے قدموں کی خاک ماتھے پر چڑھائی۔ یہ دیکھ کر رانی کا دل غرور سے پھول گیا۔ ہنستے ہوئے سبھوں کو دعائیں دے کر یہاں سے جانے لگیں تو صوفیا نے کہا۔ ماتا جی۔ آپ کی اجازت ہو تو میں یہیں رہ جاؤں۔ سورداس کی حالت خطرناک معلوم ہوتی ہے۔ اس کی باتوں میں وہ مجذوبیت ہے جو موت کی خبر دے رہی ہے۔ میں نے اسے ہوش میں ایسی باتیں کرتے کبھی نہیں سُنا۔

رانی نے صوفیا کو گلے لگا کر بخوشی اجازت دی۔ دراصل صوفیا سیوا بھون (ونے کا مکان) نہ جانا چاہتی تھی۔ وہاں کی ایک ایک چیز وہاں کے پھول پتے حتےٰ کہ وہاں کی ہوا بھی ونے کی یاد دلائے گی۔ جس گھر میں ونے کے ساتھ رہی اس میں ونے کے بغیر رہنے کا خیال ہی اُسے تڑپائے دیتا تھا۔

رانی کے چلے جانے پر صوفیا ایک مونڈھا لے کر سُورداس کی چارپائی کے پاس بیٹھ گئی۔ سُورداس کی آنکھیں بند تھیں مگر چہرہ پر ایک دلآویز سکون چھایا ہُوا تھا۔ صوفیا کو آج معلوم ہُوا کہ دل کا سکون ہی اصلی حُسن ہے۔

صوفیا کو وہاں بیٹھے بیٹھے سارا دن گذر گیا۔ وہ بے آب و دانہ اُداس بیٹھی ہوئی گزری ہوئی خوشی کی باتوں کا خواب دیکھ رہی تھی اور جب آنکھیں بھر جاتی تھیں تو اُٹھ کر جا کر رومال سے آنسو پونچھ آتی تھی۔ اُسے اب سب سے زیادہ رنج اس بات کا تھا۔ کہ میں نے دنے کی کوئی آرزو نہ پوری کی۔ اُنہیں ہمیشہ خرچ ہی رکھا۔ اُن کی محبت کی یاد اس کے دل کو ایسا مسوس رہی تھی کہ وہ بہت ہی مضطرب و بیقرار تھی۔

شام ہو گئی تھی۔ صوفیا لیمپ کے سامنے بیٹھی ہوئی سُور داس کو خداوند یسوع کے سوانحی حالات سُنا رہی تھی۔ سُور داس ایسا محو ہو رہا تھا گویا اُسے کوئی تعلیم نہیں ہے دفعتاً راجہ مہیندر کمار آکر کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے صوفیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ صوفیا حیران کی سی بیٹھی رہی۔ اُس نے راجہ صاحب سے ہاتھ نہ ملایا۔

سُور داس۔ کون ہے۔ مس صاحب؟

صوفیا۔ راجہ مہیندر کمار ہیں۔

سُور داس نے تعظیماً اُٹھنا چاہا مگر صوفیا نے بٹھا دیا اور کہا۔ ہلو مت ورنہ زخم کھل جائے گا۔ آرام سے پڑے رہو۔

سُور داس۔ راجہ صاحب آئے ہیں۔ اُن کا سواگت بھی نہ کروں؟ میرے ایسے بھاگ تو ہوئے۔ کچھ بیٹھنے کو ہے؟

صوفیا۔ ہاں کرسی پر بیٹھ گئے ہیں۔

راجہ صاحب نے پوچھا۔ سُور داس۔ کیسا جی ہے؟

سُور داس۔ بھگوان کی دیا ہے۔

راجہ صاحب جن باتوں کو ظاہر کرنے یہاں آئے تھے اُنہیں صوفیا کے سامنے زبان پر لاتے ہوئے شرماتے تھے۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ آخر بولے۔ سُور داس۔ میں تم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے آیا ہوں۔ اگر میرے بس کی بات ہوتی تو آج اپنی زندگی کو تمہاری زندگی سے بدل لیتا۔

سُور داس۔ سرکار ایسی بات نہ کہئے۔ آپ راجا ہیں۔ میں بھکاری ہوں۔

آپ نے جو کچھ کیا۔ دوسروں کی بھلائی کے بچار سے کیا۔ میں نے جو کچھ کیا اپنا دھرم سمجھ کر کیا۔ میرے کارن آپ کو اپجس ملا۔ کتنے گھر ناس ہوئے یہاں تک کہ اندر دت اور کنور وے سنگھ جیسے دو انمول رتن ہاتھ سے کھو گئے۔ پر اپنا کیا بس ہے۔ ہم تو کھیل کھیلتے ہیں۔ جیت ہار بھگوان کے ہاتھ ہے۔ وہ جیسا ٹھیک سمجھتے ہیں کرتے ہیں۔ بس اپنی نیت ٹھیک ہونی چاہیئے۔

راجہ۔ سورداس۔ نیت کو کون دیکھتا ہے۔ میں نے ہمیشہ لوگوں کی بھلائی پر ہی نگاہ رکھی پر آج تمام شہر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں ہے جو مجھے کمینہ خود غرض۔ بے ایمان اور گناہگار نہ سمجھتا ہو۔ اور تو کیا۔ میری بیوی بھی مجھ سے نفرت کر رہی ہے۔ ایسی باتوں سے دل کیوں نہ اداس ہو جائے؟ کیوں نہ دنیا سے نفرت ہو جائے؟ میں تو اب کہیں منہ دکھلانے لائق نہیں رہا۔

سورداس۔ اس کی چنتا (فکر) نہ کیجئے۔ پھائدہ۔ نکسان۔ جینا مرنا۔ نیکنامی بدنامی سب تکدیر کے ہاتھ ہے۔ ہم تو کھالی میدان میں کھیلنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ سبھی کھلاڑی من لگا کر کھیلتے ہیں

سبھی چاہتے ہیں کہ ہماری جیت ہو۔ پر جیت تو ایک ہی کی ہوتی ہے۔ تو کیا (۳) سے ہارنے والے ہمت ہار جاتے ہیں؟ وہ پھر کھیلتے ہیں۔ پھر ہارتے ہیں تو پھر کھیلتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی تو ان کی جیت ہونی ہی ہے۔ جو آج آپ کو برا سمجھ رہے ہیں وہی کل آپ کے سامنے سر جھکائیں گے۔ ہاں نیت ٹھیک رہنی چاہیئے۔ مجھ کیا ان کے گھر والے برا نہ کہتے ہوں گے جو میرے کارن جان سے گئے؟ اندر دت اور کنور وے سنگھ جیسے دو لعل جن کے ہاتھوں سنسار کا کتنا اپکار (بھلائی) ہونا سنسار سے اٹھ گئے۔ جس کا جیون نیکنامی بدنامی بھگوان کے ہاتھ ہے۔ ہمارا یہاں کیا بس ہے؟

راجہ۔ آہ سورداس۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں کتنی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ تمہیں برا کہنے والے اگر دس پانچ ہوں گے تو تمہارا جس گانے والے بہت

ہیں۔ یہاں تک کہ حکام بھی تمہارے صبر، تمہاری مضبوطی کی تعریف کر رہے ہیں میں تو دونوں طرف سے گیا۔ رعایا اور سرکار دونوں سے باغی ہُوا۔ حکّام اس ساری گڑبڑ کا الزام میرے سر تھوپ رہے ہیں۔ اُن کی سمجھ میں بھی میں نالائق۔ کوتاہ اندیش اور خود غرض ہوں۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔

سُورداس نہیں نہیں۔ راجہ صاحب۔ نراس ہونا کھلاڑیوں کا دھرم نہیں ہے۔ اب کے ہار ہوئی تو پھر کبھی جیت ہوگی۔

راجہ۔ مجھ کو یقین نہیں ہوتا کہ پھر کبھی میری عزت ہوگی مس سلوک۔ آپ میری کمزوری پر ہنس رہی ہوں گی۔ پر میں بہت ہی دُکھی ہوں۔

صوفیا نے بے اعتباری کے لہجہ میں کہا۔ عوام کے مزاج میں عفو کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اگر اب بھی آپ عوام کو یہ دکھا سکیں کہ اس حادثہ پر آپ کو دلی افسوس ہے تو شاید وہ آپ کی پھر عزت کرنے لگیں۔

راجہ نے ابھی کچھ جواب نہ دیا تھا کہ سُورداس بول اٹھا۔ سرکار نیکنامی اور بدنامی بہت سے لوگوں کے ناچنے گانے سے نہیں ہوتی۔ سچی نیکنامی اپنے مَن میں ہوتی ہے۔ اگر اپنا مَن بولے کہ میں نے جو کچھ کیا وہی مجھے کرنا چاہئے تھا۔ اس کے سوا کچھ اور کرنا مجھے اُچت (مناسب) نہ تھا تو وہی نیکنامی ہے۔ اگر آپ کو اس ہار کا بڑا دکھ ہے تو آپ کا دھرم کہ لاٹ صاحب سے اُس کی لکھا پڑھی کریں۔ وہ نہ سُنیں تو جو اُن سے بڑا حاکم ہو اُس سے کہیں اور جب تک سرکار پرجا کے ساتھ نیائے نہ کرے دم نہ لیں۔ لیکن اگر آپ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے کیا وہی آپ کا دھرم تھا۔ اپنے سوارتھ کے لئے آپ نے کوئی بات نہیں کی۔ تو آپ کو تنک بھی دُکھ نہ کرنا چاہیئے۔

صوفیا نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ سرکار کے طرفداروں کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اُن میں خود غرضی کا شائبہ نہیں ہے۔

راجہ۔ مس سیوک۔ میں آپ کو عہد قدیم سے یقین دلاتا ہوں کہ میں نے حکام کے ہاتھوں عزت و وقار پانے کے لئے اُن کی طرفداری نہیں کی اور عہدہ کا لالچ تو مجھے کبھی نہیں رہا۔ میں خود نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی بات تھی جس نے مجھے سروے کی طرف کھینچا۔ ممکن ہے نقصان کا خوف ہو یا صرف خوشامد۔ پر میری کوئی غرض نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ میں نے اُس جماعت کی نکتہ چینیوں اُس کے پوشیدہ حملوں یا اُس کی طعنہ زنیوں سے ڈر کر ایسا کیا ہو۔ میں خود ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال تھا کہ سرکار سے موافقت رکھ کر رعایا کی جتنی بھلائی کر سکتا ہوں۔ اتنی سرکار سے مخالفت رکھ کر نہیں کر سکتا۔ مگر آج معلوم ہوا کہ وہاں بھلائی ہونے کی جتنی اُمید ہے اُس سے کہیں زیادہ خوف بُرائی ہونے کا ہے۔ عزت و نیکنامی کا راستہ وہی ہے جسے سُورداس نے اختیار کیا۔ سُورداس دُعا کرو کہ ایشور مجھے ٹھیک راستہ پر چلنے کی سکت دیں۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ سُورداس نیند میں غافل تھا۔ اتنی باتیں کرنے سے وہ تھک گیا تھا۔ سجھاگی ایک ٹاٹ کا ٹکڑا لئے ہوئے آئی اور سُورداس کے پاس بچھا کر پڑ رہی۔ شفاخانہ کے ملازمین چلے گئے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

صوفیا گاڑی کا انتظار کر رہی تھی ـــــ دس بجے ہوں گے۔ رانی جی شاید گاڑی بھیجنا بھول گئیں۔ انہوں نے شاہ ہی کو گاڑی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کیسے جاؤں؟ کیا ہرج ہے۔ یہیں بیٹھی رہوں؟ وہاں رونے کے سوا اور کیا کروں گی! آہ میں نے ونے کو تباہ کر دیا۔ میرے ہی سبب سے وہ دوبار فرض کے راستہ سے منحرف ہوئے۔ میرے ہی سبب سے بالآخر آج اُن کی جان پر بنی! اب اُس منحوس مورت کو دیکھنے کو ترس جاؤں گی۔ میں جانتی ہوں کہ ہم پھر ملیں گے۔ پر نہیں جانتی کہ کب؟

اُسے وہ دن یاد آ گئے۔ جب جھیلوں کے گاؤں میں اس وقت وہ دروازہ پر بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کیا کرتی تھی اور وہ کمبل اُڑھے ننگے سر ننگے پیر

ہاتھ میں ایک لکڑی لیے آتے تھے۔ اور مسکرا کر پوچھتے تھے کہ مجھے دیر تو نہیں ہوگئی؟ وہ دن یاد آیا جب راجپوتانہ جاتے وقت دنے نے اُس کی طرف بیقرار اور حالوس نگاہوں سے دیکھا تھا۔ آہ وہ دن یاد آیا جب اُس کی طرف دیکھنے پر رانی جی نے انہیں تیز نگاہوں سے دیکھا تھا اور وہ سر جھکائے باہر چلے گئے تھے۔ صوفیا رنج سے بے چین ہوگئی جیسے ہوا کے جھونکے زمین پر پڑی ہوئی گرد کو اوپر اٹھا دیتے ہیں اسی طرح اس خاموش رات نے اُس کی یاد کو تازہ کر دیا۔ اس کا دل ہی سراپا یاد بن گیا۔ وہ بیقرار ہو کر کرسی سے اٹھی اور ٹہلنے لگی۔ جی نہ جانے کیا چاہتا تھا۔ لہیں اُڑ جاؤں۔ مر جاؤں۔ کمبخت دل کو کہاں تک سمجھاؤں؟ کہاں تک صبر کروں؟ اب نہ سمجھاؤں گی۔ روؤں گی۔ تڑپوں گی۔ خوب جی بھر کر! وہ مجھ پر جان چھڑکا کرتا تھا۔ دنیا سے اُٹھ چلے اور میں اپنے کو سمجھاؤں کہ اب رونے سے کیا ہوگا! میں روؤں گی۔ اتنا روؤں گی کہ آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ دل خون ہو کر آنکھوں کے راستہ نکلے گا اور گلا بیٹھ جائے گا۔ آنکھوں کو اب کرنا ہی کیا ہے؟ وہ اب کسے دیکھ کر خوش ہوں گی۔ دل بھی اب متحرک ہو کر کیا کرے گا۔

اتنے میں کسی کی آہٹ سُنائی دی۔ مٹھوا اور بھیرو برآمدہ میں آئے۔ مٹھوا نے صوفیا کو سلام کیا اور سُور داس کی چارپائی کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا۔ سُور داس نے چونک کر پوچھا۔ کون ہے بھیرو؟

مٹھوا۔ دادا میں ہوں۔

سُور داس۔ بہت اچھے آئے بیٹا تم سے بھینٹ ہوگئی۔ اتنی دیر کیوں ہوئی؟

مٹھوا۔ کیا کروں دادا؟ بڑے بابو سے سانجھ سے چھٹی مانگ رہا تھا۔ مگر ایک نہ ایک کام لگا دیتے تھے۔ ڈاؤن نمبر تھری کو نکالا۔ اب نمبر ون کو نکالا۔ پھر پارسل گاڑی آئی تو اُس پر مال لدوایا۔ ڈاؤن نمبر ٹھنی کو نکال کر تب آیا ہوں اس سے تو کلی تھا تبھی اچھا تھا کہ جب جی چاہتا تھا جاتا تھا۔ کوئی روکنے والا نہ تھا۔ نہیں تو اب نہانے کھانے کی چھٹی نہیں ملتی۔ بابو لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے

رہتے ہیں کسی کو نوکر رکھنے کی سمائی تو ہے۔ نہیں سیدھے میت پر کام نکالتے ہیں۔

سُورداس۔ میں نہ بُلاتا تو تم اب بھی نہ آتے۔ اتنا بھی نہیں سوچتے۔ کہ اندھا آدمی ہے نہ جانے کیسے ہوگا۔ چل کر ذرا حال چال پوچھتا آؤں۔ تم کو اس لئے بُلایا ہے کہ مر جاؤں تو میرا کریا کرم کرنا۔ اپنے ہاتھوں سے پنڈا دینا۔ برادری کو بھوج دینا اور ہو سکے تو گیا کر آنا۔ بولو۔ اتنا کرو گے؟

بھیرو۔ بھیا تم اُس کی چنتا نہ کرو۔ تمہارا کریا کرم اتنی دھوم سے ہوگا کہ برادری میں کبھی کسی کا نہ ہوگا۔

سُورداس۔ دھوم دھام سے کام تو ہوگا پر مجھے پہنچے گا۔ تو وہی جو مٹھوا دے گا۔

مٹھوا۔ دادا۔ میری ننگا جھوری لے لو۔ جو میرے پاس دھیلا بھی ہو کھاتے بھر کو تو ہوتا ہی نہیں۔ بچے گا کیا؟

سُورداس۔ ارے تو کیا تم میرا کریا کرم بھی نہ کرو گے؟

مٹھوا۔ کیسے کروں گا۔ دادا؟ کچھ پلے پاس ہو تب نا۔

سُورداس۔ تو تم نے یہ آسا بھی توڑ دی۔ میرے بھاگ میں تمہاری کمائی نہ جیتے جی بدی تھی نہ مرنے کے پیچھے۔

مٹھوا۔ دادا۔ اب منہ نہ کھلواؤ۔ پردہ ڈھکا رہنے دو۔ مجھے جو پٹ کر کے مرے جاتے ہو۔ اس پر کہتے ہو۔ میرا کریا کرم کر دینا۔ گیا پراگ کر دینا۔ ہماری دس بیگھے موروثی جمین تھی کہ نہیں؟ اُس کا ماہوار دو پیسے چار پیسے کچھ تم کو ملا کہ نہیں؟ اُس میں سے میرے ہاتھ کیا لگا؟ گھر میں بھی میرا کچھ حصہ ہوتا ہے یا نہیں۔ حاکموں سے بیر نہ ٹھانتے تو اُس گھر کے سَو سے کم نہ ملتے۔ پنڈا جی نے کیسے پانچ ہجار مار لئے؟ ہے اُن کا گھر پانچ ہجار کا؟ دروازے پر میرے ہاتھوں کے لگائے دو نیم کے پیڑ تھے۔ کیا وہ پانچ پانچ روپے میں بھی مہنگے تھے؟ مجھے تو تم نے ملیا میٹ کر دیا۔ کہیں کا نہ رکھا۔ دنیا بھر کے لئے اچھے ہو گئے۔ میری گردن پر

تو تم نے چھری پھیر دی۔ مجھے تو حلال کر ڈالا۔ مجھے بھی تو ابھی بیاہ لگائی کرنی ہے۔ گھر دُوار بنوانا ہے۔ کریا کرم کرنے بیٹھوں تو اُس کے لیے کہاں سے روپے لاؤں؟ کمائی میں تمہارے سک نہیں۔ مگر کچھ اڑایا۔ کچھ جلایا۔ اب مجھے بنا چھانہ کے چھوڑے چلے جاتے ہو۔ بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں۔ اب تک میں چپ تھا۔ نابالک تھا۔ اب تو میرے بھی ہاتھ پاؤں ہوئے۔ دیکھتا ہوں۔ کہ میری جمین کا مادیہ کیسے نہیں ملتا! صاحب لکھ پتی ہوں گے تو اپنے گھر کے ہونگے میرا حصہ کیسے دبالیں گے؟ گھر میں بھی میرا حصہ ہوتا ہے (جھانک کر) مس صاحب پھاٹک پر کھڑی ہیں۔ گھر کیوں نہیں جاتیں؟ اور سُن ہی لیں گی تو مجھے کیا ڈر؟ صاحب نے سدھے سے دیا تو دیا نہیں تو پھر میرے من میں بھی جو آئے گا وہ کروں گا۔ ایک سے دو جان تو ہوں گی نہیں مگر ہاں انہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ کسی کا حق چھین لینا دل لگی نہیں ہے۔

سُورداس بھوچکا سا رہ گیا۔ اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ منھو کے منہ سے مجھے ایسی سخت باتیں سُننی پڑیں گی۔ اُسے بے انتہا رنج ہوا خصوصاً اس لئے کہ یہ باتیں اُس وقت کہی گئیں جب وہ سکون اور ہمدردی کا خواستگار اور مستحق تھا۔ جب اُسے خواہش تھی کہ میرے عزیز و اقارب میرے پاس بیٹھے ہوئے میری تکالیف کے متعلق کی تدبیریں کرتے ہوتے۔ یہی وقت ہے جب انسان کو اپنی بڑائی سننے کی خواہش ہوتی ہے۔ جب اُس کا کمزور دل بچوں کی طرح گود میں بیٹھنے کے لئے پیار کے لئے خاطر داری کے لئے خدمت کے لئے چیخیں ہوتا ہے۔ جسے اُس نے بچپن سے بیٹے کی طرح پالا۔ جس کے لئے اُس نے نہ جانے کیا کیا تکلیفیں سہیں۔ وہ آخر وقت اگر اُس سے اپنا حصہ کا دعوے کر رہا تھا۔ اسے اپنا حق جتا رہا تھا۔ سُورداس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بولا۔ بیٹا۔ میری بھول تھی کہ تم سے کریا کرم کرنے کو کہا تم کچھ مت کرنا۔ چاہے میں پنڈا اور جل کے بنا رہ جاؤں پر یہ اُس سے

نہیں اچھا ہے کہ تم صاحب سے اپنا ماوجہ مانگو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تم اپنا کانون جان گئے ہو۔ نہیں تو پیسہ پیسہ کا حساب لکھتا جاتا۔

مٹھوا۔ میں اپنے ماوجے کا دعوئے ضرور کروں گا۔ چاہے صاحب دیں۔ چاہے سرکار دے۔ چاہے کالاچور دے۔ مجھے تو اپنے روپے سے کام ہے۔

سُوردا س۔ ہاں سرکار ہی دے دے، پر صاحب سے کوئی مطلب نہیں۔

مٹھوا۔ میں تو صاحب سے لوں گا۔ وہ چاہے جس سے دلائیں۔ نہ دلائیں گے تو جو کچھ مجھ سے ہو سکے گا وہ کروں گا۔ صاحب کچھ لاٹ تو ہیں نہیں۔ میری جائیداد نہیں ہجم نہ ہونے پائے گی۔ تم کو اُس کا کیا کلک تھا۔ سوچا ہوگا کہ کون میرے بیٹی بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ چپکے سے بیٹھ رہے۔ میں چپکا بیٹھنے والا نہیں ہوں۔

سُوردا س۔ مٹھوا کیوں میرا دل دُکھاتے ہو؟ اس جمین کے لئے میں نے کون سی بات اُٹھا رکھی؟ گھر کے لئے تو جان دے دی! اب اور میرے کئے کیا ہو سکتا تھا؟ لیکن بھلا بتاؤ تو کہ تم صاحب سے کیسے روپے لے لوگے؟ عدالت میں تو تم اُن سے لے نہیں سکتے۔ وہ روپے والے ہیں اور عدالت روپے والوں کی ہے۔ ہاریں گے بھی تو تمہیں بگاڑ دیں گے۔ پھر تمہاری جمین سرکار نے جا پٹے سے لی ہے۔ تمہارا دعوئے صاحب پر چلے گا کیسے؟

مٹھوا۔ یہ سب پڑھے بیٹھا ہوں۔ لگا دوں آگ۔ سارا گودام جل کر راکھ ہو جائے گا (آہستہ سے) بم گولہ بنانا جانتا ہوں۔ ایک گولہ رکھ دوں گا تو پتلی گھر سوا ہو جائے گا۔ میرا کوئی کیا کرے گا؟

سُوردا س۔ بھیرو۔ سُنتے ہو اس کی باتیں۔ جرا تمہیں سمجھاؤ۔

بھیرو۔ میں تو راستہ بھر سمجھاتا آرہا ہوں۔ سُنتا ہی نہیں۔

سُوردا س۔ تو پھر میں صاحب سے کہہ دوں گا کہ اس سے ہوشیار رہیں۔

مٹھوا۔ تم کو گئو مارنے کی ہتیا لگے جو تم صاحب یا کسی اور سے اس بات کی چرچا تک کرو۔ اگر میں پکڑا گیا تو تمہیں کو اُس کا پاپ لگے گا۔ جیتے جی میرا بُرا

چیتا اب مرنے پر بھی میرے لئے کانٹے بونا چاہتے ہو۔ تمہارا تو منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔
یہ کہہ کر مٹھو اغصہ سے بھرا ہُوا چلا گیا۔ بھیرو روکتا ہی رہا پر اس نے نہ مانا۔
سُورداس آدھ گھنٹہ تک غشی کی سی حالت میں پڑا رہا۔ یہ صدمہ گولی کے زخم سے بھی زیادہ مہلک تھا۔ مٹھو کی بدمعاشی اُس کے انجام کا خوف۔ اپنی ذمہ داری۔ صاحب کو آگاہ کر دینے کا فرض۔ یہ پہاڑ سی قسم۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ چاروں طرف سے بندھا ہُوا تھا۔ ابھی اسی شش و پنج میں پڑا ہُوا تھا کہ مسٹر جان سیوک آئے۔ صوفیا بھی پھاٹک سے اُن کے ساتھ چلی۔ صوفیا نے دور ہی سے کہا۔ سُورداس۔ پاپا تم سے ملنے آئے ہیں۔ اصل میں تو مسٹر سیوک سُورداس سے ملنے نہیں آئے تھے بلکہ صوفیا سے ماتم پُرسی کا فرض ادا کرنے آئے تھے۔ دن بھر فرصت نہ ملی۔ رات سے نو بجے چلے تو یاد آئی۔ سیوا بھون گئے۔ وہاں معلوم ہُوا کہ صوفیا ہسپتال میں ہے۔ گاڑی اس طرف پھیر دی۔ صوفیا رانی صاحبہ کی گاڑی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے گمان بھی نہ تھا کہ پاپا آتے ہوں گے۔ انہیں دیکھ کر رونے لگی۔ پاپا مجھے چاہتے ہیں۔ اس کا مجھے ہمیشہ یقین رہا۔ واقعی سچی بھی یہی بات۔ مسٹر سیوک کو ہمیشہ صوفیا کی یاد آتی رہتی تھی۔ کاروبار میں بیحد مصروف رہنے پر بھی وہ صوفیا کی طرف سے بالکل بیفکر نہ تھے۔ البتہ اپنی بیوی سے مجبور تھے۔ جس کا اُن پر قابو تھا۔ صوفیا کو روتے دیکھ کر انہیں ترس آگیا۔ اُسے گلے سے لگا لیا اور اس کی دلجوئی کرنے لگے۔ انہیں بار بار اس کارخانہ کو کھولنے پر افسوس ہوتا تھا جو کسی موذی مرض کی طرح اُن کے گلے پڑ گیا۔ اس کے سبب خاندانی امن میں خلل واقع نہ ہُوا۔ سارا کُنبہ پارہ پارہ ہو گیا۔ تمام شہر میں بدنامی ہوئی۔ ساری عزت مٹی میں مل گئی۔ گھر سے ہزاروں روپے خرچ ہو گئے۔ اور ابھی تک منافع کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اب مستری اور مزدور بھی کام چھوڑ چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ اُدھر شہر اور صوبہ میں اس کارخانہ کے خلاف تحریک جاری ہو رہی تھی۔ پربھو سیوک کا ترکِ سکونت چراغ بن کر

اُن کے دل کو جلا رہا تھا۔ نہ جانے خدا کو کیا منظور تھا۔
مسٹر سیوک کو ئی نصف گھنٹہ تک صوفیا کو اپنی مُصیبت کی داستان سُناتے رہے۔ آخر میں بولے۔ صوفیا تمہاری ماما کو یہ رشتہ پسند نہ تھا۔ مگر مجھے تو کوئی اعتراض نہ تھا۔ کنور دنے سنگھ جیسا بیٹا یا داماد پاکر ایسا کون ہے جو اپنے کو خوش نصیب نہیں سمجھتا؟ مذہبی اختلاف کی مجھے ذرا بھی پرواہ نہ تھی۔ مذہب ہماری حفاظت اور بہتری کے لئے ہے۔ اگر وہ ہماری روح کو سکون اور جسم کو آرام نہیں دے سکتا تو میں اُسے پُرانے کوٹ کی طرح اُتار کر پھینک دینا ہی پسند کروں گا۔ جو مذہب ہماری رُوح کی زنجیر ہو جائے اُس سے جتنی جلد ہم اپنی گلو خلاصی کر لیں اُتنا ہی اچھا۔ مجھے ہمیشہ اُس کا افسوس رہے گا۔ کہ بالواسطہ یا بے واسطہ طریقہ پر میں تمہارا دشمن ہُوا۔ اگر مجھے ذرا بھی معلوم ہوتا کہ یہ معاملہ اتنا طول کھینچے گا اور اس کا انجام اتنا افسوسناک ہو گا تو میں اُس آبادی پر قبضہ کرنے کا نام بھی نہ لیتا۔ میں نے سمجھا تھا کہ راشندے کچھ مخالفت ضرور کریں گے۔ لیکن دھمکانے سے ٹھیک ہو جائیں گے یہ نہیں جانتا تھا کہ لڑائی چھڑ جائے گی۔ اور اس میں میری ہار ہو گی۔ یہ کیا بات ہے صوفیا! کہ آج رانی جاتھوی نے میرے ساتھ مہذبانہ اور منکسرانہ سلوک کیا؟ میں تو چاہتا تھا کہ باہر ہی سے تمہیں بلا لوں لیکن دربان نے رانی صاحبہ سے کہہ دیا اور وہ فوراً باہر نکل آئیں۔ میں پشیمانی و ندامت سے گڑا جاتا تھا اور وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ بڑا وسیع دل ہے۔ پہلی کی سی رعونت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ صوفیا دے نے سنگھ کی ناوقت وفات کا کسے رنج نہ ہو گا؟ مگر اُن کی قربانی نے سینکڑوں جانیں بچا لیں ورنہ مجمع آگ میں کُود پڑنے کو تیار تھا۔ بڑا غضب ہو جاتا۔ مسٹر کلارک نے شور و اس پر گولی تو چلا دی تھی۔ مگر عوام کا رُخ دیکھ کر سہمے جاتے تھے کہ نہ جانے کیا ہو بہادر شخص تھا۔ بڑا ہی دلیر اور جانباز!
اس طرح صوفیا کو تسکین دینے کے بعد مسٹر سیوک نے اُس سے گھر چلنے

کا اصرار کیا۔ صوفیا نے بات ٹال کر کہا ــــ پاپا اس وقت مجھے معاف کیجئے۔ سُور داس کی حالت بہت نازک ہے۔ میرے یہاں رہنے سے ڈاکٹر اور دیگر مُلازمین خاص توجہ کرتے ہیں۔ میں نہ ہوں گی تو کوئی اُسے پُوچھے گا بھی نہیں۔ آیئے۔ ذرا دیکھئے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس حالت میں بھی وہ کتنا باہوش ہے اور کتنی دانشمندانہ گفتگو کرتا ہے! مجھے تو وہ انسانی قالب میں کوئی فرشتہ معلوم ہوتا ہے۔

سیلوک۔ میرے جانے سے اُسے رنج نہ ہوگا۔

صوفیا۔ کبھی نہیں پایا۔ اس کا تو خیال ہی تو دل میں نہ لائے۔ اُسے کینہ یا کدورت چھو تک نہیں گئی۔

دونوں سُور داس کے پاس گئے تو وہ پریشانیوں کی تکلیف سے بیقرار ہو رہا تھا۔ مسٹر سیلوک بولے۔ سُور داس کیسی طبیعت ہے؟

سُور داس۔ صاحب سلام۔ بہت اچھا ہوں۔ میرے دھنیہ بھاگ ہیں مرتے مرتے بڑا آدمی ہو جاؤں گا۔

سیلوک۔ نہیں نہیں۔ سُور داس۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ تم بہت جلد اچھے ہو جاؤ گے۔

سُور داس (ہنس کر) اب جی کر کیا کروں گا؟ اس سمے (وقت) مَرونا تو نہکینٹھ پاؤں گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو؟ جیسے کھیت کٹنے کا ایک بکھت ہے۔ ویسے ہی مرنے کا بھی ایک بکھت ہوتا ہے۔ یک جانے پر کھیت نہ کٹے تو اناج سڑ جائے گا۔ میری بھی وہی دَسا ہوگی۔ میں کئی آدمیوں کو جانتا ہوں جو آج سے دس برس پہلے مرتے تو لوگ اُن کا جس گاتے۔ آج اُن کی بُرائی ہو رہی ہے۔

سیلوک۔ میرے ہاتھوں تمہیں بہت نقصان پہنچا۔ اس کے لئے مجھے معاف کرنا۔

سُور داس۔ میرا تو آپ نے کوئی نکسان نہیں کیا۔ مجھ سے اور آپ سے

دشمنی ہی کون سی تھی؟ ہم اور آپ آمنے سامنے کی پالیوں میں کھیلے۔ آپ نے بھرسک جور لگایا۔ میں نے بھی بھرسک جور لگایا۔ جس کو جیتنا تھا جیتا۔ جس کو ہارنا تھا ہارا۔ کھلاڑیوں میں بیر نہیں ہوتا۔ کھیل میں روتے تو لڑکوں کو بھی لاج آتی ہے۔ کھیل میں چوٹ لگ جائے چاہے جان نکل جائے۔ پر بیر نہ ہونا چاہیئے۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔

سیوک۔ سُورداس۔ اگر اس فلسفہ کو۔ زندگی کے اس بھید کو میں بھی تمہاری طرح سمجھ سکتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ مجھے یاد ہے تم نے میرے کارخانہ کو آگ سے بچایا تھا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو شاید آگ میں اور تیل ڈالتا۔ تم اس لڑائی میں ہوشیار ہو سُورداس۔ میں تمہارے سامنے نادان بچہ ہوں۔ دُنیا کی نظروں میں میں جیتا اور تم ہارے۔ مگر میں جیت کر بھی دُکھی ہوں۔ اور تم ہار کر بھی سُکھی ہو۔ تمہارے نام کی پُوجا ہو رہی ہے۔ میرا پُتلا بنا کر لوگ جلا رہے ہیں۔ میں دولت اور عزت رکھ کر بھی تمہارا سامنا کر کے نہ لڑ سکا۔ سرکار کی آڑ سے لڑا۔ مجھے جب موقع ملا میں نے تمہارے اُوپر ناجائز حملے کئے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔

مرتے ہوئے آدمی کی وہ لوگ بھی کھلے دل سے تعریف کرتے ہیں۔ جن کی زندگی اُس سے دشمنی کرنے ہی میں گزری ہو۔ کیونکہ اب اُس سے کسی نقصان کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

سُورداس نے فراخدلی سے کہا۔ نہیں صاحب۔ آپ نے میرے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں کی۔ دَگا کرنا تو کمزوروں کا ہتھیار ہے۔ بلوان کبھی پیچھے نہیں ہوتا۔

سیوک۔ ہاں سُورداس۔ ہونا وہی چاہیئے جو تم کہتے ہو پر ایسا ہوتا نہیں میں ٹھیک قاعدہ پر کبھی نہیں چلا۔ میں دنیا کو کھیل کا میدان نہیں بلکہ لڑائی کا میدان سمجھتا رہا۔ اور لڑائی میں دغا۔ فریب۔ چھپاوار سبھی کچھ کیا جاتا ہے۔

مذہبی جنگ کا زمانہ اب نہیں رہا۔

سُور داس نے اُس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مٹھوا کی بات صاحب سے کہہ دوں یا نہیں؟ اُس نے کڑی قسم کھلائی ہے مگر کہہ دینا ہی مناسب ہے۔ لونڈا ضدّی اور بدچلن ہے پھر اُس پر کھیسو کا ساتھ۔ کوئی نہ کوئی شرارت ضرور کرے گا۔ قسم کھا دینے سے تو مجھے ہتیا لگتی نہیں۔ کہیں کچھ کر بیٹھا تو صاحب سمجھیں گے کہ اندھے نے مرنے کے بعد بھی کسر نکالی۔ بولا — صاحب۔ آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

سیلوک۔ کہو۔ شوق سے کہو۔

سُور داس نے چند لفظوں میں مٹھوا کی بیہودہ باتیں مسٹر سیلوک سے کہہ دیں اور آخر میں کہا۔ میری آپ سے اتنی ہی بنتی (عرض) ہے کہ اُس پر کڑی نگاہ رکھئے گا۔ اگر موکا پا گیا تو چوکنے والا نہیں ہے۔ تب آپ کو بھی اُس پر گُسّا آ ہی جائے گا اور آپ اُسے دنڈ دینے کا اُپائے سوچیں گے۔ میں ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں چاہتا۔

مسٹر سیلوک دیگر دولتمند لوگوں کی طرح بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ متفکرانہ لہجہ میں بولے۔ سُور داس تم نے مجھے ہوشیار کر دیا۔ اس کے لئے تمہارا احسان مند ہوں۔ مجھ میں اور تم میں یہی فرق ہے۔ میں تمہیں کبھی یوں نہ چڑاتا۔ کسی دوسرے کے ہاتھوں تمہاری گردن کٹتے دیکھ کر بھی شاید مجھے رحم نہ آتا۔ قصائی بھی رحمدل اور بیرحم ہو سکتے ہیں۔ ہم لوگ دشمنی میں بے رحم قصائیوں سے بھی بڑھ جاتے ہیں۔ (صوفیا سے انگریزی میں) بڑا راستی پسند شخص ہے۔ شاید دُنیا ایسے آدمیوں کے رہنے کا مقام نہیں ہے مجھے ایک چھپے ہوئے دشمن سے بچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ یہ تو بھتیجا ہے مگر بیٹے کی بات ہوتی تو بھی مجھے ضرور خبر کر دیتا۔

صوفیا۔ مجھے تو اب یقین ہوتا جاتا ہے کہ تعلیم دغابازوں کو پیدا کرتی ہے

اور قدرت بھلے آدمیوں کو۔

جان سیبوک کو یہ بات پسند نہ آئی۔ تعلیم کی اتنی ہجو وہ نہ برداشت کر سکتے تھے بولے۔ سُور داس میرے قابل اور کوئی خدمت ہو تو بتلاؤ۔

سُور داس۔ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

سیبوک۔ نہیں نہیں۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا پس وپیش کہو۔

سُور داس۔ طاہر علی کو پھر نوکر رکھ لیجئے گا۔ ان کے بال بچے بڑی تکلیف میں ہیں۔

سیبوک۔ سُور داس مجھے سخت افسوس ہے کہ میں تمہارے حکم کی تعمیل نہ کر سکوں گا۔ کسی بدنیت آدمی کو نوکر رکھنا میرے اصول کے خلاف ہے مجھے تمہاری بات نہ ماننے کا بہت رنج ہے مگر یہ میری زندگی کا ایک خاص اصول ہے۔ اور میں اُسے توڑ نہیں سکتا۔

سُور داس۔ رحم کرنا کبھی اصُول کے خلاف نہیں ہوتا۔

سیبوک۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ طاہر علی کے بچوں کی پرورش کرتا رہوں لیکن اُسے نوکر نہ رکھوں گا۔

سُور داس۔ جیسی آپ کی مرضی۔ کسی طرح اُن غریبوں کی پرورش ہونی چاہئے۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ رانی جاہنوی کا موٹر آپہنچا۔ رانی اُتر کر صوفیا کے پاس گئیں اور بولیں۔ بیٹی معاف کرنا۔ تجھے بڑی دیر ہو گئی۔ تم گھبرائیں تو نہیں؟ فقیروں کو کھلانے کے بعد یہاں آنے کو گھر سے نکلی تو کنور صاحب آ گئے۔ باتوں باتوں میں اُن سے بکواس ہو گئی۔ بڑھاپے میں کیوں آدمی اتنا دولت پرست ہو جاتا ہے۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں مسٹر سیبوک۔ آپ کا کیا تجربہ ہے؟

سیبوک۔ میں نے دونوں طرح کے آدمی دیکھے ہیں۔ اگر پرجو سیبوک دولت کو ہیچ سمجھتا ہے تو میرے والد صاحب کو پھیکی چائے۔ سادی چپاتیاں اور دھندلی روشنی ہی پسند ہے۔ دوسری طرف ڈاکٹر کنگرلی ہیں کہ جن کی آمدنی خرچ کے لئے

کافی نہیں ہوتی۔ اور پھر راجہ مہیندر کمار سنگھ جن کے یہاں پائی پائی کا حساب لکھا جاتا ہے۔

اس طرح باتیں کرتے ہوئے لوگ موٹروں کی طرف چلے۔ مسٹر سیوک اپنے بنگلہ کو گئے اور صوفیا رانی کے ساتھ سیوا آشرم کو۔

## (۴۵)

پانڈے پور میں گورکھے ابھی تک پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ اُن کے اُپلوں کے جلنے سے چاروں طرف دُھواں چھایا ہُوا تھا۔ اس پھیلی ہوئی تاریکی میں آبادی کے کھنڈر خوفناک معلوم ہوتے تھے۔ یہاں اب بھی دن میں تماشائیوں کا ہجوم رہتا تھا۔ شہر میں شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا۔ جو ان دو تین دنوں میں یہاں ایک بار نہ آیا ہو۔ یہ مقام اب مسلمانوں کی شہید گاہ اور ہندوؤں کا تیرتھ سمجھا گیا تھا۔ جہاں دنے۔ نگھ شہید ہوئے تھے وہاں لوگ جاتے تو پیر سے جُوتے اُتار دیتے۔ کچھ لوگوں نے وہاں پھول پتے بھی چڑھائے تھے۔ یہاں کی خاص چیز بھُوسی کے جھونپڑے کا سمان تھا۔ بھُوسی کے ڈھیر ابھی تک پڑے ہوئے تھے۔ لوگ یہاں آکر گھنٹوں کھڑے رہتے اور فوجوں کو غصہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتے۔ ان آدمیوں نے ہمیں ذلیل کیا اور اب بھی یہیں جمے ہوئے ہیں۔ اب نہ جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ مجرنگی۔ ٹھاکر دین۔ نائیک رام۔ جگدھر وغیرہ بھی اب زیادہ وقت یہیں گھورنے میں لگاتے۔ گھر کی یاد بھولے بھولتے ہی۔ بھولتی ہے۔ کوئی اپنی بھول سے چھوڑی ہوئی چیز تلاش کرنے آتا۔ کوئی پتھر یا لکڑی فرید نے اور بچوں کو اپنے گھروں کے نشانات دیکھتے ہی یہ لطف آتا تھا۔ ایک پوچھتا۔ اچھا بتاؤ ہمارا گھر کہاں تھا؟ دوسرا کہتا۔ وہ جہاں کتا لیٹا ہُوا ہے۔ تیسرا کہتا۔ جی کہیں ہو نہ؟ وہاں تو بچے کا گھر تھا۔ دیکھتے نہیں۔ یہ امرود کا پیڑ اُسی کے آنگن میں تھا۔ دوکان دار وغیرہ بھی یہیں شام صبح آتے اور گھنٹوں سر جھکائے بیٹھے

رہتے جیسے گھر کے لوگ مرے ہوئے آدمی کے چاروں طرف جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا آنگن تھا۔ یہ میری دالان تھا۔ یہیں بیٹھ کر تو میں بھی کھانا لکھا کرتا تھا۔ ارے میرے گھی کی ہانڈی پڑی ہوئی ہے۔ کتوں نے منہ ڈال دیا ہوگا۔ نہیں تو پیتے چلتے۔ کئی سال کی ہانڈی تھی۔ ارے میرا پرانا جوتہ پڑا ہوا ہے۔ پانی میں پھول کر کتنا بڑا ہو گیا ہے! دو چار آدمی ویسے بھی تھے جو اپنے بزرگوں کا رفیہ کھوجنے آیا کرتے تھے۔ عجلت میں انہیں گھر کھودنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دادا بنگال کی ساری کمائی اپنے سرہانے گاڑ کر مر گئے۔ کبھی اس کا پتہ نہ بتایا۔ کیسی ہی گرمی پڑے، کتنا ہی تھپر کاٹیں وہ اپنی کوٹھڑی ہی میں سوتے تھے۔ پتا جی کھودتے کھودتے رہ گئے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں شور نہ مچ جائے۔ جلدی کیا ہے؟ گھر ہی میں تو ہے۔ جب جی چاہے گا۔ نکال لیں گے۔ میں بھی یہی سوچتا رہا۔ کیا جانتا تھا کہ آفت آنے والی ہے نہیں تو پہلے ہی سے کھود نہ لیا ہوتا۔ اب کہاں پتہ ملتا ہے؟ جس کے بھاگ کا ہوگا وہ پائے گا۔

شام ہو گئی تھی۔ نایک رام بھرنگی اور ان کے دیگر احباب آکر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

نایک رام۔ کہو بھرنگی۔ کہیں کوئی گھر ملا؟

بھرنگی۔ گھر نہیں۔ پچھر ملا۔ سہر میں رہوں تو اتنا کرایہ کہاں سے لاؤں۔ گھاس چارا کہاں ملے؟ اتنی جگہ کہاں ملی جاتی ہے؟ ہاں اوروں کی طرح دودھ میں پانی ملانے لگوں تو گجر ہو سکتا ہے۔ پر یہ کرم عمر بھر نہیں کیا تو اب کیا کروں گا؟ دیہات میں رہتا ہوں تو گھر بنوانا پڑتا ہے۔ جمین دار کو بھرنہ دو۔ تو جمین نہ ملے۔ ایک ایک بسوے کے دو دو سو مانگتے ہیں۔ گھر بنوانے کو الگ ہجار روپیہ چاہئے۔ اتنے روپے کہاں سے لاؤں؟ جتنا ماوجہ ملا ہے اتنے میں تو ایک کوٹھڑی بھی نہیں بن سکتی۔ میں تو سوچتا ہوں کہ جانوروں کو بیچ ڈالوں اور یہیں پتلی گھر میں مجوری کروں۔ سب جھگڑا ہی مٹ جائے۔

طلب تو اچھی ملتی ہے۔ اور کہاں کہاں ٹھکانا ڈھونڈتے پھریں؟

جگدھر۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔ بنا بنایا مکان رہنے کو مل جائے گا۔ پڑے رہیں گے۔ کہیں گھر بیٹھے کھانے کو تو ملے گا نہیں۔ دن بھر کھونچہ لئے نہ پھرے۔ یہیں مجوری کی۔

ٹھاکر دین۔ تم لوگوں سے مجوری ہو سکتی ہے کرو۔ میں تو چاہے بھوکوں مر جاؤں پہ مجوری نہیں کر سکتا۔ مجوری سودروں کا کام ہے۔ روجگار کرنا ویسیوں کا کام ہے۔ اپنے ہاتھوں اپنا رتبہ کیوں کھوئیں۔ بھگوان کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگائیں گے ہی۔ یہاں تو اب کوئی مجھے سیت میت رہتے کہے تو نہ رہوں بستی اُجڑ جاتی ہے تو بھوتوں کا ڈیرا ہو جاتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو کیسا سینا پا چھایا ہوا ہے نہیں تو اس بیلا یہاں کتنا گل جار رہتا تھا۔

نایک رام۔ تجھے کیا صلاح دیتے ہو بھرنگی؟ دیہات میں رہوں کہ شہر میں؟

بھرنگی۔ بھیا۔ تمہارا دیہات میں نباہ نہ ہوگا۔ کہیں آگے پیچھے ہٹنا ہی پڑیگا۔ روج سہر کا آنا جانا ٹھہرا۔ کتنی مشکل ہوگی۔ پھر تمہارے جانوری تمہارے ساتھ دیہات میں تھوڑے جائیں گے۔ یہاں سے تو سہر اتنا دور نہیں تھا۔ اس لئے سب چلے آتے تھے۔

نایک رام۔ تمہاری کیا صلاح ہے۔ جگدھر؟

جگدھر۔ بھیا۔ میں تو سہر میں رہنے کو نہ کہوں گا۔ کھرچ کتنا بڑھ جائے گا۔ مٹی بھی مول لے۔ پانی کے بھی دام دو۔ چالیس پچاس کو تو ایک چھوٹا سا مکان ملیگا۔ تمہارے ساتھ ہر بکھت دس بیس آدمی رہا چاہیں۔ اس لئے بڑا گھر لینا پڑیگا۔ اس کا کرایہ سو سے نیچے نہ ہوگا۔ گائیں بھینسیں کہاں رکھو گے؟ جانوروں کو کہاں لکاؤ گے۔ تمہیں جتنا ماوجہ ملا ہے اُتنے میں تو اتنی جمین بھی نہ لے گی۔ گھر بنوانے کی کون کہے؟

نایک رام ۔ بولو بھائی بجرنگی ۔ سال کے بارہ سو کرایہ کے کہاں سے آئیں گے؟ کیا ساری کمائی کرایہ ہی میں کھرچ کر دوں گا؟

بجرنگی ۔ جمین تو دہات میں بھی مول لینی پڑے گی ۔ سینت تو ملے گی نہیں ۔ پھر کون جانے کس گاؤں میں جگہ ملے ۔ بہت سے آس پاس کے گاؤں تو ایسے بھرے ہوئے ہیں کہ وہاں اب ایک جھونپڑی بھی نہیں بن سکتی ۔ کسی کے دوار پر آنگن تک نہیں ہے ۔ پھر جگہ مل گئی تو گھر بنوانے کے لئے سارا سامان سہر سے لے آنا پڑے گا ۔ اس میں کتنا کھرچ پڑے گا ۔ نوکی لکڑی سے بنتے کھرچ ۔ کچا مکان بنواؤ گے تو کتنی تکلیف ۔ ٹیکے کیچڑ ہو ۔ روج منوں کوڑا نکلے ۔ سانویں دن لیپنے کو چاہئے ۔ تمہارا گھر میں کون لیپنے والا بیٹھا ہوا ہے ۔ تمہارے رہا پکے مکان میں نہ رہا جائے گا ۔ سہر ٹیکا آنے جانے کے لئے سواری رکھنی پڑے گی ۔ اس کا کھرچ بھی بچاس سے نیچے نہ ہوگا ۔ تم پکے مکان میں تو کبھی رہے نہیں ۔ کیا جانو ویک کیڑے مکوڑے ۔ سیل ۔ پوری چھپکلی ہوتی ہے ۔ تم تماس میں آدمی ٹھہرے ۔ پان پتا ساگ بھاجی ۔ دہات میں کہاں ہے ۔ میں تو یہی کہوں گا کہ دہات کے ایک کی جگہ سہر میں دو کھرچ ہوں تب کہیں سہر میں رہو ۔ وہاں ہم لوگوں سے بھی بھینٹ بھلائی ہو جایا کرے گی ۔ تم کھیر وہیں سے کر سہر تو روج جانا ہی پڑے گا ۔

نایک رام ۔ واہ بہادر واہ ۔ مان گیا تمہارا جوڑ تو بھیرو تھا ۔ دوسرا کون تمہارے سامنے ٹک سکتا ہے ۔ تمہاری بات میرے من میں بیٹھ گئی ۔ بولو جگہ کتنے میں دلا دیتے ہو تو دو بیگھے تو بجرنگی کی ڈگری ہوتی ہے ۔ سو روپے کرایہ دینا پڑے ۔ چھجھٹ کو سر پہ نہ لے گا ۔

جگدھر ۔ بھیا ۔ تمہاری مرضی ہے تو سہر میں چلے جاؤ ۔ میں بجرنگی سے لڑائی تھوڑے ہی کرتا ہوں ۔ یہ دہات دہات ہی ہے ۔ سہر سہر ہی ہے ۔ سہر میں پانی تک تو اچھا نہیں ملتا ۔ وہی میلے کا پانی پیو ۔ دھرم جائے اور کچھ سواد نہ ملے ۔ ٹھاکر دین ۔ اندھا آدمی جانی تھی ۔ جانتا تھا کہ ایک دن یہ پنچی گھر ہم

لوگوں کو بن باس دے گا۔ جان تک گنوائی پر اپنی جمین نہ دی۔ ہم لوگ اس کرنے کے چکلے میں آکر اُس کا ساتھ نہ چھوڑتے تو صاحب لاکھ سر ٹپک کر مر جاتے ایک نہ چلتی۔ نایک رام۔ اب اُس کے بچنے کی کوئی آسا نہیں معلوم ہوتی۔ آج تین گیا تھا۔ را حال تھا۔ کہتے ہیں کہ رات کو ہوش میں تھا۔ جان سیوک صاحب اور راجہ صاحب سے دیر تک باتیں کیں۔ معمولی سے بھی باتیں کیں۔ سب لوگ سوچ رہے تھے کہ اب بچ جائے گا۔ بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے کہا کہ اندر سے کی جان کا کچھ کھٹکا نہیں ہے۔ مگر سُور داس یہی کہتا۔ بابو آپ کو میری جو سالنت کرنا ہے کیجئے۔ پر میں بچوں گا نہیں۔ آج بول بند ہے۔ میٹھو پڑا کپوت نکل گیا۔ اُس کی پوتی نے اندھے کی جان لی نہیں تو ابھی کچھ دن اور جیتا۔ ایسے بیر بے ہی کہیں دتے ہیں۔ آدمی نہیں دیوتا تھا۔

بجرنگی۔ سچ کہتے ہو بھیا۔ آدمی نہیں تھا دیوتا تھا۔ ایسا مرد آدمی کہیں ہیں دیکھا۔ سچائی کے سامنے کسی کی پرواہ نہیں چاہے کوئی اپنے گھر کا لاٹ ہی کیوں نہ ہو۔ گھیسو کے پیچھے میں اُس سے بگڑ گیا تھا پر اب جو سوچتا ہوں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ سُور داس نے کوئی انیائے نہیں کیا۔ کوئی بدماس ہماری بہو کو بُری نگاہ سے دیکھے تو بُرا لگے گا کہ نہیں۔ اُس کے گھونسے کے پیاسے ہو جاؤ گے۔ گھات پائیں گے تو سر اتار لیں گے۔ اگر سُور نے ہمارے ساتھ وہی بیوہار کیا تو کیا بُرائی کی؟ گھیسو کا چلن بگڑ گیا تھا۔ سمجھا نہ پاتا تو نہ جانے کیا کدھیر کرتا۔

ٹھاکر دین۔ اب تک یا تو اُسی کی جان گئی ہوتی یا دوسروں کی۔

جگدھر۔ چودھری۔ گھر گاؤں میں اتنی سچائی نہیں برتی جاتی۔ اگر سچائی سے کسی کا نکسان ہوتا ہو تو اُس پر پردہ ڈال دیا جاتا ہے۔ سُور داس میں اور سب بس اچھی تھیں۔ بس اتنی ہی بات بُری تھی۔

ٹھاکر دین۔ دیکھو جگدھر۔ سُور داس یہاں نہیں ہے۔ کسی کی پیٹھ

پیچھے نندا (ہجو) نہیں کرنی چاہیئے۔ نندا کرنے والے کی تو بات ہی کیا۔ نندا سُننے والوں کو بھی پاپ لگتا ہے۔ نہ جانے پُورب جنم میں کون سا پاپ کیا تھا کہ ساری جماعت چور موسر لے گئے۔ یہ پاپ اب نہ کروں گا۔

بجرنگی۔ ہاں جگدھر۔ یہ بات اچھی نہیں۔ میرے اوپر بھی تو وہی پڑی ہے جو تمہارے اوپر پڑی۔ لیکن سورداس کی نندا نہیں سُن سکتا۔

ٹھاکر دین۔ ان کی بہو بیٹی کو کوئی گھورتا تو ایسی باتیں نہ کرتے۔

جگدھر۔ بہو بیٹی کی بات اور ہے۔ ہر جائیوں کی بات اور۔

ٹھاکر دین۔ بس اب چُپ ہی رہنا جگدھر۔ تمہیں ایک بار سُجھاگی کی سُجھا دیتے پھرتے تھے۔ آج ہرجائی کہتے ہو۔ لاج بھی نہیں آتی؟

نایک رام۔ یہ عادت بہت کھراب ہے۔

بجرنگی۔ آسمان پر تھوکنے سے تھوک اپنے ہی مُنہ پر پڑتا ہے۔

جگدھر۔ ارے تو میں سُورداس کی نندا تھوڑے ہی کر رہا ہوں۔ دِل دُکھتا ہے۔ تو بات منہ سے نکل ہی آتی ہے۔ تمہیں سوچ کہ بدیا دھراب کس کام کا رہا پڑھانا لکھانا سب مٹی ہو گیا کہ نہیں؟ اب نہ سرکار میں نوکری لگے گی۔ نہ کوئی دو آدمی رکھے گا۔ اُس کی تو جند کاہی کھراب ہو گئی۔ بس یہی دکھ ہے۔ نہیں تو سُورداس کا سا آدمی کونسا ہو گا۔

نایک رام۔ ہاں اتنا میں بھی مانتا ہوں۔ کہ اُس کی جند کاہی کھراب ہو گئی جس سچائی سے کسی کا اَن بھل ہوتا ہو اُس کا منہ سے نہ نکالنا ہی اچھا۔ پر سُورداس کو سب کچھ ماپھ ہے۔

ٹھاکر دین۔ سُورداس نے بدیا تو نہیں چھین لی؟

جگدھر۔ وہ بدیا کس کام کی جب نوکری چاکری نہ کر سکے۔ دھرم کی بات ہوتی تو یوں بھی کام دیتی۔ یہ بدیا ہمارے کس کام آوے گی؟

نایک رام۔ اچھا یہ بتاؤ کہ سُورداس مر گئے تو گنگا نہانے چلو گے یا نہیں

بھگدھر۔ گنگا نہانے کیوں نہ چلوں گا۔ سب کے پہلے چلوں گا۔ کندھا تو آدمی بیر بھدر کو بھی دے دیتا ہے۔ سُورداس ہمارے بَیری نہیں تھے۔ جب اُنہوں نے مٹھوا کو چھوڑا جیسے بیٹے کی طرح پالا تو دوسروں کی بات ہی کیا۔ مٹھوا کیا وہ اپنے کھاس پیٹے کو نہ چھوڑتے۔

نائک رام۔ چلو دیکھ آئیں۔

چاروں آدمی سُورداس کو دیکھنے چلے۔

## (۴۶)

چاروں آدمی شفاخانہ پہنچے تو نو بج چکے تھے۔ آسمان خواب میں مست آنکھیں بند کئے پڑا ہُوا تھا مگر زمین بیدار تھی۔ بھیرو کھڑا ہُوا سُورداس کو پنکھا جھل رہا تھا۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ سرہانے کی طرف بیٹھی ہوئی صوفیا بیقرار آنکھوں سے سُورداس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سُبھاگی انگیٹھی میں آگ بنا رہی تھی۔ کہ تھوڑا سا دودھ گرم کرکے سُورداس کو پلائے۔ تینوں کی شکل سے بالوسی برس رہی تھی۔ چاروں طرف وہ سکوت تھا جو موت کا پیش خیمہ ہے۔

صوفیا نے غمگین لہجہ میں کہا۔ پنڈا جی۔ آج سوگ کی رات ہے۔ اُن کی نبض کو کئی کئی منٹوں تک پتہ نہیں چلتا۔ شاید آج کی رات مشکل ہی سے کٹے۔ ہیئت تبدیل ہوگئی ہے۔

بھیرو۔ دوپہر سے یہی حال ہے۔ نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کو پہچانتے ہیں۔

صوفیا۔ ڈاکٹر گنگولی آتے ہی ہوں گے۔ اُن کا تار آیا تھا کہ میں آرہا ہوں۔ یوں تو موت کی دوا کسی کے پاس نہیں مگر ممکن ہے کہ ڈاکٹر گنگولی کے ہی ہاتھوں جس بدا ہو۔

سُبھاگی۔ میں نے شام کو پکارا تھا تو آنکھیں کھولی تھیں پر بولے کچھ نہیں۔

ٹھاکر دیوان۔ بڑا اکیالی پرس تھا۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک موٹر آیا اور کنور بھرت سنگھ۔ ڈاکٹر گنگولی او رانی جانہوی اُتر پڑے۔ گنگولی نے سُور داس کے چہرہ کی طرف دیکھا اور یاسانہ تبسم سے بولے۔ ہم کو دس منٹ کا بھی دیر ہوتا تو ان کا درسن بھی نہ پاتا۔ بُلا داآچکا ہے کیوں دودھ گرم کرتا ہے بھائی۔ دودھ کون پیئے گا؟ جمراج (فرشتہ موت) تو دودھ پینے کا مہلت نہیں دیتا۔

صوفیانے معصومانہ انداز سے پوچھا۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب گنگولی۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے مس صوفیا؟ ہم جمراج کو ہرا دے گا۔ ایسے لوگوں کا اصل چندگی تو موت کے پیچھے ہی ہوتا ہے جب وہ مٹی پانی ہوا آگ۔ آکاش۔ ان پانچوں کے بندھن کو توڑ دیتا ہے۔ سُور داس ابھی نہیں مرے گا۔ بہت دنوں تک۔ نہیں مرے گا ہم سب مر جائے گا۔ کوئی آج کوئی کل۔ کوئی پرسوں۔ پر سُور داس تو امر ہو گیا۔ اُس نے تو کال کو جیت لیا۔ ابھی تک اُس کا جندگی مٹی پانی وغیرہ پانچوں سے بندھا تھا اب وہ پھینے گا اور سارے صوبہ اور سارے ملک کو جگا دے گا۔ ہم کو کام کرنے کا پیرتنے کا بات بتائے گا۔ یہ سُور داس کا موت نہیں ہے۔ صوفیا! یہ اُس کی جندگی کا بڑھاوا ہے۔ ہم تو اسی ماپھک سمجھتا ہے۔

یہ کہہ کر ڈاکٹر گنگولی نے جیب سے ایک شیشی نکالی اور اُس کے کئی قطرے سُور داس کا منہ کھول کر حلق میں ٹپکا دیئے۔ فوری اثر نمودار ہُوا۔ سُور داس کے بے رونق چہرہ پر ہلکی ہلکی سُرخی دوڑ گئی۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر اُدھر تاکتے ہوئے ہنسا۔ پھر گراموفون کی سی بناوٹی اور بیٹھی ہوئی آواز سے بولا۔ بس بس اب مجھے کیوں مارتے ہو؟ تم جیتے اور میں ہارا۔ یہ باجی تمہارے ہاتھ رہی۔ مجھ سے کھیلتے نہیں بنا۔ تم منجھے ہوئے کھلاڑی ہو۔ دم نہیں اُکھڑتا۔ کھلاڑیوں کو بلا کر کھیلا ہو اور تمہیں حوصلہ بھی اچھا ہے۔ ہمارا دم اُکھڑ جاتا ہے۔ ہم ہانپنے لگتے ہیں۔ ہم کھلاڑیوں کو بلا کر نہیں کھیلتے۔ آپس میں بھڑتے ہیں۔ کالی گلوچ مار پیٹ کرتے

ہیں۔ کوئی کسی کی نہیں مانتا۔ تم کھیلنے میں ہوشیار ہو اور ہم اناڑی ہیں بس اتنا پھرک ہے۔ تالیاں کیوں بجاتے ہو؟ بیٹا جیتنے والوں کا دھرم نہیں۔ تمہارا دھرم تو ہے ہماری پیٹھ ٹھونکیں۔ ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں۔ ارے روئے تو نہیں۔ دھاندلی تو نہیں کی۔ پھر کھیلیں گے۔ جا دم لے لینے دو۔ بار بار کر تمہیں سے کھیلنا سیکھیں گے۔ اور ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی ضرور ہوگی۔

ڈاکٹر گنگولی اس بکواس کو آنکھیں بند کئے کچھ دیر تک بالکل بے حس و حرکت ہو کر سنتے رہے۔ گویا کلام خدا ہو۔ پھر عقیدت کے لہجہ میں بولے ۔۔۔ بڑے کھلاڑی کا آدمی ہے۔ ہمارے نام آپس کے سوشل اور پولیٹیکل جنگ کا بڑا اچھا تصویر کھینچ دیا اور تھوڑے میں۔

صوفیا نے سورداس سے کہا۔ سورداس ۔۔۔ کنور صاحب اور رانی جی آئے ہوئے ہیں۔ کچھ کہنا چاہتے ہو؟

سورداس نے مخمور دیانہ سرگرمی سے کہا۔ ہاں ہاں ہاں۔ بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اُن کے پیروں کی دھول میرے ماتھے پر لگا دو۔ تر جاؤں۔ نہیں نہیں مجھے اٹھا کر بیٹھا دو۔ کھول دو بیٹی۔ میں کھیل چکا۔ اب مجھے مرہم پٹی نہیں چاہئے۔ رانی۔ کون؟ بنے سنگھ کی ماتا نا؟ کنور صاحب اُن کے پتا نا؟ مجھے بیٹھا دو۔ اُن کے پیروں پر آنکھیں ملوں گا۔ میری آنکھیں کھل جائیں گی۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر اسیس دو۔ آہا۔ ہاں اب میری جیت ہوگی۔ ادھیر۔ وہ سامنے بنے سنگھ اور اندر دت سنگھ سنگاسن پر بیٹھے ہوئے مجھے بُلا رہے ہیں۔ اُن کے پہلو پہ کتنا تیج ہے! میں بھی آتا ہوں۔ بہو رانی تمہاری کچھ سیوا نہ کر سکا اب وہاں کروں گا۔ ماتا پتا۔ بھائی بند۔ سب کو سورداس کا رام رام! اب جاتا ہوں۔ جو کچھ بنا بگڑا ہو ما پھ کرنا۔

رانی جانہوی نے آگے بڑھ کر فرط عقیدت سے سورداس کے قدموں پہ سر

رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ سُور داس کے پیر آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ کنور صاحب نے آنکھوں پر رومال ڈال لیا اور کھڑے کھڑے رونے لگے۔

سُور داس کا چہرہ پھر اُداس ہو گیا۔ دوا کا اثر زائل ہو گیا۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

نایک رام گنگا جل لانے دوڑے۔ جگدھر نے سور داس کے قریب جا کر زور سے کہا۔ سُور داس میں ہوں، جگدھر۔ میرا اپرادھ چھما کرو۔

سور داس منہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں ہاتھ جوڑے۔ آنسو کی دو بُوندیں گالوں پر بہہ آئیں اور کھلاڑی میدان سے رُخصت ہو گیا۔

ایک لمحہ میں چاروں طرف خبر پھیل گئی۔ چھوٹے بڑے۔ امیر غریب۔ عورت مرد۔ بوڑھے جوان ہزاروں کی تعداد میں نکل پڑے۔ سب ننگے سر۔ ننگے پیر۔ گلے میں انگوچھے ڈالے شفاخانہ کے میدان میں جمع ہو گئے۔ عورتیں منہ ڈھانکے کھڑی رو رہی تھیں۔ گویا اپنے گھر کا کوئی آدمی مر گیا ہو۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اُسی کے سب ہوتے ہیں۔ سارا شہر اُمڈا چلا آتا تھا۔ سب کے سب اس کھلاڑی کو ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کی ہار میں بھی جیت کی شان تھی۔ کوئی کہتا تھا سادھو تھا۔ کوئی کہتا تھا ولی تھا۔ کوئی دیوتا کہتا تھا۔ پر اصل میں وہ کھلاڑی تھا۔ وہ کھلاڑی جس کے ماتھے پر کبھی شکن نہیں پڑی۔ جس نے کبھی ہمت نہیں ہاری جس نے کبھی قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ جیتا تو خوش رہا۔ ہارا تو خوش رہا۔ ہارا تو جیتنے والے سے کینہ نہیں رکھا۔ جیتا تو ہارنے والے پر تالیاں نہیں بجائیں۔ جس نے کھیل میں ہمیشہ صفائی برتی۔ کبھی دھاندلی نہیں کی۔ کبھی مخالف پر چھپ کر وار نہیں کیا۔ بھکاری تھا۔ مجہول تھا۔ زندھا تھا۔ بیکس تھا۔ کبھی پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوا کبھی بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملا۔ مگر دل پر داغ نہ تھا۔ سچائی اور ہمت کے جذبات سے معمور تھا۔ بدن پر گوشت نہ تھا مگر دل میں انکسار۔ اخلاق اور ہمدردی تھی۔

ہاں وہ سادھو نہ تھا۔ مہاتما نہ تھا۔ دیوتا نہ تھا۔ فرشتہ نہ تھا بلکہ ایک حقیر اور کمزور انسان تھا۔ مکروہاتِ دُنیا سے گھِرا ہُوا۔ جس میں برائیاں بہت۔ غصّہ۔ حرص۔ تلوّن۔ غرور۔ یہ سبھی بُرائیاں اُس میں موجود تھیں۔ وصف صرف ایک تھا۔ مگر یہ سبھی کمزوریاں اُس ایک وصف سے مِل کر نمک کی کان میں جاکر نمک ہوجانے والی چیزوں کی طرح خوبیوں کی شکل اختیار کرلیتی تھیں۔ غصّہ جائز غصّہ ہوجاتا تھا۔ حرص محبت بن جاتی تھی۔ تلوّن جوش کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا۔ اور غرور خودداری کی صورت میں۔ وہ وصف کیا تھا؟ حق پرستی۔ انصاف پسندی۔ ایثار نفسی یا ہمدردی یا اُس کا اور جو نام چاہے رکھ لیجئے۔ ناانصافی دیکھ کر اُس سے نہ رہا جاتا تھا۔ زیادتی اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔

جنازہ کس دھوم دھام سے نکالا گیا۔ اس کا ذکر کرنا فضول ہے۔ باجے گاجے نہ تھے۔ ہاتھی گھوڑے نہ تھے۔ مگر آنسو بہانے والی آنکھوں اور تعریف کرنے زبانوں کی کمی نہ تھی۔ بڑا ہجوم تھا۔ سُورداس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ دشمنوں کو بھی اُس سے دشمنی نہ تھی۔ اگر عزادار وں میں صوفیا۔ گنگولی۔ جانھوی۔ بھرت سنگھ نایک رام تھے تو مہیندر کمار سنگھ۔ جان سیوک جگدھر جیسے کہ مسٹر کلارک بھی تھے۔ صندل کی چتا تیار کی گئی تھی۔ اُس پر فتح کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ چتا میں آگ دینے کی رسم کون ادا کرتا؟ مٹھو ٹھیک اُسی وقت روتا ہُوا آپہنچا۔ سُورداس نے چیتے جی جو نہ کر پایا تھا اُسے مرکر کیا۔

اُسی مقام پر کئی روز پہلے یہی رنج و سوگ کا منظر دکھائی دیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اُس روز لوگوں کے دل میں غم تھا اور آج فتح کا غرور۔ وہ ایک بہادر کی بہادرانہ موت تھی۔ یہ ایک کھلاڑی کا آخری کھیل۔ ایک بار پھر آفتاب کی شعاعیں چتا پر پڑیں۔ اُن میں غرور کی چمک تھی گویا آسمان سے فاتحانہ گیت کے نغمے آرہے تھے۔

لوٹتے وقت مسٹر کلارک نے راجہ مہیندر کمار سے کہا۔ یہ میری بدنصیبی ہے

کہ میرے ہاتھوں ایسے نیک انسان کا خون ہُوا۔

راجہ صاحب نے طنز سے کہا۔ خوش نصیبی کہئے۔ بدنصیبی کیوں؟

کلارک۔ نہیں راجہ صاحب بدنصیبی ہی ہے۔ ہمیں آپ جیسے انسانوں سے خوف نہیں۔ خوف ایسے ہی آدمیوں سے ہے جو عوام کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ یہ حکومت کرنے کی سزا ہے کہ اس مُلک میں ہم ایسے آدمیوں کو قتل کرتے ہیں۔ جن کی انگلینڈ میں ہم پرستش کرتے۔

صوفیا اُسی وقت اُن کے پاس سے ہو کر گزری۔ یہ الفاظ اُس کے کان میں پڑے۔ بول اُٹھی — کاش یہ الفاظ آپ کے دل سے نکلے ہوتے!

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ مسٹر کلارک اس طنز سے تلملا گئے۔ ضبط نہ کر سکے۔ گھوڑا بڑھا کر بولے۔ یہ تمہارے اُس ظلم کا نتیجہ ہے جو تم نے مجھ پر کیا ہے۔

صوفیا آگے بڑھ گئی۔ یہ بات اُس نے نہ سُنی۔

آسمانی راہ گیر جو پردۂ ابر سے باہر نکل آئے تھے۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ لاش کے ساتھ جانے والے بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ پر صوفیا کہاں جاتی؟ اسی دوبدھا میں کھڑی تھی کہ اندو مل گئی۔ صوفیا نے کہا — اندو ذرا ٹھہرو۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔

## (۴۷)

شام ہو گئی تھی۔ مل کے مزدور چھٹی پا گئے تھے۔ آج کل دونی مزدوری دینے پر بھی بہت تھوڑے مزدور کام کرنے آتے تھے۔ پانڈے پور میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہاں اب مکانات کھنڈروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہاں درخت ابھی تک بدستور کھڑے تھے۔ وہ چھوٹا سا نیم کا درخت اب سُور داس کی جھونپڑی کا نشان بتلاتا تھا۔ چھوس لوگ اٹھائے گئے تھے۔ زمین ہموار کی جا رہی تھی۔ اور کہیں کہیں نئے مکانوں کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ صرف بستی کے آخری حصہ میں ایک

چھوٹا سا کھپریل کا گھر اب تک آباد تھا جیسے کسی خاندان کے سب آدمی مر گئے ہوں۔ اور صرف ایک بوڑھا کمزور اور مریض آدمی نام لیوا باقی رہ گیا ہو۔ یہی کنبہ کا گھر ہے جسے اپنے وعدہ کے ایفا میں سُور داس کی خاطر سے مسٹر جان سیوک نے گرانے نہیں دیا۔ دروازہ پر نسیمہ اور چاند کھیل رہے ہیں اور طاہر علی ایک ٹوٹی چارپائی پر سر جھکائے بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہینوں سے اُن کی حجامت نہیں بنی۔ بدن کمزور ہے۔ چہرہ اُترا ہوا۔ آنکھیں آگے کو نکل آئی ہیں۔ سر کے بال بھی کھچڑی ہو گئے ہیں۔ قید کی تکلیفوں اور گھر کی فکروں نے کمر توڑ دی ہے۔ وقت کی رفتار نے اُن پر برسوں کا کام مہینوں میں کر ڈالا ہے۔ اُن کے اپنے کپڑے جو جیل سے چھوٹتے وقت واپس ملے ہیں اُتارے سے معلوم ہوتے ہیں۔ آج صبح وہ ٹینی جیل سے آئے ہیں اور گھر کی دردناک حالت نے اُنہیں اتنا پریشان کر رکھا ہے کہ بال بنوانے تک کو جی نہیں چاہتا۔ اُن کے آنسو نہیں تھمتے۔ دل کو سمجھانے پر بھی نہیں تھمتے۔ اس وقت بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں رہ رہ کر طاہر علی پر غصہ آتا ہے اور وہ ایک آہ سرد کھینچ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ تکلیفیں یاد آرہی ہیں جو انہوں نے خاندان کے لئے خوشی سے جھیلی تھیں۔ وہ ساری تکلیفیں ساری قربانیاں بیکار گئیں۔ کیا اسی دن کے لئے میں نے اتنی مصیبتیں جھیلی تھیں؟ اسی دن کے لئے اپنے خون سے خاندان کے درخت کو سینچا تھا؟ یہی کڑوے پھل کھانے کے لئے؟ آخر میں جیل میں ہی کیوں گیا تھا؟ میری آمدنی میرے بچوں کی پرورش کے لئے کافی تھی۔ میں نے جان دی خاندان کے لئے۔ اُسی نے جو بوجھ میرے سر رکھ دیا تھا وہی میری تباہی کا سبب ہوا۔ غضب خدا کا مجھ پر یہ قہر! میں نے کبھی نئے جوتے نہیں پہنے۔ برسوں کپڑوں میں پیوند لگا لگا کر دن گزارے۔ بچے مٹھائیوں کو ترس ترس کر رہ جاتے تھے۔ بیوی کے سر کے لئے تیل بھی میسر نہ ہوتا تھا۔ چوڑیاں پہننا نصیب نہ تھا۔ ہم نے فاقے کئے۔ زیور اور کپڑوں کی کون کہے عید کے دن بھی بچوں کو نئے کپڑے نہ ملتے تھے۔ کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ بیوی

کے لئے ایک لوہے کا چھلا بنوا نا۔ اُلٹے اُس کے سارے گہنے فروخت کر کر کے کھلا دیئے اس تمام نفس کشی کا یہ نتیجہ اور وہ بھی میری غیر حاضری میں۔ میرے بچے اس طرح گھر سے نکال دئے گئے گویا کسی غیر کے بچے ہیں۔ میری بیوی کو رو رو کر دن کاٹنے پڑے۔ کوئی آنسو پونچھنے والا بھی نہ ہوا اور میں نے اسی کمبخت لونڈے کے لئے غبن کیا تھا! اسی کے لئے امانت میں خیانت کی تھی! کیا میں مر گیا تھا؟ اگر وہ لوگ میرے بال بچوں کو اچھی طرح عزت آبرو سے رکھتے تو کیا میں ایسا گیا گزرا تھا کہ ان کے احسان کے بار سے سبکدوش ہونے کی کوشش نہ کرتا؟ نہ دودھ گھی کھلاتے۔ نہ تہذیب ادھی پہناتے۔ روکھی روٹیاں ہی دیتے۔ گزی گاڑھا پہناتے مگر گھر میں تو رکھتے۔ وہ روپیوں کے پان کھا جاتے ہوں گے اور یہاں میری بیوی کو سلائی کر کے اپنا گزر بسر کرنا پڑا اُن ہی جیبوں سے تو جان سیوک ہی اچھے جنہوں نے رہنے کا مکان تو نہ گرایا۔ مدد کرنے کے لئے آئے تو۔

کلثوم نے یہ مصیبت کے دن سلائی کر کے گزارے تھے۔ دیہات کی عورتیں اُس کے یہاں اپنے لئے کرتیاں۔ بچوں کے لئے ٹوپ اور کرتے سلاتیں۔ کوئی پیسے دے جاتی۔ کوئی اناج۔ اُسے کھانے پینے کی تکلیف نہ تھی۔ طاہر علی اپنے عروج کے زمانہ میں بھی اُس سے زیادہ آرام نہ دے سکے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت سر پر اپنا شوہر تھا اور اب کوئی نہ تھا۔ اس بے کسی نے مصیبت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ تاریکی میں تنہائی زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔

طاہر علی سر جھکائے غمگین بیٹھے تھے کہ کلثوم نے دروازہ پر آکر کہا۔ شام ہو گئی اور ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ چلو۔ کھانا ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ طاہر علی نے سامنے کے کھنڈروں کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ ماہر تھانہ ہی میں رہتے ہیں یا کہیں اور مکان لیا ہے؟

کلثوم۔ مجھے کیا خبر۔ یہاں تب سے جھوٹوں بھی تو نہیں آئے جب یہ مکانات خالی کرائے جا رہے تھے۔ جبھی ایک روز سپاہیوں کو لے کر آئے تھے۔

نسیمہ اور صابر چچا چچا کہہ کر دوڑے پر اُنہوں نے دونوں کو پھٹکار دیا۔

طاہر علی۔ ہاں کیوں نہ پھٹکارتے۔ اُن کے کون ہوتے تھے۔

کلثوم۔ چلو دور تمہے کھالو۔

طاہر علی۔ ماہر میاں سے ملے بغیر مجھ پر آب و دانہ حرام ہے۔

کلثوم۔ مل لینا۔ کہیں بھاگے جاتے ہیں۔

طاہر علی۔ جب تک جی بھر اُس سے باتیں نہ کرلوں گا۔ دل کو تسکین نہ ہوگی۔

کلثوم۔ خدا اُنہیں خوش رکھے۔ ہماری بھی تو کسی طرح کٹ ہی گئی۔ خدا نے کسی نہ کسی حیلہ سے رزق پہنچا تو دیا۔ تم سلامت رہوگے تو ہماری پھر آرام سے گزرے گی اور پہلے سے زیادہ آرام سے۔ دو کو کھلا کر کھائیں گے۔ ان لوگوں نے جو کچھ کیا۔ اُس کا ثواب اور عذاب اُن کو خدا سے ملے گا۔

طاہر علی۔ خدا ہی انصاف کرتا تو ہماری یہ حالت کیوں ہوتی؟ اُس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔

اتنے میں ایک بڑھیا سر پر ٹوکری رکھے آکر کھڑی ہوگئی اور بولی۔ بہو لڑکوں کے لئے بھٹے لائی ہوں۔ کیا تمہارے میاں آگئے لیا؟

کلثوم بڑھیا کے ساتھ کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اُس کے کچھ کپڑے سئے تھے۔ دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

اندھیری رات دریا کی لہروں کی طرح مشرق سے دوڑی چلی آتی تھی۔ وہ کھنڈرا ایسے بھیانک معلوم ہوتے تھے گویا کوئی قبرستان ہے۔ نسیمہ اور صابر دونوں آکر طاہر علی کی گود میں بیٹھ گئے۔

نسیمہ نے پوچھا۔ ابا۔ اب تو ہمیں چھوڑ کر نہ جاؤ گے؟

صابر۔ اب جائیں گے تو ہمیں اِنہیں پکڑ لوں گا۔ دیکھیں کیسے چلے جاتے ہیں۔

طاہر علی۔ میں تمہارے لئے مٹھائیاں بھی نہیں لایا۔

نسیمہ۔ تم تو ہمارے ابّا جان ہو۔ تم نہیں تھے تو چچا نے ہمیں اپنے پاس سے بھگا دیا تھا۔

صابر۔ پنڈا جی نے ہمیں پیسے دئے تھے۔ یاد ہے نا نسیمہ؟

نسیمہ۔ اور سورداس کی جھونپڑی میں ہم تم جاکر بیٹھے تو اُس نے ہمیں گڑ کھانے کو دیا تھا۔ مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کرتا تھا۔

صابر۔ اُس بیچارے کو ایک صاحب نے گولی ماردی ابّا۔ مرگیا۔

نسیمہ۔ یہاں پلیگ آئی تھی ابّا۔ ہم لوگ ڈر کے مارے گھر سے نہ نکلتے تھے۔ کیوں صابر؟

صابر۔ نکلتے تو پلیگ والے پکڑ نہ لے جاتے!

بچّے تو باپ کی گود میں بیٹھ کر چہک رہے تھے مگر باپ کا دھیان ان کی طرف نہ تھا۔ وہ ماہر علی سے ملنے کو بیقرار تھے۔ اب موقع پایا تو بچّوں سے مٹھائیاں لانے کا حیلہ کرکے چل کھڑے ہوئے۔ تھانہ میں پہنچ کر پوچھا۔ تو معلوم ہُوا کہ داروغہ جی اپنے دوستوں کے ساتھ بنگلہ میں رونق افروز ہیں۔ طاہر علی بنگلہ کی طرف چلے جو پھوس کا ایک ہشت پہل جھونپڑا تھا۔ بیلوں سے سجا ہُوا۔ طاہر علی نے برسات میں سوتے اور اپنے احباب کی صحبت کا لُطف اُٹھانے کے لئے اسے بنوایا تھا۔ چاروں طرف سے ہوا جاتی تھی۔ طاہر علی نے سامنے جاکر دیکھا تو کئی اصحاب مسند لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ بیچ میں اُگالدان رکھا ہُوا تھا۔ خمیرہ تمباکو دھواں دھار اُڑ رہی تھی۔ ایک طشتری میں پان الائچی رکھے ہوئے تھے۔ دو چوکیدار کھڑے پنکھا جھل رہے تھے۔ اُس وقت تاش کی بازی ہو رہی تھی۔ درمیان میں مذاق بھی ہونے لگتا تھا۔ طاہر علی کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ یہاں یہ جلسے ہو رہے ہیں۔ یہ عیش کی گرم بازاری ہے۔ اور ایک میں ہوں کہ کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا بھی نہیں۔ روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ یہاں جتنا پان تمباکو میں اُڑ جاتا ہوگا اُتنے میں میرے بال بچّوں کی پرورش ہو جاتی۔ غصّہ سے ہونٹ چبانے لگے۔ خون کھولنے لگا۔ بیدھڑک مجلس میں گھس گئے۔ اور غم و غصّہ

سے دیوانہ ہو کر بولے ۔ ماہرا مجھے پہچانتے ہو کون ہوں ؟ غور سے دیکھ لو۔ بڑھے ہوئے بالوں اور پھٹے ہوئے کپڑوں نے میری صورت اتنی نہیں بدل ڈالی ہے کہ پہچانا نہ جا سکوں۔ بدحالی صورت کو نہیں تبدیل کر سکتی ۔ دوستو ۔ آپ لوگ شاید نہ جانتے ہوں گے ۔ میں اس بے وفا ۔ دغا باز ۔ کمینہ آدمی کا بھائی ہوں ۔ اس کے لئے میں نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں ۔ یہ میرا خدا جانتا ہے ۔ میں نے اپنے بچوں کو ۔ اپنی بیوی کو ۔ اپنی ذات کو اس کے لئے مٹا دیا ۔ اس کی ماں اور اس کے بھائیوں کے لئے میں نے وہ سب کچھ برداشت کیا جو کوئی انسان کر سکتا ہے ۔ اسی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے اُس کے شوق اور تعلیم کا خرچ ادا کرنے کے لئے میں نے قرض لیا ۔ اپنے آقا کے مال میں تصرف کیا اور جیل بھی گیا ۔ ان تمام نیکیوں کا صلہ یہ ہے کہ اس کم ظرف نے میرے بال بچوں کی بات بھی نہ پوچھی ۔ یہ اُسی روز مراد آباد سے آیا جس روز مجھے سزا ہوئی تھی ۔ میں نے اسے تانگہ پر آتے دیکھا ۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے ۔ میرا دل بلیوں اُچھلنے لگا کہ میرا بھائی ابھی آکر میری تشفی کرے گا ۔ اور گھر کو سنبھالے گا ۔ مگر یہ احسان فراموش سیدھا چلا گیا ۔ میری طرف دیکھا بھی نہیں ۔ منہ پھیر لیا ۔ اُس کے دو چار دن بعد یہ اپنے بھائیوں کے ساتھ یہاں چلا آیا ۔ میرے بچوں کو وہیں ویرانہ چھوڑ دیا ۔ یہاں مجلس سجی ہوئی ہے ۔ عیش ہو رہا ہے اور وہاں میرے تاریک مکان میں چراغ بتی کی بھی صورت نہیں ۔ خدا اگر منصف ہوتا تو اس کے سر پر اُس کا قہر بجلی بن کر گرتا ۔ لیکن اُس نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ۔ آپ لوگ اس ظالم سے پوچھئے کہ کیا میں اسی بیدردانہ سلوک کا سزاوار تھا ؟ کیا اسی دن کے لئے میں نے فقیروں کی سی زندگی بسر کی تھی ؟ اس کو شرمندہ کیجئے ۔ اُس کے چہرہ پر کالک لگائیے ۔ اس کے منہ پر تھوکئے ۔ نہیں ۔ آپ لوگ اس کے دوست ہیں ۔ مروت کے سبب انصاف نہ کر سکیں گے ۔ اب مجھی کو انصاف کرنا پڑے گا ۔ خدا گواہ ہے ۔ اور خود اس کا دل گواہ ہے کہ آج تک میں نے اسے کبھی تیز نگاہ سے بھی نہیں دیکھا ۔ اسے کھلا کر خود فاقہ کیا ۔ اسے پہنا کر خود

برہنہ رہا۔ مجھے یاد ہی نہیں آتا کہ میں نے کبھی نئے جوتے پہنے تھے۔ کبھی کپڑے بنوائے تھے۔ اس کے اُتارے ہوئے جوتوں اور کپڑوں ہی پر میری بسر ہوتی تھی۔ ایسے ظالم پر اگر خدا کا عذاب نہیں نازل ہوتا تو اس کا سبب یہی ہے کہ خدا نے انصاف کرنا چھوڑ دیا ہے۔

طاہر علی نے تیزی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور قبل اس کے ماہر علی کچھ جواب دیں یا جواب سوچ سکیں طاہر علی نے جھپٹ کر قلمدان اٹھا لیا۔ اس کی سیاہی نکال لی اور ماہر علی کی گردن زور سے پکڑ کر اس سیاہی کو اُن کے چہرہ پر مل دیا۔ پھر تین بار انہیں جھک جھک کر سلام کیا اور آخر میں یہ کہہ کر وہیں بیٹھ گئے۔ میرے ارمان نکل گئے۔ میں نے آج سے سمجھ لیا کہ تم مر گئے۔ اور مجھے تو تم نے پہلے ہی سے مرا ہوا سمجھ لیا ہے بس ہمارے اور تمہارے درمیان اتنا ہی رشتہ تھا۔ آج وہ بھی ٹوٹ گیا۔ میں اپنی تمام تکالیف کا صلہ اور انعام پا گیا۔ اب تمہیں اختیار ہے مجھے گرفتار کرو۔ مارو یا ذلیل کرو۔ میں یہاں مرنے ہی کے لئے آیا ہوں۔ زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ دنیا رہنے کی جگہ نہیں۔ یہاں اتنی دغا ہے۔ اتنی بیوفائی ہے۔ اتنا حسد ہے۔ اتنا کینہ ہے کہ یہاں زندہ رہ کر کبھی خوشی نہیں حاصل ہو سکتی۔

ماہر علی دم بخود سے بیٹھے رہے۔ مگر اُن کے ایک دوست نے کہا۔ مان لیجئے۔ انہوں نے بیوفائی کی۔ . . . . .

طاہر علی نے کہا۔ مان کیا لوں صاحب۔ بھگت رہا ہوں۔ رو رہا ہوں مانے کی بات نہیں ہے۔

دوست نے کہا۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ انہوں نے ضرور بیوفائی کی لیکن آپ بزرگ ہیں۔ یہ حرکت شرافت سے بعید ہے کہ کسی کو سر مجلس برا بھلا کہا جائے اور اُس کے چہرے پر سیاہی لگا دی جائے۔

دوسرے دوست نے کہا۔ شرافت سے بعید ہی نہیں ہے دیوانگی ہے۔ ایسے شخص کو پاگل خانہ میں بند کر دینا چاہئے۔

طاہر علی۔ جانتا ہوں۔ اتنا جانتا ہوں کہ شرافت سے بعید ہے لیکن میں شریف نہیں ہوں۔ پاگل ہوں۔ دیوانہ ہوں۔ شرافت تو آنسو بن کر آنکھوں کی راہ بہہ گئی۔ جس کے بچے گلیوں میں دو کانوں پر بھیک مانگتے پھرتے ہوں۔ جس کی بیوی پڑوسیوں کا آٹا پیس کر اپنا گزر کرے۔ جس کی کوئی خبر لینے والا نہ ہو۔ جس کے رہنے کو گھر نہ ہو۔ جس کے پہننے کو کپڑے نہ ہوں وہ شریف نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ آدمی شریف ہو سکتا ہے جس کے بیرحم ہاتھوں نے میرا یہ گلشن بنایا۔ اپنے جیل سے لوٹنے والے بھائی کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اگر شرافت ہے تو یہ بھی شرافت ہے۔ کیوں میاں ماہر بولتے کیوں نہیں۔ یاد ہے تم نئی اچکن پہنتے تھے اور جب تم اسے اتار کر پھینک دیا کرتے تھے تو میں پہن لیتا تھا۔ یاد ہے تمہارے پہننے جوتے گھٹا کر میں پہنا کرتا تھا؟ یاد ہے میرا حصہ یہ روپے ماہوار تھا اور وہ سب کا سب میں تمہیں مراسلاد بھیج دیا کرتا تھا۔ یاد ہے؟ دیکھو ذرا میری طرف دیکھو! تمہارے تمباکو کا خرچ میرے بال بچوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ نہیں تم سب کچھ بھول گئے۔ اچھی بات ہے بھول جاؤ۔ نہ میں تمہارا بھائی ہوں نہ تم میرے بھائی ہو۔ میری ساری تکلیفوں کا معاوضہ وہی سانپ ہے جو تمہارے منہ پر لگی ہوئی ہے۔ لو رخصت۔ اب تم پھر یہ صورت نہ دیکھو گے۔ اب سانپ کے دانت تمہارا دامن نہ پکڑیں گے۔ تمہارے اوپر میرا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ کہہ کر طاہر علی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس اندھیرے میں جدھر سے آئے تھے ادھر چلے گئے۔ جیسے ہوا کا کوئی جھونکا آئے اور نکل جائے۔ ماہر علی نے بڑی دیر کے بعد سر اٹھایا اور فوراً صابون سے منہ دھو کر تولیہ سے صاف کیا۔ بعدہٗ آئینہ میں منہ دیکھ کر بولے۔ آپ لوگ گواہ رہیں۔ میں ان کو اس حرکت کا مزہ چکھاؤں گا۔

ایک دوست۔ اجی جانے بھی دیجئے۔ مجھے تو دیوانہ سے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا دوست۔ دیوانہ نہیں تو اور کیا ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی سمجھداروں

کا کام ہے؟

ماہر علی۔ ہمیشہ سے یہود کے غلام رہے ہیں۔ جس طرف چاہتے ہے ناک پکڑ کر گھما دیتے ہے۔ آپ لوگوں سے فاقی دکھڑا کیا روؤں؟ میری ماں کی بھائیوں کی اور خود میری بھاوج کے ہاتھوں جو دُرگت ہوئی ہے وہ کسی دشمن کی بھی نہ ہو۔ کبھی بلا رشتے دار نہ نصیب ہوتا تھا۔ میری البتہ یہ ذرا خاطر کرتے تھے۔ سمجھتے رہے ہوں گے۔ کہ اس کے ساتھ ذرا نرمی برتو۔ جس زندگی بھر کے لئے میرا غلام ہو جائے گا۔ ایسی عورت کے ساتھ شاہ کو کرنا ہوتا؟ یہ حضرات تو جیل میں تھے۔ وہاں اُس نے ہم لوگوں کو فاقے کرنے شروع کئے۔ میں خالی ہاتھ تھا۔ بڑی مصیبت میں پڑا۔ وہ تو کہئے۔ دُور اندیشی کرنے سے یہ آسامی مل گئی۔ ورنہ خدا ہی جانے کہ ہم لوگوں کی کیا حالت ہوتی۔ ہم نہار منہ تمام دن بیٹھے رہتے تھے۔ اور مٹھائیاں منگا منگا کر کھائی جاتی تھیں۔ میں ہمیشہ سے ان کا ادب کرتا رہا۔ یہ اسی کا صلہ ہے جو آپ نے عطا فرمایا ہے۔ آپ لوگوں نے دیکھا کہ میں نے اتنی ذلت گوارا کی مگر سترک نہیں اٹھایا۔ زبان تک نہیں کھولی۔ نہیں ایک دھکا دیتا تو بیسیوں فلاہازیاں کھا جاتے۔ اب بھی دعوے کر دوں تو حضرت بندے بھر ہیں مگر اس وقت دُنیا یہی کہے گی کہ بڑے بھائی کو ذلیل کیا۔

ایک دوست۔ جانے بھی دو میاں گھروں میں ایسے جھگڑے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بھاوجوں کی بلا دُور کرو دوں کے لئے شرم نہیں ہے۔ لاؤ تاش اٹھاؤ۔ اب تک تو ایک بازی ہو گئی ہوتی۔

ماہر علی۔ قسم کلام شریف کی۔ اگر جان نے اپنے پاس کے دو ہزار روپے ان لوگوں کو کھلا دیئے۔ ورنہ پچیس روپیوں میں یہ بیچارے کیا کھا کر سارے خاندان کا خرچ سنبھالتے۔

ایک کانسٹیبل۔ ہجوم۔ گھر گرستی میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ جانے دیجئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ وہ بڑے ہیں۔ آپ چھوٹے ہیں۔ دُنیا انہیں کو تھوکے گی۔ آپ

کی بڑائی ہوگی۔

ایک دوست۔ میرا شیر کیسا لپکا ہوا تھا اور قلمدان سے سیاہی انڈیل کر حل ہی تو دی۔ مانتا ہوں۔

ماہر علی۔ حضرت۔ اس وقت دل نہ جلائیے۔ قسم خدا کی بڑا ملال ہے۔

طاہر علی یہاں سے چلے تو اُن کی حالت میں وہ اضطراب نہ تھا۔ وہ یہ رہے تھے کہ ناحق اپنی شرافت میں بٹہ لگایا۔ گھر آئے تو کلثوم نے پوچھا غائب ہو گئے، پھر راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ بچے رو کر سو گئے۔ اپنے پلنگ پر چلے گئے۔

طاہر علی۔ ذرا ماہر علی سے ملنے گیا تھا۔

کلثوم۔ اس کی ایسی کیا جلدی تھی؟ کل مل لیتے۔ تمہیں یوں بھی حوالوں وبیلہ کر شرمائے تو نہ ہوں گے؟

طاہر علی۔ میں نے انہیں ایسی سُنائی کہ عمر بھر نہ بھولیں گے۔ زبان تک نہ کھلی۔ اُسی غصہ میں میں نے اُس کے چہرہ پر کالک بھی لگا دی۔

کلثوم اُداس ہو گئی۔ بولی ــــ تم نے بڑی نادانی کا کام کیا۔ یہ کالک تم نے اُس کے منہ میں نہیں بلکہ اپنے منہ میں لگائی ہے۔ تمہاری زندگی بھر کے کئے دھرے پہ سیاہی پھر گئی۔ تم نے اپنی ساری نیکیوں کو ملیامیٹ کر دیا۔ آخر یہ تمہیں سُوجھی کیا؟ تم تو اتنے غصہ ور کبھی نہ تھے۔ اتنا صبر نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی ہی تھے۔ اُن کی پرورش کی تو کون سی حاتم کی قبر پر لات ماری۔ نیکی نیکی ہے۔ انسان کسی غیر کے ساتھ بھی نیکی کرتا ہے تو دریا میں ڈال دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ قرض وصول کرتا پھرے۔ تم نے جو کچھ کیا خدا کی راہ میں کیا۔ اپنا فرض سمجھ کر کیا۔ قرض نہیں دیا تھا کہ معہ سود واپس لے لو۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے نہ رکھا۔ ابھی دُنیا اُن کو ہنستی تھی۔ اب تمہیں ہنسے گی۔ دُنیا ہنسے یا نہ ہنسے۔ اس کی پرواہ نہیں۔ اب تک خدا اور رسول کی نظروں میں وہ خطاوار تھے۔ اب تم خطاوار ہو۔

طاہر علی نے نادم ہو کر کہا۔ حماقت تو ہو گئی مگر میں تو بالکل دیوانہ ہو گیا تھا۔
کلثوم بھری مجلس میں انہوں نے سر تک نہ اٹھایا۔ پھر بھی تمہیں غیرت نہ آئی۔ میں تو کہوں گی تم سے کہیں زیادہ شریف وہی ہیں ورنہ تمہاری آبروریزی کرا دینا اُن کے لئے کیا مشکل تھا۔

طاہر علی۔ اب یہی خوف ہے کہ کہیں مجھ پر دعوے نہ کر دے۔
کلثوم۔ اُن میں تم سے زیادہ انسانیت ہے!

کلثوم نے اتنا شرمندہ کیا کہ طاہر علی رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔ پھر بہت منانے پر کھانے کو اُٹھے اور کھا پی کر سوئے۔ تین روز تک وہ اسی کوٹھری میں پڑے رہے۔ کچھ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کہاں جائیں کیا کریں۔ کیسے گزر بسر کریں؟ چوتھے دن گھر سے نوکری کی تلاش میں نکلے مگر کہیں کوئی صورت نہ نکلی۔ یکایک انہیں سوجھی کہ کیوں نہ جلد بندی کا کام کروں۔ جیل خانہ میں وہ اس کام کو سیکھ گئے تھے۔ ارادہ پختہ ہو گیا۔ کلثوم نے بھی پسند کیا۔ بلا سے تھوڑا ملے گا۔ کسی کے غلام تو نہ رہو گے۔ سند کی ضرورت نوکری ہی کے لئے ہے۔ وہاں جیل سے آئے ہوؤں کا گذر نہیں۔ پیشہ ور دوں کے لئے کسی سند کی ضرورت نہیں۔ اُن کا کام ہی اُن کی سند ہے۔ چوتھے روز طاہر علی نے وہ مکان چھوڑ دیا اور شہر کے دوسرے محلہ میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر جلد بندی کا کام کرنے لگے۔

اُن کی بنائی ہوئی جلدیں بہت خوبصورت اور مضبوط ہوتی ہیں۔ کام کی کمی نہیں ہے۔ سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اُنہوں نے اب دو تین جلد سازوں کو نوکر رکھ لیا ہے اور شام تک دو تین روپے کی مزدوری کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی اتنے مرفہ حال تھے۔

## (۴۸)

بنارس کے میونسپل بورڈ میں مختلف سیاسی عقاید کے لوگ موجود تھے۔ بادشاہت سے لے کر جمہوریت تک سبھی خیالات کے لوگ تھے۔ ابھی تک دولت و ثروت

کا بول بالا تھا۔ مہاجنوں اور رئیسوں کی اکثریت تھی۔ جمہوریت پسند فرقہ کمزور تھا۔ اُسے سر اُٹھانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ راجہ نہیندر کمار کی ایسی دھاک بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی اُن کی مخالفت نہ کر سکتا تھا۔ مگر پانڈے پور کے ستیاگرہ نے جمہوریت پسندوں میں ایک نئی اجتماعی قوت پیدا کر دی۔ اُس ساختہ کا سارا الزام راجہ صاحب پر عاید کیا جانے لگا۔ تحریک شروع ہوئی کہ انتظامی اقتصادی کی تجویز پیش کی جائے۔ تحریک روز بروز زور پکڑنے لگی۔ جمہوریت کے حامیوں نے طے کر لیا کہ موجودہ انتظام کا خاتمہ کر دینا چاہیئے جس کی وجہ سے عوام کو اتنی مصیبت برداشت کرنی پڑی۔ راجہ صاحب کے لئے یہ ایک سخت امتحان کا موقع تھا۔ ایک طرف تو حکام اُن سے بدظن تھے۔ دوسری طرف یہ مخالف جماعت اٹھ کھڑی ہوئی۔ بڑی مشکل میں پڑے۔ انہوں نے جمہوریت پسندوں کی مدد سے حکام کی مخالفت کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اُن کے سیاسی عقائد میں بھی کچھ تغیر واقع ہو گیا تھا۔ وہ عوام کو ساتھ لے کر میونسپلٹی کا کام کرنا چاہتے تھے۔ پر اب کیا ہو؟ اس تجویز کو روکنے کی کوشش کرنے لگے۔ جمہوریت پسند طبقہ کے رہنماؤں سے ملے۔ اُن کی بہت کچھ تشفی کی کہ آئندہ اُن کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوگا۔ ادھر اپنی جماعت کو بھی مضبوط کرنے لگے۔ جمہوری خیالات والوں کو وہ ہمیشہ سے حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے لیکن اب مجبوراً انہیں کی خوشامد کرنی پڑی۔ وہ جانتے تھے کہ بورڈ میں یہ تجویز رکھ دی گئی تو اس کا منظور ہو جانا یقینی ہے۔ خود دورے کرتے تھے۔ اپنے دوستوں کو بھی دوڑاتے تھے کہ کسی طرح یہ بلا سر سے دور ہو۔ مگر پانڈے پور کے بجائے وطنوں کا تمام شہر میں رونا ہو رہا تھا۔ اُن کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے۔ ہمیں کیونکر یقین ہو کہ ایسی حالت میں آپ پھر ایسی خودسری سے کام نہ کریں گے۔ سُور داس ہمارے شہر کا ایک رتن (جواہر) تھا۔ ونے سنگھ اور اندر دت انسانی جماعت کے دو رتن تھے۔ ان کا خون کس کی گردن پر ہے۔

بالآخر وہ تجویز حسب ضابطہ بورڈ میں پیش ہی کر دی گئی۔ اُس روز تڑکے

ہی سے ہمدردی کے اظہار میں لوگوں کا تانتا بندھنے لگا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے دس بارہ ہزار آدمی جمع ہو گئے۔ ایک بجے تجہیز و تکفین ہونی تھی۔ راجہ صاحب نے گھر جا کر نہایت دردناک الفاظ میں اپنی بیوی کو اطلاع دی اور شہادت کیلئے مجھے بھیجا۔ اس نازک حالت میں میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور بہانہ کر جاتا۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔ مگر میں نے اپنی ذلت کو مدنظر نہ رکھا۔ مجھے عہدہ کی پرواہ نہیں عزت کی پرواہ نہیں۔ صرف آپ کی خدمت کی پرواہ ہے۔ اب اور بھی زیادہ اس لئے کہ مجھے یہ سچی خوشی حاصل ہوئی ہے کہ میں اس عہدہ سے سبکدوش ہو کر میں نہ کر سکوں گا۔ کہ [illegible] میرے [illegible] سے نکل جائے گا۔ سو وہ اس سے مجھے اتنی ہی حقیقت [illegible] ہو سکتی ہے۔ آپ لوگوں کو شاید معلوم نہیں ہے کہ میں [illegible] جاتا ہوں [illegible] اور سچے دل سے افسوس ظاہر کیا [illegible] میں [illegible] اپنے عہدہ پر قائم رہوں اور نہ لیے تو [illegible] دینے [illegible] کے [illegible] کو نہیں ہو [illegible] تھے۔ [illegible] کے [illegible] کا اندر [illegible] اندر [illegible] ہاتھوں [illegible] دوست کی گردن پر چھری پھیرتا [illegible] نامنصفانہ ہے۔ یہ میرے [illegible] پر ناک پھوڑ [illegible] کے سامنے [illegible] ہوں۔ میں آپ کو اپنی خدمتوں کا [illegible] نہیں دلانا چاہتا۔ وہ تو مسلمہ ہے۔ آپ صاحبوں کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کی خدمت میں اپنا کتنا وقت صرف کیا ہے۔ کتنی محنت کتنی جانفشانی کی ہے۔ میں رعایت نہیں چاہتا۔ صرف انصاف چاہتا ہوں۔

تقریر نہایت مؤثر تھی مگر جمعیت پنچوں کو اپنے ارادہ سے باز نہ رکھ سکی۔ پندرہ منٹ میں اکثریت رائے سے ریزولیوشن منظور ہو گیا اور راجہ

صاحب نے بھی اُسی وقت استعفیٰ دے دیا۔ جب وہ بورڈ کے کمرہ سے باہر نکلے تو عوام نے تبھیں گُن کی تقریر سُننے کا موقعہ نہ ملا تھا اُن پر اتنی پھبتیاں اُڑائیں اتنی تالیاں بجائیں کہ وہ بڑی مشکل سے اپنے موٹر تک پہنچ سکے۔ پولیس نے کافی انتظام نہ کیا ہوتی تو ضرور فساد ہو جاتا۔ راجہ صاحب نے ایک بار کمرۂ بورڈ کے کمرہ کو آبدیدہ ہو کر دیکھا اور چل دیئے۔ نیک نام ہونا اُن کی زندگی کا خاص مقصد تھا۔ اور اس کا یاس انگیز نتیجہ ہوا۔ زندگی بھر کے کئے کرائے پر پانی پھر گیا۔ نہ نیک نامی۔ ساری عزت۔ ساری شہرت عوام کے غصہ کے سیلاب میں بہہ گئی!

راجہ صاحب وہاں سے چلے گئے گھر آئے تو دیکھا کہ اندو اور صوفیا دونوں بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی اندو بولی ۔ مس صوفیا سُور داس کا مجسمہ نصب کرنے کے لئے چندہ جمع کر رہی ہیں آپ بھی تو اُس کی جانبازی کے مداح تھے۔ کتنا دیجیے گا؟

صوفیا۔ اندو رانی نے ایک ہزار روپے دیئے ہیں اور اس کے دوگنے سے کم دینا آپ کے لئے نازیبا ہوگا۔

نہیندر کمار۔ میں اس کا جواب سوچ کر دوں گا۔

صوفیا۔ میں پھر کب آؤں؟

نہیندر کمار نے ظاہرداری سے کہا۔ آپ کے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود بھیج دوں گا۔

صوفیا اُن کے چہرہ کی طرف دیکھا اور [illegible] اُٹھ کر چلی گئی۔ تو راجہ صاحب نے اندو سے کہا۔ تم مجھ سے بلا پوچھے ایسا کام کیوں کرتی ہو جس سے میری سراسر بیعزتی ہوتی ہے؟ میں تمہیں کتنی بار سمجھا کر ہار گیا۔ آج اُسی اندھے کی بدولت مجھے منہ کی کھانی پڑی۔ بورڈ نے مجھ پر بے اعتمادی کا ریزولیوشن پاس کر دیا اور اُسی کے مجسمہ کے لئے تم نے چندہ دیا اور مجھے بھی دینے کو کہہ رہی ہو۔

اندو۔ مجھے کیا خبر تھی کہ بورڈ میں کیا ہو رہا ہے آپ نے بھی تو کہا تھا کہ اس

رزولیوشن کے پاس ہونے کا امکان نہیں ہے۔

راجہ۔ کچھ نہیں۔ تم مجھے ذلیل کرنا چاہتی ہو۔

اندو۔ آپ اس وقت سودا اس کی تعریف کر رہے تھے۔ میں نے سمجھا کہ چندہ دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں کسی کے دل کی بات تھوڑا ہی جانتی ہوں۔ آخر وہ رزولیوشن پاس کیسے ہو گیا۔

راجہ۔ اب میں کیا جانوں کہ کیسے پاس ہو گیا۔ اتنا جانتا ہوں کہ پاس ہو گیا۔ ہمیشہ سبھی کام اپنی مرضی یا امید کے موافق تو ہوا نہیں کرتے۔ جن لوگوں پر میرا کامل اعتماد تھا انہیں نے دغا کی وہ بورڈ میں آئے ہی نہیں۔ میں اتنا مکمل مزاج نہیں ہوں کہ جس کے سبب میری ذلت ہوئی اسی کی پرستش کروں۔ میں جب تک الامکان اس تحریک والی تحریک کو سرسبز نہ ہونے دوں گا بدلا تو ہو ہی رہا ہے اور ہوا ہی کرے پروا نہیں۔ میں سرکار کو ایسا بھر دوں گا کہ مجھ سے نقصان نہ ہونے پائے گا۔ تم کو نفع پہنچانے کی طاقت اب چاہے نہ ہو۔ پر نقصان پہنچانے کی طاقت ہے اور یہ طاقت روز بروز بڑھتی جائے گی۔ تم بھی اپنا چندہ واپس لے لو۔

اندو۔ (متغیر ہو کر) دئے ہوئے روپے واپس کر دوں؟

راجہ۔ ہاں اس میں کوئی ہرج نہیں۔

اندو۔ آپ کو کوئی ہرج نہ معلوم ہوتا ہو میری تو اس میں سراسر ذلت ہے۔

راجہ۔ جس طرح تمہیں میری ذلت کی پروا نہیں اسی طرح اگر میں بھی تمہاری ذلت کی پرواہ نہ کروں تو کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔

اندو۔ میں آپ سے روپے تو نہیں مانگتی۔

بات پر بات نکلنے لگی۔ حتےٰ کہ روٹھ کر پوتنہ پہنچی۔ پھر طعنوں کی بارش آئی حتےٰ کہ ایک لمحہ میں بدزبانی ہونے لگی۔ اپنے اپنے خیال کے مطابق دونوں حق پر تھے۔ اس لئے کوئی نہ دبتا تھا۔

راجہ صاحب نے کہا نہ جانے وہ کون سا دن ہوگا کہ مجھے تم سے نجات ملے گی۔ موت کے سوا شاید اب کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔

اندو۔ آپ کو اپنی عزت دینکنا می مبارک رہے میرا بھی ایشور مالک ہے میں بھی زندگی سے تنگ آ گئی۔ کہاں تک لونڈی بنوں؟ اب حد ہو گئی۔

راجہ۔ تم میری لونڈی ہو گی! وہ دوسری سوتی عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے شوہر پر جان نچھاور کر دیتی ہیں۔ تمہارا بس چلے تو مجھے زہر دے دو اور دے ہی رہی ہو۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا؟

اندو۔ یہ زہر کیوں اگلتے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ میرے گھر سے نکل جا۔ جانتی ہوں کہ آپ تو میرا رہنا شاق گذرتا ہے۔ آج سے نہیں بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ اُسی دن جان گئی تھی جب میں نے ایک مہری کو اپنی ساڑی دے دی تھی اور آپ نے مہابھارت مچایا تھا۔ اُسی دن سمجھ گئی تھی کہ یہ تیل مُنڈھے چڑھنے کا نہیں۔ جتنے دن یہاں رہی کبھی آپ نے یہ سمجھنے نہ دیا کہ یہ میرا گھر ہے۔ پیسے پیسے کا حساب دے کر بھی گلا نہیں چھوٹا۔ شاید آپ سمجھتے ہوں گے کہ یہ میرے ہی روپے کا اپنا کہہ کر من مانا خرچ کرتی ہے اور یہاں آپ کا ایک دھیلا چھونے کی قسم کھاتی ہوں۔ آپ کے ساتھ بیاہ ہوا ہے آپ کے ہاتھوں کچھ اپنا ضمیر نہیں فروخت کر دیا۔

مہیندر نے ہونٹ چبا کر کہا۔ بھگوان سب دکھ دے پر بُہے کا ساتھ نہ دے۔ بچے ہی دے، دے۔ تم جیسی عورت کا گلا گھونٹ دینا بھی ثواب میں داخل ہے۔ اس حکومت کی خیریت سمجھو کہ چین کر رہی ہو۔ اپنی حکومت ہوتی تو یہ قینچی سی چلنے والی زبان تالو سے کھینچ لیتا۔

اندو۔ اچھا اب چپ رہئے بہت ہو گیا۔ میں آپ کی گالیاں سُننے نہیں آئی ہوں۔ یہ لیجئے اپنا گھر۔ خوب پیر پھیلا کر سوئیے۔

راجہ۔ جاؤ۔ کسی طرح دفان بھی ہو۔ بلی بخشے چوہا کیا ہی بھلا۔

اندو نے دبی زبان سے کہا۔ یہاں کون تمہارے لئے دیوانہ ہو رہا ہے۔

راجہ نے غضبناک ہو کر کہا۔ گالیاں دے رہی ہو۔ زبان کھینچ لوں گا۔

اندو جانے کے لئے دروازہ تک گئی تھی۔ یہ دھمکی سُن کر لوٹ پڑی۔ اور شیرنی کی طرح بپھر کر بولی۔ اس بھروسہ پر نہ رہئے گا۔ بھائی مر گیا ہے تو کیا۔ گڑ کا باپ کو لھو نیا رہے۔ سر کے بال نہ بکھیرے گے۔ ایسے ہی بھلے مانس ہوتے تو دُنیا میں اتنا اُچکیں (رسوائی) کیسے کماتے؟

یہ کہہ کر اندو اپنے کمرہ میں گئی۔ اُن چیزوں کو سمیٹا جو اُسے ساتھ لیں گی تھیں۔ وہ سب چیزیں الگ کر دیں جو یہاں کی تھیں۔ فکر نہ تھی غم نہ تھا۔ ایک آگ تھی جو اُس کے نازک جسم میں زہر کی طرح پھیل رہی تھی۔ منہ سُرخ تھا آنکھیں سُرخ تھیں۔ رگیں رگوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ ذلت ایک آتشیں شے ہے۔

اپنی سب چیزیں سنبھال کر اندو نے اپنی خاص گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ گاڑی تیار ہونے تک وہ برآمدہ میں ٹہلتی رہی۔ جیوں ہی پھاٹک پر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ وہ اگر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا جس گھر کی وہ رانی تھی جسے وہ اپنا سمجھتی تھی جس میں کہیں ذرا سا کوڑا پڑا ہوا دیکھ کر وہ نوکروں کے سر ہو جاتی تھی اُسی گھر سے وہ اس طرح نکل گئی جیسے روح قالب سے۔ اُسی قالب سے جس کی وہ ہمیشہ حفاظت کرتی تھی اور جس کی ذرا سی تکلیف سے خود بے چین ہو جاتی تھی کسی سے کچھ نہ کہا اور نہ کسی کی ہمت پڑی کہ اُس سے کچھ پوچھے۔ اُس کے چلے جانے کے بعد مہاجن نے جا کر مہیندر سے کہا۔ سرکار۔ رانی بہو نہ جانے کہاں چلی جا رہی ہیں!

مہیندر نے اُس کی طرف گھور کر کہا۔ جانے دو۔

مہاجن۔ سرکار۔ صندوق اور صندوقچے لئے جاتی ہیں۔

مہیندر۔ کہہ دیا۔ جانے دو۔

مہاجن۔ سرکار رد تھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ابھی دُور نہ گئی ہوں گی۔ آپ منا لیں۔

مہیندر۔ میرا سر نہ کھا۔

اندو اپنا سب سامان لئے ہوئے سیدھا بھون پہنچی تو جانھوی نے کہا۔ تم لڑ کر آ رہی ہو۔ کیوں؟

اندو۔ کوئی اپنے گھر نہ رہنے دے تو کیا زبردستی ہے؟

جانھوی۔ صوفیا نے آتے ہی آتے مجھ سے کہا تھا۔ آج خیریت نہیں ہے۔

اندو۔ میں لونڈی بن کر نہیں رہ سکتی۔

جانھوی۔ تم نے ان سے بلا پوچھے چندہ کیوں لکھا؟

اندو۔ میں نے کسی کے ہاتھوں اپنا ضمیر نہیں بیچا۔

جانھوی۔ جو استری اپنے پُرمل کی ہتک کرتی ہے اُسے لوک پرلوک کہیں شانتی نہیں مل سکتی۔

اندو۔ کہاں آپ چاہتی ہیں کہ یہاں سے بھی چلی جاؤں؟ میرے زخم پر نمک نہ چھڑکئے۔

جانھوی۔ پچھتاوٹی اور کیا۔ سمجھانے سمجھاتے ہار گئی پر تم نے اپنی ہٹ نہ چھوڑی۔

اندو یہاں سے اُٹھ کر صوفیا کے کمرہ میں چلی گئی۔ ماں کی باتیں اُسے زہر سی لگیں۔

یہ جھگڑا اب ازدواجی دائرہ سے نکل کر سیاسی دائرہ میں پہنچا۔ مہیندر کمار اُدھر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے اور صوبہ کی گورنمنٹ کو بھی اُکسا رہے تھے۔ اِدھر اندو صوفیا کے ساتھ چندہ وصول کرنے میں مصروف تھی۔ مسٹر کلارک ابھی تک راجہ صاحب سے کینہ رکھتے تھے۔ اپنی ذلت بھولے نہ تھے۔ انہوں نے عوام کی اس تحریک میں دست اندازی کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ راجہ صاحب کی ایک نہ چلی۔ چندہ کثرت سے وصول ہونے لگا۔ ایک ماہ میں ایک لاکھ سے زیادہ آ گیا۔ کسی پر کسی طرح کا دباؤ نہ تھا۔ کسی سے کوئی سفارش نہ کرنا تھا۔ دونوں دیویوں کی کوششوں کا معجزہ تھا۔ نہیں اُن شہیدوں کی جانبازی کی کرامات تھی۔ جنہیں یاد کر کے لوگ ابھی رویا کرتے تھے۔ لوگ خود آ کر چندہ دیتے تھے۔ اور اپنی حیثیت سے زیادہ۔ مسٹر جان سیوک نے بھی اپنی خوشی سے ایک ہزار روپے دے دئے۔ اندو نے اپنا چندہ ایک ہزار تو دیا تھا۔ اب اپنے کئی قیمتی زیورات بھی دے ڈالے جو بیس ہزار کو فروخت ہوئے۔ راجہ صاحب کے دل پر سانپ سا لوٹتا رہتا تھا۔ پہلے پوشیدہ پھر علانیہ طور سے مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ گورنر کے پاس خود گئے۔ وہ سارا کو بھڑکایا۔ سب کچھ کیا مگر ہونا تھا وہی ہوا۔

چھ مہینے گذر گئے۔ سُورداس کا مجسمہ بن کر آ گیا۔ بنارس کے ایک مشہور کاریگر نے اُسے ایک قومی خدمت سمجھ کر بنا دیا تھا۔ اُسے پانڈے پور میں نصب کرنے کی تجویز تھی۔ جان سیوک نے بخوشی اجازت دے دی۔ جہاں سُورداس کا چھوٹا سا مجسمہ کھڑا تھا وہیں اُسے نصب کیا گیا۔ نیک ناموں کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے انسانوں کے پاس اور کون سا ذریعہ ہے؟ اشوک کی لاٹ بھی تو اُس کے سنگین ستونوں کی تحریروں سے تازہ ہے۔ والمیک

دیاس۔ ہومر اور فردوسی سب کو تو نہیں ملتے۔

پانڈے پور میں بڑی دھوم دھام سے جلسہ ہو رہا تھا۔ شہر کے لوگ اپنے کام چھوڑ کر اس میں شامل ہوئے تھے۔ رانی جانھوی نے اس مجسمہ کو قائم کیا۔ اس کے بعد دیر تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ پھر قومی رہنماؤں کی پُراثر تقریریں ہوئیں اور پہلوانوں نے اپنے اپنے کرتب دکھائے۔ شام کو ایک دعوت دی گئی۔ چھوت اور اچھوت ایک قطار میں بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے۔ یہ سُورداس کی سب سے بڑی فتح تھی۔ رات کو ایک ناٹک منڈلی (جماعت) نے سُورداس نامی ناٹک کھیلا جس میں سُورداس ہی کے حالات بیان کئے گئے تھے۔ پربھو سیوک نے انگلستان سے یہ ناٹک بنا کر اسی موقع کے لئے بھیجا تھا۔ بارہ بجتے بجتے جلسہ ختم ہُوا۔ لوگ اپنے اپنے گھر گئے۔ وہاں سناٹا چھا گیا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور اُس کی اُجلی روشنی میں سُورداس کی مُورت ایک ہاتھ میں ٹیکتی ہوئی اور دوسرا ہاتھ کسی غیبی دان کے سامنے پھیلائے کھڑی تھی۔ وہی کمزور جسم تھا۔ ہنسلیاں نکلی ہوئیں کمر جھکی ہوئی۔ چہرہ پر سکینی اور سادگی چھائی ہوئی مجسم سُورداس معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ متحرک تھا اور یہ ساکن۔ وہ گویا تھا اور یہ خاموش۔ اور بنانے والے نے اُس میں ایک ایسی محبت بھر دی تھی جس کا اصل میں پتہ نہ تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بیگناہ کا بھکاری دیوتاؤں سے سنسار کے کلیان کی بھیک مانگ رہا تھا!

آدھی رات گذر چکی تھی۔ ایک شخص سائیکل پر سوار ہو کر مجسمہ کے قریب آیا۔ اُس کے ہاتھ میں کوئی اوزار تھا۔ اُس نے لمحہ بھر تو مورت کو سر سے پیر تک دیکھا۔ اور پھر اُسی اوزار سے اُس پر وار کیا۔ تڑاق کی آواز ہوئی اور وہ سنگین بُت دھماکے کے ساتھ زمین پر آگرا اور اُسی شخص پر جس نے اُسے توڑا تھا۔ وہ شاید دُوسرا وار کرنے والا تھا کہ اتنے میں بُت گر پڑا۔ وہ بھاگ نہ سکا۔ اُسی کے نیچے دب گیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا تو راجہ نریندر کمار سنگھ تھے۔ سارے شہر میں خبر پھیل گئی کہ راجہ

صاحب نے سُور داس کی مُورت توڑ ڈالی اور خود اُسی کے نیچے دب گئے۔ جب تک جیا سُور داس کے ساتھ دُشمنی رکھی اور اُس کے مرنے پر بھی دُشمنی نہ چھوڑی۔ ایسے حاسد انسان بھی ہوتے ہیں۔ ایشور نے اُس کا پھل بھی فوراً دے دیا۔ جب تک جیئے۔ سُور داس سے نیچا دیکھا اور مرے بھی تو اُسی مجسمہ کے نیچے دب کر۔ دُشمنِ دِیم قاتل۔ مکّار۔ دغاباز اور اس سے بھی زیادہ ثقیل الفاظ میں اُن کا ذکر کیا گیا

کاریگروں نے پھر مسالہ سے مورت کے پیر جوڑے اور اُسے کھڑا کیا۔ لیکن اُس ضرب کے نشانات ابھی تک ہیروں پر بنے ہوئے ہیں۔ اور چہرہ بھی بگڑ گیا ہے۔

## (۴۹)

اِدھر سُور داس کی یادگار قائم کرنے کے لئے چندہ جمع کیا جا رہا تھا۔ اُدھر قلیوں کے مکانات کی سنگ بنیاد رکھنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ شہر کے معززین مدعو کئے گئے تھے۔ صوبہ کے گورنر سے سنگِ بنیاد رکھنے کی استدعا کی گئی تھی۔ ایک گارڈن پارٹی ہونے والی تھی۔ گورنر صاحب کو ایڈریس دیا جانے والا تھا۔ مسز سیوک دل و جان سے تیاریاں کر رہی تھیں۔ بنگلہ کی صفائی اور آرائش ہو رہی تھی۔ جھالریں وغیرہ بنائی جا رہی تھیں۔ انگریزی بینڈ بُلایا گیا تھا۔ مسٹر کلارک نے سرکاری اہلکاروں کو مسز سیوک کی مدد کے لئے تعینات کر دیا تھا اور خود بھی چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے۔

مسز سیوک کے دل میں اب ایک نئی اُمید پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ سنگھ کی موت سے صوفیا اب مسٹر کلارک کی طرف متوجہ ہو۔ اس لئے وہ مسٹر کلارک کی اور بھی خاطر و مدارت کر رہی تھیں۔ صوفیا کو خود جا کر ساتھ لانے کا قصد کر چکی تھیں۔ جیسے بنے گا دبے لاؤں گی۔ خوشی سے نہ آئے گی تو جبراً لاؤں گی۔ روؤں گی۔ پیروں پڑوں گی اور بغیر ساتھ لائے۔ اُس کا گلا نہ چھوڑوں گی۔

مسٹر جان سیوک کمپنی کی سالانہ رپورٹ تیار کرنے میں مصروف تھے۔ سال

گذشتہ کا منافع ظاہر کرنے کے لئے اُنہوں نے اسی موقع کو پسند کیا تھا۔ اگر واقعی منافع بہت کم ہُوا تھا۔ مگر جمع خرچ میں حسب دلخواہ تصرف کر کے وہ اُمید سے بڑھ کر منافع دکھلانا چاہتے تھے کہ کمپنی کے حصص کا نرخ چڑھ جائے اور لوگ اُن پر ٹوٹ پڑیں۔ اِدھر کے نقصان کو وہ اس حکمت سے پورا کرنا چاہتے تھے۔ کلرکوں کو رات رات بھر کام کرنا پڑتا تھا اور خود مسٹر سیوک حساب کے بنانے میں اُس سے کہیں زیادہ محنت کر رہے تھے جتنا کہ جلسہ کی تیاری میں۔

لیکن مسٹر ایشور سیوک کو یہ تیاریاں جنہیں وہ فضول خرچی کہتے تھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں۔ وہ بار بار جھنجھلاتے تھے۔ بیچارے بوڑھے آدمی کو صبح سے شام تک سر کھپاتے گزرتا تھا۔ کبھی بیٹے پر جھلاتے۔ کبھی بہو پر۔ کبھی منتظموں پر۔ بھی ملازموں پر۔ یہ پانچ من برف کی کیا ضرورت ہے؟ کیا لوگ اس میں نہائیں گے؟ من بھر کافی تھی۔ کام تو نصف من سے بھی چل سکتا تھا۔ اتنی شراب کی کیا ضرورت؟ کوئی پرنالہ بہانا ہے یا مہمانوں کو پلا کر اُن کی جان لینا ہے؟ اس سے کیا فائدہ کہ لوگ پی پی کر بدمست ہو جائیں اور آپس میں جوتی پیزار ہونے لگے؟ لگا دو گھر میں آگ یا مجھی کو زہر دے دو۔ نہ زندہ رہوں گا نہ جلن ہوگی۔ خداوند یسوع مجھے اپنے دامن میں لے۔ اس اندھیر کا کچھ ٹھکانا ہے۔ فوجی بینڈ کی کیا ضرورت؟ کیا گورنر کوئی بچہ ہے جو باجہ سُن کر خوش ہوگا یا شہر کے رُوسائے باجہ کے بھوکے ہیں۔ یہ آتشبازیاں کیا ہوں گی؟ غضب خدا کا! ایک سرے سے سب بھنگ پی گئے ہیں؟ گورنر کا خیر مقدم ہے پانچوں کا کھیل؟ پٹاخے اور چھچھوندریں کس کو خوش کریں گی؟ مانا کہ پٹاخے اور چھچھوندریں نہ ہوں گی۔ انگریزی آتشبازی ہوگی مگر کیا گورنر نے آتشبازی نہیں دیکھی؟ فضول کام کرنے سے کیا مطلب؟ کسی غریب کا گھر جل جائے۔ کوئی اور حادثہ ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ہندوستانی رئیسوں کے لئے یہ پھل میوے اور مٹھائیاں منگانے کی کیا ضرورت؟ وہ ایسے مربھوکے نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ایک سگریٹ کافی تھا۔ ہاں پان الائچی کا بندوبست اور کر دیا جائے۔

وہ یہاں کوئی دعوت کھانے تو آئیں گے نہیں۔ کمپنی کی سالانہ رپورٹ سننے آئیں گے۔ اے او خانساماں سُور! ایسا نہ ہو کہ میں تیرا سر توڑ کر رکھ دوں۔ جو جو وہ پگلی (مسز سیوک) کہتی ہے تو وہی کرتا ہے۔ تجھے بھی کچھ تمیز ہے کہ نہیں؟ جانتا ہے آج کل چار روپے سیر انگور ملتے ہیں۔ اُن کی مطلق ضرورت نہیں۔ فہرار جو یہاں انگور آئے۔ خلاصہ یہ کہ کئی دنوں کی لگاتار بکواس سے اُن کی طبیعت کچھ خراب سی ہو رہی تھی۔ کوئی ان کی سُنتا نہ تھا۔ سب ہی ماتی کرتے تھے۔ جب وہ بکتے بکتے تھک جاتے تو اُٹھ کر باغ چلے جاتے لیکن تھوڑی دیر بعد پھر آ پہنچتے اور پہلے کی طرح لوگوں پر بگڑنے لگتے۔ یہاں تک کہ جلسہ کے ایک ہفتہ قبل جب مسٹر جان سیوک نے یہ تجویز کیا کہ گھر کے سب نوکروں اور کارخانہ کے چپڑاسیوں کو اگلن مل کی نئی وردیاں دی جائیں تو مسٹر الیشور سیوک نے غصہ کے مارے وہ انجیل جسے وہ ہاتھ میں لیے ہوئے ظاہرا عینک کی مدد سے مگر دراصل اپنے حافظہ سے پڑھ رہے تھے اپنے سر پٹک لی اور بولے — یا خدا مجھے اس جنجال سے نکال! سر دیوار کے قریب تھا۔ یہ دھکا لگا تو دیوار سے ٹکرا گیا۔ نوے برس کی عمر۔ کمزور جسم (وہ تو کہو پرانی ہڈیاں تھیں جو کام دیتی تھیں) بیہوش ہو گئے۔ دماغ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا۔ آنکھیں نکل آئیں۔ ہونٹ کھل گئے اور جب تک لوگ ڈاکٹروں کو بلائیں اُن کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ خدا نے اُن کی آخری دعا قبول کر لی۔ انہیں اس جنجال سے نکال لیا۔ یقینی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کی موت کا خاص سبب کیا تھا۔ چوٹ کا صدمہ یا خانگی تفکرات کا صدمہ۔

صوفیا نے یہ خبر سُنی تو اُس کی کشیدگی جاتی رہی۔ اپنے گھر میں اب اگر کسی کو اُس سے محبت تھی تو وہ الیشو بیوک ہی تھے۔ صوفیا کو بھی اُن سے عقیدت تھی۔ اُس نے فوراً ماتمی لباس پہنا اور اپنے گھر گئی۔ مسز سیوک دوڑ کر اُس سے گلے ملیں اور ماں بیٹی نے مل کر الیشور سیوک کی لاش پر خوب آنسو بہائے۔

رات کو جب ماتمی دعوت ختم ہوئی اور لوگ اپنے اپنے گھر گئے تو مسز سیوک

نے صوفیا سے کہا۔ بیٹی تم اپنا گھر ہوتے ہوئے دوسری جگہ رہتی ہو۔ کیا یہ ہمارے لئے شرم و افسوس کی بات نہیں ہے؟ یہاں اب تمہارے سوا اور کون وارث ہے؟ پربھو کا اب کیا ٹھکانہ گھر آئے یا نہ آئے۔ اب تو جو کچھ ہو تمہیں ہو۔ ہم نے اگر سخت بات کہی ہوگی تو تمہارے بھلے کے لئے۔ میں کچھ تمہاری دشمن تو ہوں نہیں۔ اب اپنے گھر میں رہو۔ یوں آنے جانے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔ رانی صاحب سے مل آیا کرو۔ پر رہنا یہیں۔ خدا نے اور تو سب ارمان پورے کر دیئے۔ تمہاری شادی بھی ہو جاتی تو بے فکر ہو جاتی۔ پر تجھ جب آتا دیکھی جاتی۔ اتنے دنوں کا ماتم کم نہیں ہوتا۔ اب وقت گزارنا مناسب نہیں۔ میری خواہش ہے کہ اب کی تمہاری شادی ہو جائے اور گرمیوں میں ہم سب دو تین ماہ کے لئے منصوری چلیں۔

صوفیا نے کہا۔ جیسی آپ کی مرضی کریں گی۔

ماں۔ اور کیا صوفی۔ زمانہ ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔ ہماری زندگی کا کیا بھروسہ۔ تمہارے بڑے پاپا یہ ارمان لئے ہی چلے گئے۔ تو میں تیاری کروں؟

صوفیا۔ کہہ تو رہی ہوں۔

ماں۔ تمہارے پاپا سن کر پھولے نہ سمائیں گے۔ کنور دنے سنگھ کی میں برائی نہیں کرتی۔ بڑا جوانمرد تھا مگر بیٹی اپنے ہم مذہب شخص کی بات ہی کچھ اور ہے۔

صوفیا۔ ہاں اور کیا۔

ماں۔ تو اب رانی جاتھوی کے یہاں نہ جاؤ گی نہ؟

صوفیا۔ جی نہیں۔ نہ جاؤں گی۔

ماں۔ گاڑیوں سے کہہ دوں۔ تمہاری چیزیں اٹھا لائیں؟

صوفیا۔ کل رانی صاحبہ خود ہی بھیج دیں گی۔

مسز بیوک خوش خوش دعوت کا کمرہ صاف کرنے گئیں۔ مسٹر کلارک ابھی وہیں تھے۔ انہیں بھی یہ مژدہ سنایا۔ سن کر پھڑک اٹھے۔ باچھیں کھل

کھل گئیں۔ دوڑے ہوئے صوفیا کے پاس گئے اور بولے۔" صوفیا۔ تم نے مجھے زندہ کر دیا۔ آہا۔ میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ مگر تم ایک بار اپنے منہ سے میرے سامنے کہہ دو۔ تم اپنا وعدہ پورا کرو گی؟"

صوفیا۔ کروں گی۔

ابھی بہت سے لوگ موجود تھے پس مسٹر کلارک صوفیا کو پیار نہ کر سکے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتے اور ہوائی قلعے بناتے اپنے گھر گئے۔

علی الصباح صوفیا کا اپنے کمرہ میں پتہ نہ تھا۔ تلاش شروع ہوئی۔ ماں نے کہا کہ میں نے انہیں جاتے تو نہیں دیکھا پر جب یہاں سب لوگ سو گئے تھے تو ایک بار چھاتک کھلنے کی آواز آئی تھی۔ لوگوں نے سمجھا کہ کنور بھجرت سنگھ کے یہاں گئی ہو گی۔ فوراً ایک آدمی بھیجا گیا۔ لیکن وہاں بھی پتہ نہ تھا۔ بڑی ہل چل مچی۔ کہاں گئی؟

جان سیبوک۔ تم نے رات کو کچھ کہا سنا تو نہیں تھا؟

مسز سیبوک۔ رات کو تو شادی کی بات چیت ہوتی رہی۔ مجھ سے تیاریاں کرنے کو بھی کہا۔ خوش خوش سوئی۔

جان سیبوک۔ تمہاری سمجھ کا قصور تھا۔ اُس نے تو اپنے دل کی بات ظاہر کر دی۔ تم کو جتا دیا کہ میں کل نہ ہوں گی۔ جانتی ہو۔ شادی سے اس کا مطلب کیا تھا؟ فدا ہو جانا! اب وہ نے سے اُس کی شادی ہو گی جو یہاں نہ ہو سکی وہ بہشت میں ہو گی۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی سے شادی نہ کرے گی۔ تم نے رات کو شادی کا تذکرہ چھیڑ کر اُسے خوف زدہ کر دیا۔ جو بات کچھ دنوں میں ہوتی وہ آج ہی ہو گئی۔ اب جتنا رونا ہو رو لو۔ میں تو پہلے ہی رو چکا ہوں۔

اتنے میں رانی جانھوی آئیں۔ آنکھیں روتے روتے سُرخ ہو گئی تھیں۔ اُنہوں نے ایک خط مسز سیبوک کے ہاتھ میں دیا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔

یہ صوفیا کا خط تھا۔ ابھی ڈاکیہ نے دیا تھا۔ لکھا تھا:۔

"مادر محترمہ۔ آپ کی صوفیا آج دنیا سے رخصت ہوتی ہے۔ جب وہ نہ رہے تو یہاں میں کس کے لئے رہوں؟ اتنے روز تک دل کو تسکین دینے کی کوشش کرتی رہی۔ سمجھتی تھی کہ کتب کے مطالعہ میں اس دکھ بھری یاد کو غرق کر دوں گی اور اپنی زندگی کو خدمتی فرائض کی انجام دہی میں گوار دوں گی۔ مگر میرا پیارا وہ نے مجھے بلا رہا ہے۔ میرے بغیر اُسے وہاں ایک لمحہ بھی چین نہیں ہے۔ اُس سے ملنے جاتی ہوں۔ یہ جسم ہی میرے اور اُن کے درمیان میں حائل ہے۔ اسے میں یہیں چھوڑ دوں گی۔ اسے میں گنگا کو سونپے دیتی ہوں۔ میرا دل بشاش ہے۔ پیر اُڑے جا رہے ہیں۔ خوشی روئیں روئیں میں سما رہی ہے۔ اب جلد ہی مجھے وہ نے کے درشن ہوں گے۔ آپ میرے لئے غم نہ کیجئے گا۔ مجھے کھوجنے کی بیفائدہ کوشش بھی نہ کیجئے گا کیونکہ جب تک یہ خط آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا صوفیا کا سر وہ نے کے قدموں پر ہوگا۔ مجھے ایک زبردست طاقت کھینچے لئے جا رہی ہے اور بیڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹتی جا رہی ہیں۔ ماما اور پاپا سے کہہ دیجئے گا۔ کہ صوفیا کا بیاہ ہو گیا۔ اب اُس کی فکر نہ کریں۔"

خط کے ختم ہوتے ہی مسز سیوک دیوانہ وار کرخت لہجہ میں بولیں۔ "تمہیں بس کی گانٹھ ہو۔ میری زندگی کو برباد کرنے والی میری اُمیدوں کو پامال کرنے والی میری عزت بگاڑنے والی کالی ناگن تمہیں ہو۔ تمہیں نے اپنی شیریں کلامی سے اپنی چال بازی سے اپنی جادوگری سے میری سیدھی سادی صوفیا کو اپنا گرویدہ بنا لیا اور آخر اسے تباہ کر دیا۔ یہ تمہیں لوگوں کو ترغیب و تحریک کا نتیجہ ہے کہ میرا لڑکا آج نہ جانے کہاں اور کس حالت میں ہے۔ اور میری لڑکی کا یہ حشر ہوا۔ تم نے میرے سارے منصوبے خاک میں ملا دئے۔"

وہ اسی حالت غیظ میں نہ جانے اور کیا کیا کہتیں کہ مسٹر جان سیوک اُن کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے کھینچ لے گئے۔ رانی جاکھوی نے ان ناملائم اور اہانت آمیز الفاظ کا کچھ جواب نہ دیا۔ مسز سیوک کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھتی

رہیں اور پھر بلا کچھ کہے سُنے وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں۔
مسز سیوک کی تمام خواہشوں پر پالا پڑ گیا۔ اُس روز سے پھر اُنہیں کسی نے گرجا جاتے نہیں دیکھا۔ وہ پھر کبھی گاؤن اور ہیٹ پہنے ہوئے نہیں دکھائی دیں۔ پھر لیورو بین کلب میں نہیں گئیں۔ پھر (تکریمی دعوتوں میں شریک نہیں ہوئیں۔ دوسرے دن علی الصباح پادری پم اور مسٹر کلارک ماتم پُرسی کے لئے آئے۔ مگر مسز سیوک نے دونوں کو وہ پھٹکار سُنائی کہ اپنا سا منہ لے کر واپس گئے۔ خلاصہ یہ کہ اُسی روز سے اُن کی عقل میں فتور آگیا۔ دماغ اتنی سخت چوٹیں نہ سہہ سکا۔ وہ ابھی تک زندہ ہیں۔ مگر زندہ درگور۔ انسانوں کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ کبھی ہنستی ہیں کبھی روتی ہیں کبھی ناچتی ہیں۔ کبھی گاتی ہیں۔ کوئی سامنے جاتا ہے تو دانت نکالے کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔
رہے مسٹر جان سیوک۔ وُہ بالرسانہ استقلال کے ساتھ صبح سے شام تک اپنے تاجرانہ مشاغل میں منہمک رہتے ہیں۔ انہیں اب دُنیا میں کوئی خواہش کوئی آرزو نہیں۔ دولت سے اُنہیں بیغرضانہ محبت ہے۔ کچھ وہی محبت جو ادیبانِ کرام کو خدا سے ہوتی ہے۔ دولت اُن کے لئے کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وہ خود مقصد ہے۔ نہ دن کو دن سمجھتے ہیں نہ رات کو رات۔ کاروبار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ نفع بھی روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے یا نہیں اس میں شک ہے۔ ملک میں کوچہ کوچہ۔ دوکان دوکان۔ اس کارخانہ کے سگار اور سگریٹوں کی کثرت ہے۔ وہ اب پٹنہ میں ایک تمباکو کا کارخانہ کھولنے کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کیونکہ صوبہ بہار میں تمباکو بکثرت پیدا ہوتا ہے ان کی دولت کی ہوس علم کی ہوس کی طرح آسودہ نہیں ہوتی۔

## (۵۰)

کنور دے سنگھ کی بہادرانہ موت کے بعد رانی جانکوی کا جوش دُونا ہو

گیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعدی سے کام کرنے لگیں۔ اُن کے روئیں روئیں سے غیر معمولی سرگرمی ظاہر ہونے لگی۔ عالم ضعیفی کی کاہلی شباب کی تیزی میں تبدیل ہوگئی۔ انہوں نے کمربستہ ہوکر سنیاسمتی کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ رتو اس چھوڑ کر میدانِ عمل میں قدم رکھا اور اتنے جوش سے کام کرنے لگیں کہ سمنی کو جو فروغ کبھی نہ حاصل ہُوا تھا وہ اب ہوا۔ روپیہ کبھی اتنا زیادہ نہ تھا اور نہ والنٹیروں کی تعداد ہی کبھی اس قدر کثیر تھی۔ اُن کا خدمتی دائرہ بھی کبھی اتنا وسیع نہ تھا۔ اُن کے پاس جتنی ذاتی دولت تھی۔ وہ سب سمتی کو وقف کردی حتیٰ کہ اپنے لئے ایک زیور بھی نہ رکھا۔ سنیاسی کا بھیس لے کر دکھا دیا کہ موقع پڑنے پر عورتیں کتنا کام کرسکتی ہیں۔

ڈاکٹر گنگولی کی اُمیدواریاں بھی بالآخر اپنی برہنگی میں ظاہر ہوگئیں۔ اُنہیں معلوم ہوگیا کہ موجودہ حالت میں کوئی امید رکھنا اپنے ضمیر کو دھوکا دینے کے سوا اور کچھ نہیں۔ انہوں نے کونسل میں مسٹر کلارک کے خلاف بڑا واویلا مچایا مگر وہ سب نالہ صحرا ثابت ہُوا۔ مہینوں کی بحث اور سوالوں کی بھرمار سب بے سُود ہوئی۔ وہ گورنمنٹ کو مسٹر کلارک کی تنبیہ کے لئے مجبور نہ کرسکے۔ اس کے برعکس مسٹر کلارک کے عہدہ میں ترقی ہوگئی۔ اس پر ڈاکٹر صاحب اتنے برانگیختہ ہوئے کہ آپے میں نہ رہ سکے۔ وہیں بھری سبھا میں گورنر کو خوب سخت سُست کہا یہاں تک کہ صدر جلسہ نے اُنہیں بیٹھ جانے کو کہا۔ اُس پر وہ اور بھی گرم ہوئے اور صدر صاحب کی بھی خبر لی۔ اس پر صدر نے انہیں کونسل ہاؤس سے باہر چلے جانے کا حکم دیا اور پولیس سے مدد لینے کی دھمکی دی۔ مگر ڈاکٹر صاحب کا غصہ اب بھی فرو نہ ہوا۔ وہ بگڑ کر بولے "آپ حیوانی طاقت سے مجھے خاموش کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آپ میں جواز و انصاف کی قوت نہیں ہے۔ آج میرے دل سے وہ اعتقاد اٹھ گیا جو گزشتہ چالیس برسوں سے مجھے تھا کہ گورنمنٹ انصاف کی طاقت سے حکومت کرنا چاہتی ہے۔ آج

اس طاقت کی قلعی کھل گئی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ گیا اور ہم گورنمنٹ کو اُس کی بے حجابانہ اور برہنہ شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ اب ہمیں صاف نظر آرہا ہے کہ صرف ہم کو پیل کر تیل نکالنے کے لئے ہماری ہستی مٹانے کے لئے ہماری تہذیب و انسانیت کا خون کرنے کے لئے ہم کو غیر محدود زمانہ تک چکی کا بیل بنائے رکھنے کے لئے ہم پر حکومت کی جارہی ہے! اب تک جو کوئی مجھ سے ایسی باتیں کرتا تھا تو میں اس سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ میں ریپبلک۔ ہیومن اور لبرٹی وغیرہ کی تعریف کر کے اُسے لاجواب کر دینے کی کوشش کرتا تھا مگر اب معلوم ہو گیا کہ مقصد سب کا ایک ہے۔ صرف حصول کے ذرائع میں فرق ہے۔"

وہ زیادہ نہ بولنے پائے پولیس کا ایک سارجنٹ اُنہیں وہاں سے باہر نکال لے گیا۔ اور ممبر بھی وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے۔ پہلے تو لوگوں کو اندیشہ تھا کہ سرکار ڈاکٹر گنگولی پر مقدمہ چلائے گی مگر شاید کارکنان متعلقہ کو اُن کی پیرانہ سالی پر رحم آگیا خصوصاً اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اُسی روز گھر آتے ہی اپنا استعفےٰ بھیج دیا۔

وہ اُسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے اور تیسرے روز کنور بھرت سنگھ سے آملے۔ کنور بھرت سنگھ نے کہا۔ تم تو اتنے غصہ ور نہ تھے۔ یہ تمہیں ہو کیا گیا؟

گنگولی۔ ہو کیا گیا۔ وہی ہو گیا جو آج سے چالیس برس قبل ہونا چاہئے تھا۔ اب ہم بھی آپ کا ساتھی ہو گیا۔ اب ہم دونوں سمتی کا کام کھوب حوصلہ سے کرے گا۔

کنور۔ نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا ساتھ نہ دے سکوں گا۔ مجھ میں وہ جوش نہیں رہا۔ ولنے کے ساتھ سب چلا گیا۔ جانھوی البتہ آپ کی مدد کریں گی۔ اگر اب تک کچھ شک تھا تو آپ کے اس

مرچ چلے آنے سے وہ دور ہو گیا کہ سیدا سمتی سے حکام اعلےٰ بدظن ہیں اور اگر میں اُس سے علیحدہ نہ رہا تو مجھے اپنی جائداد سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہماری قسمت میں غلامی ہی لکھی ہوئی ہے۔ . . . . .

گنگولی۔ یہ آپ کو کیسے یقین ہُوا؟

کنور۔ حالات کو دیکھ کر اور کیا۔ جب یہ یقین ہے کہ ہم ہمیشہ غلام ہی رہیں گے تو میں اپنی جائداد کیوں تلف کروں؟ جائداد بچی رہے گی تو ہم اس معذوری کی حالت میں بھی اپنے غریب بھائیوں کے کچھ کام آسکیں گے۔ اگر وہ بھی نکل گئی تو ہمارے دونوں ہاتھ کٹ جائیں گے۔ ہم رونے والوں کے آنسو بھی نہ پونچھ سکیں گے

گنگولی۔ اہا۔ تو کنور رونے سنگھ کی موت بھی آپ کے اس پیڑی کو نہیں توڑ سکا ہم سمجھا تھا۔ اب آپ چھوٹ کیا پر دیکھتا ہے۔ تو وہ بیڑی ویسا ہی آپ کے پیروں میں پڑا ہُوا ہے۔ اب آپ کو معلوم ہُوا ہو گا کہ ہم کیوں جائداد والوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ تو اپنی جائداد کا گلام ہے۔ وہ کبھی سچائی کا لڑائی نہیں لڑ سکتا۔ جو سپاہی سونے کا اینٹ گردن میں باندھ کر لڑنے چلے وہ کبھی نہیں لڑ سکتا۔ اُس کو تو اپنے اینٹ کا پھکر لگا رہے گا۔ جب تک ہم لوگ موہ (حرص) کا تیاگ نہیں کرے گا ہمارا مطلب کبھی نہ پورا ہو گا۔ ابھی تک ہم کو کچھ سک تھا پر وہ بھی مٹ گیا کہ جائداد والا آدمی ہمارا مدد کرنے کے بدلے اُلٹا ہمیں نکسان پہنچائے گا۔ پہلے آپ تراس والا تھا۔ اب آپ جائداد والا ہو گیا۔

یہ کہہ کر ڈاکر گنگولی بردلی کے ساتھ وہاں سے اُٹھے اور جانھوی کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ کہیں جانے کو تیار بیٹھی ہیں۔ انھوں نے دیکھ کر ہنس کر ان کی تعظیم کی۔ پھر کہا "اب تو آپ بھی میرے رفیق ہو گئے ہیں جانتی تھی کہ ہم لوگ ایک نہ ایک روز آپ کو ضرور کھینچ لیں گے۔ جو

میں خودداری کا جذبہ ہے۔ اُن کے لئے وہاں جگہ نہیں ہے۔ وہاں اُنہیں کے لئے جگہ ہے جو یا تو خود غرض ہیں یا اپنے کو دھوکا دینے میں مشاق۔ ابھی یہاں دو ایک روز آرام کیجئے گا نا؟ میں تو آج کی گاڑی سے پنجاب جا رہی ہوں۔"

گنگولی۔ آرام کرنے کا وقت تو اب کریب آگیا ہے۔ اُس کا کیا جلدی ہے؟ تب بہت آرام کرے گا۔ ابھی تو ہم بھی آپ کے ساتھ چلے گا۔

جاتھوی۔ کیا کروں۔ بیچاری صوفیا نہ ہوئی ورنہ اُس سے بڑی مدد ملتی

گنگولی۔ ہم کو تو اُس کا حال وہیں بلا تھا۔ اس کی زندگی اب دُکھ میں کٹتا۔ وہ کھتم ہوگیا۔ یہ بہت اچھا ہُوا۔ پریم سے نراس ہو کر وہ کبھی سُکھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو وہ ستی تھا اور ستی کا یہی دھرم ہے۔ رانی اندو تو رام سے ہے نا؟

جاتھوی۔ وہ تو مہیندر کمار سے پہلے ہی روٹھ کر چلی آئی تھی۔ اب یہیں رہتی ہے۔ وہ بھی تو میرے ساتھ جا رہی ہے۔ اُس نے اپنی ریاست کے انتظام کے لئے ایک ٹرسٹ قائم کرنا طے کیا ہے۔ جس کے پریسیڈنٹ آپ ہوں گے۔ اُسے ریاست سے کوئی تعلق نہ رہے گا۔

اتنے میں اندو آگئی اور ڈاکٹر گنگولی کو دیکھ کر انہیں نمسکار کر کے بولی۔ "آپ خود آگئے۔ میرا تو ارادہ تھا کہ پنجاب ہوتے ہوئے آپ کی خدمت میں بھی حاضر ہوں۔"

ڈاکٹر گنگولی نے کچھ کھانا کھایا اور شام کے وقت تینوں آدمی یہاں سے روانہ ہو گئے۔ ان کے دلوں میں ایک ہی لگن تھی۔ ایک ہی آگ تھی۔ اُنہیں ایشور پر پورا بھروسہ تھا۔

کنور بھرت سنگھ اب پھر عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

پھر وہی سیر و شکار ہے۔ وہی رئیسانہ تکلفات۔ وہی امیرانہ نخرے۔ وہی نمود و نمائش۔ ان کے مذہبی اعتقاد کی جڑ اکھڑ گئی ہے۔ اس زندگی کے بعد اب اُن کے لئے نامتناہی خلا اور غیر محدود نیستی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دُنیا ناپائدار ہے۔ عقبےٰ بھی ناپائدار ہے۔ جب تک زندگی ہے ہنس کھیل کر گزار دو۔ مرنے کے پیچھے کیا ہوگا کون جانتا ہے؟ دُنیا سدا اسی طرح رہی اور اسی طرح رہے گی۔ اُس کا انتظام نہ کسی سے ہو سکا ہے نہ ہو سکے گا۔ بڑے بڑے دانا۔ بڑے بڑے فلاسفر۔ بڑے بڑے رشی منی مر گئے اور کوئی یہ بھید نہ جان سکا۔ ہم محض جیو ہیں اور ہمارا کام فقط جینا ہے۔ حُب الوطنی انسانیت۔ خدمت۔ ایثار۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ اب اُن کے مایوس دل کو انہیں خیالات سے تسکین ملتی ہے۔